

ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
اکتوبر 2016
معراج
Monthly PAKEEZA
REGD. NO. MC-1 OCT. 2016 PRICE RS.
دُرِ ثمن بلال کا ناول اختتامی مراحل میں
عنیزہ سید، سحر ساجد اور سیما رضا کی خصوصی تحریریں
وہ آئے بزم میں...... مصنفہ ثمینہ عظمت علی کی خوشگوار آمد

ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی



ماڈل: علینہ علی
میک اپ: روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی: موسیٰ رضا

MEMBER APNS
CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد رمضان خان	0333-2168391
	رانا لے حمید	0323-2895528
نمائندہ لاہور	سید افراز علی نازش	0332-4214400

قیمت فی پرچا (پاکستان) 60 روپے

قیمت فی پرچا (سعودی عرب) 12 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات

زر سالانہ (اندرونِ ملک) 800 روپے ...... جلد: 44 شمارہ: 07 نومبر 2016ء

اداریہ

سلسلے وار ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

خصوصی مضامین

پبلشر و پرو پرائٹر: نیشان رسول مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



مستقل عنوانات

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313, Fax: 35802551, E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجھے کچھ کہنا ہے......!

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم روزانہ ایسے بہت سے کام کرتے ہیں، جن کو ہم پسند بھی نہیں کرتے مگر نہ کرنے کی کوئی دلیل بھی نہیں ہوتی...... مثلاً ہمیں معلوم ہے کہ تیز رفتاری کے باعث حادثات رونما ہوتے ہیں۔ مگر جب ہمیں خود کہیں جلدی جانا ہو...... تو گاڑی تیز ترین چلاتے ہیں۔ ڈاکٹری اصول کے تحت مرغن غذائیں ہمارے لیے نقصان دہ ہیں مگر ہم کھاتے ہیں۔ خصوصاً شادیوں اور دعوتوں میں شریک ہو کر تو لمحہ بھر کے لیے یہ خیال نہیں آتا کہ آج کا یہ کھانا ہمارے معدے کے لیے گرانی کا باعث ہوگا۔

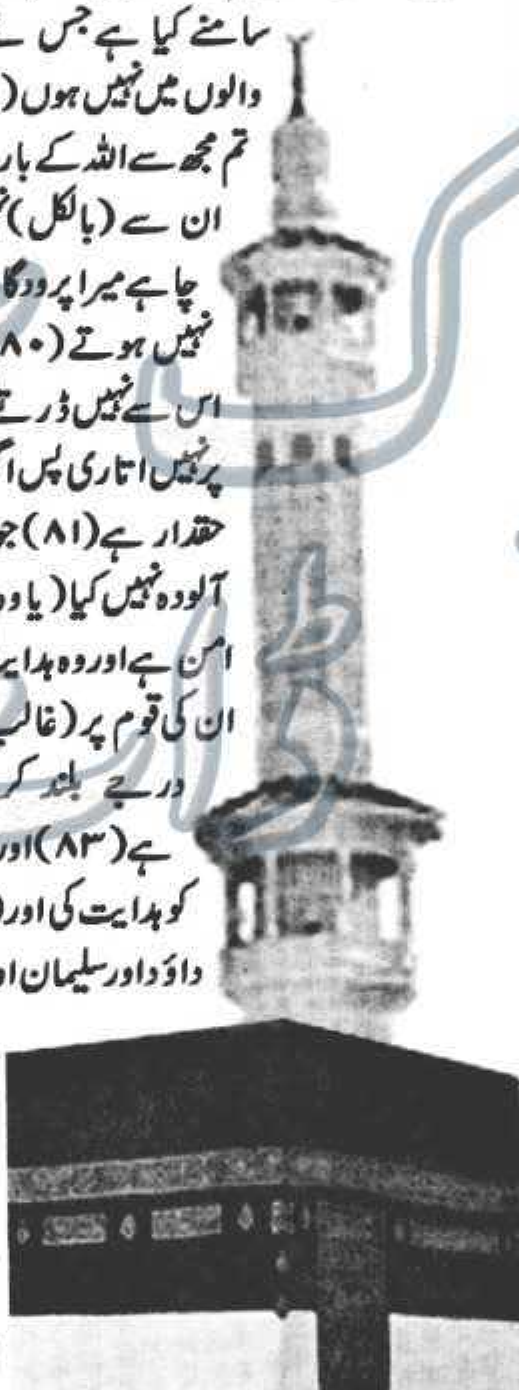
ہمارا سوشل میڈیا روزانہ چلا، چلا کر کہتا ہے کہ اگر پانی ابال کر نہیں پئیں گے تو بیمار ہو جائیں گے۔ پانی ابالنے سے جراثیم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ مگر غور کیجیے ہمارے ہاں زیادہ تر لوگ بغیر ابلا پانی پیتے ہیں بلکہ ہمارے ملک کی ننانوے فی صد آبادی، کنوؤں، دریاؤں، نہروں کا پانی پیتی ہے اور زندہ ہیں۔

حیرت تو ان لوگوں پر بھی ہے جنہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ پانی ابال کر پینا چاہیے۔ وہ بھی پانی کو ایسے ہی استعمال کرتے ہیں اور انہیں کچھ نہیں ہوتا یہ سطور لکھنے کا ہمارا مقصد بالکل یہ نہیں ہے کہ جو دل چاہے کرو...... کچھ نہیں ہوتا۔ اور پانی تو بالکل بھی ابال کر مت پیو...... طبی نقطۂ نظر سے ہمیں واقعی پانی ابال کر ہی پینا چاہیے۔ اور دیگر زندگی کے معاملات میں بھی سوچ بچار کر کام کرنا چاہیے۔

اور آج ہمیں آپ سے بھی صرف یہی کہنا ہے کہ بلاوجہ کے خوف اور وہم کبھی مناسب نہیں ہوا کرتے۔ بے شک ہم ابلا ہوا پانی پینے کے عادی ہیں لیکن کبھی بغیر ابلا پانی پینا پڑ جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں...... اور گھنٹوں پیاسے پھرنا بھی اس کا کوئی حل نہیں ہے۔ جذبات اور عقل کا درمیانی راستہ کامن سینس ہے جو ہمیں بتاتا ہے کہ زندگی کو سہولت سے گزارنے کے لیے ہمیں فوری عمل بھی کرنے پڑتے ہیں...... اور بیکار کی سوچیں خواہ مخواہ پریشان کیا کرتی ہیں اس لیے ہمیں ان سے خود ہی چھٹکارا پانا ہے، کیا خیال ہے؟

مدیرہ
انجم انصار

پس جب ان پر رات نے سیاہی ڈالی انہوں نے ستارے کو دیکھا کہا کہ یہ میرا پروردگار ہے پھر وہ جب ڈوب گیا (تو) کہنے لگے کہ میں ڈوبنے والوں کو دوست نہیں رکھتا (۷۶) پھر جب انہوں نے چاند کو چمکتے ہوئے دیکھا (تو) کہا کہ یہ میرا پروردگار ہے پھر وہ جب ڈوب گیا کہنے لگے اگر میرا پروردگار مجھے ہدایت نہ کرے گا تو بے شک یقیناً میں گمراہ لوگوں میں سے ہو جاؤں گا (۷۷) پھر جب آفتاب کو دمکتے ہوئے دیکھا کہا یہ میرا پروردگار ہے یہ (بہت) بڑا ہے پھر جب وہ ڈوب گیا تو کہنے لگے کہ اے میری قوم بے شک میں ان چیزوں سے بیزار ہوں جنہیں تم اللہ کا شریک کہتے ہو (۷۸) بے شک میں نے یکسو اپنا منہ اس (ذات مقدس) کے سامنے کیا ہے جس نے آسمان پیدا کیے اور زمین (پیدا کی) اور میں شرک کرنے والوں میں نہیں ہوں (۷۹) اور ان کی قوم نے ان سے جھگڑا کیا (تو) انہوں نے کہا کہ تم مجھ سے اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہو اور بے شک اس نے مجھے ہدایت کی اور میں ان سے (بالکل) نہیں ڈرتا جنہیں تم شریک کرتے ہو مگر یہ کہ میرا پروردگار کچھ چاہے میرا پروردگار باعتبار علم کے ہر چیز پر حاوی ہے پس کیا تم اب بھی نصیحت پزیر نہیں ہوتے (۸۰) اور میں ان سے جنہیں تم شریک کرتے ہو کیوں ڈروں اور تم اس سے نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ کے ساتھ اس کو شریک کیا جس کی اللہ نے کوئی سند تم پر نہیں اتاری پس اگر تم جانتے ہو (تو بھلا بتاؤ) تو دونوں فریق میں کون امن کا زیادہ حقدار ہے (۸۱) جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو کسی گناہ سے آلودہ نہیں کیا (یا وہ لوگ جو مشرک ہیں) یقیناً وہی لوگ (مومن) ہیں جن کے لیے امن ہے اور وہ ہدایت یافتہ ہیں (۸۲) اور یہ ہماری دلیل ہے جو ہم نے اور ابراہیم کو ان کی قوم پر (غالب) آنے کے لیے) عنایت فرمائی ہم جسے چاہتے ہیں اس کے درجے بلند کرتے ہیں بے شک تمہارا پروردگار حکمت والا (اور) دانا ہے (۸۳) اور ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب عنایت فرمائے (اور) ہر ایک کو ہدایت کی اور (اس سے) پہلے نوح کو ہدایت کر چکے تھے، ابراہیم کی اولاد سے داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو اور (جس طرح ہم نے اور ابراہیم کو مورد لطف بنایا) اسی طرح ہم نیکی کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں (۸۴) اور زکریا اور یحیٰی اور عیسیٰ اور الیاس کو (بھی ہدایت کی اور یہ) سب نیک بندوں میں سے ہیں (۸۵) اور اسماعیل اور الیسع اور یونس اور لوط کو (بھی ہدایت کی) اور (ان) سب کو ہم نے جہان والوں پر فضیلت دی (۸۶)



سورۂ انعام آیت نمبر ۷۶ تا ۸۶

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسمائے گرامی

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ سَیِّدِ الشَّاھِدِیْنَ

افضل الانبیا سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صفاتی اسمائے مبارک میں سے ایک نام شاہد بھی ہے جس کا مفہوم گواہی دینے والے، مشاہدہ کرنے والے کے ہیں۔

تفصیلِ مفہوم: شاہد کا مطلب حاضر و ناظر بھی ہے، مفردات راغب میں ہے۔

اَلشُّھُوْدُ وَالشَّھَادَۃُ اَلْحُضُوْرُ مَعَ الْمُشَاھَدَۃِ اِمَّا بِالْبَصَرِ اَوْ بِالْبَصِیْرَۃِ ۝

یعنی شہود اور شہادت کے معنی ہیں حاضر ہونا مع ناظر ہونے کے۔ بصر کے ساتھ ہو یا بصیرت کے ساتھ۔ اور گواہ کو بھی اس لیے شاہد کہتے ہیں کہ وہ مشاہدہ کے ساتھ جو علم رکھتا ہے اس کو بیان کرتا ہے حضور تمام عالم کی طرف مبعوث ہیں۔ آپ کی رسالت عامہ ہے جیسا کہ سورۂ فرقان کی پہلی آیت میں بیان ہوا ہے۔

"بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر قرآن کو اتارا کہ وہ سارے جہان کو ڈرسنائے۔" اس طرح حضور قیامت تک ہونے والی ساری مخلوق کے شاہد ہیں اور ان کے اعمال و افعال و احوال، تصدیق، تکذیبِ ہدایت، ضلال سب کا مشاہدہ فرماتے ہیں۔

(ابوالسعود و جمل)

القرآن: یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا (۴۵) سورۂ احزاب

ترجمہ: اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم نے تم کو گواہی دینے والا، خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول پاکؐ نے فرمایا کہ میرے واسطے دنیا ظاہر کی گئی اور میں نے دنیا کو اور قیامت تک ہونے والے واقعات کا اس طرح مشاہدہ کرلیا کہ جس طرح میں اپنے ہاتھ کی ہتھیلی دیکھتا ہوں۔ (خصائص کبریٰ)

سرولیم مور ایک مغربی مورخ کی رائے کے مطابق......

"فصاحت و بلاغت پر مہارت تامہ رکھتے ہوئے آپؐ کی موثر کن اندازِ گفتگو نے عربوں کی فصاحت پر گہرا اثر ڈالا اور آپؐ نے لوگوں کے سامنے قیامت کے دن کو جنت میں مومنین کی خوشیوں اور جہنم میں ملعون روحوں کی تکالیف کو یوں پیش کیا جیسے وہ عنقریب رونما ہونے والی حقیقتیں ہوں۔

الفضائل: روزانہ ۳۱۹ مرتبہ اس اسم پاک (شاہد) کا ورد کرنے والا لوگوں میں مقبول ہوگا اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ جو کوئی اس بات کا خواہشمند ہو کہ اس کی قوتِ مشاہدہ و مکاشفہ تیز ہو تو وہ کثرت سے اس اسم پاک کا ورد کرے۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماالنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اقتباس

گم شدہ محبت

قسط 9

انجم انصار

انسان نہ کچھ کر سیکھتا ہے، نہ رو کر سیکھتا ہے، جب بھی سیکھتا ہے، یا کسی کا ہو کر سیکھتا ہے، یا پھر کسی کو کھو کر سیکھتا ہے... چونکہ لوگ دل کے امیر کم، کم ہوتے ہیں، اس لیے زندگی کی کتاب میں اتنی غلطیاں نہ کرو کہ پنسل سے پہلے ربڑ ختم ہو جائے اور توبہ سے پہلے زندگی...

جو آنکھوں اوٹ ہے چہرہ اسی کو دیکھ کر جینا
یہ سوچا تھا کہ آساں ہے مگر آساں نہیں ہوتا
نہ بہلاوا نہ سمجھوتا، جدائی سی جدائی ہے
ادا سوچو تو خوشبو کا سفر آساں نہیں ہوتا

محبت کے انوکھے روپ سنوارتی ایک حسین تحریر......





ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر 5-L/79 ڈاکخانہ 5.L/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر:03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

شہلا سرشاری گھر میں داخل ہوئی تو ذکیہ بیگم اس سے کہیں زیادہ خوش اس کے انتظار میں ٹہل رہی تھیں اور جیسے ہی وہ دروازے سے اندر داخل ہوئی تو اس کے منہ میں مٹھائی کی ڈلی دے ڈالی۔

''کہاں سے آئی ہے یہ اتنی لذیذ برفی......؟'' شہلا نے مٹھائی رغبت سے کھاتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے منگائی ہے تاکہ سب سے پہلے تمہیں کھلاؤں۔''

''یقیناً آپ کی کمیٹی نکلی ہوگی۔'' اس نے سوچ کر کہا۔

''تم بھول گئیں شاید وہ تو دو ماہ پہلے ہی نکل چکی۔'' وہ مسکرائیں۔

''پھر کیا بات ہے؟'' اب وہ ان کے مقابل بیٹھی بڑی حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

''میرا اور تمہارے ابو کا عمرے کا ویزا لگ گیا ہے اور اب ہم آئندہ ہفتے سعودی عرب جائیں گے۔''

''آپ نے تو بتایا ہی نہیں...... کب پاسپورٹ ویزے کے لیے جمع کروائے تھے؟''

''میں نے کہاں...... وہ تو کریم لے گیا تھا، چھوٹی آپا کا بھی لگ گیا ہے۔ اور بڑے بھائی اور بھابی کا بھی یوں ہم سب ایک ساتھ جائیں گے۔''

''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے مگر روانگی کب تک ہے؟''

''آئندہ سنیچر کو انشاء اللہ......'' انہوں نے کہا اور اسے پانی پیتے ہوئے اُچھو ہو گیا۔

''کیا بات ہے؟'' اس کے چہرے پر پریشانی سی رچی دیکھ کر انہوں نے پوچھا۔

''وہ دراصل میرے آفس والے مجھے ایک ماہ کے لیے ٹریننگ پر بھیج رہے ہیں۔''

''ارے تو تم منع کر دو...... اور کہہ دو جب ہمارے گھر والے واپس آجائیں گے تب ہی ٹریننگ ہوگی۔''

''تو کیا وہ مان جائیں گے؟'' اس نے دھیمے سے جیسے اپنے آپ سے کہا تھا۔

''کیوں نہیں مانیں گے؟ اور میری غیر موجودگی میں، تم راحیلہ کے گھر چلی جانا...... یا اسے اور کریم کو یہاں بلا لینا تاکہ تمہیں اکیلے میں کسی قسم کا ڈر نہ لگے۔''

''امی آپ جانتی ہیں کہ نہ تو میں کریم کے گھر جاؤں گی اور نہ ہی اسے اپنے گھر بلا کر رکھوں گی۔''

''اب کیا تم اپنے گھر میں اپنی بہن کا داخلہ بند کرنا چاہتی ہو؟''

''یہ بھلا میں کب کہہ رہی ہوں۔

اگر میں صرف راحیلہ کو اپنے پاس بلاؤں گی تو کریم خود چلے آئیں گے اور ظاہر ہے میں انہیں روک نہیں پاؤں گی۔''

''اچھا ہے، ان دونوں کے آنے سے تمہیں دوسراہٹ رہے گی۔'' ذکیہ بیگم نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''امی، وہ راحیلہ کو جس، جس طرح تنگ کرتا ہے...... آپ شاید واقف نہیں۔'' اس نے جیسے انہیں آگاہ کیا۔

''اور اگر اس نے ہمارے گھر آکر...... میری بہن کو کچھ بھی ایسا ویسا کہہ دیا ناں...... تو میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسی وقت گھر سے نکال دوں گی۔ مجھ میں بالکل بھی برداشت نہیں ہے، کوئی بھی، میری بہن کی بے عزتی کرے...... ہاں۔''

''پھر تو ٹھیک ہے، وہ اپنے گھر میں رہیں اور تم اپنے گھر میں...... پرانا محلہ ہے، سب دیکھے بھالے لوگ ہیں اگر رات کو ڈر لگے...... تو پڑوس میں مینا بھابی کی پروین کو اپنے پاس سلا لیا کرنا۔''

''آپ ان باتوں کو چھوڑیں...... پہلے یہ بتائیں آپ کے پاس کتنے سوٹ نئے ہیں اور احرام اور عبایا کہاں سے لینا ہے۔'' شہلا...... نے ان کی تیاری کی باتوں سے گفتگو کا رخ ہی موڑ دیا۔

☆☆☆

پہلے ندیم کو...... اور پھر صبا کو نیچے گرتے دیکھ کر...... وہ لڑکا یہی سمجھا تھا کہ ایک گولی سے دو شکار ہو گئے ہیں۔

تب وہ دونوں ہی سرپٹ بھاگ نکلے...... بھاگتے ہوئے وہ کس سے ٹکرائے تھے ؟کس سے الجھے تھے...... یہ کسی کو بھی کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ بس بھگدڑ کا سماں تھا۔ اس بلڈنگ کا ہر دوسرا شخص بھاگتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر خود بھی بھاگ رہا تھا۔

مگر ندیم خان نے گرنے کے باوجود بھی صبا کو تھام لیا تھا۔

گولی صبا کے کہاں لگی تھی؟ ندیم کو یہ تو پتا نہیں چل رہا تھا مگر خون میں نہائی ہوئی صبا...... جس کے آف وائٹ سوٹ پر خون نے ایسے گل بوٹے بنا دیے تھے کہ ندیم خان جیسا مضبوط اعصاب کا شخص بھی پسینے پسینے ہو گیا تھا۔ اور اسے ایسا لگ رہا تھا...... جیسے آج کسی نے اس کی تمناؤں کا خون کر دیا ہو۔ وہ بار، بار بھی اس کی نبض چیک کر رہا تھا اور کبھی اس کی دل کی دھڑکن سن رہا تھا۔

صبا ہوش و خرد سے بیگانہ اس کے بازوؤں میں جھول رہی تھی۔

''ارے صبا میڈم تو مر گئی ہیں صاحب......'' آفس میں بچے لوگوں میں سے کوئی بولا۔

پھر بقیہ کھڑے ہوئے لوگ بھی آفس سے یوں بھاگے...... جیسے یہاں کوئی بم بلاسٹ ہو گیا ہو۔

اور تب ندیم خان بھی اسے اپنی بانہوں میں لے کر یوں باہر لپکا...... کہ کہیں دیر ہونے کے سبب اس کی دنیا ہی نہ اندھیری ہو جائے۔

آج اسے یہ پہلی مرتبہ معلوم ہوا تھا کہ جب دکھ، خوف اور بیچارگی اکٹھے ہو جائیں تو قدم کیسے بھاری ہو جاتے ہیں۔ نہ آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی سماعت کوئی کام کر پاتی ہے۔ اور ایک باہوش شخص کس طرح سکتے کی سی کیفیت میں آجاتا ہے۔

☆☆☆

ہوش و حواس تو عامر کے بھی اُڑ گئے تھے یا فرزانہ نے اُڑا دیے تھے جو اس کے تصورات کے محل کو دھیرے، دھیرے منہدم کیے جا رہی تھی۔

وہ جب بھی آتی کوئی نہ کوئی پٹاخا چھوڑ جاتی...... جیسے اس کی کسی سہیلی نے بتایا تھا۔ ''صبا کی جس سے شادی ہوئی...... وہاں سے اس نے طلاق لی اور پھر اس کی دوسری شادی ہوئی اور وہ اس کے ساتھ اپنے ڈھیر سارے بچوں کے ساتھ رہ رہی ہے۔''

''کہاں رہ رہی ہے وہ......؟'' بے ساختہ اس نے پوچھ لیا۔

''ارے کسی گاؤں میں رہ رہی ہو گی...... دوسری شادی تو شاید کسی زمیندار سے ہوئی تھی ناں......''

معمولی سی بات میں گل بوٹے ٹانک کر بیان کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔

''اس نے سنا ہے کہ صبا تو مر بھی گئی آپ خواہ مخواہ اس کے انتظار میں باؤلے بنے رہے۔'' کبھی آتی تو...... بڑی بے پروائی سے اسے سناتی۔

''کیسے مر گئی وہ......'' تڑپ کر اس نے پوچھا تھا۔

''پتا نہیں اسے کینسر، ٹی بی، ہیپاٹائٹس وغیرہ ہو گیا تھا۔ اور پھر دو، چار بیماریاں اور تھیں اس میں چٹ پٹ ہو گئی۔''

یہ سب سن کر وہ آزردہ ہوتا تو وہ ہنس کر کہتی...... ''اب اس کے لیے تو اس کا شوہر بے کل ہو رہا ہو گا۔ آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں خواہ مخواہ اگر کسی کو پتا چل گیا کہ ان صاحبہ کا شادی سے پہلے کسی کے ساتھ چکر تھا تو لوگ دعائے مغفرت کے بجائے الٹی سیدھی باتیں کرنا شروع کر دیں گے۔''

''فرزانہ، تم یہ کس طرح کی باتیں کرتی ہو؟''

''میں تو بھئی سچی بات کہنے کی عادی ہوں...... اور ظاہر ہے آج کل سچی بات دوسرے کے حلق سے مشکل سے ہی اترتی ہے۔''

''تم فضول باتیں کرتی ہو...... جن کا نہ سر ہوتا ہے نہ پیر...... پہلے تم نے سنا کہ اس کی شادی ہوگئی...... پھر تم نے سنا کہ وہ مرگئی...... یہ تم سنی سنائی باتوں کو اتنی اہمیت کیوں دیتی ہو؟'' ایک دن تو وہ غصے کے مارے کھول ہی گیا تھا۔

''عامر...... میں نے آپ سے یہ تو نہیں کہا تھا کہ میں نے ایسا خود دیکھا تھا۔ میں نے تو جو سنا وہ آپ کو بھی بتادیا، میری بلا سے کسی کی شادی ہو یا نہ ہو...... کوئی جیے یا مرے میری جوتی سے۔''

''سنو، صبا کسی کی جوتی نہیں ہے۔ صبا تو میرے دل کا تاج ہے۔'' اس نے سوچا مگر اس کے سامنے سارے لفظ ہی اس کے حلق میں پھنس کر رہ گئے۔

یہ فرزانہ کی پہلی کامیابی تھی...... جب عامر چاہتے ہوئے بھی صبا کا ذکر نہیں کر پایا تھا۔ اور وہ اس کی پریشان کیفیت دیکھ رہی تھی...... اور لاابالی انداز میں قہقہے لگا رہی تھی۔

اور پھر اس دن وہ پھر حیرت سے فرزانہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ جب وہ اس کی اور اپنی تصویر بڑی کروا کے خوب صورت سے فریم میں سجا کر اس کے لیے لائی تھی۔

''یہ سب کیا ہے؟'' وہ ہکا بکا سا پوچھ رہا تھا۔

''آپ کے لیے تحفہ۔'' وہ چھن سے ہنس دی تھی۔

''یہ اتنی بڑی جہازی سائز تصویر...... کیا مکان کے فرنٹ پر لگے گی؟'' وہ تمسخرانہ لہجے میں بولا تھا...... ''لوگ ہمارے گھر کو تھیٹر سمجھنے لگیں گے۔''

''جی نہیں، یہ یہاں آپ کے بیڈروم میں لگے گی۔'' اس نے ٹی وی کے اوپر وال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہاں پر۔''

''پھر تو اس کمرے میں اس تصویر کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آئے گا۔''

''یہی تو میں چاہتی ہوں آپ کو میرے سوا کچھ بھی نہ دکھائی دے۔''

''میرا خیال ہے اگر یہ تصویر آپ امی کے کمرے میں لگائیں تو وہ زیادہ خوش ہوں گی۔''

وہ تو اپنے والٹ کی اندرونی جیب میں صبا کی چھوٹی سی تصویر رکھنے کا عادی تھا...... اتنی بڑی تصویر دیکھ کر اسے واقعی وحشت سی ہو رہی تھی۔ یہ ان کی پکنک کا کوئی پوز تھا...... جو فارم ہاؤس میں ارینج کی گئی تھی۔

''یہ تصویر کس نے اتاری تھی؟'' عامر واقعی لاعلم تھا۔

تصویر میں فرزانہ اس کے سینے سے لگی یوں کھڑی تھی کہ بغور دیکھنے پر وہ نظریں چرا کر رہ گیا تھا۔

''عامر، آپ پریشان نہ ہوں، پھپھو مجھے آپ سے زیادہ عزیز ہیں ان کے کمرے میں، میں دوسری تصویر لگا کر آئی ہوں اور جناب وہ تصویر پھپھو کو بہت پسند بھی آئی ہے۔''

''اوہ...... امی کے کمرے میں آپ کمال کر آئی ہیں۔'' وہ کھسیا کر بولا۔

''ظاہر ہے میری پھپھو مجھ سے اتنی محبت کرتی ہیں تو مجھے بھی ان سے اتنی ہی کرنی ہوگی ناں......!'' عامر نے اس کی لن ترانی سن کر کوئی جواب نہیں دیا۔

''آپ کو پتا ہے، میں نے اس تصویر کو یہاں لانے کا فیصلہ کیوں کیا؟''

"مجھے کیا پتا؟" اس نے بیزاری سے اس پوسٹر نما تصویر پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر کہا۔

"وہ اس لیے کہ......" وہ کھنکھاری اور پھر قدرے شرما کر بولی۔ "آپ اس تصویر میں میرے بہت قریب ہیں ناں......اس لیے یہ تصویر فی الحال آپ کے اور بہت جلد ہمارے اس کمرے میں مناسب لگے گی ویسے بھی یہ ہماری پرسنل تصویر ہے اور پرسنل چیزیں اپنے بیڈروم تک ہی رہنی چاہیے ناں......"

"اور اگر کسی دن صبا آگئی تو سب سے پہلے وہ یہ تصویر اٹھا کر یہیں کھڑکی سے نیچے پھینک دے گی۔"

عامر کو کچھ نہ سوجھا تو صبا کا حوالہ آڑے لے آیا۔

"نہیں عامر......اب وہ نہیں آئے گی۔" فرزانہ کا لہجہ وثوق بھرا تھا۔

"اور اگر کسی دن وہ واقعی آگئی؟"

"ہاں سچ میں آگئی تو وہ تو مجھے جھوٹا کہے گی۔" اس وقت عامر کی ذہنی حالت ایسی تھی جیسے وہ کوئی چھوٹا سا بچہ ہو۔

"میں مان لیتی ہوں کہ صبا اگر آ بھی جائے گی تو وہ آپ سے کسی قسم کی شکایت کرنے کے بجائے صرف یہی کہے گی۔

"عامر......اگر میں آپ کی قسمت میں ہوتی ناں تو فرزانہ سے پہلے ہی آپ کو مل جاتی اور میرے نہ ملنے کا مقصد شاید یہی تھا کہ قدرت بھی یہی چاہتی تھی کہ آپ کی فرزانہ سے شادی ہو جائے۔" وہ ناصحانہ انداز میں بولے چلی جا رہی تھی۔

"پتا نہیں کیا غلط ہے، کیا صحیح ہے؟" وہ ایک ٹھنڈی سی سانس لے کر بولا۔

"سنیے......صحیح ہمیشہ ظاہر ہو جاتا ہے، سات پردوں میں بھی ہو تب بھی نکل آتا ہے اور غلط ہمیشہ چھپا ہوا ہوتا ہے کہ اس کا ساتھ ہمیشہ تاریکی کے ساتھ جو ہوتا ہے۔"

☆☆☆

یہ بھی اللہ کا شکر تھا کہ گولی صبا کا بازو چھوتے ہوئے گزر گئی تھی اس لیے ہاتھ کی پٹی کے بعد صبا کو اسپتال سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ اور جب ندیم خان کے ساتھ وہ اپنے فلیٹ میں داخل ہوئی تو امی کے ساتھ خالہ کی بھی چیخیں نکل گئیں۔ اس کا خون آلود لباس دیکھ کر وہ بے حد پریشان ہو گئی تھیں۔

"مجھے بچانے کے چکر میں آج صبا نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال دی تھی......مگر اللہ نے بہت کرم کیا......صبا کو کچھ نہیں ہوا۔"

"اوہ......تم ندیم خان کے آفس میں کام کرتی ہو، تم نے بتایا بھی نہیں۔" خالہ نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔

"میں نے بتایا تو تھا آپ کو، میرے باس کا نام ندیم خان ہے۔" وہ نقاہت بھرے لہجے میں بولی تھی۔

خالہ جو اسے بتانا چاہ رہی تھیں اسے وہ واقعی نہیں سمجھی تھی مگر ندیم سمجھ گیا تھا۔ مگر اس وقت اسے بالکل پروا نہیں تھی کہ وہ جس گھر میں کھڑا ہے وہاں اس کا رشتہ مسترد کر دیا گیا تھا۔

اگلے دن پھر وہ ڈھیر سارے پھل لے کر اس کے پاس موجود تھا۔

"سر میں ڈر زیادہ گئی......ورنہ چوٹ تو اتنی زیادہ نہیں لگی ہے۔ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں۔"

"تو کیا مجھے تمہارے لیے پریشان نہیں ہونا چاہیے؟"

"آپ کو بس اپنا بہت زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔" صبا نے کہا۔

"کیا تمہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ لوگ مجھے نقصان پہنچانے آئے ہیں؟"

"پہلے تو اندازہ نہیں ہوا تھا مجھے میری چھٹی حس ہی آپ کے کمرے میں لے گئی تھی......مگر جب دوسرا لڑکا بغیر اجازت آپ کے کمرے میں داخل ہوا تو میں ڈر گئی تھی۔"

''اور تم مجھے بچانے کے چکر میں...... خود لہولہان ہو گئیں۔''

''تو کیا ہوا، آپ تو بچ گئے ناں......''

''اور اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو؟''

''سوائے امی اور خالہ کے کسی کو کوئی افسوس نہیں ہوتا۔''

''اور میں کیا کرتا......؟ اس کے بارے میں سوچا تم نے؟'' یہ سب اس نے دل میں تو ضرور سوچا مگر کہا صرف اتنا ہی......

''صبا......!'' جذب سے پکارا گیا۔

''جی......''

''ایک بات بتاؤ گی؟''

''کیسی بات؟''

''یہی کہ تم نے اپنی جان خطرے میں کیوں ڈالی؟''

''ہر بات کوئی پتا تھوڑی ہوتی ہے، میں تو خطرے کو خطرہ کہاں سمجھ رہی تھی۔''

''مگر تمہیں یہ تو پتا چل ہی گیا تھا کہ وہ لوگ مجھے مارنے کے لیے آئے تھے۔''

''ہاں، کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ آپ کو نقصان پہنچانے آئے ہیں۔''

''تو، تم نے مجھے بچانے کے لیے...... اپنی جان تک کی پروا نہیں کی۔''

''یہ سب تو واقعی انجانے میں ہوا تھا۔'' نظر جھکائے، جھکائے کہا گیا۔

''اور اگر گولی تمہیں ایسی جگہ لگ جاتی جو جان لیوا ثابت ہوتی تو پھر......؟''

''نہیں لگ سکتی تھی۔''

''کیوں کیا اس گولی پر تمہارا نام نہیں لکھا ہوا تھا، اس لیے......''

''نہیں، میں بہت سخت جان ہوں اس لیے...... دیکھ لیں گولی بازو کو چیرتی ہوئی باہر دفعان ہو ہی گئی ناں۔''

''ہاتھ میں دکھن تو ہو رہی ہو گی ناں......''

''نہیں...... ایسی کوئی خاص نہیں۔''

''مگر انگلیوں پر تو ورم آ گیا ہے۔'' وہ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔

''نہیں تو......'' اسے شرم سی آ گئی اور اپنا ہاتھ آہستگی سے ہٹا لیا۔

یوں بھی...... کل ہی رات تو خالہ نے اسے بتایا تھا کہ ندیم خان کا رشتہ اس نے لوٹا یا تھا۔ اور سبین آپا...... ندیم خان کی بڑی بہن ہیں، جن سے اس کا بارہا ٹکراؤ بھی ہوا تھا۔ اور وہ اس وقت ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گئی تھی۔

کچھ دیر وہ خاموش بیٹھا رہا پتا نہیں کن سوچوں میں تھا۔ اور اسے لگ رہا تھا کہ وقت جیسے ٹھہر گیا ہو۔ اس کی خاموشی، ایک گھٹن سی پیدا کر رہی تھی۔

''میں اتنی چائے کہاں پیتا ہوں۔'' میڈ چائے رکھ کر گئی تو وہ بولا۔

''مگر اس وقت آپ روزانہ چائے پیتے ہیں۔'' اس نے یاد دلایا...... تو وہ مسکرانے لگا۔

''تمہیں پتا ہے کل میری امی کے ساتھ ان کی ایک دوست بھی آئیں گی، وہ تمہارے کالم بے حد شوق سے پڑھتی ہیں۔''

''کیا سبین آپا بھی آئیں گی؟'' اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔
''اچھا تو تمہیں یہ پہلے سے پتا تھا کہ میں سبین کا بھائی ہوں۔'' لہجے میں برہمی تو تھی مگر مسکراہٹ میں گھلی ملی سی۔
''یہ بات تو مجھے کل ہی رات پتا چلی ہے۔''
''میرا تو خیال ہے کہ یہ بات تمہیں اول دن سے پتا تھی۔''
''بالکل بھی نہیں...... آپ کی تصویر ہمارے گھر میں آئی ضرور تھی مگر میں نے دیکھی ہی نہیں تھی۔''
''اگر دیکھ لیتیں...... تو کم از کم گولی کھانے تو میرے کمرے میں نہ آتیں۔''
''اللہ نہ کرے، آپ یہ کیسی بات کررہے ہیں، آپ کو میں کیسے نقصان پہنچنے دیتی۔''
''وہ اس لیے کہ میں سبین آپا کا بھائی ہوں...... اور سبین آپا تم سے چڑنے لگی تھیں......'' اب وہ ازخود ہر بات بتانے پر آمادہ ہو رہا تھا۔
''مگر مجھے تو کل رات ہی خالہ نے بتایا ہے۔''
''اور مجھے بھی کچھ ہی عرصہ قبل بتایا گیا کہ یہی تو وہ محترمہ ہیں، جنہوں نے مجھے مسترد کیا۔ مگر میری جان بچانے کے لیے تم خود اپنی جان پر کھیل گئیں۔''
''ظاہر ہے، کالم تو میں لکھتی تھی ناں......''
''تو کیا ہوا؟''
''پھر اس کی سزا...... آپ کو کیوں ملتی......''
''اوہ...... یہ لاجک تھی تمہاری......'' گہری سانس لے کر وہ بولا۔
''بالکل...... جس نے کالم لکھا ہے سزا بھی اسی کو ملنی چاہیے تھی۔''
''مگر ساحر نام تو میرا تھا، یہ بچپن کا نک نیم ہے میرا۔''
''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''
''فرق تو بہت پڑتا ہے۔'' ہنسی داب کر کہا گیا۔
''میں سمجھی نہیں؟''
''صبا، کہیں یہ بات تو نہیں تھی کہ میرے نام سے کالم لکھتے لکھتے تم اس نام کو بھی اپنا نام سمجھنے لگی تھیں؟'' اس کا لہجہ انتہائی شوخ سا ہو گیا تھا۔
''یہ سب تو مجھے نہیں پتا۔'' اب وہ دوسری جانب دیکھتے ہوئے کھسیا کر کہہ رہی تھی۔
''صبا!'' ندیم نے اسے پکارا۔ اس کے ملائمت بھرے لہجے میں پتا نہیں کیا تھا کہ اس کی نظریں اٹھ نہیں پا رہی تھیں۔
''میری طرف دیکھو صبو......'' پیار بھرے لہجے میں کہا گیا۔
اب پتا نہیں وہ کیا کہہ دیں گے۔ صبا کا رواں رواں لرزنے کو تیار تھا۔
''جی سر۔'' بہ مشکل اس نے نظریں اٹھائیں۔
''تمہارا بلڈ بہت ضائع ہوا ہے، بے حد کمزور ہو گئی ہو تم۔ اور اب تم کم از کم پندرہ دن گھر پر آرام کرو گی۔''
''جی......'' اس نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔
''ہاں...... آفس بالکل نہیں آؤ گی۔''

''سر میں ٹھیک ہوں، دو تین دن بعد...... آرام سے آسکتی ہوں میں۔''

''میں نے کہا ناں...... نہیں تو...... نہیں......''

''اور جو دل میرا گھر پر نہیں لگے گا تو......؟''

تب ندیم خان کا دل چاہا کہ اس سے کہہ دے کہ اس کا دل بھی... اب کون سا کہیں لگ جائے گا۔ مگر وہ کچھ نہیں بولا۔ چپ چاپ اسے یوں دیکھتا رہا جیسے اسے اپنی آنکھوں میں بھر رہا ہو۔

☆☆☆

اور پھر کتنے ہی دن گزر گئے...... بور اور بے کیف سے۔ میں چپ چاپ بستر پر لیٹی رہتی...... یا پھر اپنے کمرے میں ہی چہل قدمی کر لیتی۔ بازو پر ابھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ آفس کے سب لوگ میری عیادت کے لیے گھر پر آئے تھے اور ندیم خان تو روز ہی آ رہے تھے۔

امی اور خالہ روزانہ ہی ندیم خان کی تعریفوں میں مگن ہو جاتیں اور پھر بھول جاتی تھیں کہ میں ہر روز ان کی ایک ہی جیسی باتیں سن کر بھی واقعی بور نہیں ہو رہی تھی۔

پہلی مرتبہ مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا کہ ندیم میرے لیے کتنے پریشان ہیں۔

اور انہیں آفس میں میرے بغیر بالکل بھی کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مجھے واقعی اندازہ نہیں تھا کہ میں نے اتنے اچھے شخص کو ریجیکٹ کر دیا تھا۔

آج بھی وہ کافی دیر میرے پاس بیٹھ کر گئے ہیں اور کتنی بار اپنے ہاتھ سے سیب کاٹ کر میرے منہ میں قاش دی تھی۔

''سنیں، میرے ہاتھ ٹھیک ہیں...... میں خود سے کھا سکتی ہوں۔''

''ذرا سی تیمارداری بھی نہیں کرنے دو گی کیا......؟'' جانے کس لہجے میں پوچھا گیا... کہ دل مٹھی میں آ گیا تھا۔

''اگر ایسی بات کریں گے تو میں یہ دعا کروں گی کہ میرا یہ زخم کبھی نہ ٹھیک ہو۔''

''اللہ نہ کرے۔'' بے اختیار انہوں نے اپنا ہاتھ میرے لبوں پر رکھ دیا اور پھر کچھ سوچ کر فوراً ہاتھ ہٹا لیا۔

''صبا، میں یہ ہرگز نہیں چاہوں گا کہ تمہاری اس بیماری کی وجہ سے میں تم پر کوئی وزن ڈالوں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے سر......''

''مگر عامر خان زادہ ایک ایسی شخصیت ضرور ہے جو میرے اور تمہارے درمیان حائل ہے۔ اور میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ تم کوئی بھی فیصلہ کسی بھی دباؤ کی وجہ سے کرو۔''

''میں کیا کروں سر...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ عامر کا انتظار کرتے، کرتے میں واقعی تھک چکی ہوں۔''

''مگر میں تھکنا نہیں چاہتا۔''

''تو پھر میں کیا کروں؟''

''وہی جو سب چاہتے ہیں۔''

''امی اور خالہ...... میری فوراً شادی کرنا چاہتی ہیں۔''

''ان کی رائے اس لیے درست ہے کہ عامر جو عرصۂ دراز سے موجود نہیں، پلٹا نہیں، تم اس کا انتظار کر رہی ہو اور وہ لوگ جو تم سے محبت کرتے ہیں اور جن سے تم بھی محبت کرتی ہو اُن کو تم دھتکار رہی ہو یہ کہاں کا انصاف ہے صبا......؟''

''میں انصاف کیسے کروں اور کس کے ساتھ کروں......یہی تو میں سمجھ نہیں پا رہی......'' پریشان ہو کر میرے آنسو اس روانی سے بہہ نکلے کہ آنسوؤں میں بھیگا میرا چہرہ دیکھ کر ندیم خان حد درجہ پریشان ہو گئے۔

☆☆☆

''شہلا......آپ صرف ایک ماہ کے لیے مسز ناصر کے فلیٹ میں شفٹ ہو جائیں......مگر اپنے گھر میں یہ کہہ دیں کہ آپ ایک ماہ کے لیے اسلام آباد اور کبھی لاہور میں رہیں گی۔ آفس کی دیگر خواتین بھی آپ کے ساتھ ہوں گی۔'' ریحان نے اس کے گمبھیر مسائل کے جواب میں کہا تو وہ اچھل پڑی۔

''سر، ایسے کس طرح ہو سکتا ہے کہ میں کراچی میں رہوں اور کسی کو نظر نہیں آؤں......میرا جھوٹ تو پکڑا جائے گا۔''

''کراچی جتنا بڑا ہے بعض ممالک بھی اتنے بڑے نہیں ہیں......یہاں نہ آپ کو کوئی دیکھ سکے گا اور نہ پہچان سکے گا۔''

''پہچان کیوں نہیں سکے گا......میری شکل کوئی تبدیل تھوڑی ناں ہو جائے گی۔''

''مسز ناصر بہترین بیوٹیشن ہیں، وہ روزانہ آپ کو اس طرح تیار کریں گی کہ اگر آپ کے سامنے آپ کی بہن بھی آ جائے تو وہ تک نہیں پہچان پائے گی اور یوں بھی آپ کا آنا جانا صرف ساجد کے پروڈکشن ہاؤس سے مسز ناصر کے فلیٹ تک ہی ہوگا۔''

''اور اگر میں حارث کے ساتھ کہیں جانا چاہوں تو نہیں جا سکوں گی کیا؟'' اسے اپنے اوپر لگائی جانے والی پابندیاں بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔

''حارث ان دنوں مصروف زیادہ ہے، وہ فون پر تو تم سے رابطے میں رہے گا اور ممکن ہوا تو مسز ناصر کے فلیٹ کا چکر لگا لے مگر یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ایسا بھی ہو۔'' ریحان نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میرا یہ پکا خیال ہے، امی مجھے لاہور اور اسلام آباد جانے کی اجازت ہی نہیں دیں گی۔'' ریحان کی ساری کتھا سن کر جب اس نے کہا تو وہ اسے دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔

''آپ اپنی امی کو کنونس نہیں کر سکتیں؟''

''نہیں......بالکل بھی نہیں۔''

''یہ بات تو ہم نے پہلے ہی آپ کو بتائی تھی کہ ایک شہر سے دوسرے شہر آپ کو ٹریننگ کے لیے بھیجا جائے گا۔''

''ہاں ٹھیک ہے مگر جب امی اور ابو آ جائیں گے تب......''

''اب آفس کے کام گھر کی مصروفیات کو دیکھ کر تو نہیں سیٹ کیے جاتے ناں......'' ریحان نے اپنا غصہ داب کر اسے قدرے سنجیدگی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ایسا کریں، آپ امی سے خود بات کر لیں......اگر وہ مان جاتی ہیں تو ٹھیک ہے۔''

اور اگلے دن جب مسز ناصر کے ساتھ سر ریحان ان کے گھر گئے اور مسز ناصر نے ان سے بات کرنی شروع کی تو وہ جلد ہی مان گئیں۔

''ایسی سمجھدار خاتون......جب ہمہ وقت ان کی بیٹی کے ساتھ ہو گی تو انہیں کیا پریشانی ہے۔''

اور یہ بات انہوں نے واضح کر دی تھی کہ ٹریننگ کا بونس اضافی ہو گا......اور اس ماہ کا پیشگی وہ ان کو دینے بھی آئی تھیں۔

''ٹھیک ہے بھئی......ادھر میں ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہوں گی اور اُدھر ہماری شہلا بھی......اور ہو سکتا ہے کہ

ساتھ، ساتھ ہی چلیں۔"

"نہیں آپ آرام سے جائیں...... ہماری فلائٹ بعد کی ہے اور ہم سب لوگ ایک ساتھ جائیں گے...... اس لیے ہم شہلا کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" انہیں مسز ناصر کی کسی بات پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔

حارث اور ریحان جس بات کو بہت مشکل سمجھ رہے تھے وہ بے حد آسانی سے حل ہو گئی تھی۔ شاید چرب آمیز گفتگو لوگوں کو آسانی سے شیشے میں اتار لیا کرتی ہے۔ اور ظاہر ہے، مسز ناصر اس فن میں ماہر سمجھی جاتی تھیں۔

☆☆☆

ماہر تو وہ بہت تھی۔ گھر والے تو اسے ہر فن مولا کہا کرتے تھے...... کون سا کام تھا جسے وہ کرنے کی سعی نہ کرتی ہو، کام بھلے سے نہ آتا ہو مگر اس میں ٹانگ اڑانا...... اس نے ضرور سیکھا تھا۔ "مجھے ہر چیز کا پتا ہے۔" یہ اس کا تکیہ کلام تھا۔

اور یہی وجہ تھی کہ منگنی کے بعد فرزانہ، عامر کے سر پر یوں سوار ہو گئی تھی کہ وہ واقعی حواس باختہ سا ہو گیا تھا۔

"چلیں آپ میرے ساتھ، اس وقت گول گپے کھانے ہیں مجھے......" وہ آفس سے آکر ابھی اپنی کمر بھی سیدھی نہ کر پاتا کہ وہ آموجود ہوتی۔

"اب کیا میں تمہارے ساتھ ٹھیلے والے سے گول گپے کھاؤں گا۔"

"ہاں، جہاں کے مجھے پسند ہیں، میں وہیں کے کھاؤں گی۔"

"سوری فرزانہ... میں نہیں لے جا سکتا، مجھے اس طرح کے تماشے اچھے نہیں لگتے۔"

"ٹھیک ہے، ہم گاڑی میں بیٹھ کر کھالیں گے باہر اتریں گے ہی نہیں اب تو کوئی پریشانی نہیں ہے ناں......"

"ارے لے جاؤ بچی کو......" رئیسہ بیگم علیحدہ شہ دینے کو تیار رہتی تھیں۔

"یہ بچی ہے، ناک میں دم کر کے رکھ دیا ہے میرا...... روزانہ کبھی کہیں چلو، کبھی کہیں...... تم سے کیا آرام سے گھر میں نہیں بیٹھا جاتا؟ پیروں میں بلیاں بندھی ہوئی ہیں کیا...؟" وہ پریشان ہو کر کہہ دیتا۔ اور وہ برا مانے بغیر ہنس دیتی۔

"بعد میں بیٹھوں گی ناں گھر میں......" وہ ناز بھری ہنسی کے ساتھ بولتی تو اکثر اوقات وہ اس کی ہنسی کے جھرنوں میں کھو سا جاتا...... کتنی مسحور کن ہنسی تھی اس کی۔

فرزانہ، واقعی خوب صورت لڑکی تھی...... مگر اسے اپنی خوب صورتی سے رجھانا بھی آتا تھا۔ وہ اپنے سیاہ دراز بالوں کو بظاہر بے پروائی سے ایسے پیچھے کیا کرتی کہ اس کے بال اس کے شانوں پر پھیل جاتے اور وہ گھبرا سا جاتا۔

"یہ لڑکی ہے کیا......؟ کبھی اچھی لگتی ہے اور کبھی دل گھبرا سا جاتا ہے اور ایسی وحشت ہونے لگتی ہے کہ دل چاہتا ہے یہاں سے کہیں دور بھاگ لیا جائے۔" وہ اکثر سوچتا...... مگر صرف سوچ کر ہی رہ جاتا۔

☆☆☆

خالہ نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ ندیم خان جیسا اب کوئی لڑکا مل ہی نہیں سکتا۔

"ایسا ہیرا لڑکا جو رجیکٹ ہونے کے باوجود دوبارہ خود چل کر آیا ہے، سین کو تم ہمیشہ برا ہی کہا کرتی تھیں اب دیکھو تمہاری مزاج پرسی کرنے کتنی محبت سے آرہی ہے۔" خالہ ان کے جانے کے بعد بدستور گن گائے جا رہی تھیں۔

''میں نے بھی تو ان کے بھائی کی جان بچائی ہے۔''

''تو وہ کون سا یہ کہہ رہے ہیں کہ تم نے اچھا کیا اور تمہارا یہی فرض تھا۔'' امی کو میری باتیں سن کر اب غصہ آرہا تھا۔

''بھری تھالی کو لات مارنا اسی کو تو کہتے ہیں، ندیم کی ماں تو ڈھکے چھپے لفظوں میں پھر کہہ گئی ہیں کہ۔۔صبا ہماری ہی بیٹی ہے اور اسے ہمارے پاس ہی آنا ہے۔''

''امی، آپ سے میں نے کہا تھا...... اب میں کوئی چوں چرا نہیں کروں گی۔ آپ جس سے چاہے میری شادی کردیں۔''

''جس سے چاہے کیوں کریں شادی تو تمہاری اب ندیم خان سے ہی ہوگی۔''

''ٹھیک ہے کردیں اور انہیں فون کردیں کہ آ کر منگنی کرلو۔''

''نہیں بھئی منگنی ونگنی تو کرنی نہیں ہے اب تو سیدھے انداز میں شادی ہوگی۔''

''جیسے آپ کی مرضی...... مگر اتنی مہلت تو دے دیں کہ اپنی اور عامر کی البم کو آگ تو لگادوں......''

''ارے وہ تو میں کب کی آتش دان میں ڈال چکی ہوں...... اس گھر میں تمہیں کوئی ایک تصویر بھی عامر کی نظر نہیں آئے گی۔'' خالہ نے چمک کر کہا۔

''خالہ...... میں تو اپنی یادوں کی البم کی بات کررہی ہوں جو میرے دل میں محفوظ ہے۔''

''ارے دفع کرواسے...... ایسی یادوں کو بھی بھلا کوئی سینت کر رکھا کرتا ہے...... جو دکھ دینے کے سوا کوئی کام ہی نہیں کرسکیں۔''

اور تب میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بظاہر خوش ہونے کے باوجود نا معلوم دکھی سی کیوں ہوگئی تھی...؟

بڑا دشوار ہوتا ہے
ذرا سا فیصلہ کرنا
کہ جیون کی کہانی کو
بیانِ بے زبانی کو
کہاں سے یاد رکھنا ہے
کہاں سے بھول جانا ہے
کسے کتنا بتانا ہے
کسے کتنا چھپانا ہے
کہاں رو، رو کے ہنسنا ہے
کہاں ہنس، ہنس کے رونا ہے
کہاں آواز دینی ہے
کہاں خاموش رہنا ہے
کہاں رستہ بدلنا ہے
کہاں سے لوٹ جانا ہے
بڑا دشوار ہوتا ہے

پروین شاکر

☆☆☆

شہلا کو مسز ناصر نے جدید لباس پہننے کو دیا تھا اور بلیک اور گرے کامبی نیشن میں واقعی وہ بہت پیاری لگ رہی تھی...... ہائی ہیل پہننے کی اسے عادت نہیں تھی مگر ایک روز کی پریکٹس نے اسے پُراعتماد بنا دیا تھا۔

اونچا سا جوڑا بنائے اپنا بیگ شولڈر پر ڈالے جب وہ ساجد کے آفس میں داخل ہوئی تو یکبارگی وہ اسے دیکھتے ہی بولا...... ''مون تم آگئیں......''

''سر میرا نام شہلا ہے۔'' اس نے کھنکھار کر کہا۔

''سوری، میرے ذہن میں آپ کا نام مون تھا۔''

''آپ نے کہا تھا کہ آپ کے آفس میں جاب مل جائے گی تو میں اسی لیے ہی آئی ہوں۔''

''مگر میرے آفس میں تو کوئی جگہ نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ وثوق بھرا سا تھا۔

''تو پھر میں خواہ مخواہ ہی آگئی......'' وہ جیسے اپنے آپ سے بولی۔

''یہ تو مجھے نہیں پتا......'' اس نے اس کے ہونٹوں کی جنبش سے شاید اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

''سر، واقعی کوئی جگہ نہیں ہے؟'' وہ مسز ناصر کی بتائی ہوئی ہدایت کے تحت خاصے ناز سے بولی تھی۔

''ہاں، جگہ نہیں ہے۔'' دوٹوک جواب دیا گیا۔

''تو پھر...... کیا میں واپس چلی جاؤں؟'' اب وہ واقعی افسردہ سی ہوگئی تھی۔ دل میں سوچ رہی تھی کہ آج گھر جا کر...... راحیلہ کو بتانا پڑے گا ٹریننگ ہی کینسل ہوگئی ہے۔ اس لیے فوراً واپس آنا پڑا۔

''آپ سے واپس جانے کو کس نے کہا ہے؟'' مخموری سی آواز میں کہا گیا...... اب ساجد اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''آپ نے کہا تھا ناں ابھی......''

''ہاں آفس میں تو واقعی جگہ نہیں ہے......'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''تو پھر...... مجھے جانا ہی ہوگا ناں؟''

''آپ میری پرسنل سیکریٹری ہوں گی۔''

''اور اس سے قبل جو آپ کی سیکرٹری تھیں؟''

''وہ ہمارے ڈراموں میں کام کریں گی...... انہیں اداکاری کا شوق بھی بہت ہے۔''

''مجھے تو اداکاری کا بالکل شوق نہیں ہے۔''

''گڈ......''

''مگر مجھے کرنا کیا ہوگا؟''

''مجھ سے وابستہ...... ہر خبر کو مجھ تک پہنچانا...... اور یہ سب ہمارا قائم کردہ سیل آپ کو اچھی طرح آگاہ کردے گا۔''

''سر، اس ٹائپ کی جاب میں پہلی مرتبہ کررہی ہوں۔''

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' اور پھر وہ اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ ''ارے، دو بج گئے...... چلیے لنچ کے لیے کہیں باہر چلتے ہیں۔''

''سر، باہر جائیں گے......؟'' وہ قدرے پریشانی سے بولی۔

''ہاں، چلو کوئی مسئلہ ہے کیا؟'' وہ قدرے الجھ کر بولا۔

''تو سر......'' وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے قدرے اعتماد سے بولی۔
اور جب ساتھ چلتے ہوئے ساجد نے اسے سہارا دیا تو وہ لرز کر رہ گئی اور یکبارگی اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔
''ابھی گر جاتیں آپ...... سیڑھی کو دیکھے بغیر چل رہی تھیں۔''
''اوہ، تھینکس......'' اور وہ اب اسے یوں لاتعلقی سے دیکھ رہا تھا جیسے نہ تو وہ اسے جانتا ہے اور نہ ہی اسے وہ جاننا چاہ رہا ہو۔ چند لمحے پہلے کی وارفتگی اور اب بے گانگی...... پہلی ملاقات میں وہ اسے واقعی بہت عجیب سا لگا اور جب وہ اپنے فلیٹ جا رہی تھی تو سوچ رہی تھی۔ ''کاش میری جگہ کوئی اور لڑکی اس جاب کے لیے یہاں آئی ہوتی۔ میرے بجائے کسی دوسری لڑکی کو سر ریحان منتخب کر لیتے تو کتنا اچھا ہوتا......''

☆☆☆

''سنیں، مجھے بالکل نہیں اچھا لگا جب ساجد نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے گاڑی میں بیٹھنے کو کہا تھا۔'' حارث چند لمحوں کے لیے ساکت ہی رہ گیا۔
''گاڑی تو ڈرائیور چلا رہا ہوگا ناں......؟'' اس نے اپنے اوپر قابو پا کر پوچھا تھا۔
''ہاں......''
''وہ اپنے ساتھ گارڈ لے جانے کا بھی عادی ہے۔''
''ہاں گارڈ بھی گاڑی میں تھا۔''
''راستے میں کوئی بات کی اس نے؟''
''ہاں وہ اپنے بارے میں بتا رہے تھے کہ کہاں، کہاں سے پڑھا اور کن، کن ممالک سے مزید تعلیم حاصل کرنے انہیں وہاں جانا پڑا تھا۔''
''یوں کہو کہ وہ تم پر رعب جما رہا تھا۔''
''ہاں شاید...... ایسی ہی بات ہو۔''
''زیادہ فری ہونے کی تو کوشش نہیں کر رہا تھا وہ؟'' حارث نے پوچھا۔
''نہیں، ویسے بھی یہ میرا پہلا ہی دن تھا اور مسز ناصر کہہ رہی تھیں کہ اپنے پروڈکشن ہاؤس میں وہ بے حد شریف باس مشہور ہے۔''
''یہ تو خیر اچھی بات ہے۔'' حارث نے گہری سانس لی۔
شہلا کا فون بند ہو گیا تھا مگر حارث کو لگ رہا تھا جیسے اس کے سینے پر کوئی بوجھ سا آپڑا ہو۔ اسے شہلا کا یوں ساجد کے ہاں جاب کرنا بالکل بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔
''اب ساجد کے آفس میں یا اس جیسے لوگوں کے آفسز میں ڈھیروں لڑکیاں کام کیا کرتی ہیں تو کیا میں ان سب کے لیے یوں رنجیدہ رہوں گا؟'' اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔
''ہرگز نہیں......'' اس کا دل اسے خود ہی جواب دے رہا تھا۔
''تو پھر مجھے شہلا کے لیے بھی یوں بے کل سا تو نہیں ہونا چاہیے۔'' اس نے اپنے آپ کو پھر سمجھایا۔
''ہاں، بالکل وہ بے وقوف سی لڑکی جب بولنے پر آتی ہے تو پتا نہیں کیا کچھ اناپ شناپ بکے چلی جاتی ہے اور اب اس کی باتوں کے کوئی ایسے معانی اور مطالب تو ہوتے نہیں...... جن کے بارے میں، میں سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہوں۔ یوں بھی ریحان شاید ٹھیک ہی کہتا ہے کہ زیادہ تر لڑکیاں اپنے بجائے دوسروں کو پریشان کر

کے خوش ہوا کرتی ہیں۔"

آج مسز ناصر نے شہلا کی تیاری پر کچھ زیادہ ہی زور دیا تھا......لائٹ اور ڈارک بلیو کامبی نیشن کے سوٹ میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی، دراز بالوں کو جوڑے کی شکل دے دی تھی......اور جب وہ گلے کی بڑی سی چین کو ہلاتے ہوئے آفس پہنچی تو اسے باہر استقبالیہ پر ہی روک لیا گیا۔

"مجھے سر ساجد کے روم میں جانا ہے۔"

"آج وہ آفس نہیں آئے ہیں۔"

"تو کیا ہوا......؟ میں ان کی نئی سیکرٹری ہوں......"

"سر ساجد کی غیر موجودگی میں کسی کو بھی ان کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔"

"اچھا......تو وہ پھر کب تک آئیں گے؟"

"وہ اس ادارے کے اونر ہیں، ان کی اپنی مرضی ہے، جب دل چاہے آئیں اور جب دل چاہے نہ آئیں۔" ریسپشن پر بیٹھے ہوئے شخص نے اپنے دانت دکھاتے ہوئے ہنس کر کہا۔

شہلا، دو تین گھنٹے بیٹھی رہی کہ شاید ساجد آجائے اور پھر وہ اٹھ کر چلی آئی۔ جیسے ہی وہ مسز ناصر کے فلیٹ پہنچی ساجد کا فون آگیا۔

"آج آپ آفس نہیں آئیں؟"

"سر، میں تو ابھی آئی ہوں واپس......"

"آپ کا آفس کا ٹائم تو شام پانچ بجے تک کا ہے، آپ آفس سے کیوں چلی گئیں؟"

"سر میں سمجھی کہ آج آپ نہیں آئیں گے۔"

"میرے آنے کا کوئی وقت طے نہیں ہوتا۔"

"میں دوبارہ آجاتی ہوں۔" وہ کھسیا کر بولی۔

"نہیں، اب آپ کل ہی آئیے گا۔"

اور جب وہ دوسرے دن پہنچی تو ساجد آفس نہیں آئے تھے۔ وہ شام تک بیٹھی رہی......اور انہوں نے آنا تھا اور نہ آئے......اسی طرح پورا ہفتہ گزر گیا......وہ صبح جاتی اور شام تک یونہی بیٹھ کر واپس آجاتی۔

ریحان کا تو خیال تھا......اس طرح کی حرکتیں کر کے وہ شہلا کا صبر آزما رہا ہے۔

"میرے لیے تو بہت اچھی بات ہے، جا کر بیٹھ جاتی ہوں اپنے موبائل پر گیمز کھیلتی رہتی ہوں اور شام کی چائے پی کر گھر کے لیے نکل جاتی ہوں۔"

"پاگل شخص......اسی طرح کی حرکتیں کیا کرتے ہیں۔" یہ حارث کا خیال تھا۔

"اسے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگی کہ اس کی نئی سکریٹری خالی بیٹھی ہوئی ہے اور نہ وہ آرہا ہے اور نہ ہی اسے واپس جانے دے رہا ہے۔"

وہ ساتواں دن تھا جب مسز ناصر نے شہلا کو میک اپ کے لیے بلایا تو اس نے صاف منع کردیا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"اچھا، آج میں تمہارے بالوں کو بڑے خوب صورت اسٹائل میں سنواروں گی۔"

"نہیں، مجھے جوڑے بنا کر وحشت ہوتی ہے، آج میں کھلے بالوں کے ساتھ ہی جاؤں گی......اونچی سی پونی ٹیل بنا کر جیسے کہ میں گھر میں رہتی ہوں۔" اور جب وہ ہلکے گلابی کاٹن کے سادہ سے سوٹ میں آفس میں داخل ہوئی تو

یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ساجد اس سے پہلے وہاں موجود تھا۔

''گڈ......تو آپ روز آرہی ہیں۔''

''جی سر......''

''آیئے......میرے روم میں......'' وہ اس کو ساتھ لے کر اندر کی جانب بڑھا۔

''ہمارے آفس میں آپ کو بوریت تو نہیں ہوئی؟'' اس نے پوچھا۔

''کوئی کام نہیں تھا......اس لحاظ سے تو ہوئی۔''

''میری طبیعت کچھ خراب تھی......اس لیے میں آفس نہیں آرہا تھا۔''

''سر، اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''بہتر ہوں، کچھ دیر میں اپنے کمرے میں آرام کرتا ہوں......پھر لنچ پر آپ سے ملاقات ہوگی۔'' وہ مزید آگے کی جانب جاتے ہوئے بولا۔

''یہاں آفس میں آپ کا بیڈروم بھی ہے؟ اس نے دھیمے سے کہا تھا مگر اس نے سن لیا، پلٹ کر آیا اور بولا۔

''زیادہ تر آفسز میں آرام کرنے کے لیے روم بنائے جاتے ہیں۔''

''اوکے سر......'' وہ کھسیا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''آپ جب تک اپنے موبائل پر گیم کھیلیں۔'' وہ جاتے جاتے پھر بولا۔ اور وہ حیرت زدہ سی رہ گئی۔

ایسی ہی بوریت کا وہ پانچواں دن تھا......جب وہ اپنے بیڈروم سے باہر آیا تو شہلا سے بولا۔

''ارے، میں اپنا موبائل تو اپنے کمرے میں ہی بھول آیا ہوں......ذرا وہ تو لا دیں۔''

''سر میں آپ کے روم میں جاؤں؟'' اس نے رک کر پوچھا۔

''ہاں، آپ جائیں، وہاں کوئی جن بھوت نہیں بیٹھے۔''

اور جب شہلا نے وہاں قدم رکھا تو مارے حیرت کے وہ گنگ سی رہ گئی۔ اس کمرے میں اس کی بڑی سی تصویر لگی تھی۔

''سر، آپ کے کمرے میں تو میری تصویر لگی ہوئی ہے، سو فی صد میری تصویر......'' موبائل لیے بغیر وہ بدحواس سی واپس آئی اور اٹکتے ہوئے لفظوں میں بولی۔

''وہ آپ کی تصویر نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ باوثوق سا تھا۔

''نہیں سر، میرے بال، میری آنکھیں، میرے ہونٹ وہ سو فی صد میری ہی تصویر ہے۔''

''میں نے کہا ناں......وہ تصویر آپ کی نہیں ہے۔''

''اتنی زیادہ مماثلت کیسے ہو سکتی ہے؟''

''ہو سکتی ہے......کیونکہ وہ آپ کی تصویر نہیں ہے، وہ تو مونا کی تصویر ہے جو کبھی میری مون تھی......''

''کون مونا......کون مون......؟ پلیز کچھ بتائیں ناں......''

''میرا خیال ہے کہ میں نے شاید سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ آپ کو اپنے روم میں بھیج دیا......آپ خواہ مخواہ میرا سر نہ کھائیں۔''

''سوری سر......میں واقعی نہ آپ کے بارے میں کچھ جانتی ہوں اور نہ اس مون کے بارے میں......مگر......مجھے وہ تصویر......واقعی اپنی ہی لگی۔''

''کاش، وہ تمہاری تصویر ہی ہوتی مگر وہ تمہاری تصویر بالکل بھی نہیں ہے۔ وہ مونا کی ہے اور تم مونا نہیں ہو،

بالکل بھی نہیں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں میرا نام تو شہلا ہے۔''

اور ساجد اسے ایسے دیکھنے لگا جیسے وہ اس میں اپنی مونا کو کھوج رہا ہو۔ وہ اسے تکے چلا جا رہا تھا اور شہلا جھینپ سی رہی تھی۔

''میرا تو خیال ہے یہ کافی عیار شخص ہے، اس ایک ہفتے میں اس نے تمہاری تصویر بنوالی ہے اور اب کچھ عرصے بعد وہ تم سے محبت کا دعویٰ بھی کر بیٹھے گا۔'' رات کو جب حارث کو اس نے سارے دن کی رُوداد بتائی تو وہ برملا بولا تھا۔

''مگر وہ تو اس تصویر کو مونا کا نام دے رہے ہیں۔''

''بندہ، پیار کے دل چاہے کتنے ہی نام رکھ سکتا ہے۔''

''مگر آپ نے تو میرا ایسا ایک نام بھی نہیں رکھا۔''

''وہ اس لیے کہ میں ساجد جیسا چھچھورا جو نہیں ہوں...... شریف شخص کسی کو بے وقوف نہیں بنایا کرتا۔''

''آپ کے خیال میں...... وہ ساجد سر، مجھے بے وقوف بنائیں گے یا بے وقوف بنا رہے ہیں؟''

''بالکل، اس میں شبہ ہی کیا ہے، اس ٹچے شخص سے میں کوئی اچھی توقع ہی نہیں رکھ سکتا۔''

''ٹھیک ہے، میں مون یا مونا کی کہانی معلوم کرلوں تو پھر سوچتی ہوں کہ ان کے آفس کب تک جانا ہے یا نہیں......''

''تم اس مون نامی لڑکی کی تصویر اپنے موبائل پر نہیں اتار کر لاسکتی ہو؟'' حارث نے کچھ سوچ کر کہا۔

''سر وہ تصویر ہو بہو میرے جیسی ہے...... آپ میری تصویر اپنے موبائل سے لے لیں اور آپ یہ سمجھ لیں کہ وہ مونا ہے۔''

''جیسا میں کہہ رہا ہوں تم اگر ویسا کرسکتی ہو تو کرلینا ورنہ تم جیسی موٹی عقل سے میں کوئی ایسی امید نہیں رکھ سکتا۔''

''اللہ آپ نے مجھے موٹی کہا ہے؟ میں کہاں سے موٹی دکھ رہی ہوں۔ میرا وزن صرف 110 پونڈ ہے اور آپ نے مجھے موٹی کہہ دیا۔'' وہ اس کی ادھوری بات سن کر ہی برا مانتے ہوئے بولی۔

تو حارث نے بہانہ بنا کر فون ہی منقطع کردیا۔ ''جو لڑکی اتنی سی بات نہ سمجھ سکتی ہو...... وہ اس قابل ہے کہ کسی کا بائیو ڈیٹا جمع کرکے لائے گی۔ ہونہہ ہرگز نہیں......'' اور پھر کتنے ہی دن...... اس نے نہ شہلا کو فون کیا تھا اور نہ ہی اس کا فون ریسیو کیا تھا۔

''لکھوں یا نہ لکھوں......؟'' وہ دل میں سوچ رہی تھی۔

آفس آتے ہوئے آج اس کا اٹھارواں دن تھا...... سر ساجد آج پھر آفس سے غائب تھے اور ان کی غیر موجودگی میں اسے کمرے میں بیٹھنے کے بجائے وہیں استقبالیہ میں رکھے گئے صوفوں پر بیٹھنے کو کہا جاتا تھا۔ پانچ بجے سے پہلے وہ اگر گھر چلی جاتی تو ان کا فون آجاتا کہ وہ کہاں پر ہے۔ وہ موبائل پر گیمز کھیلتی رہتی تو اسے اگلے دن یہ باور کرادیا جاتا کہ وہ آفس میں گیم کھیلنے کے لیے ہی تو آتی ہے۔ کام کوئی خاص ہے نہیں...... اور تنخواہ پچاس ہزار ملے گی۔

اس لیے...... آج وہ اپنی ڈائری میں رکھے رنگین کاغذ جس پر گزشتہ رات گل بوٹے بھی کناروں پر بڑی محنت سے بنائے تھے...... خط لکھنا شروع کیا...... خط کیا تھا اس کے دل کا احوال تھا جس میں حارث سے کہا گیا تھا کہ وہ نہ

ریحان کے ہاں جاب کرنا چاہتی ہے اور نہ ہی ساجد کے ہاں...... اس کی تو یہ دلی خواہش ہے کہ حارث کی ماں جلدی سے آکر اس کا پیام دیں...... اور جھٹ پٹ اس کی حارث سے شادی ہو جائے...... شہلا نے تو اس کی آسانی کے لیے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ اگلے ماہ کی پندرہ تاریخ تک امی، ابو عمرے کی ادائیگی کر کے واپس آجائیں گے اس لیے ان کے آنے کے بعد حارث کی امی کو ان کے گھر آجانا چاہیے۔

اپنے خط میں مزید آگے کے پروگرام ڈسکس کرنے کو بھی اس نے لکھا تھا...... کہ مہندی مشترکہ ہوگی یا الگ، الگ...... شادی کے بعد ان کی فیملی میں چوتھی، چالے کی رسمیں ہوتی ہیں یا نہیں...... اور یہ بات بھی وہ انہیں پہلے سے بتا دے کہ پہناؤنی کے جوڑے چاہئیں یا نقد رقم...... تاکہ بعد میں کوئی بدمزگی نہ ہونے پائے...... اور بھی اسی طرح کی دیگر باتوں کی تفصیل لکھی گئی تھی...... اور آفس سے واپسی پر اپنا یہ خط ارجنٹ ڈلیوری کی ہدایت کے ساتھ پوسٹ کر دیا گیا تھا۔

اور شہلا یہ خط لکھ کر ایسی آسودگی سی محسوس کر رہی تھی...... جیسے شادی سے پہلے لڑکیاں اپنی جہیز کی چیزیں اٹھا کر حفاظت سے بڑی پیٹی میں رکھ کر خوش ہوا کرتی ہیں۔

☆☆☆

آج پورے پندرہ دن کے بعد میں نے آفس جوائن کر لیا تھا...... میرے آفس کے کولیگز نے مجھے میری صحت یابی کی مبارک باد دی۔

فرزانہ اور ناعمہ بھی کافی دیر تک میرے پاس بیٹھی رہیں اور میں سوچ رہی تھی کہ کوئی بھی انسان مکمل برائیوں کا مجموعہ نہیں ہوا کرتا۔ میں ناعمہ اور فرزانہ سے کتنی نالاں رہا کرتی تھی اور وہ سب ہی مزاج پرسی کے لیے میرے گھر آئی تھیں...... میری غیر موجودگی میں میرا کام کیا...... اور اب وہ دوبارہ مجھے آفس میں دیکھ کر اپنی دلی خواہش کا

اظہار کررہی تھیں۔

اب اگر وہ میری پاپولیرٹی سے جلا کرتی تھیں تو یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ انسان ہونے کے ناتے ہر شخص میں بہت سی کمزوریاں ہوا کرتی ہیں۔

اب جیسے میں خود...... اپنے آپ سے آگاہ نہیں تھی...... ندیم خان کو پسند کرنے کے باوجود عامر خانزادہ کی مالا جپ رہی تھی اور اب ندیم خان کے حق میں فیصلہ دینے کے بعد آج میں آفس آئی ہوں تو ندیم خان آفس سے غائب...

"سر کیا چھٹی پر ہیں؟" میں نے ساجد سے پوچھا۔

"چھٹی تو صرف انہوں نے ایک دن کی تھی فیملی میں کسی فوتگی کے باعث...... دو دن سے تھوڑی دیر کے لیے آفس آرہے ہیں۔"

"کیا آج بھی آئیں گے......؟" میں نے بے صبری سے پوچھا۔

"پتا نہیں، شاید تھوڑی دیر کے لیے آجائیں۔"

"کچھ پتا ہے کہ کس کی فوتگی ہوئی ہے؟"

"نہیں، اس بارے میں تو معلوم نہیں......" ساجد نے سادگی سے بتایا مگر مجھے تو گھبراہٹ سی شروع ہوگئی تھی۔

"پتا نہیں...... ندیم کہاں ہیں اور کن پریشانیوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ اللہ ان کے گھر میں خیروعافیت رکھے۔" اور جب دل کو کسی صورت چین نہیں آیا...... تو انہیں فون ملا دیا جو پہلی ہی بیل پر اٹھا لیا گیا۔

"صبا ٹھیک تو ہو ناں......" میرے سلام کے جواب میں انہوں نے فوراً پوچھا۔

"ہاں، میں نے تو آفس جوائن کرلیا ہے آج۔"

"ارے یہ تو بہت اچھی بات ہے، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں آفس۔"

"خیریت تو ہے ناں...... آپ آفس سے چھٹی پر کیوں تھے؟"

"سین آپا کے سسر کا انتقال ہوگیا تھا...... آپا کے جیٹھ باہر تھے...... ان کے آنے پر کل ہی تو تدفین ہوئی ہے۔"

"آپ کو بتانا چاہیے تھا۔"

"ہاں، میں نے سوچا تھا...... بتادوں گا...... تمہاری امی کے پیر میں تکلیف ہے، خالہ ڈرائیونگ نہیں کرسکتیں...... اب اکیلی تم کیا کروگی۔"

"میں آج ہی امی اور خالہ کے ساتھ سین آپا کے پاس تعزیت کے لیے چلی جاؤں گی۔"

"اوہو، میں لے جاؤں گا۔" وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولے۔

اور جب تھوڑی ہی دیر بعد وہ آفس آئے تو میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان کے آفس میں کیا بہانہ بنا کر جاؤں۔ اور وہ بھی آکر...... اپنے کام میں ایسے مگن ہوگئے تھے کہ نہ مجھے بلایا تھا اور نہ ہی وہ خود راؤنڈ کے بہانے باہر نظر آئے تھے۔

"کیا آفس میں چائے پینے کا مقابلہ ہورہا ہے؟" چائے والے کو جب تیسری بار چائے لے کر ان کے روم میں جاتے دیکھا تو اس سے پوچھا۔

"نہیں باجی، آج کوئی چینل والے آئے ہوئے ہیں۔ جو چائے پیتے ہوئے ٹی وی کے پروگراموں کی طرح خوب باتیں بنارہے ہیں۔" اس نے ہنس کر بتایا۔

"اوہ ٹھیک ہے۔" میں نے اپنے آپ کو از خود سنبھالا۔ جو بات...... میں بتانے کے لیے کچھ زیادہ ہی اتاؤلی

ہوئی جارہی تھی۔ اسے بتانے کا شاید ابھی وقت نہیں آیا تھا۔

''فوراً آؤ۔'' صرف پندرہ منٹ کے بعد ہی ان کی کال آگئی۔

''جی سر!'' میں میگزین کی فائل لے کران کے آفس میں... پہنچ گئی۔

''طبیعت، ٹھیک ہے ناں؟'' انہوں نے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی سر...... !طبیعت بالکل ٹھیک ہے، جب ہی تو آفس آئی ہوں۔''

''اور کوئی نئی خبر؟'' انہوں نے عادتاً اپنا جملہ دُہرایا۔

''نئی خبر تو یہی ہے کہ امی اور خالہ نے آپ کا ایک سال پہلے آنے والا پروپوزل قبول کرلیا ہے۔'' میں نے عام سے لہجے میں بتایا۔

''کیا......؟'' وہ حیرت سے کھڑے ہوگئے۔

''جی سر......اور اس پروپوزل کو قبول کرنے میں صبا رحیم کی بھی پوری، پوری مرضی شامل ہے۔'' میں نے قدرے مسکرا کر کہا۔

''واقعی......؟'' وہ بیٹھ گئے اور مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگے...... ''اتنی بڑی نیوز......تم مجھے اب بتارہی ہو۔''

''میں تو صبح سے آفس میں ہوں......آپ ہی موجود نہیں تھے......تو کیا میں آپ کے کمرے کے دروازوں اور کھڑکیوں کو آکر بتاتی۔''

''مجھے فون کردینا تھا......آفس آنا تھوڑی ضروری تھا۔''

''آپ کا فون... دو دن سے آف جارہا تھا یا بہت بزی......تو میں کیا کرتی......''

''تم مجھے میسج کرسکتی تھیں۔''

''اب یہ خبر......میں میسج تو نہیں کرسکتی تھی ناں......''

''چلو گھر چلتے ہیں......میں آنٹی کا شکریہ تو ادا کروں......''

وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

''آفس والے کیا کہیں گے۔ آج آئی ہیں......اور دو گھنٹے کے بعد گھر روانہ ہوگئیں۔''

''میں کہہ دوں گا جب بیس دن کا میڈیکل تھا......تو پانچ دن پہلے کیوں آگئیں؟''

''تو کیا میں کل بھی نہ آؤں؟''

''ہاں نہ کل، نہ پرسوں......''

''ٹھیک ہے چلیں......'' میں سر پر اسکارف ٹھیک کرتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔

''کہاں چلے آپ لوگ......'' ساجد نے پوچھا۔

''جس پروگرام کے لیے ہم نے چینل کو اوکے کیا ہے وہیں جارہے ہیں۔'' ندیم خان نے کہا۔

''یہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟'' ان کے ساتھ چلتے ہوئے میں نے کہا۔

''میرا دل تو چاہ رہا تھا سچی بات بتادوں......مگر تمہاری وجہ سے جھوٹ بولنا پڑا۔ اخبار کے کسی ورکر کو کوئی بات بتانے کا مطلب یہی ہوا کرتا ہے کہ اس نے مسجد میں مائیک پر اعلان کردیا ہو......'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے۔

☆☆☆

شہلا کو ہنسی برداشت کرنا مشکل ترین کام لگا کرتا تھا اور آج تو اسے بار، بار ہنسی آرہی تھی۔ آج سر ساجد اسے

بالکل بچوں کی طرح ٹریٹ کر رہے تھے...... (ایسا ہی سب کچھ تو اسے ہمیشہ سے پسند تھا) اب انہوں نے آفس میں اس کے اور شوق پوچھے تھے تو شہلا نے بھی سادگی سے بتا دیا تھا۔

''گول گپے، بھٹے اور آئس کریم کھانا، فلم دیکھنا اور خوب مرچوں والے چپس کھانا اور گولا گنڈا تو لازمی کھانا...... مجھے حد سے زیادہ پسند ہے۔''

''یہ گولا گنڈا کیا ہوتا ہے؟'' وہ بڑی دلچسپی سے اپنی معلومات میں شاید اضافہ کر رہے تھے۔

''برف کو چورا کر کے اسے کسی ڈنڈی میں لگا کر اس پر کئی طرح کے جوسز ڈالے جاتے ہیں جسے کھا کر بہت مزہ آتا ہے۔'' وہ لہجے میں ذائقہ بھر کر انہیں بتا رہی تھی۔

اور آج لنچ کرنے کے بجائے وہ کہیں اسے گول گپے کھلا رہے تھے اور کہیں مرچوں والے چپس...... اور خود بڑے شوق سے اسے کھاتا دیکھ رہے تھے۔

''سر آپ بھی کھائیں ناں......'' وہ اسے کھاتے ہوئے دیکھ رہے تھے تو وہ ان کو دیتے ہوئے بولی۔

''سچ کہوں......ایسی چیزیں نہ تو میں نے کبھی کھائی ہیں اور نہ ہی کھا سکتا ہوں۔ مگر تمہیں اتنا خوش دیکھ کر میں بھی واقعی بہت انجوائے کر رہا ہوں۔''

اور جب اس کے پسندیدہ ہیرو کی فلم دیکھ کر وہ باہر نکل رہے تھے تو ایک ایجڈ سے حضرت اسے دیکھ کر ساجد سے بولے۔

''ارے ساجد مبارک ہو...... مونا واپس آ گئی۔''

''ارے بھئی کب آئیں تم کراچی...... فون بھی نہیں کیا ہے'' پھر شہلا سے بولے۔

''جی میں تو ہمیشہ سے کراچی میں ہی ہوں...... اور آج تک کراچی سے باہر نکلی ہی نہیں۔''

''اچھا جوک کر لیتی ہو۔'' وہ ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔

''سر، یہ صاحب ایسا کیوں کہہ رہے تھے......'' ساجد سر کے ساتھ چلتے ہوئے شہلا نے پوچھا۔

''وہ تمہیں مونا ہی سمجھے...... اور یہ بھول گئے کہ دس سال پہلے کی مونا...... آج بھی ویسی کی ویسی کیسے ہوگی...... اس میں... فرق تو ضرور آیا ہوگا۔''

''ہو سکتا ہے کہ وہ بھی ویسی ہی ہو...... میں تو پچھلے پانچ سال سے ایسی ہی ہوں...... نہ وزن بڑھا ہے اور نہ ہی قد بڑھا ہے۔'' اور ساجد اسے بس دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا تھا۔

''سر آپ مونا کے بارے میں کچھ بتائیں۔'' ایک دن پھر شہلا نے بڑی لگاوٹ سے پوچھا۔

''اگر یہ راز تم اپنے دل میں رکھ سکو تو بتا دوں گا۔''

''سر، آپ سے وابستہ بات میں کیوں کسی کو بتاؤں گی۔''

''اچھا، تو پھر سنو......''

''یہ مونا، میری جان تھی...... جس سے میں دل کی گہرائیوں سے محبت کرتا تھا۔''

''پھر آپ دونوں کی شادی ہوئی؟''

''نہیں، اس وقت میں غریب تھا...... اور وہ فضاؤں میں اڑنے والی کسی ائیر لائن میں ائیر ہوسٹس تھی۔ محبت تو مجھ سے کی مگر شادی کسی امیر شخص سے کرنے کے بعد باہر چلی گئی...... اور ایسی گئی کہ واپس پلٹی ہی نہیں...... اپنے والدین سے ملنے کے لیے بھی نہیں آئی؟ اسے پتا تھا کہ اگر وہ واپس آئی تو مجھ سے نظر ملانے کے قابل نہیں ہوگی...... اس کی ماں ایک، دو بار جا کر اس سے مل آئی ہیں۔''

''آپ بہت محبت کرتے تھے اس سے؟''

''ہاں، بے حد......''

''اور آج بھی کرتے ہیں، اتنی محبت......؟''

''نہیں، اب تو میں بے حد نفرت کرتا ہوں۔ اور یہ میری نفرت ہی تو تھی...جب ہی تو اس کے بھائی کو ایسا تباہ کیا کہ وہ آج بھی اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا ہے۔''

''اس کے بھائی کو تباہ کیا آپ نے......؟'' شہلا نے تاسف سے کہا۔

''ہاں، حارث......اس کا بھائی ہے جو بینک کی ایک بہت بڑی برانچ کا منیجر تھا......اور جب مجھے پتا چلا کہ اس کی شاندار کارکردگی کی وجہ سے اس کا ڈبل پروموشن ہونے والا ہے تو میں نے اس کی ساکھ کو ایسا دھبا لگایا کہ آج وہ ایک غیر معروف چھوٹی سی برانچ میں منیجر بنا بیٹھا ہے......ورنہ کب کا ایریا منیجر بنا......دھوم مچا رہا ہوتا......یہ دونوں بہن بھائی بلا کے ٹیلینٹڈ تھے۔''

''اوہ......یہ تو بہت برا ہوا......'' شہلا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ابھی تو کچھ بھی برا نہیں ہوا۔ برا تو جب ہوگا جب حارث کسی اتفاقیہ حادثے میں جاں بحق ہو جائے گا اور وہ روتی پیٹتی اپنے گھر آئے گی۔''

''سر آپ ماریں گے حارث کو؟'' شہلا کا رواں، رواں لرزنے لگا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ زلزلوں کے جھٹکوں میں ہو۔

''میں کیوں مارنے لگا......اتفاقی حادثات ہر جگہ ہوتے رہتے ہیں......اور ایسا ہی اتفاق اگر اس کے ساتھ بھی ہو جائے تو کسی کا کیا بگڑے گا۔ البتہ میرا دل تو طمانیت سے بھر جائے گا۔'' وہ بے ساختہ قہقہے لگاتے ہوئے بولا۔

اور شہلا......خوف زدہ سی اسے دیکھنے لگی جس کی آنکھوں میں سفاکیت رچی ہوئی تھی۔ اور وہ شہلا کا ہاتھ پکڑ کر اس سے محبت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''شہلا تم میری مونا ہو......میں تم سے شادی کروں گا......اور تم نے ہی حارث کو اس کے آخری مقام تک پہنچانا ہے۔ جس طرح اس کی بہن نے مجھے ٹھوکر ماری اور اب اسی طرح تمہیں حارث کو ٹھوکر لگانی ہے۔''

''مگر، میں کسی حارث کو نہیں جانتی......بالکل بھی نہیں......'' وہ دانت کٹکٹاتے ہوئے بولی تھی۔

''نہیں جانتی تو جان جاؤ گی۔''

''مگر میں اسے جاننا بھی نہیں چاہوں گی۔''

''ارے ڈرو نہیں......میں ہوں ناں تمہارے ساتھ......اور میرے ہوتے ہوئے تمہارا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔'' اب وہ اس کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

اور شہلا کو لگ رہا تھا کہ اگر وہ یہاں سے نہیں گئی تو ابھی یہیں گر کر ختم ہو جائے گی۔

☆☆☆

دو دن سے وہ وائرل فیور کی وجہ سے بینک نہیں جا رہا تھا۔ مستقل گھر میں رہنے کی وجہ سے وہ عجیب چڑچڑا سا ہو رہا تھا۔ ایسا بخار تو اسے کبھی نہیں ہوا تھا......جو بار، بار چڑھ رہا تھا اور اتنا تیز تھا کہ اس سے بستر سے نہیں اٹھا جا رہا تھا۔ اور ایسے میں اسے شہلا کا محبت بھرا خط پڑھ کر یوں لگا۔ جیسے اب بخار اس کے دماغ پر بھی چڑھ گیا ہو۔

اچھا ہے والدہ کسی عزیز کی شادی میں شرکت کرنے دوسرے شہر گئی ہوئی تھیں ورنہ وہ اسے دیکھ کر پریشان

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



ہو جاتیں۔

''ان لڑکیوں سے ذرا بات کیا کرلو...... عشق و عاشقی کے سوا انہیں کچھ سوجھتا نہیں۔''

''ٹھیک ہے، اب ملاقات ہوگی...... تو محترمہ کی ایسی طبیعت صاف کروں گا کہ ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔ یہ بلیو لٹریچر اور اوندھی سیدھی فلمیں دیکھ کر اپنے آپ کو ہیروئن ہی سمجھنے لگی ہے...... اتنی سی لڑکی اور باتیں دیکھو...... کتنی بڑی، بڑی کر رہی ہے۔'' خط پر ایک نظر ڈال کر وہ مزید کھول گیا تھا۔

یہ بھی اچھا ہی تھا...... اس کی طبیعت خراب تھی ورنہ اس کے پاس جا کر اس نے وہ کھری، کھری سنانی تھیں کہ وہ بھی بھول جاتی کہ اس نے کس سے دل لگایا تھا۔

☆☆☆

کتنی مشکلوں سے وہ گھر پہنچی تھی...... یہ وہی جانتی تھی...... اور گھر آئی تو مسز ناصر نے اسے بتایا کہ انہیں فوری طور پر اپنے بیٹے کے پاس لاہور جانا پڑ رہا ہے۔ جس کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی ہے۔

''آنٹی میں اکیلی کیسے رہوں گی......؟'' وہ لجاجت بھرے لہجے میں ان سے بولی۔

''آفس میں سے کسی کو بلا لو یا اپنے کسی رشتے دار کو...... مجھے تو آنے میں دس دن لگ جائیں گے۔'' وہ اس کی حالت دیکھے بغیر ہی اسے خدا حافظ کہہ کر چلی گئی تھیں۔

اور شہلا کو ہر آہٹ پر یہ گمان ہو رہا تھا کہ جیسے کہیں سے ابھی ساجد آجائے گا اور اس کے سامنے حارث کو ختم کر دے گا۔ مارے خوف کے اس کا برا حال تھا حارث اس کا فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ تنگ آکر اس نے اسے میسج کیا۔

''حارث، اگر تم نہیں آئے تو میں مر جاؤں گی۔'' حارث کا دل چاہا کہ اسے فوراً جواب لکھ دے۔

''ہاں مر جاؤ......'' مگر لکھتے، لکھتے رک گیا...... بخار قدرے کم ہوا...... تو بارش شروع ہوگئی۔

شہلا کا پھر میسج آگیا۔

''حارث...... اگر تم نہ آئے تو شاید میں خوف سے ہی مر جاؤں...... مجھے اس بارش سے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

''چھوٹی لڑکی...... خط میں جگہ، جگہ ساون کے شعر لکھے تھے اور اب محترمہ بارش سے خوف زدہ بھی ہو رہی ہیں۔ ہاں بارش بہا کر لے جائے گی ناں، ان کو۔''

بارش مزید تیز ہوئی، بخار بھی قدرے کم ہوا تو اس نے سوچا...... آج شہلا کو اس کی اصل حقیقت بتا کر اس سے کہہ دے کہ تم اپنے گھر جاؤ...... یہاں کام کر کے تم اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کرو...... بلکہ مجھ پر تو ہرگز کوئی احسان نہ کرو......

وہ مسز ناصر کے فلیٹ پر پہنچا تو بارش کی تیزی کے باعث وہاں لائٹ گئی ہوئی تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا جن فلیٹوں میں جنریٹر یا یو پی ایس کا انتظام تھا صرف ان میں روشنی تھی۔ مسز ناصر کا تو پورا فلیٹ ہی اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ شکر ہے کہ گراؤنڈ کا تھا۔ دروازے پر دستک دینے کو ہاتھ بڑھایا تو وہ صرف بھڑا ہوا تھا...... آواز دیتے ہوئے وہ قدرے آگے بڑھا تو سامنے سے موم بتی جلا کر شہلا آتی نظر آئی۔

بال کھلے ہوئے آنکھیں پُرنم وہ اسے دیکھ کر بے ساختہ آگے بڑھی اور بے اختیار اس کے گلے لگ گئی۔ اب وہ خوب زار و قطار رو رہی تھی۔

''کیا بات ہے، بارش ہونے اور لائٹ چلے جانے پر اتنا رونا آرہا ہے۔''

''مسز ناصر لاہور چلی گئی ہیں...... اور مجھے اس اندھیرے فلیٹ میں ڈر لگ رہا ہے۔''

''تو تم اپنے گھر چلی جاؤ......''

''ابھی میں نہیں جا سکتی......''

''میں کہہ رہا ہوں...... تم چلی جاؤ...... تو کیوں نہیں جا رہی ہو۔''

''کہاں ناں حارث...... اصل کام تو وہاں اب شروع ہوا ہے۔''

''مجھے اس شخص کی سائیکی کی مزید معلومات ملنی شروع ہو گئی ہیں...... اس لیے میں کہہ رہا ہوں تم اپنے گھر چلی جاؤ ایسا نہ ہو...... کہ اس کھیل میں تمہیں کہیں کوئی نقصان پہنچ جائے۔''

''آپ کی خاطر مجھے ہر نقصان قبول ہوگا...... کہ آپ میرے ہیں...... اور میں یہ بالکل نہیں کر سکتی کہ کوئی میرے ہونے والے شوہر کو بری نظر سے بھی دیکھے۔''

''پلیز شہلا...... اچھی لڑکیاں اس ٹائپ کی باتیں نہیں کیا کرتیں...... مجھے بے حد نامناسب لگتا ہے جب تم ایسی باتیں کرتی ہو۔''

''میں کسی غیر سے تو ایسی بات نہیں کر رہی، آپ تو میرے اپنے ہیں......'' وہ محبت بھرے لہجے میں بولی۔

''سنو...... اگر آج میں ایک سچ کہہ دوں تو تم مجھے معاف کر دو گی؟''

''میں تو آج، آپ کو ایک اور سچ بتانا چاہ رہی تھی...... چلیں آج آپ پہلے بولیں کہ کون سا ایسا سچ ہے جو مجھے نہیں معلوم......''

''سن سکو گی......؟'' حارث نے کہا۔

''ہاں کیوں نہیں......''

بادل زور سے گرجا...... اور وہ ڈر کر حارث سے آ لگی۔

حارث نے دونوں شانوں سے تھام کر اسے سامنے بٹھایا اور اسے دیکھے بغیر بولنا شروع ہوا۔

''شہلا پہلی بات تو یہ ہے کہ نہ میں تم سے کوئی محبت کرتا ہوں اور نہ ہی کوئی پیار وغیرہ...... یہ تو بس ریحان کے کہنے پر تم سے فون پر بات اس لیے کر لی کہ تم کو ساجد کے آفس میں جاب دلوا کر اس کی معلومات حاصل کر لی جائے۔ مگر تم میری جانب سے اتنی غلط فہمی کا شکار ہو گئی ہو کہ اپنی شادی کے پروگرام بھی سیٹ کرنے لگی ہو۔ ارے بھئی میری شادی، میری ماں اپنی پسند سے کسی ڈھنگ کی لڑکی سے کریں گی تم سے نہیں...... اس لیے برائے مہربانی یہ ساجد جیسے کرمنل شخص کی جاب چھوڑ دو...... اور اپنے گھر میں سکون سے رہو...... اور جہاں تمہارے والدین کہیں وہیں شادی کر لو۔''

''بات ختم ہو گئی ہے آپ کی؟'' شہلا نے اپنے آنسوؤں کو پیتے ہوئے کہا۔

''ہاں، جو میرے دل میں تھا وہ میں نے کہہ دیا۔''

''آپ نے کہا تھا ناں کہ آپ ساجد کی طرح چیٹر نہیں ہیں اور شریف شخص کسی کو بے وقوف نہیں بنایا کرتے مگر آپ سے زیادہ تو کوئی چیٹر ہو ہی نہیں سکتا......'' وہ دہائی دیتے ہوئے بولی۔ ''اور آپ ایسے شریف شخص کا ماسک پہنے ہوئے ہیں جس کا کام ہی لوگوں کو بے وقوف بنانا ہے۔''

''تم غلط سمجھ رہی ہو...... میں ایسا ہرگز نہیں ہوں۔''

''نہیں حارث، آپ جیسا پوز کرتے رہے ویسے تو آپ ہیں ہی نہیں۔ میں واقعی آپ کو پہچان نہیں سکی......'' وہ گلوگیر لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''جھوٹے، چالاک اور مطلب پرست...... اپنے مطلب کے لیے ایک لڑکی کو جھوٹی امیدوں میں باندھ

دیا...... تا کہ اپنا کام نکلوا سکیں۔''

''میں نے کہا ناں...... ایسا صرف ریحان کی وجہ سے ہوا ہے جو تمہاری غلط فہمیاں چاہتے ہوئے بھی دور نہیں کر سکا۔ مگر تمہیں بارہا سمجھایا تھا۔''

''مت جھوٹ بولیں...... آپ دونوں ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں، یہ پلان آپ دونوں کا ہی تھا...... کہ کس طرح اپنا معاملہ صاف کروانے کے لیے مجھے استعمال کیا جائے...... اور بیچارے ساجد کو پھنسا دیا جائے...... جس نے آپ سے بالکل صحیح انتقام لیا ہے۔''

''کیسا انتقام...۔ اور یہ ساجد کہاں سے بیچارہ آ گیا۔'' اب حارث حیرت سے اسے دونوں شانوں سے پکڑے پوچھ رہا تھا۔

''بیچارے آپ نہیں ہیں، ساجد بیچارہ ہے اور آپ سے ہزار گنا اچھا ہے۔ جس نے اپنے دل کی بات مجھ سے ایمانداری سے کی ہے۔ آپ تو مجھ سے کھیل رہے تھے...... میں شادی کی بات کرتی تھی جسے آپ ہنسی میں اڑا یا کرتے تھے مگر وہ مجھ سے شادی بھی کرنا چاہتا ہے۔ اور وہ واقعی مجھ سے شادی کر بھی لے گا۔''

''وہ کسی سے شادی نہیں کرے گا، مار دے گا تمہیں۔'' حارث نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''مار، تو آپ نے بھی مجھے دیا۔'' وہ دھواں دھار روتے ہوئے بولی۔

شہلا کی باتیں سن کر حارث کا سر گھوم گیا تھا اور اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے شہلا اب صرف اس کی وجہ سے کسی بڑی کھائی میں گرنے والی ہو۔

''میں واقعی غلط تھا اور مجھ سے کوئی غلطی نہیں بلکہ بہت بڑا گناہ سرزد ہوا ہے۔ پلیز تم مجھے معاف کر دو...... مجھے واقعی تمہیں ساجد کے انسٹی ٹیوٹ نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔'' اب حارث نادم سا اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔

''حارث تم پہلے بھی غلط تھے اور آج بھی غلط ہو۔ دفع ہو جاؤ تم یہاں سے...... میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا نہیں چاہتی۔'' وہ ہذیانی لہجے میں چیخی۔ ''میں نے کہا ناں...... اب تم مجھے اپنی شکل بھی نہیں دکھانا تم جیسے ابن الوقت ہی تو صرف اپنا فائدہ دیکھا کرتے ہیں۔'' اب وہ اسے دھکے بھی دے رہی تھی۔

حارث اسے سنبھالنا چاہ رہا تھا مگر اس کا انداز تو کسی بپھری شیرنی جیسا تھا۔

''حارث تم نے ہی صرف مجھے محبت کے نام پر بے وقوف نہیں بنایا، تمہاری بہن نے بھی ایسا ہی کچھ کیا تھا۔ تمہارے گھرانے میں تو محبت صرف تجارت ہے اور میں ایسے شاطر لوگوں کی انگلیوں پر ہرگز نہیں ناچوں گی۔ جاؤ دفعان ہو جاؤ۔'' وہ چلاتے ہوئے اسے نہ صرف مکے مار رہی تھی بلکہ دھکے بھی دے رہی تھی۔

یہ بھی اچھا ہی تھا کہ اس وقت تیز بارش ہو رہی تھی۔ بادل بھی گرج رہے تھے...... اور مذکورہ فلیٹ گراؤنڈ فلور پر ہونے کی وجہ سے ان کی آوازیں بھی کہیں نہیں جا رہی تھیں۔

یکبارگی بادل زور سے گرجا...... شہلا نے اسے پھر جنونی انداز میں باہر کی جانب دھکا دیا...... اور سرعت سے دروازے کو لاکڈ کر لیا......

اب حارث باہر سے دروازے کو پیٹ رہا تھا، اس سے التجا آمیز لہجے میں دروازہ کھولنے کی درخواست کر رہا تھا...... اور وہ دروازے کی پشت سے ٹیک لگائے یوں رو رہی تھی جیسے برستی بارش سے مقابلہ کر رہی ہو کہ آج کون زیادہ آنسو بہائے گا......

(جاری ہے)

صحبتِ دوستاں

اُمِ ایمان



دروازہ دھاڑ سے کھلا، نمرہ نے جو کتاب کا رٹا لگانے میں مصروف تھی کھا جانے والی نظروں سے صدف کو دیکھا جو اس کے غصے کو خاطر میں لائے بغیر تیزی سے آکر بستر پر ڈھیر ہو چکی تھی اور ہلکے، ہلکے گنگنا رہی تھی۔ اردگرد شاپنگ بیگز بکھرے پڑے تھے جو وہ اپنے ساتھ لائی تھی اور آتے ہی ڈھیر کر دیے تھے۔ نمرہ کچھ دیر تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھتی رہی اور پھر ایک گہری سانس لے کر دوبارہ کتاب پر نظریں جمالیں اگرچہ اب پڑھنے میں وہ پہلے جیسا انہماک نہیں رہا تھا لیکن وہ خود صدف سے بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی کیونکہ رات ہی تو دونوں کے درمیان ایک معرکہ ہوا تھا۔

نمرہ ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی گھر شہر سے باہر ہونے کی بنا پر وہ یہاں کالج ہاسٹل میں رہائش پذیر تھی۔ صدف اس کی روم میٹ تھی جس کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا، دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ نزدیکی قصبے سے انٹر کر کے اس نے آگے پڑھنے کے لیے اپنے گھر والوں کے کان کھالیے تھے اگرچہ آگے پڑھانے کے لیے اس کے گھر والوں میں سے کوئی بھی تیار نہیں تھا لیکن اس نے رو دھو کر، بھوک ہڑتال کر کے اپنے باپ، بھائیوں سے ہر بات منوائی تھی کہ اسے صرف دو سال آگے ریگولر پڑھنے دیا جائے یوں اس کے ابا راضی ہو گئے تھے۔ وہ ایک بڑے زمیندار کی زمینوں پر ملازم تھے۔ ایک بھائی شہر میں پینٹ کا کام کرتا تھا۔ پارٹ ٹائم کے طور پر اور میٹرک کے بعد اس کا باقاعدہ پینٹ کی شاپ کھولنے کا ارادہ تھا، ابھی اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ اسے ذاتی دکان دی جا سکتی۔ دوسرا بھائی بھی جو اس سے چھوٹا تھا قصبے کے

مدرسے میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ بڑا بھائی اگرچہ عمر میں بڑا سہی لیکن پڑھائی میں کوئی خاص رجحان نہ ہونے کے باعث ایک، ایک کلاس میں دو، دو سال لگائے تھے۔ صدف کی ضد پر مجبور ہو کر ابا نے اس کے شہر کے ہاسٹل میں رہنے کے لیے ہامی بھرلی یوں وہ اور نمرہ روم میٹس تھیں۔ پہلے، پہلے تو کچھ طبقاتی فرق کچھ عادتوں میں مطابقت نہ ہونے کے باعث وہ دونوں ایک دوسرے سے سلام، دعا کے علاوہ بات نہ بڑھا پائیں لیکن بہرحال کلاس فیلو بھی تھیں، روم میٹس بھی تھیں تو جہاں ساتھ دن رات کا ہو تو وہاں بندہ ایک دوسرے سے کہاں بیگانہ رہ سکتا ہے۔ نمرہ نے تھرڈ ائیر سائنس اور صدف نے آرٹس کے مضامین لیے تھے کچھ ہی دن گزرے تھے کہ نمرہ نے صدف کو کالج کی کچھ ایسی لڑکیوں کے ساتھ دیکھا جن کی شہرت کالج میں کچھ خاص اچھی نہیں تھی جو تھیں تو لوئر مڈل کلاس لیکن اسی شہر میں رہائش کے باعث صبح کسی کزن کے ہمراہ نظر آتیں تو جاتے ہوئے ان کو بائیک پر کوئی اور کزن لینے کے لیے آیا ہوتا کلاس میں جن کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہوتی لیکن کلاس ٹائم کے بعد خوب ٹیچرز کا ریکارڈ لگایا جاتا...... فلموں، تھرڈ کلاس فیشن اور آئے روز ہونے والی منگنیوں کی رودادیں سنائی جاتیں، وہ لڑکیاں ایسی تھیں جو کالج میں صرف ٹائم پاس کرنے اور ماں، باپ کا نام ڈبونے آتی ہیں۔ نمرہ کی ان سے بے تکلفی تو ہرگز نہیں تھی نہ وہ ان جیسوں کو منہ لگاتی لیکن ان کی شہرت سے غافل نہ تھی۔ دو تین دن تو وہ صدف کے ان کے ساتھ رہنے کو برداشت کرتی رہی، ایک دن جب دونوں رات کے کھانے کے بعد کمرے میں آئیں تو نمرہ نے بات کا آغاز کیا۔

''تم آج کل شیریں، نعمانہ وغیرہ کے گروپ کے ساتھ بہت ہوتی ہو۔ اکثر کلاسز بنک کر کے تمہیں ان کے ساتھ لان میں بیٹھ کر قہقہے لگاتے دیکھا ہے جبکہ ایک ماہ بعد فرسٹ سمسٹر کے پیپرز اسٹارٹ ہونے والے ہیں اور تم رات کو اسٹڈی ٹائم میں بھی خاص پڑھتی نظر نہیں آتی ہو۔'' نمرہ نے سنجیدگی سے اس سے دریافت کیا۔

''کیوں شیریں، نعمانہ کے گروپ میں کیا برائی ہے جو میں ان کے ساتھ نہ بیٹھوں اور جہاں تک پیپرز کی بات ہے تو وہ ابھی دور ہیں، ہو جائے گی تیاری بھی۔'' صدف نے ادائے بے نیازی سے جواب دیا اور بیگ میں سے ایک فیشن میگزین نکال کر اس کی ورق گردانی کرنے لگی۔

''صدف!'' نمرہ نے پکارا۔

''ہوں......'' صدف کے انداز میں بے پروائی تھی۔

''تمہیں خود پتا ہے کہ تمہیں کتنی مشکلوں سے یہاں آنے اور رہنے کی اجازت ملی ہے، تمہارے ابا جب بھی ملنے آتے ہیں گاؤں کی ڈھیروں سوغاتیں اور پھل وغیرہ لے کر آتے ہیں کہ ہماری بیٹی تو شہر میں جا کر پڑھ رہی ہے۔ اسے کسی چیز کی کمی نہ ہو۔ اگر تم فیل ہو گئیں تو ان کے بارے میں سوچا ہے کہ وہ کیا محسوس کریں گے۔'' نمرہ نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے اس کے بڑھے ہوئے نیلز اور ان پر لگی کیوٹکس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ان چند شب و روز میں صدف میں کافی تبدیلی آئی تھی اور آئی برو کو مزید تیکھا اور کمان کی شکل دے دی گئی تھی۔ ہاسٹل کی مشین سے کپڑے تنگ اور فیشن کے مطابق اونچے کرا لیے تھے۔ بال بھی دو تین جگہوں سے ڈائی ہوئے نظر آ رہے تھے۔

''کیا ہے یار......! ڈونٹ ٹیل می پلیز......'' نمرہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''اور مجھے ایک بات کا جواب دو۔''

''دیکھو نمرہ بی بی، یہ ہر وقت کا وعظ اور نصیحتیں مجھے پسند نہیں...... میرے خیال میں، میں عاقل و بالغ اور آج کے دور کی سمجھدار لڑکی ہوں، مجھے معلوم ہے کیا اچھا ہے اور کیا برا...... اس لیے اگر یہ کچھ عرصہ جو ہم ساتھ ہیں اپنے وعظ اور انداز اپنے پاس رکھو تو ہم بہتر ٹائم پاس کر لیں گے نہیں تو میں نے ویسے بھی روم چینج

کرنے کی اپلیکیشن وارڈن صاحبہ کو دے رکھی ہے، اس لیے یہ جو دن ہیں خود بھی سکون سے رہو اور مجھے بھی رہنے دو۔'' صدف نے اپنی چادر جھاڑ کر اپنے اوپر لی اور لمبی تان کر لیٹ گئی جبکہ نمرہ کا تو وہ حال تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں...... اتنی انسلٹ صرف ایک اس جرم کی پاداش میں کہ اس نے صدف کو دوست سمجھتے ہوئے اس کی صحیح راستے کی طرف نشاندہی کی تھی۔

ساری رات اسے صدف کے الفاظ رہ رہ کر یاد آتے رہے۔ اور صبح اٹھنے کے بعد سر کچھ بھاری، بھاری لگا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر فریش ہونے کے بعد ناشتا کر کے کالج چلی گئی جبکہ صدف ابھی سو رہی تھی۔ کالج میں اس نے آج پھر صدف کو شیریں اور نعمانہ کے ساتھ دیکھا تو گہری سانس بھر کے اپنی کتاب پر جھک گئی۔ شام کو وہ نیند سے بیدار ہو کر نیچے سے چائے کا اپنا کپ لے کر پلٹتے ہوئے صدف کو بستر پر دراز موبائل کے بٹن پش کرتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''یہ کہاں سے آیا؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے پھسلا۔

''ہوں...... یہ'' صدف نے پہلے اسے اور پھر موبائل کو دیکھا۔

''میری ایک دوست نے گفٹ کیا ہے۔''

''کس نے؟ اور تمہاری دوست تو خود ایسے گھرانوں سے ہیں جہاں ان کی گزر بسر مشکل سے ہوتی ہے ایسے میں ان کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر میں حیران ہوتی ہوں کہ وہ کہاں سے یہ سب چیزیں، پیسے لاتی ہیں جو خود بھی بڑی فراخدلی سے استعمال کرتی ہیں اور دوستوں کو بھی دے دیتی ہیں۔''

''تم ذرا زبان سنبھال کر بات کرو اگر تمہارا باپ ایک پروفیسر، ماں ایک ہیڈ مسٹریس ہے تو دوسروں کی غربت کو کیوں نشانہ بناتی ہو...... بار، بار مجھے غریب ہونے کا طعنہ کبھی کسی بہانے تو کبھی کسی بہانے دیتی ہو۔ آئندہ میرے معاملے میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے، کون لگتی ہو تم میری ... ماں، بہن؟ کون ہو جو

حیرت

☆کل ایک انسان روٹی مانگ کر لے گیا
اور بدلے میں کروڑوں کی دعا دے گیا۔
پتا نہیں چلا کہ غریب وہ تھا یا میں......

معصومہ حسن، کراچی

اپنے پیارے دوست کے نام

سنو تم جلدی سے آجاؤ کہ اب مجھ سے
کاٹا نہیں جاتا تم بن یہ اداس سا موسم
آنکھیں جو ہر دم چوکھٹ کو تکتی ہیں
آنے سے ہی تمہارے ہوگا پھر یہ آس کا موسم

از: عائشہ یوسف، لاہور

نصیحت

مت سوچ اتنا زندگی کے بارے میں اے انسان
جس نے زندگی دی ہے اس نے بھی تو کچھ سوچا ہوگا

حلیمہ نقوی، کراچی

بابا جان کے نام

ہر لمحہ، ہر پل آپ یاد آتے ہیں
مگر جانے والے کب لوٹ کے آتے ہیں
رہتا ہے نظروں میں آپ کا چہرہ
ہر پل سوچوں میں آپ ہی آتے ہیں
وعدے نبھائے سب اس طرح آپ نے
جیسے اہلِ وفا اپنا عہد نبھاتے ہیں
بہاروں کے سلسلے پُرخار ہوئے ہیں
اب تو راہوں کے پھول بھی ستاتے ہیں
اپنا اپنا کرتے ہیں سب کوئی نہیں اپنا
سب جھوٹی اپنائیت کا ڈھونگ رچاتے ہیں
جدھر سے گزروں جدھر بھی دیکھوں
ہر پل بابا جان آپ یاد آتے ہیں

سامعہ ملک پرویز، بھیرہ خان پور ہزارہ

اتنے دھڑلے سے حق جتاتی ہو، یہاں کیوں ہو؟ وہاں کیوں گئی اس سب سے تمہیں کیا......'' بولتے بولتے صدف کی آواز غصے سے بہت اونچی ہوگئی اور اس کے الفاظ، اس کا انداز نمرہ کو اس حد تک سن کر گئے کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت ہی نہیں کرسکی۔ صدف بکتی جھکتی موبائل اٹھا کر کمرے سے باہر چلی گئی اور کچھ ہی دیر بعد واپس آئی تو اس کے کانوں پر ہیڈ فون لگا ہوا تھا آتے ہی وہ اپنے بستر پر بیٹھ کر میگزینز کی ورق گردانی کرنے لگی گویا کچھ ہوا ہی نہیں ہو جبکہ نمرہ نے وہ رات بہت ٹینشن میں گزاری کہ کسی کو غلط کرتا دیکھ کر رک بھی نہیں سکتی تھی اور صحیح کہہ کر بھی سکون سے اسے نہیں رہنے دیا جاتا تھا۔ اس رات کے بعد اس نے صدف کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

اگلے دن ہفتہ تھا اور ہفتے کے دن اسے ابو جی لینے کے لیے آتے تھے۔ وہ پورا ہفتہ پڑھائی میں مصروف رہتی لیکن ویک اینڈ کا اسے بہت بے چینی سے انتظار رہتا کہ وہ اپنے پیارے ابو جی سے ملے گی؟ اپنی امی جی کے پیار کو محسوس کرے گی لیکن آج اس نے ابو جی کو کامن روم کے فون سے کال کر کے کل نہ آنے کو کہا کیونکہ منڈے سے ان کے فرسٹ سمسٹر اسٹارٹ تھے وہ پوری یکسوئی سے پیپرز کی تیاری کرنا چاہ رہی تھی اگلے ہفتے پیپر ختم ہوجانے تھے جس کے بعد انہیں ایک ہفتے کی چھٹیاں تھیں جبکہ گھر جا کر وہ پڑھائی کو اتنا ٹائم نہیں دے سکتی تھی۔ اتوار کو اس نے اٹھ کر ناشتا کیا اور صدف کو نظر انداز کرتی ہوئی کتابیں لے کر مرکزی لان میں آگئی۔ صدف کے البتہ گھر نہ جانے کی اسے کوئی لاجک سمجھ نہیں آئی تھی اور اب اسے ڈھیروں شاپنگ بیگز لاتے دیکھ کر سمجھ آگیا تھا کہ پھر کسی چچا، ماموں کے گھر کا بہانہ کر کے گئی ہوگی اب اسے کزن نما دوست اور دوست نما کزنز ڈھونڈنے کے لیے شیریں اور نعمانہ وغیرہ کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی، وہ خود ہی ان کے بتائے تباہی کے راستے پر بہت آگے چلی گئی جہاں اسے ان دوستوں کی رہنمائی کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ آئے روز اس کے موبائل تبدیل ہوتے نظر آتے۔ ظاہری حلیہ دیکھنے پر وہ کسی امیر گھرانے کی ایک فیشن ایبل لڑکی نظر آتی تھی۔ اس کے ابا اب بھی ہر ویک اینڈ پر اسے ملنے آتے اور نمرہ اگر کسی ویک اینڈ پر یہاں ہوتی تو اسے ان کو دیکھ بہت دکھ ہوتا دل چاہتا کہ جا کر انہیں صاف، صاف بتادے کہ آپ کی بیٹی جن راہوں کی مسافر بن چکی ہے ان کی منزل صرف بربادی اور تباہی ہے لیکن وہ دل مسوس کر رہ جاتی۔ گھر میں اس نے اپنی امی سے بھی یہ ساری بات ڈسکس کی تھی انہوں نے اسے سمجھایا کہ صدف کے غلط راستوں پر قدم پڑنے پر نمرہ نے اسے سمجھانے کی کوشش تو کی ہے اب اگر وہ نہیں مان رہی تو اس میں نمرہ کا کوئی قصور نہیں، وہ بس اپنی پڑھائی کی طرف دھیان دے اگرچہ نمرہ کی والدہ خود درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ تھیں اور ان کا دل بہت کڑھتا تھا۔ لیکن وہ کیا کرسکتی تھیں، انہوں نے اپنی تدریس کے پچیس سالوں میں بہت سی لڑکیوں کو اس راہ گزر کی مسافر ہوتے اور نتیجتاً برباد ہوتے دیکھا تھا۔ وہ حتی المقدور کوشش کیا کرتیں کہ بچیوں کی صحیح رہنمائی کرسکیں لیکن ہر لڑکی ایک جیسی نہیں ہوتی۔ نمرہ اپنی امی کی تسلی پا کر کچھ مطمئن ہوگئی تھی۔

آج اتوار تھا۔ کل آخری پیپر تھا اور اس کے بعد انہیں ایک ہفتے کی چھٹیاں ہوجانی تھیں۔ نمرہ نے صبح میس روم میں جا کر ناشتا کیا اور کمرے میں آگئی، کل کے پیپر کی اس کی تیاری تھی سو ٹہلتی ہوئی کاریڈور میں آگئی اور اس کے ایک سرے پر بنے شیشے میں جھانک کر دیکھنے لگی۔ نیچے مین گیٹ کے پاس بنے لان میں لڑکیوں کے وزیٹرز آئے ہوئے تھے۔ اس نے صدف کو اپنے ابا کے پاس سر جھکائے بیٹھے دیکھا۔ پاس ہی ڈھیروں پھل اور سوغاتیں رکھی تھیں جو اس کی اماں بنا کر بھیجتی تھیں۔ اس کا دل دکھ سے بھرنے لگا پھر وہ سر جھٹک کر کمرے میں آکر کتابیں کھول کر بیٹھ گئی۔

پڑھتے، پڑھتے کافی وقت ہوگیا تو کھانا کھانے نیچے ڈائننگ ایریا میں آگئی۔

صدف ابھی تک روم میں واپس نہیں آئی تھی؟ وہ اپنا چائے کا کپ لے کر نیچے مرکزی لان میں ہی بیٹھ گئی۔ صدف اسے پھر نظر نہیں آئی۔ شام کے آثار ہوتے دیکھ کر اس نے کل کے لیے اپنے سامان کی پیکنگ شروع کردی کہ گھر والے شدت سے یاد آنا شروع ہوگئے تھے اور وہ اُڑ کر ان کے پاس پہنچنا چاہتی تھی۔ تیاری پوری تھی، پیپرز کی ٹینشن نہیں تھی سو جلد ہی اسے نیند آنے لگی۔ صبح معمول کے مطابق اس کی آنکھ نماز کے لیے کھلی تو ساتھ والے بستر کو خالی دیکھا گویا رات صدف کمرے میں آئی ہی نہیں تھی۔ اسے تشویش نہ ہوئی کہ اکثر صدف اپنے جیسی کچھ فرینڈز کے روم میں رات کو رک جایا کرتی تھی۔ ناشتا کرنے کے بعد اوپر آئی کہ ابھی کالج جانے میں کچھ دیر تھی سو اوپر کاریڈور کے سرے پر بنے شیشے پر ناک چپکا کر نیچے کا نظارہ کرنے لگی۔ کچھ لڑکیاں نیچے بیٹھی پڑھ رہی تھیں۔

وہ سوچتے ،سوچتے خیالوں میں اپنے گھر جا نکلی جہاں امی، ابو اور دو شرارتی سے بھائی اس کے منتظر تھے۔ ابو جی نے آج پیپر کے فوراً بعد آنے کے لیے کہا تھا اور اس ہفتے وہ اس سے مل کر بھی گئے تھے۔ امی نے اس کے لیے کچھ چیزیں بھیجی تھیں ان کی محبت محسوس کر کے اس کا دل شاد ہوگیا تھا۔ شور کی آواز پر اس کا دھیان ہٹا تو دیکھا کہ ہاسٹل کے مین گیٹ سے ایک پولیس جیپ اندر داخل ہوئی تھی اور وارڈن کے آفس کے ساتھ بنے ڈرائیووے پر چلتے ہوئے آفس کے مین گیٹ کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ اس کا دل بے ساختہ دھڑکا اس نے نیچے بیٹھی تمام لڑکیوں کو چونک کر وارڈن کے آفس کے پاس جمع ہوتے دیکھا۔ دفعتاً اس کی نگاہ پولیس کی گاڑی سے اترتی ایک لیڈی کانسٹیبل پر پڑی جس نے کھلے دروازے سے کسی کو ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور بازو سے پکڑ کر اسے گویا گھسیٹتی ہوئی آفس

کے اندر لے جانے لگی۔ گاڑی کے دوسرے دروازوں سے اس نے ایک اور لیڈی کانسٹیبل اور ایک پولیس والے کو بھی نکلتے دیکھا لیکن اس کی نظر گویا اس گھسٹتی لڑکی پر جم گئی جس نے بلیک کلر کا وہی سوٹ پہن رکھا تھا جو وہ کل اس وقت پہنے ہوئے تھے جب اس نے اسے اپنے ابا کے پاس بیٹھے دیکھا تھا۔

''صدف؟'' اس کے ذہن نے جھٹکا کھایا اور وہ بھاگ کر نیچے آئی، وارڈن کے آفس کے باہر اس وقت لڑکیوں کا جم غفیر تھا لیکن وہ اس ہجوم کو چیرتی ہوئی آگے بڑھی اور آفس کے کھلے دروازے کے آگے کھڑی لڑکیوں کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ جہاں پر ایک مرد کانسٹیبل کی آواز جو کچھ کہہ رہی تھی اس کو سن کر اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔

''آپ ہمارا یقین کیجیے میڈم صاحبہ! ہم رات پٹرولنگ پر تھے جب ایک سنسان کھڑی گاڑی میں سے کچھ آوارہ نشے کی حالت میں بگڑے امیر زادوں کے ساتھ اس لڑکی کو برآمد کیا۔ تو وہ بھی ایسی حالت میں کہ کوئی شریف آدمی اس حالت کا تصور کرنے سے پہلے مرجانا پسند کرے، تھانے لے جانے پر قانونی کارروائی کرنے میں صبح ہوگئی، وہ لڑکے تو معاشرے کے ٹھیکداروں کے سپوت تھے۔ جو صبح ہوتے ہی اپنے کرتا دھرتا اور پشت پناہی کرنے والے چند اونچے گھرانوں کے نام نہاد لوگوں کے ساتھ باعزت گھر کو سدھارے اور رہی یہ لڑکی پہلے تو اپنا اتا پتا بتانے پر تیار نہیں تھی پر جب سختی کی گئی تو اس نے اپنے گھر کا پتا بتانے کے بجائے یہاں کا ایڈریس دیا۔'' کانسٹیبل نے حقارت بھری نظروں سے صدف کو دیکھتے ہوئے کہا جو اس وقت وارڈن صاحبہ کی میز کے کنارے سر کو ایسے جھکائے کھڑی تھی کہ اس کا منہ ہی صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ کانسٹیبل نے وارڈن صاحبہ سے الوداعی کلمات کہے اور لیڈی کانسٹیبل کے ہمراہ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ ان کے جانے کے بعد وارڈن صاحبہ جو اپنی چیئر پر براجمان تھیں اور شاید حیرت اور پریشانی

سے صحیح صورت حال سمجھنے سے قاصر نظر آرہی تھیں۔ تیزی سے نکل کر سامنے آئیں اور صدف کو بہت بری طرح سے پیٹنا شروع کردیا۔ ساتھ، ساتھ ان کے منہ سے بے ربط جملے نکل رہے تھے جو ان کے غصے کو ظاہر کررہے تھے۔

''بے غیرت، بے حیا، وزٹ آورز میں مجھ سے ماموں کے گھر کا کارڈ بنوا کر گئی تھیں تو کیا وہ بے غیرت تمہارے ماموں تھے جن کی گاڑی سے تم نکلی تھیں۔ میری تیرہ سال کی نیک نامی کو ضائع کردیا، آوارہ لڑکی...... ارے میرا نہ سہی ان ماں، باپ کا ہی سوچ لیتیں جو غربت کی چکی میں پس کر اپنا پیٹ کاٹ کر نہ جانے کیسے اس ہاسٹل کے اور کالج کے اخراجات کا بندوبست کرپاتے ہوں گے۔'' غصے سے ان کی آواز کانپ رہی تھی۔

''فوراً اس کے بھائی کے نمبر پر کال کرکے اسے اور اس کے والد کو آنے کو کہو کہ ایمرجنسی ہے۔'' میڈم نے اس کو مارنا چھوڑ کر ہانپتے ہوئے اپنی اسسٹنٹ مس عارفہ کو کہا جو پاس ہی ان کے لیے پانی کا گلاس لیے کھڑی تھیں۔ نمرہ ایک دم ہوش میں آئی اور اس بھیڑ سے باہر نکلتی چلی گئی، اس کو پتا ہی نہیں تھا کہ آنسو تیزی سے اس کا چہرہ بھگو رہے تھے۔ وہ تیز، تیز چلتی جارہی تھی اور سوچتی جارہی تھی کہ جب صدف کے والد اور بھائی ایمرجنسی کا سن کر پریشانی میں بھاگے چلے آئیں گے کہ صدف ٹھیک ہو اسے کچھ ہو نہ گیا ہو، آنے پر جب اس صورت حال کا پتا چلے گا تو شاید وہ باپ اور بھائی پھر کبھی دنیا والوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہ کرسکیں اور نہ ہی گردن اٹھا کر چل سکیں گے اور سوچیں گے کہ کاش صدف کسی.... ایمرجنسی میں مر کیوں نہ گئی جس نے ان کے لاڈ پیار کا یہ نتیجہ دیا تھا۔ نمرہ ان چہروں پر آنے والی بے بسی، شرم نہیں دیکھنا چاہتی تھی سو تیزی سے ہاسٹل کے اندرونی حصے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

✻

''نہیں، نہیں...... آج میں تمہیں ڈنر کے بغیر نہ جانے دوں گا...... ہم نے آج تک کہیں اکٹھے جا کر کھانا نہیں کھایا، آج تو تمہیں چلنا ہوگا......'' سلطان ضد کرنے لگا۔

''مائی ڈیئر...... پلیز ضد نہ کرو، مجھے مجبور نہ کرو...... تمہیں پتا ہے کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ مجھے ہر حالت میں مام اور ڈیڈ کے ساتھ ڈنر ٹائم پر گھر موجود ہونا ہوتا ہے ورنہ قیامت آجاتی ہے۔ ڈیڈ چیزیں اٹھا، اٹھا کر دیواروں پر مارنا شروع کر دیتے ہیں۔'' میگل

کب آؤ گے

نیلم احمد بشیر



نے گیلی ریت میں اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے گول دائرے بناتے ہوئے کہا۔

ایک سینڈ پائپرز کا جوڑا اپنی چونچ میں ننھی منی مچھلیاں تھامے اُن کے بالکل قریب آیا اور پھر پھڑ پھڑا کر اُڑ گیا۔

''لیکن کیا مجھ سے پہلے تمہیں کبھی کوئی ڈنر ڈیٹ پر نہیں لے کر گیا ہوگا...... میں نہیں مانتا میگل۔'' سلطان نے اسے شرارتی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

''ہائی اسکول کے زمانے میں جب میرے لیے لڑکے گھر آ کر مجھے ڈیٹ پر لے جانے کی اجازت مانگتے تو ڈیڈی ان کے ساتھ اتنا توہین آمیز سلوک کرتے کہ وہ بیچارے جاتے اور پھر کبھی ہمارے گھر کا رخ نہ کرتے۔ ہمارے اسکول میں فنکشن ہوتے، ڈانسز ہوتے لیکن روایت کے مطابق مجھے کبھی کوئی لڑکا کروساج کا پھول لگانے نہیں آسکا، میں ہمیشہ تنہا اور الگ تھلگ رہی ہوں۔''

''لیکن تمہارا باپ تم پہ اتنا زیادہ کنٹرول کیوں رکھتا ہے۔ یہ تو زیادتی لگتی ہے۔'' سلطان نے پوچھا۔

''بس ڈیڈ میرے معاملے میں بہت پوزیسو ہیں، بچپن سے ہی مجھ سے بے انتہا پیار کرتے ہیں۔ ایک پل کے لیے اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے نہیں دیتے۔''

سلطان خاموش ہوگیا۔ شام ہونے کو تھی اس لیے بہت سے آبی پرندے ڈاریں بنا کر گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ میگل اور سلطان ٹہلتے ٹہلتے بیچ کے کافی سنسان علاقے میں نکل آئے تھے۔ یک دم میگل نے گھڑی دیکھی، ساڑھے سات بج چکے تھے۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔

''میں چلتی ہوں، اچھا میرے دوست مجھے گڈ بائے بھی نہیں کہو گے؟ ناراض ہو گئے؟''

وہ بت بنا کھڑا رہا، کچھ نہ بولا۔

''کل تین بجے اسی بڑی چٹان کے نیچے مجھے ملنا...... ڈیڈ اس وقت گولف کھیلنے جائیں گے اور مام نیچے ریسپشن ڈیسک پر مصروف ہوں گی۔ میں سوئمنگ کرنے کے بہانے کھسک آؤں گی۔''

سمندر کی ایک بڑی سی لہر دور سے زور شور سے آتی نظر آئی اور پاس آ کر میگل کے قدموں میں دم توڑ گئی۔

سلطان اس کے جانے کے بعد کتنی ہی دیر وہاں ایک ننھے سے ٹیلے پر بیٹھا اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ اس کے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ حالانکہ اس میں بظاہر کوئی ایسی خاص بات بھی نہیں تھی کہ اسے دیوانہ کر دیتی۔ گورے چٹے رنگ اور سمندر جیسی نیلی آنکھیں تو اس نے اور امریکی لڑکیوں کی بھی دیکھ رکھی تھیں لیکن اسے میگل کے اندر ایسی معصومیت اور سچائی محسوس ہوئی تھی کہ وہ اس کی طرف کھنچتا ہی چلا گیا تھا۔ میگل نے بھی اس کی محبت کا جواب محبت سے ہی دیا تھا اور اب اپنے سارے دکھ درد اس کی جھولی میں ڈال دینے کو تیار ہو گئی تھی۔

ان کی ملاقات بھی بس یونہی سرِ راہ چلتے، چلتے ہوگئی تھی۔

سلطان پاکستان شپنگ کمپنی کے شپ شاہین میں ایک نیول آفیسر تھا۔ ان کے جہاز کا cape cod کے خوب صورت ساحل پر دو ماہ رکنے کا پروگرام تھا لیکن ان کی روانگی میں اب کچھ تاخیر ہو رہی تھی۔

کیپ کاڈ امریکا کے مشہور شہر بوسٹن کے پہلو میں بسنے والا ایک چھوٹا سا ساحلی گاؤں ہے جہاں دنیا بھر سے سیاح اس کے پانیوں میں فشنگ کرنے اور اس کے اینٹیک سامان والی چھوٹی، چھوٹی آرٹسٹ دکانوں میں سووینئر شاپنگ کے لیے آتے رہتے ہیں۔ موسم گرما جب چاروں طرف بہت سے خوب صورت پھول اور شگوفے کھلا دیتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے قدرت نے پینٹنگ کرنے کے بعد بے خیالی میں رنگوں بھرا برش کیپ کاڈ کے علاقے پر جھٹک دیا ہو۔ ہر طرف رنگ و بُو کا ایک سیلاب سا نظر آتا ہے انہی ساحلوں پر سلطان کو جاگنگ کرتے، کرتے میگل نظر آ گئی تھی۔ وہ سیپیاں، گھونگے تلاش کرتی اکیلی ہی ساحل پر ننگے پاؤں چلتی چلی جا رہی تھی۔ کچھ لمحوں بعد وہ پانی میں لنگر انداز دور

کھڑے بحری جہازوں کو دیکھنے لگی جو دور سے بڑے دلکش دکھائی دیتے تھے۔ چند ہی ملاقاتوں میں وہ ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ سلطان کو معلوم ہوا کہ میتھل کے ماں، باپ اپنی سمر کاٹیج کے کمرے کرایے پر چڑھا کر اپنی گزر بسر کرتے ہیں۔ ان کا بلومون نامی کاٹیج بیلوں سے ڈھکا بہت خوب صورت تھا اور اسی لیے ٹورسٹوں کے لیے کشش کا باعث بنا رہتا تھا۔

''یہ سب میرے باپ کی لینڈ اسکیپنگ سینس کا نتیجہ ہے۔'' ایک دن میتھل اسے بتانے لگی۔ ''میرے باپ کو خوب صورت چیزیں بہت پسند ہیں۔''

''تم کبھی یہ تم میرا باپ، میرا باپ کہہ کر کیوں ان کا ذکر کرتی ہو؟'' سلطان نے اس کے انداز میں کچھ طنز محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

''ارے یہ تمہارا نام سلٹن (سلطان) کیوں ہے؟ کیا تم کہیں کے راجا ہو یعنی کنگ؟'' میتھل نے بات بدل دی۔

''یہ تم نے کیسے سوچ لیا؟'' سلطان ہنس پڑا۔

''بھئی سلٹن تو فلموں میں ہوتے ہیں ناں...... وہی جو موتیوں والی ٹوپیاں پہنتے اور بڑے گلیمرس ملبوس میں.... موو مجمل کرواتے نظر آتے ہیں۔'' میتھل بھی مسکرانے لگی۔

''ایک تو تم امریکنوں کی جنرل نالج بہت کمزور ہوتی ہے۔ بھئی میں کہیں کا کنگ نہیں ہوں، پاکستان میری کنٹری ہے، یونو...... بتایا تو ہوا ہے میں نے تمہیں۔''

پھر سلطان نے اس کو پاکستانی کلچر کی باتیں بتانا شروع کر دیں تو وہ بھی اس کی باتیں دلچسپی سننے لگی۔

شروع، شروع میں تو سلطان یونہی وقت گزاری کے لیے اس کے ساتھ گپ شپ کرتا رہا لیکن آہستہ، آہستہ اسے وہ بہت اچھی لگنے لگی۔ اتنی اچھی کہ اگر کوئی بھی دن اسے ملے بغیر گزارنا پڑ جاتا تو وہ غصے سے کہنے لگتا۔

''کل تم نہیں ملیں ناں، کل کا دن میں نے اپنی زندگی کے کیلنڈر سے کاٹ دیا ہے۔'' تب وہ اپنی پیاری باتوں سے اسے منا لیتی اور اپنی گھریلو مجبوریاں سمجھانے کی کوشش کرتی۔ اس کا باپ اس کی کڑی نگرانی کرتا تھا اور وہ اس کی مرضی کے خلاف چلنے کی طاقت خود میں نہیں پاتی تھی۔ میتھل نے اس کے ساتھ ڈنر پر جانے سے انکار کر دیا تو سلطان بہت بیزاری محسوس کرنے لگا۔ اس نے اپنے عملے کے ایک دوست جمیل کو ساتھ لیا اور ویسٹ و ہارف کے ایک سی فوڈ ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے کی نیت سے جا پہنچا...... یہ ریسٹورنٹ اپنے شرمپ سوپ کی وجہ سے سارے کیپ میں نمبر ون سمجھا جاتا تھا۔ کھڑکی سے نظر آتے سمندر کے نظارے سے اکتا کر جب سلطان نے نظر گھما کر پیچھے ٹیبلو کی طرف دیکھا تو اسے میتھل اپنے ماں، باپ کے ساتھ کھانا کھاتی نظر آئی۔ وہ بے اختیار بلا سوچے سمجھے اٹھ کر انہیں ہیلو کہنے جا پہنچا۔

''ہیلو مسٹر اینڈ مسز ملر میرا نام سلطان خان ہے۔ میں میتھل کا دوست ہوں۔'' اس نے خوش دلی سے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

میتھل کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔ اس نے نظریں جھکا کر جلدی، جلدی سوپ پینا شروع کر دیا۔

مسز ملر نے کمزوری آواز نکال کر جواباً ہیلو کہا اور ہلکا سا مسکرائی مگر مسٹر ملر اسے مکمل طور پر نظر انداز کر کے بیرے کو مزید بیئر لانے کا آرڈر دینے لگ گئے۔

سلطان اپنی ٹیبل پر لوٹ آیا۔

''چھوڑ یار، یہ امریکی بھی تو نسل پرست اور متعصب ہوتے ہیں تو اس لڑکی کے لیے خواہ مخواہ ذلیل ہو رہا ہے۔ ایک سے ایک گوری بھری پڑی ہے اس دیس میں... اس میں ایسی کیا خاص بات ہے۔ ویسے بابا مجھے تو آئندہ اس کے باپ کے پاس جانے کی جرأت نہ ہوگی...... دیکھا نہیں کتنا موٹا تازہ پلا ہوا ہے کمبخت......'' جمیل اسے ہنسانے لگا۔

سلطان کو میتھل کئی روز نہ نظر آئی۔ وہ بے چینی سے اس کے فون کا انتظار کرتا رہا۔ اس کے کاٹیج کے آگے جاگنگ بھی کی۔ صرف اس خیال سے کہ شاید وہ اسے

دکھائی دے جائے مگر وہ نہ جانے کہاں چھپ گئی تھی۔
''کہیں وہ کسی مشکل میں نہ ہو، کہیں بیمار نہ ہو۔''
ایک دن یہی سوچ کر وہ بلومون کاٹیج کے اندر چلا گیا۔ مسز ملر کسی گاہک کو کمرے کی چابی دے کر رخصت کرتے ہی اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔
''کیا میں میبل سے مل سکتا ہوں؟ آئی ایم ہر فرینڈ...... سلطان۔''
''میبل تم سے نہیں مل سکتی، تم یہاں سے جا سکتے ہو۔'' مسز ملر رجسٹر پہ جھک گئیں۔
''لیکن کیوں؟ ہم صرف دوست ہی نہیں ہیں۔ ایک دوسرے کو چاہتے بھی ہیں۔'' سلطان کے منہ سے خود بخود ہی نکل گیا۔
''میں جانتی ہوں اور یہی تو پرابلم ہے... وہ بےوقوف لڑکی ایک اجنبی سے محبت کرنے لگی ہے جو خدا جانے کس دور دراز سیارے سے تعلق رکھتا ہے؟'' اس نے متعصبانہ لہجے میں طنز کیا۔
سلطان کو غصہ تو بہت آیا لیکن ضبط کر گیا۔
''دیکھو ینگ مین...... تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔'' مسز ملر کی آواز گلوگیر ہوگئی اور وہ خوفزدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔
''میں جانتی ہوں تم ایک اچھے آدمی ہوں۔ میبل نے مجھے تمہارے بارے میں سب بتا دیا ہے لیکن سوری میں مجبور ہوں۔ میبل کا باپ بہت سخت طبیعت کا مالک ہے۔ وہ میبل کو اتنا چاہتا ہے کہ وہ اس کو ایک پل کے لیے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے نہیں دیتا۔''
''لیکن آپ انہیں سمجھائیں...... یہ تو ٹھیک نہیں ہے۔'' سلطان کی بات نے اس کے لبوں پر ہی دم توڑ دیا کیونکہ اس نے میبل کو سیڑھیوں سے ہولے، ہولے نیچے آتا دیکھ لیا تھا۔
''ارے یہ تم نے اپنی کیا صورت بنا رکھی ہے۔'' سلطان اس کے پاس چلا آیا کیونکہ میبل کی حالت سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کئی راتوں سے نہ سوئی ہو، نہ کپڑے بدلے ہوں۔
وہ سلطان کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر سیڑھیوں پر الٹے قدموں لوٹنے لگی۔
''میبل رکو...... میں تم سے ایک ضروری بات کرنے آیا ہوں۔'' وہ ایک سیڑھی اتر کر نیچے کھڑا ہوگیا۔ میبل رک گئی۔
سلطان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
''تمہیں پتا ہے ہماری زبان میں میبل کو مشال پروناؤنس کرتے ہیں اور اس کا مطلب ہے راستہ دکھانے والی روشنی، میں تم سے اپنی زندگی میں روشنی کرنے کا خواہش مند ہوں۔'' پھر سلطان گھٹنوں کے بل بیٹھ کر روایتی وکٹورین اسٹائل میں میبل کے ہاتھ پر بوسہ دے کر مسکرا دیا۔ ''ول یو میری می میبل...... آئی لو یو۔''
''آر یو شیور؟'' میبل دم بخود رہ گئی...... اس نے سلطان کا ہاتھ گرم جوشی سے دبا دیا۔
''یس، آئی ایم شیور...... میں تمہیں یہاں سے اپنے ملک لے جاؤں گا۔ میرے والدین پہلے پہل تو نہیں مانیں گے لیکن بالآخر میری خوشی کے آگے انہیں ہتھیار ڈالنے ہی پڑیں گے۔'' سلطان جذبات کی رو میں بہہ کر بولتا چلا جا رہا تھا۔
میبل کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔
''ایسا نہیں ہوسکتا...... تم مجھ سے شادی نہیں کرسکتے۔ میں تم سے شادی نہیں کرسکتی۔''
''کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں؟'' سلطان اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔
''نہیں، نہیں مجھے تم سے محبت نہیں بلکہ نفرت ہے۔'' میبل چیخ چیخ کر جھوٹ بولنے لگی۔
سلطان حیرت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا جس طرف میبل دیکھ رہی تھی۔ وہاں اس کا کیم شحیم قوی الجثہ باپ نیچے کھڑا ان دونوں کو خشمگیں نگاہوں سے گھور رہا تھا۔
''گیٹ آؤٹ آف ہیئر......'' وہ چنگھاڑا۔
''میری بات تو سنیں مسٹر ملر......'' سلطان نے

آرام سے بات کرنے کی کوشش کی۔

''گیٹ آؤٹ، ورنہ میں پولیس کو فون کر دوں گا اور کہوں گا کہ یہ شخص میری بیٹی کو ہراساں کر رہا ہے۔''

سلطان وہاں سے خاموشی سے چلا تو آیا مگر اس کے دل و دماغ میں طوفان سے اٹھ رہے تھے۔ اسے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میبل اپنے ماں، باپ کے آگے اتنی کمزور کیوں پڑ جاتی تھی۔ وہ کوئی مشرقی مجبور لڑکی تو نہیں تھی مگر پھر بھی اپنی ذاتی خوشیوں کو قربان کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

اب تو اس کا کیپ کاڈ جیسی خوب صورت جگہ سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا بحری جہاز جلد سے جلد وہاں سے آگے کو روانہ ہو جائے تاکہ وہ میبل سے وابستہ تلخ یادیں اپنے ذہن سے جھٹکنے میں کامیاب ہو سکے۔

موسم بدلتے ہی میپل (Maple) اور (oak) اوک کے درختوں کے پتوں نے رنگ برنگے لباس پہننے اور پھر اتار پھینکنے شروع کر دیے۔ اس کے بحری جہاز میں کچھ خرابی ہو گئی تھی جس کے لیے بڑے پیمانے پر مرمت کی ضرورت تھی۔ سلطان اب ساحل پر جاگنگ نہیں کرتا تھا وہ جہاز کے ڈیک پر ہی چہل قدمی کر لیا کرتا تھا۔

رات کو سیاہ پانی کی بے چین لہروں کی آہیں سنتے، سنتے وہ اداس ہو جاتا۔ ایسے میں اگر چاند بھی آسمان پر جگمگا رہا ہوتا تو اس پر جنون اور یاسیت کا دورہ سا پڑ جاتا۔ چاند جب خوش دکھتا تو سلطان کا جی چاہتا کہ لپک کر اس چمکتے ماہتاب کو بجھا دے۔ اس کا منہ نوچ ڈالے۔ آسمان پہ جلتے ننھے، ننھے دیوں کو اس اداس لڑکی کی ہتھیلیوں پر یوں سجا دے کہ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

(Hallowe'en) ہالووین کی وہ رات بھی ایسی ہی ایک رات تھی۔ سارے شہر میں ہالووین تہوار کی تیاریاں کئی ہفتوں سے ہو رہی تھیں۔ جگہ، جگہ نارنجی اور کالی ڈیکوریشنز لگی ہوئی تھیں۔ اکتیس اکتوبر کی یہ

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماء راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

رات سب کے لیے بہت محظوظ کن رات ہوتی ہے۔
اب کی بار یہ ویسے ہی جمعہ کو آرہی تھی۔ اس لیے سب لانگ ویک اینڈ منانے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔
روایتی طور پر یہ ایک مذہبی شام ہوا کرتی تھی۔ یعنی (the eve of all saints) جسے پہلے پہل بڑا مقدس سمجھا جاتا تھا لیکن موجودہ زمانے میں اب یہ صرف ایک شغل منانے والی رنگا رنگ شام بن کر رہ گئی ہے۔ اس رات چڑیلوں، بدروحوں کا زمین پر اترنا تصور کرلیا جاتا ہے۔ بچے بڑے سرِ شام مختلف کاسٹیوم پہنے، ہاتھوں میں ننھی منی ٹوکریاں، بیگ لیے گھر گھر جا کر دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں اور دروازہ کھلنے پر مخصوص سوال کرتے ہیں۔ trick or treat جس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ کیا آپ کوئی ٹریٹ دیں گے؟ اگر نہیں تو بدلے کے طور پر ہماری کسی ٹرک، کسی شرارت کے لیے تیار ہو جائیں۔ عموماً دروازے پر آنے والے کو خالی ہاتھ نہیں لوٹایا جاتا بلکہ ٹافیاں، کینڈیاں، پھل وغیرہ دے کر رخصت کردیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی کچھ شر پسند دوسروں کو نقصان پہنچانے کے لیے حرکتیں بھی کر جاتے ہیں۔ کچھ گھٹیا مثلاً کسی کے گھر کی کھڑکیاں توڑ ڈالیں، ٹافیوں کی جگہ پتھر رکھ دیے یا سیب میں بلیڈ چھپا کر گھسا دیا مگر زیادہ تر ایسا نہیں ہوتا۔ ناخوشگوار واقعات کم ہی ہوتے ہیں۔
شہر میں (Hallowe'en) ہالووین کی پریڈ ہونے جارہی تھی۔ اسی لیے دکانیں بند پڑی تھیں۔ لوگ مین اسٹریٹ پر کرسیاں ڈالے دلچسپ پریڈ سے محظوظ ہو رہے تھے۔ بچوں نے زیادہ تر سپر ہیروز کے کاسٹیوم پہن رکھے تھے۔ کوئی سپر مین تھا تو کوئی بیٹ مین، کوئی اسپائیڈر مین تھا تو کوئی ونڈر ویمن...... نوجوان لڑکے زیادہ تر ٹی وی اور فلموں کے کرداروں کی طرح ڈریس اپ ہوئے نظر آرہے تھے۔
لڑکیوں کے ایک ٹولے میں سے گزرتی ہوئی میثل کو دیکھ کر سلطان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ اس کی سہیلیوں میں سے کوئی شیر اپرکس آف پاور بنی ہوئی تھی، کوئی میڈونا اور کوئی مشہور راک سنگر پالا عبدل کا روپ دھارے ہوئے تھی۔
میثل اسنو وہائٹ کا سفید لباس پہنے واقعی ایک اسٹوری بک کیریکٹر کی طرح کسی اور دنیا کی مخلوق نظر آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹوکری تھی جو اس نے سیبوں سے بھر رکھی تھی۔
”میثل، میثل......“ سلطان نے اسے پاس سے گزرتے دیکھ کر آواز دی۔
وہ بے تاب ہو کر پلٹی۔ سلطان کو دیکھ کر ایک اداس مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ بغیر کچھ کہے اس نے اپنی ٹوکری میں سے ایک سیب نکالا اور سلطان کو تھما کر آگے چلنے ہی والی تھی کہ سلطان نے اسے کھینچ کر ایک جھاڑی کی اوٹ میں کرلیا۔
”میثل آئی لو یو...... میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ سلطان نے اپنا سوال دُہرا دیا۔
میثل نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی مشعل کو پھونک کر مار بجھا دیا۔ اندھیرا ہوگیا تو اس نے اپنے بازو پھیلا دیے اور سلطان کے سینے سے لگ کر سسکنے لگی۔
”مجھے یہاں سے لے جاؤ...... کہیں دور...... اپنے دیس، اپنے پاس رکھنے کے لیے۔“ سلطان کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس نے میثل کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے اور قریب کر کے دیکھا...... مگر دوسرے ہی لمحے کچھ محسوس کر کے اس نے میثل کو ایک جھٹکے سے اپنے سے علیحدہ کردیا۔ میثل کا جسم پہلے سے مختلف تھا۔ اس کے پیٹ کا ننھا سا ابھار نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔
”یہ کیا ہے میثل......؟“ اس نے اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے طنزیہ زہریلے لہجے میں پوچھا۔ ”کیا ہالووین کے لیے تم نے کوئی سوانگ بھرا ہے؟“
ایک برفیلی ہوا کے جھونکے نے پاس سے گزرتے ہوئے زور سے سسکی لی۔
میثل نے اپنے پیٹ پر بڑے آرام سے ہاتھ پھیرا۔ کچھ لمحے وہیں ساکت کھڑے رہنے کے بعد

یکلخت اس نے اپنا اسنو وہائٹ والے خوب صورت سفید لباس کی آستین جسم سے نوچ کر علیحدہ کردی۔

اس کی گوری جلد پہ جابجا نیلے کالے نشان تھے، کچھ پرانے زخم مندمل ہوتے نظر آرہے تھے، اتنا داغدار مجسم دیکھ کر سلطان چیخ اٹھا۔

''یہ سب کیا ہے؟ کس نے کیا ہے؟'' وہ پسینے، پسینے ہورہا تھا۔

میتل ہنسنے لگی۔ اس کی دیوانہ وار ہنسی نے سلطان کو پریشان کردیا۔ وہ نظریں ہٹانے پہ مجبور ہوگیا۔

''تمہیں تو مجھ سے محبت ہے ناں...... میری ذات سے دلچسپی ہے ناں...... تو تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔ محبت تو subjective چیز ہوتی ہے۔ تم اپنا کام کرو...... مجھ سے شادی کرو، جیسا کہ تم چاہتے ہو اب میں نے تو ہاں کردی ہے۔ کرو گے شادی؟ کرو گے؟ ہمت ہے؟'' وہ پھر قہقہے لگانے لگی۔

''میتل؟ یہ کیا بے ہودگی ہے؟'' نہ جانے کہاں سے نمودار ہونے والے مسٹر ملر نے اسے ایک زوردار تھپڑ رسید کیا تو وہ ایک اور جھاڑی پر جاگری۔ اس کے پرانے زخموں سے نیا خون رسنے لگا۔

میتل وہیں گری رہی۔ اٹھی ہی نہیں۔

سلطان...... میٹ مائی چائلڈز فادر۔'' اس نے اپنے باپ کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی ماں بھی بھاگتی چلی آئی۔ وہ دونوں بھی غالباً پریڈ دیکھنے آئے ہوئے تھے اور میتل کو اس کی سہیلیوں کے ساتھ نہ دیکھ کر اسے ڈھونڈنے چلے آئے تھے۔

''اوہ مائی بے بی...... مائی پور بے بی......؟''

مسز ملر اسے سینے سے لگا کر رونے لگی۔

سلطان دوڑنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے ہالووین کی اس رات کو اترنے والی ساری چڑیلیں، بدروحیں اس ہی کے تعاقب میں ہوں۔ خوفناک بھوت اسے پکڑنے کو لپک رہے ہوں۔ شعلے اسے چاٹنے کو لمبی، لمبی زبانیں باہر نکال رہے ہوں۔

شپ کے کیبن میں بیٹھے، بیٹھے اس نے ساری رات جاگ کر بتادی۔ ٹیبل پر رکھے اس سیب کو گھورتا رہا جو میتل نے اسے ٹریٹ کے طور پر دیا تھا۔ اسے لگا جیسے اس میں ایک تیز دھاری بلیڈ چھپا اس کے لبوں کو لہولہان کرنے کو بے قرار ہو۔

صبح ہوتے ہی اس کے ساتھی جمیل نے اسے خوشخبری سنائی کہ جہاز روانہ ہونے والا ہے۔ ان کا اگلا اسٹاپ فلوریڈا کی گرم ریاست تھا۔ جمیل خود بھی کیپ کاڈ کی ٹھنڈ سے اکتا گیا تھا۔

شپ پہ روانگی کی تیاریاں کی جانے لگیں۔ سلطان بھی ٹوٹے دل سے سامان تیار کرنے لگا۔ جہاز ساحل سے دور ہوتا جارہا تھا۔

''وعدہ وفا کرنے کے لیے ہم لوگ جان پر بھی کھیل جاتے ہیں۔'' اس کی کبھی کی کہی بات میتل کو یاد آئی۔

''اس نے مجھ سے ہمیشہ پیار کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ یہ وعدہ نبھانے کے لیے ضرور واپس آئے گا۔ اس کے کلچر کے لوگ سچے اور پرخلوص ہیں۔''

مسز ملر کی طرف سے لکھا خط اسے دو سال بعد جمیل نے دیا تھا جب وہ دوبارہ کیپ کاڈ سے واپس جارہا تھا۔ خط میں لکھا تھا۔

''میتل کہتی ہے...... اگلے موسم گرما میں تو پاکستان شپنگ کارپوریشن کا جہاز ضرور ہی آئے گا کیونکہ وہ ہر سال آتا ہے۔ وہ اگلی گرمیوں تک پھر تمہارا انتظار کرے گی اور اس سے اگلی کئی گرمیوں تک بھی لیکن میں جانتی ہوں کہ تم اسے قبول کرنے نہیں آؤ گے۔ وہ یونہی کیپ کاڈ کے ویران بیچ پر بیٹھی ریت کے گھروندے بناتی بحری جہازوں کو تکتے، تکتے ایک دن تھک جائے گی۔''

سلطان سے مزید خط نہ پڑھا گیا۔ شپ کے ڈیک پر کھڑے ہوکر بہتے پانی کو تکتے، تکتے اس کی آنکھیں پتھرانے لگیں۔ کیپ کاڈ کا ساحل پیچھے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اس نے خط کا ایک گولہ سا بنایا اور بہتے پانی میں پھینک دیا۔ اسے وہ گولا دور تک تیرتا نظر آتا رہا۔ کیپ کاڈ کا ساحل پیچھے، بہت پیچھے رہ گیا تھا۔

ناولٹ

من جانبازم

سحر ساجد



آج بارش کی پیش گوئی تھی۔ موسم گرما اپنے جوبن پر تھا۔ شدید گرمی اور شدید تھا ہوا ایک اور دن خیالآلود سا۔ سڑکیں سنسان، بازار خالی...... یوں جیسے ہر ذی روح، ذی نفس، گرمی سے بے حال ہو کر کہیں چھپ گیا ہو۔

سورج اتنی آب وتاب سے چمکتا تھا کہ اس کی آب وتاب معافی مانگنے پر مجبور کرتی تھی۔ اس پیلی تیز دھوپ والے دن میں دور، اوپر نیلے آسمان پر ایک چیل گردش کر رہی تھی کہ جس کے بولنے کی آواز وقتاً فوقتاً گونجتی تھی۔ بار، بار



ابھرتی تھی اور بے حد کریہہ محسوس ہوتی تھی۔ خاموشی معمول سے بڑھ کر تھی لیکن اس دن محض گرمی ہی تو نہ تھی جو کہ یوں برس رہی تھی...... وہاں وحشت تھی، کوئی نامعلوم سی وحشت...... جو دھوپ کے ساتھ گھل گھل کر نیچے زمین والوں تک پہنچ رہی تھی۔ اسلام آباد ہائی وے کا کاک پل کہ جس پر ٹریفک شاذ ہی کم ہوتا تھا لیکن آج، آج وہاں بھی ٹریفک معمول سے کم نظر آ رہا تھا۔ دن، 12:30 بجے...... زوال کا وقت گزر رہا تھا۔

آج تو بارش کی پیش گوئی تھی۔

سڑک پر بھاری بھر کم ٹرالر...... ٹرک، لوڈرز سب ہی گاڑیاں گزر رہی تھیں، کچھ دوسری گاڑیاں اور ٹیکسیاں بھی تھیں، بسیں بھی، ہر دفعہ کسی گاڑی کے گزرنے کے ساتھ ہی اک زن کی سی آواز اٹھتی، گونجتی اور پھر خاموشی...... کوئی ٹرک گزرتا، فضا میں اس کے شور کی آواز ذرا دم رہتی اور پھر سے خاموشی...... کوئی مزدا، منی بس گزرتی اسٹاپ پہ چند لمحے ٹھہرتی کنڈیکٹر آوازیں لگاتا۔

”جاسو؟ (جانا ہے؟) جاسو (جانا ہے؟)“ کچھ سواریاں لپک کر اترتیں کچھ لپک کر چڑھتیں۔ مزدا پھر سے حرکت میں آتی۔ شور تمام ہوتا اور پھر سے خاموشی...... جبکہ آج بارش کی پیش گوئی تھی۔

اتنے خاموش، سنسان، ویران، ہیبت ناک دن میں، دور آسمان کے جنوبی کونے میں دفعتاً ایک نقطہ سا نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ہلکی سی مدھم سی...... دور سے آتی دھیمی سی گڑگڑاہٹ کی آواز...... جیسے، جیسے وہ نقطہ واضح ہو رہا تھا۔ ویسے، ویسے گڑگڑاہٹ کی آواز بھی بلند سے بلند ہوتی جا رہی تھی۔ لحہ بہ لحہ آواز شور میں بدلتی ہوئی اور شور کانوں کو پھاڑتا ہوا۔ وہ قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا اور پھر جیسے ہی وہ کاک پل کے قریب واقع رہائشی گاؤں کے آسمان پر نمودار ہوا تو وہاں کے باسیوں نے کیا دیکھا...... ہاں...... !بہت کچھ دیکھا؟

☆☆☆

پاکستان کی اٹھارہ کروڑ عوام اور اس اٹھارہ کروڑ عوام کا زیادہ تر حصہ ٹی وی کے آگے موجود تھا۔ ٹی وی چل رہے تھے اور لوگ ہاک چلتے پھرتے اپنے، اپنے کاموں میں مگن، کچھ دیکھنا ہو یا نہ دیکھنا ہو سن رہے ہوں یا نہ سن رہے ہوں مگر ٹی وی چل رہے تھے کچھ عام سے گھر تھے جہاں کی خواتین اسکول سے آنے والے بچوں کے لیے کھانا بنانے میں معروف تھیں، کچھ ایسے اشرافیہ کے گھر جہاں اس وقت یعنی دن ساڑھے بارہ بجے ناشتے کے نام پر جوس کا گلاس یا چائے کا کپ...... انگلش نیوز پیپر کا مطالعہ ہو رہا تھا۔ لیکن سب کے لاؤنج میں پلازما اسکرین ضرور آن تھیں۔ عام بازاروں میں......“ 19 کا پرانا ساڈبائی وی جس کے عین سر پر دھپ مارنے سے اس کی عقل ٹھکانے آتی تھی اور وہ ذرا سا ہڑبڑا کر پھر سے چلنا شروع کر ہی دیتا تھا۔ بڑے، بڑے شاپنگ پلازہ اور مالز میں روشن بڑے، بڑے ایل ای ڈی یا پلازما اسکرین...... سب ہی چل رہے تھے۔ ائرپورٹس کے لاؤنجز، کاروباری حضرات کے دفاتر میں ہوٹلز، ریستوران، لائرز چیمبرز اور کچھ مدارس میں بھی ہر جگہ ٹی وی آن تھے۔ ان سب چلتے ہوئے ٹی وی پر جہاں، جہاں نیوز چینلز آن تھے دن 1-20 بجے اک بریکنگ نیوز چلی تھی۔

”ناظرین ایک انتہائی افسوس ناک خبر آپ کو دیتے چلیں کہ......“ نیوز کاسٹر خبر سنا رہا تھا۔ ”آپ کو پھر سے خبر دیتے ہیں کہ......“ اور اس کے ساتھ ہی سرخ بیک گراؤنڈ کے اوپر سیاہ رنگ سے لکھی بریکنگ نیوز پڑھی جا سکتی تھی۔ سب چینلز کو ابھی کے ابھی خبر ملی اور طوفان برپا ہو گیا تھا۔ ایک سے بڑھ کر ایک نیوز رپورٹنگ اور رپورٹر، بار، بار سنسنی خیز انداز میں ایک ہی خبر بار، بار دُہرا رہے تھے تیز، تیز اور جوش سے بولتے ہوئے نیوز کاسٹرز منٹ، منٹ کی رپورٹنگ...... جائے حادثہ پر سب سے پہلے پہنچنے کے دعوے...... ایک طوفانِ بدتمیزی برپا ہو چکا تھا اور شاید یہ وہ واحد طوفان ہے جسے ساری عوام ڈٹ کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ کر دیکھتی ہے۔ سمندر کو کوزے میں بند کر کے اور پھر وہاں اک عدد سونامی برپا کر دینے کی...... بھرپور کوشش کی جا رہی تھی...... سارا کا سارا پاکستان یوں لگتا تھا کہ ہلا ہوا تھا اور غم زدہ بھی تو یقیناً تھا اور اگر عین اسی

وقت آپ کوئی ڈراما چینل لگالیں تو......؟اس خبر کو جہاں، جہاں بھی جس، جس نے بھی سنا، دیکھا اِک پل کو ٹھٹکا......ٹھٹک کر رکا اور رک کر اس خبر پر غور کیا......ذرا سا افسوس ہوا اور اس کا اظہار بھی ہوا اور پھر سے......دنیا چل پڑی اور اس طرح سے رواں ہوئی کہ جیسے رکے گی ہی نہیں......

''یہ ان کا غم تو نہیں تھا جو وہ ٹھہرتے......'' عام گھروں کے باورچی خانوں میں مصروف خواتین کے ہانڈیوں میں چلنے والے چمچ اِک پل کو ساکت ہوئے۔ وہ ذرا تیز قدموں سے چلتے ہوئے چمچ ہاتھ میں ہی لیے کچن سے باہر نکلیں، لاؤنج یا سٹنگ ایریا میں بہ آواز بلند چلتے ہوئے ٹی وی پر خبر سنی اور اِک پُراثر اور دردناک سی ہائے کہہ کر افسوس کا شدید ترین اظہار ہوا......کچھ زیادہ ہی جذباتی خواتین کے آنسو بھی بہہ نکلے......لیکن جیسے ہی نظر گھڑی پر پڑی تو......

اوہ......پپو، کامی، گڑیا، بہلو، مانی، چنٹو، گڈو جو بھی اسکول سے آنے والا، یا آنے والی ہوگی۔ بھوک کا کچا ہے یا کچی ہے، ذرا بڑی عمر کے بچوں کی ماؤں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ کالج سے آکر اسے کوچنگ کلاسز کے لیے جانا ہے، کھانا نہ ملا تو......اور بس......وہ سب خواتین پھر سے کچن میں غڑاپ ہانڈیوں میں چمچ پھر سے چلنے لگے۔ کچن میں کھانے کی خوشبو پھر سے چکرانے لگی اور ان کے ذہن خبر سے خالی ہوکر اپنے اپنے تفکرات سے بھرنے لگے۔

کہ یہ ان کا ''غم'' نہیں تھا۔ اور یہ کہ ''یہ زندگی نہیں رک سکتی تھی۔''

انگریزی اخبار پڑھنے والے جوس یا چائے کا گھونٹ بھرتے، بھرتے رک سے گئے اور بے اختیار پلازما اسکرین کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ والیوم اونچا کیا گیا......یوں ہی سپ پہ سپ بھرتے ہوئے نیوز سنی......دو تین چینلو بدلے اور "Oh very sad" کہہ کر پھر سے اخبار کی طرف متوجہ ہوگئے کہ ''زندگی نہیں رکتی۔''

''اور یہ کون سا ان کا غم تھوڑی ہی تھا؟'' بازاروں، دفاتر، اسپتالوں، ہوٹلز میں موجود انسانوں نے بھی کم و بیش ایسے ہی ردِ عمل کا اظہار کیا......زندگی کے سفر میں معمولی سا......ذرا سا، اک سیکنڈ کے ہزارویں حصے جتنا تعطل آیا اور وہ پھر سے چل پڑی۔ کبھی نہ رکنے کے لیے......زندگی چل رہی تھی، دوڑ رہی تھی۔ ہاں ملک کے اٹھارہ کروڑ عوام کی زندگی چل رہی تھی۔ لیکن......ذرا ٹھہریے اس اٹھارہ کروڑ عوام میں کئی نفوس ایسے بھی تھے کہ جن کی زندگی عین اسی لمحے، اسی پل میں، اِک زبردست سا جھٹکا کھا کر رک گئی تھی۔

''کہ یہ ان کا ہی غم تھا۔''

''جو کہ ان کے اوپر ڈھے پڑا تھا۔''

☆☆☆

ساڑھے تین سال کی مومنہ مجیب عالم......جو کہ مجیب عالم کی موی ہے اور ان کی پہلی اولاد ہے......نہایت صاف آواز میں باتیں کرتی ہے اور ہر پوچھے جانے والے سوال کا جواب ضرور دیتی ہے۔

جی ہاں......ساڑھے تین سال کی مومنہ مجیب عالم...... وہ اس طرح سے پٹر، پٹر بولتی اور فر، فر جواب دیتی کہ پوچھنے والا حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر ایک دفعہ تو ضرور ہی اسے دیکھتا اور سوچتا ہے کہ ''یہ انسانی مخلوق ہی ہے ناں......؟'' ساڑھے تین سال کی عمر میں یعنی کہ اس کی ہوش کی عمر میں پہلی بار مجیب عالم فلائٹ پر گئے تو اس نے ضد کر کے ماں سے فون ملوایا کہ بابا سے بات کرنی ہے۔ ماں نے چند بٹن دبا کر اسے بہلایا کہ دوسری طرف بابا بات کررہے ہیں، ذرا سنیں تو......وہ دوسری طرف موجود ''خیالی بابا'' سے کیا فرمائش کررہی ہے۔

''بابا! کیا فون میں تصویر نہیں آتی؟ جیسے ٹی وی میں آتی ہے۔ آپ مجھے ایسا فون دیں ناں بابا! جس میں آپ کی تصویریں بھی آتی ہوں اور آپ جہاں بھی ہوں گے میں آپ کو دیکھا کروں گی بابا......'' ماں پاس کھڑی اسے باتیں کرتے دیکھ کر مسکراتی رہی۔ وہ موی کی باپ سے محبت کے جنون سے بخوبی واقف تھی۔

''بابا اس میں آواز آتی ہے، تصویر کیوں نہیں آتی؟ ٹی وی پر تو تصویریں بھی ہوتی ہیں اور آواز بھی......'' گل

اب کہ ذرا قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھیں۔

"ممی! بابا بول نہیں رہے۔" اب کی بار اس نے منہ بسور کر کہا تھا۔ ممی نے آرام سے اس کے ہاتھ سے ریسیور لیا اور روٹری فون کے کریڈل پر رکھا۔

"ابھی بابا مصروف ہیں ناں...... وہ مومی کی آواز سن رہے ہیں مگر ابھی جواب نہیں دے سکتے۔ تو جب بابا فارغ ہو جائیں گے تو تب ممی اور مومی سے بات کریں گے، ٹھیک ہے۔" ممی نے اسے گود میں اٹھاتے ہوئے پچکارتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے!" ذرا سی مایوسی سے لٹکے ہوئے منہ کے ساتھ جواب آیا تھا۔

"ممی! کیا فون ریڈیو کی طرح ہے؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"آں...... نہیں تو؟" ممی ذرا پریشان ہوئیں۔

"ریڈیو میں بھی بس آوازیں آتی ہیں، فون میں بھی بس آواز آتی ہے۔ تصویر نہیں آتی تو فون، ریڈیو کی طرح ہوا ناں ممی......" "لیں جی! ہو گیا شروع مومی کا سوال نامہ۔ ممی نے آئیں بائیں شائیں کرتے ہوئے ٹالنے کی کوشش کی۔ مومی تھوڑی دیر تک عظیم فلاسفروں کو مات دیتی، سوچ میں غرق نظر آئی۔ اس کے یوں خاموش ہونے پر گل نے شکر ادا کیا تھا کہ وہ بہل گئی تھی لیکن وہ جتنی بہلی تھی اس کا اندازہ اس کے اگلے سوال سے ہی ہو گیا تھا۔

"ممی! ٹی وی کے اندر سچ والے لوگ ہوتے ہیں کیا؟ وہ ٹی وی کے اندر کیسے جاتے ہیں؟" اور گل نے زچ ہو کر مومی کو دیکھا تھا۔ وہ مومی کے فلسفیانہ سوالات کے جواب دینے سے قاصر تھیں۔ یہ اعجاز اس کے بابا کو ہی حاصل تھا۔ اور بابا تو فلائٹ پہ تھے تو ممی کی خیر نہیں تھی۔ بالکل بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

موسم گرما سال 2009ء یہ ایک فوجی بیس کیمپ تھا۔ جبل الدخان دو آزاد ملکوں کے درمیان واقع سرحدی علاقہ۔ اس وقت ایک فوجی جیپ اور فوجی ٹرک سست رفتاری سے چلتے ہوئے...... جو چلتے کم اور جھولتے زیادہ تھے کہ یہ ایک پہاڑی علاقہ تھا۔ وہ ٹرک اور جیپ اس وقت بیس کیمپ کی طرف جا رہے تھے جو کہ جبل الدخان پہ واقع تھا۔ ٹرک میں فوجی سپاہی سوار ہیں اور جیپ میں اعلیٰ افسر موجود ہیں۔ وہ ایک کارروائی سے فارغ ہو کر بیس کیمپ کی طرف جا رہے ہیں۔ وہ سب خوش گپیوں میں مصروف تھے اور مطمئن سے زیادہ خوش دکھائی دیتے تھے۔ جیپ کو ڈرائیو کرنے والے دو مضبوط مردانہ ہاتھ جو کہ مضبوطی سے اسٹیرنگ کو پکڑے ہوئے تھے۔ جیپ آہستہ، آہستہ بل کھاتی ہوئی چل رہی تھی۔ فوجی فیلڈ ڈریس کی گہرے مونگیا رنگ کی پلین ٹی شرٹ اور مخصوص فوجی ٹراوزر سر پر فوجی پی کیپ اس کے چہرے پر سختی کا تاثر بے حد نمایاں تھا اور جب وہ ساتھ بیٹھے میجر کی کسی بات پر مسکراتا تو یہ تاثر ذرا سا کم پڑتا دکھائی دیتا...... اس کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے اور وہ کئی راتوں کا جاگا ہوا محسوس بھی ہوتا تھا مگر پھر بھی یہ چیز اس کی شخصیت کے مجموعی تاثر کو متاثر کرنے میں ناکام نظر آتی تھی ساتھ بیٹھے میجر نے اسے کوئی اشارہ کیا تھا...... اس نے ڈرائیو کرتے، کرتے لگا سا میجر کی جانب جھک کر اس کی بات سنی تھی اور پھر الٹے ہاتھ کی بند مٹھی کی پشت منہ پر رکھ کر بے ساختہ ہنسا تھا۔ یوں جیسے یوں منہ پر ہاتھ رکھ کر وہ ہنسی کو کنٹرول کرنا چاہتا ہو اور ابھی...... عین اسی وقت کہ جب وہ مسکرا رہا تھا تو...... اچانک......

"زوں......" کی سی ایک تیز برق جیسی آواز......

اور اس کے ساتھ ہی کسی چیز نے جیپ کو ہٹ کیا تھا اور اس بری طرح سے ہٹ کیا تھا کہ جیپ اچھل کر بلندی سے......رول ہوتی ہوئی نیچے گرتی جاتی تھی۔ اس کے بعد حملہ فوجی ٹرک پہ ہوا وہ یکے بعد دیگرے راکٹ لانچر سے فائر کیے جانے والے دو راکٹ تھے جنہوں نے بالترتیب جیپ اور ٹرک کو نشانہ بنایا تھا۔ ٹرک میں اک دھما کا ہوا اور آگ بھڑک اٹھی۔ انسانی وجود پتنگوں کے مانند بھڑ بھڑ جلنے لگے۔ کئی چیخیں ایک دم ایک ساتھ فضا میں بلند ہوئیں۔ کئی فوجیوں نے آگ لگے وجود کے ساتھ ٹرک سے چھلانگ لگا دی۔ اک بے اختیاری حرکت اور تڑپتے ہوئے لڑھکتے ہوئے بلندی سے نیچے

گرنے لگے۔

اور پھر جسم ٹھنڈے ہو جانے کے بعد بھی جلتے رہے۔

کچھ کو اتنی بھی مہلت نہیں ملی اور وہ وہیں آگ میں ہی...... اور وہ جیپ، اس میں بھی آگ بھڑک چکی تھی اور وہ بل کھاتی، لڑکھڑاتی نیچے جا گری تھی۔ اس میں موجود پانچ افراد۔ وہ پانچ افراد وہ زندہ کیسے رہ سکتے تھے بھلا؟

اور وہ...... وہ جو جیپ کو چلا رہا تھا۔ وہ کہ جس کی مسکراہٹ ہونٹوں پہ پھسل کر ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ...... اس کی جیپ کو ہٹ کرنے والا راکٹ ڈرائیونگ سیٹ کے مخالف سمت پہ لگا تھا۔ راکٹ کے جیپ کو ہٹ کرنے کے بعد، جیپ کو لگنے والے زبردست جھٹکے میں وہ اچھل کر باہر جا گرا تھا۔ اس کا وجود بھی پتھریلی پہاڑی زمین پر...... بل کھا کر گرتے ہوئے نشیب کی جانب لڑھکنے لگا تھا۔ بے ڈول ہو کر فری فال اور جب اس کی پشت ایک جھٹکے کے ساتھ سخت زمین سے ٹکرائی تو...... اِک لمحے کے لیے اس نے سانس اندر کو کھینچی اور پھر دوسرے ہی لمحے اِک گہری، لمبی سانس فضا کے سپرد کرتے ہوئے وہ ساکت ہو گیا تھا۔

فضا اِک گونج دار دھماکے سے لرزی تھی...... چند آوازیں، چیخوں کی صورت بلند ہوئیں پھر جمادات کے گرنے، لڑھکنے کی آواز کہ جس کی، آواز میں حیات کے گرنے اور لڑھکنے کی آواز دب کر رہ گئی تھی۔ اور پھر خموشی، گہرا سکوت...... اِک سوگوار سا سکوت...... ''بس بھڑ بھڑ، چڑ چڑ کرتے شعلوں کی آواز...... یا پھر شاید کسی نشیب میں گرا کوئی فوجی کراہ رہا ہو شاید کہ ''دھواں سیاہ، کالا دھواں...... گوشت کے جلنے کی سڑاند...... جسموں کے جل کر چٹخنے کی آواز...... اور اِک سوگواری خموشی......''

ہمیشہ خموشی ہی وہ پہلی چیز ہوتی ہے جو کسی شہید کو سلام اور خراجِ عقیدت پیش کرنے آتی ہے۔

کہ تمہارا لہو نہیں تھا اتنا ارزاں کہ یوں بہایا جاتا......

''سلام...... سلام...... سلام......''

''اے خموشیوں کی رہ گزر کے خموش مسافر......

سلام ہو تجھ پر......''

''تو زندہ ہے، یقیناً زندہ ہے مگر ہم تیری زندگی کو پا نہیں سکتے۔''

''شعور اس زندگی تک جا نہیں پاتا اور عقل اسے ڈھونڈ نہیں سکتی۔''

''تو زندہ ہے، یقیناً زندہ ہے۔''

''اے! خموشیوں کی رہ گزر کے خموش مسافر اب تم سلامتی کے علاوہ کسی چیز کے حقدار نہیں...... اے خموشیوں کی رہ گزر کے خموش مسافر......'' بھڑ بھڑ کرتے شعلے......

اِک مہیب سا سکوت...... اور دور آسمان پر چلتے پھرتے وجودوں کے عین اوپر گول گول چکر کاٹتی اِک چیل کہ جس کی کریہہ آواز بار، بار سکوت کو توڑتی تھی اور بے حد بری لگتی تھی۔

''ششش، شش چپ ہو جاؤ، خاموش کہ وہ سو رہے ہیں۔ اِک لافانی حیات جینے کے لیے وہ سو رہے ہیں۔''

''ششش...... خاموش کہ وہ سو رہے ہیں۔''

☆☆☆

''موی......!'' وہ سوئی ہوئی تھی اور سوتے ہوئے جیسے کہیں دور سے سرگوشی کی سی آواز اس کے کان میں پڑی تھی۔ وہ کسمسائی مگر نیند کا غلبہ زیادہ تھا۔

''موی......!'' آواز پھر سے آئی۔ اب کہ یہ پھر سرگوشی کی سی ہی تھی اور پھر اسے اپنے گال پر وہ محبت بھرا، جانا پہچانا سا لمس محسوس ہوا۔ وہ نیند میں تھی اور نیند میں ہی اس نے دونوں بازو اس طرح سے بلند کیے کہ مجھے اٹھا لیا جائے۔ مجیب عالم ذرا سا مسکرائے انہوں نے آگے بڑھ کر موی کو اپنے بازوؤں میں لیتے ہوئے سینے سے لگایا۔ نیند میں ہی موی نے باپ کی گردن کے گرد دونوں ہاتھ مضبوطی سے لپیٹے اور ان کے سینے سے چمٹ کر پھر سے گہری نیند میں چلی گئی تھی۔ مجیب عالم نے بے حد محبت سے اور مسکرا کر اس کا سر چوما اور پھر اس کو کندھے سے ذرا سا الگ کر کے اس کا گال بھی چوما تھا۔ گل ذرا فاصلے پر کھڑی باپ بیٹی کی محبت کے مظاہرے کو مسکرا کر

دیکھتی رہی تھیں۔

''چینج تو کرلیں۔'' انہوں نے سرگوشی کی۔ مجیب عالم نے سر کے اشارے سے اثبات میں جواب دیا جس کا مطلب تھا کہ ابھی تھوڑی دیر تک کرلیتا ہوں۔

''کھانا؟'' گل نے پھر سرگوشی میں پوچھا جواب پھر سے وہی آیا۔ یعنی تھوڑی دیر تک، گل مسکراتے ہوئے مڑ گئی تھیں۔ مجیب عالم تھوڑی دیر تک موی کو سینے سے لگائے اِدھر اُدھر چکر لگاتے رہے اور پھر اسی طرح اسے سینے پہ لٹائے، خود بھی بیڈ پر لیٹ گئے تھے اور جب گل دوبارہ اُن سے کھانے کا پوچھنے آئیں تو...... تو وہ دونوں سو رہے تھے۔ باپ بیڈ پر اور بیٹی باپ کے سینے پر۔

☆☆☆

وہ ایک سولہ سال کی لڑکی تھی...... ہنیا ذوالفقار...... بڑی ہی جوش بھری، شوخ سے زیادہ چنچل، کچھ کچھ پاگل سی، ہر کام کو کرنے کے بعد سوچنے والی اور پھر سوچ سوچ کر ہلکان ہونے والی۔

یہ ایسے کیوں کیا تھا اور وہ ویسے کیوں ہو گیا تھا؟ ہائے میری عقل...... اس وقت کہاں تھی کہ جب فلاں، فلاں کام کیا تھا...... بس وہ بس تب ہی تو نہیں تھی جب وہ فلاں، فلاں کام کیا تھا۔ ماں، باپ کی اکلوتی اولاد ناز نخروں سے پلنے والی اور اس کو دیکھ کر لگتا بھی تھا کہ اس کے ناز اٹھائے جانے چاہئیں۔ خوب صورت اتنی نہ تھی کہ جتنی کیوٹ تھی، خواہ مخواہ ہی دل کرتا کہ ذرا اس کے گال پر اِک چٹکی بھر کر تو دیکھا جائے۔ بھلا کیسا لگتا ہے؟ وہ بالکل ہی ممی، ڈیڈی ٹائپ بگڑی بچی...... ہر بیگ کو کراس بیگ کی طرح پہننے والی، ہر فیشن کو سب سے پہلے ایڈاپٹ کرنے والی چاہے چوڑی دار پاجامہ ہو یا شارٹ شرٹ کا...... کلائیوں میں رنگ برنگے بینڈز اور ہر اشکال کے چوکور، تکونی اور گول بریسلیٹ بینگلز پہننے والی۔ ہاں البتہ اسے یہ لمبے، لمبے جھمکے یا ایئر رنگز پسند نہیں تھے۔ وہ ایئر اسٹڈز زیادہ پسند کرتی تھی۔ ایک وقت میں کئی، کئی کام شروع کرنے والی اور پھر کئی کسی کام کو بھی مکمل نہ کرنے والی۔ یہ لمبے بال، جتنے لمبے اتنے ہی گھنے...... اس کی جسمانی ساخت کو دیکھ کر لگتا تھا کہ بال

ان قدر وزنی ہیں جن کو وہ بہ مشکل اٹھائے ہوئے تھی۔

بات بے بات تصویریں کھینچ، کھینچ کر فیس بک پہ اپ لوڈ کرنے والی۔ کھٹ کھٹ کر کے تیزی سے میسج ٹائپ کرنے والی۔ کچھ محسوس ہو نہ ہو مگر فیس بک پہ طرح، طرح کے اسٹیٹس لکھنے والی، ہر نئے جوڑے چاہے کپڑوں کا ہو یا جوتوں کا کی تصویر فیس بک پر اپ لوڈ کرنے والی۔ ہر کام کانوں میں ہینڈ فری ٹھونس کر میوزک سنتے ہوئے کرنے والی رو، رو کر گھر میں ٹشوؤں کا thunder storm لے آنے والی، یاد رہے کہ چاہے بات رونے والی ہو یا نہ ہو غرض کہ زندگی سے... بھرپور اک لڑکی...... نازک سی مگر احساسات سے بھری ہوئی بلکہ کچھ زیادہ ہی بھری ہوئی۔ زندگی بھرپور طریقے سے جینے کی زبردست قائل تھی وہ اور وہ جیتی بھی تھی...... اِک بھرپور زندگی کوئی لمحہ انجوائے کرنے والا ہو یا نہ ہو اس کا بھی لطف اٹھانے والی...... مسکراتی کم اور ہنستی زیادہ تھی۔

فاسٹ دور کی فاسٹ سی لڑکی ہاں وہ ہنیا ذوالفقار زندگی سے بھرپور...... تھرکتی زندگی جیسی...... وہ ہنیا ذوالفقار......

☆☆☆

مومنہ مجیب عالم......

اب ساڑھے چار سال کی ہو چکی تھی۔ ذہن کچھ پختہ ہو چلا...... وہ اسکول جاتی اور گاہے بہ گاہے بابا اس کی تعلیم پہ توجہ دیتے رہتے...... اب بھی وہ اسے لیے بیٹھے اسکول کا کام کروا رہے تھے۔

''موی! لکھو...... اسپیئر......'' اور موی نے کاپی پہ لیڈ پنسل کے ساتھ بالکل ٹھیک اسپیلنگو لکھے۔ spare وہ اس وقت بابا کے سینے کے ساتھ سر اور پشت لگائے اِن کی گود میں بیٹھی تھی۔ کاپی پنسل اس کے گھٹنوں پر دھری تھی۔ اور بابا اس کے کندھے کے اوپر سے اس کی ہر کارروائی ملاحظہ کر رہے تھے۔ اس کو صحیح اسپیلنگو لکھتے دیکھ کر وہ مسکرائے تھے۔ موی اکثر الفاظ کو صحیح طریقے اور درست اسپیلنگو کے ساتھ لکھا کرتی تھی اور یہ ہی کمال اسے اردو میں بھی حاصل تھا۔ اب بھی وہ ڈکٹیشن ورڈ ہی لکھ رہی تھی۔

''موی لکھو ''ٹاک'' اور موی نے لکھا tak

"اوں ہوں...... غلط ہے موی......" مجیب عالم نے ٹوکا تھا۔ اس نے الجھ کر منہ اٹھا کر بابا کو دیکھا اور پھر کاپی پہ لکھے حرف کو...... غلط کہاں تھا؟ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے ربڑ سے لکھے گئے حروف مٹائے اور پھر انہیں بول، بول کر لکھا۔ "t.a.k"

"نہیں موی! ٹاک...... talk ہوتا ہے۔" وہ اب اس کے ہاتھ سے پنسل لے کر اس کے لکھے حروف پر کراس لگا کر درست لفظ لکھتے ہوئے بولے تھے۔ وہ بابا کو لفظ لکھتے ہوئے غور سے دیکھتی رہی۔

"یہ تو ٹالک بنتا ہے بابا!" اور جیسے ہی لفظ مکمل ہوا، وہ پھٹ سے بولی تھی۔ مجیب عالم اپنا قہقہہ نہیں روک سکے تھے۔ اب اس کو وہ سائلنٹ ورڈز کے بارے میں کیا سمجھاتے۔ لیکن پھر بھی انہوں نے کوشش کی تھی۔

"موی کچھ لفظوں میں بعض لیٹرز نہیں بولے جاتے۔ جیسے یہ ٹالک ہے مگر اس میں l کو pronounce نہیں کریں گے۔" موی منہ اٹھا کر ان کو بولتا دیکھتی رہی اور سمجھنے کی کوشش کرتی رہی پھر اس نے کاپی پہ لکھے talk کے لفظ میں موجود l پر لگے گول دائرے کو دیکھا مگر......

"نہیں بابا...... یہ ٹالک بنتا ہے، اس میں ایل آتا ہے۔" موی نے سنا دیا تھا فیصلہ...... اب کوئی ذرا بدلوا کر دکھائے یہ اور اسی طرح کے کئی مظاہرے گل، باپ اور بیٹی کے دیکھا کرتیں۔

☆☆☆

یہ اسلام آباد کا سیکٹر ایف ہے۔ IMCG کی بس سیکٹر سے باہر رینگ کر نکلتی ہوئی آہستہ، آہستہ چلتی ہوئی سگنل کی طرف جارہی تھی۔ بس اس وقت لڑکیوں سے بھری ہوئی تھی۔ جنہیں ان کے مطلوبہ اسٹاپس تک اتارنا تھا۔ بس میں لڑکیاں تھیں، مطلب کے شور تھا، طرح، طرح کی آوازیں، ہنسی، قہقہے...... اک اودھم کی سی کیفیت اور رنگ برنگی لڑکیاں انہی رنگ برنگیوں لڑکیوں میں سے ایک وہ تھی۔ ہنیا ذوالفقار...... کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکائے وہ باہر کے نظاروں میں مگن تھی۔ آج وہ chatter box خلاف معمول خاموش تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھی اس کی دوست بلا تکان بولے جارہی تھی۔ بولے ہی چلی جارہی تھی۔

"ول یو شٹ اپ......؟" یک دم ہی وہ بھرا کر بولی تھی۔ ثنا کا منہ کھلا اور وہ آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

"ہوا کیا ہے تمہیں؟" اس سے بات کرتے ہوئے ثنا کی تیوری بھی چڑھ گئی تھی۔

"میرے سر میں اتنا درد ہورہا ہے اور تم بولے ہی چلی جارہی ہو۔ بندہ کچھ تو خیال کرتا ہے۔" ناک چڑھا کر شہزادیوں کے سے برہم لہجے میں کہا گیا تھا۔ ثنا کا منہ پہلے سے بھی زیادہ کھلا۔

"تم نے خود کبھی خیال کیا ہے۔ لحاظ کیا ہے کسی کا؟" کچھ کچھ ایسی بُو آرہی تھی کہ جیسے دو عدد لڑکیوں میں لڑائی ہونے والی تھی اور وہ بھی دھواں دھار قسم کی...... اس جواب پر ہنیا کا گورا رنگ بتدریج سرخ ہونے لگا تھا۔ ناک کے نتھنے پھڑ پھڑاتے سے محسوس ہوتے تھے اور آنکھیں غضبناک سی...... قریب تھا کہ وہ اک تھپڑ جیسی بات ثنا کے منہ پر جڑ دیتی کہ بس ایک جھٹکے سے رک گئی تھی۔ بس سگنل پر رکی تھی۔ یوں جھٹکے سے رکنے کی وجہ سے، ان دونوں کو بھی جھٹکا لگا تھا اور وہ دونوں ہی بے توازن ہوئی تھیں۔ ہنیا نے بے ساختہ کھڑکی کے شیشے پر ہاتھ رکھ کر خود کو گرنے سے روکا تھا۔

"انکل! بریک لگانے سے پہلے بتا تو دیا کریں۔" اس نے غصہ انکل پر منتقل کیا لیکن بس میں شور ہونے کی وجہ سے وہ انکل تک منتقل نہیں ہو پایا تھا۔ اس بات پر آنسہ ہنیا کو اور غصہ آیا اور غصے سے سر جھٹکتے ہوئے اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا اور جوں ہی باہر جھانکا تو......

"ہائیں، یہ کب ہوا اور اس کو معلوم بھی نہیں ہوا۔" وہ یک دم اچھل کر کھڑی ہوئی تھی اور بے حد تیزی سے کھڑکی کا شیشہ ہٹایا تھا۔

"سر......!" پوری قوت لگا کر وہ حلق پھاڑ کر چیخی تھی۔ بس کے عین ساتھ رکی ہوئی جیپ میں موجود لوگوں نے مڑ کر اور بے حد چونک کر اسے دیکھا تھا۔ نہ

صرف انہوں نے بلکہ ارد گرد موجود اور لوگ بھی چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے، مسرت اور جوش سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا اور آنکھیں...... وہ دن کی روشنی کو بھی مات دیتی نظر آتی تھیں۔ ان کے متوجہ ہونے پر وہ ذرا سا پیچھے ہٹی۔ سیدھی ٹانگ موڑ کر اٹھاتے ہوئے شیشے تک لائی اور پھر زور سے پاؤں زمین پر مارتے ہوئے اس نے سیدھے ہاتھ کی چار انگلیاں کنپٹی پر رکھ کر ایک زبردست سا فوجی سلیوٹ، خالص فوجیوں کے سے انداز میں ہی بس کے ساتھ رکی جیپ میں بیٹھے فوجیوں کو کیا تھا۔

"I love PAK Army" اس کے بعد اس نے نکل کر کھڑکی میں سے آدھا لٹک کر پہلے سے بھی اونچی آواز میں کہا تھا۔ سگنل پر موجود سارے لوگ، ساری بس، بس کا ڈرائیور ماسوائے ثنا کے اس کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ (ثنا تو اسے جانتی تھی ناں) کچھ تو حیرانی سے اور اس انداز میں اسے دیکھ رہے تھے جیسے کہتے ہوں۔

''پاگل ہے پاگل......'' اور کچھ مسکرا کر اور کچھ عجیب نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ فوجی بھی اس کی اس حرکت پر مسکرائے بنا نہیں رہ سکے تھے۔ ان میں سے ایک فوجی نیچے اترا...... ہنیا ساکت ہوئی کہ اب کیا ہونے والا تھا؟ اس فوجی نے بھی زور سے زمین پر دھپ سے پاؤں مارتے ہوئے سلیوٹ کا جواب دیا تھا۔ وہ حیران سے زیادہ شاکڈ ہوئی تھی، یہ غیر متوقع تھا۔ اس نے بے ساختہ دونوں ہاتھ گالوں پر رکھ کر خوشی سے ہلکی سی چیخ ماری تھی۔

"PAK Army also love paki people" وہ فوجی زور سے اپنی بھاری آواز میں بولا اور پوری بس میں ایک دم سکوت سا پھیل گیا تھا۔ سب لوگ اُدھر ہی متوجہ تھے اور ہنیا...... وہ اب کہ کچھ بول ہی نہیں سکی تھی۔ ایک غیر متوقع بات کا بالکل ہی غیر متوقع جواب آیا تھا۔ اس کی آنکھیں جگمگا سی اٹھی تھیں اس عزت افزائی پہ اس نے جوش سے مڑ کر کہا۔

"Girls salute PAK Army"

اس بات پر چند لڑکیاں بس کے شیشوں تک آ گئیں اور مشترکہ طور پر سلیوٹ کیا تھا۔ فوجی نے مسکراتے ہوئے سلیوٹ وصول کیا اور اس کے ساتھ ہی اشارہ کھل گیا تھا۔ وہ فوجی بھی اب دوبارہ واپس جیپ میں بیٹھ چکا تھا۔ جاتے، جاتے اس ملٹری مین نے ہنیا کو پھر سے سلیوٹ کیا۔ ہنیا نے بھی ہاتھ ماتھے تک لے جا کر جواب دیا تھا۔ بس حرکت میں آئی ہنیا کو پھر سے جھٹکا لگا۔ وہ پھر سے بے توازن ہوئی اور ناراض نظروں سے ڈرائیور کو دیکھا۔

''یہ انکل بھی ناں، بندہ چلانے سے پہلے کم از کم بتا تو دے کہ وہ بس چلانے والا ہے۔'' بڑبڑاتے ہوئے اس نے سیٹ پر بیٹھ کر پھر سے کھڑکی سے ناک چپکائی اور پھر جہاں تک وہ جیپ نظر آئی وہ وہاں تک یوں ہی کھڑکی سے ناک چپکائے اسے دیکھتی رہی۔ تو آنسہ ہنیا ذوالفقار پاک فوج کے عشق میں مجنوں کی طرح جلا تھیں وہ پاکستان کی نوے فیصد لڑکیوں کی طرح فوج سے زیادہ فوجیوں پر مرتی تھی۔ اسے وہ ساڑی پہننی تھی جو پاک فوج کی خواتین پہنا کرتی ہیں، اسے زندگی میں کچھ کرنا تھا تو بس یہ کہ آرمی جوائن کرنا تھی۔ ایک انجینئر کے طور پر ہر حال میں، ہر قیمت پر اسے ملک کی اس فورس کو جوائن کرنا تھا۔ خواب دیکھے جاتے ہیں کہ یہ دیکھنے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ خواب بنا آنکھوں والے بھی دیکھتے ہیں مگر بات یہ ہے کہ تعبیر کے دکھ کوئی کوئی ہی اٹھاتا ہے۔

''اور شوق بنا جنون کے کچھ نہیں......''

خوابوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بڑی محنت، سخت لگن، ان تھک کوششیں درکار ہوتی ہیں اور ہر کوئی ایسا کرنے کا اہل ہوتا بھی نہیں...... یہ چند روحیں ہوتی ہیں...... جن میں جنون کا مادہ بھر کر زمین پر اتار دیا جاتا ہے۔ ایک شاہکار پینٹنگ کیا صرف رنگوں سے بنتی ہے؟ نہیں...... وہ اس جنون سے بنتی ہے جو آرٹسٹ کے دل سے اس کے ہاتھوں میں منتقل ہو کر رنگوں کو شاہکار میں بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ کام سب کرتے ہیں، کام سے محبت کوئی، کوئی کرتا ہے۔ خواب سب دیکھتے ہیں تعبیر پانے کے جتن کوئی کوئی کرتا ہے۔ چند خاص الخاص لوگ ہوا کرتے ہیں جو اپنے شوق، اپنے جذبے، اپنے کام

سے اتنی محبت رکھتے ہیں کہ وہ اس میں ڈوب جاتے ہیں اور ڈوب کر مٹ جاتے ہیں اور مٹ کر ان مٹ ہو جاتے ہیں خاک میں خاک تو ہونا ہی پڑتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اٹھنے کی سعی کتنے کرتے ہیں اور اٹھ کر کھڑے ہونے میں کامیاب کتنے ہوتے ہیں۔ خواب دیکھنا آسان نہیں، یہ جلتی ہوئی آنکھوں والوں کے کام ہیں کہ نیند کا سکون تو ہر کوئی پالیتا ہے یہ ہمت والوں کے کام ہیں، خواب سمفنی "symphony" (موسیقار کی ترتیب دی ہوئی دھن) ہیں مدھر اور مدہوش کرنے والی ایسی سمفنی کہ جس کے note (موسیقی کے سروں کی زبان) پکڑ میں نہ آتے ہوں، سمجھ میں نہیں آتے ہوں۔ سنتے سب ہی ہیں، یہ دل کو بھاتی ہے، سر بھی دھنا جاتا ہے مگر سمجھتے کتنے ہیں؟ بس صرف چند خاص لوگ اور جب یہ سمجھ جاتے ہیں تو...... ہاتھ میں پکڑی اِک چھڑی سے سارے سُر، سارے راگ چھیڑتے ہیں، یہ آرکیسٹرا کو کنٹرول کرنے والے لوگ ہوتے ہیں چند...... چند جنونی لوگ...... جو جب کچھ کرنے کا ٹھان لیں تو کر کے ہی چھوڑتے ہیں، زندگی تو ملی ہوئی ہے آپ کو خاک میں خاک کر دینے کے واسطے اور اٹھنا اسی خاک سے پڑتا ہے سرخاب کی طرح...... جو جب جل کر مرتا ہے تو تب اسی راکھ سے اِک نیا جنم لیتا ہے تو ہے کوئی جو تیار ہو جل کر راکھ ہونے کے واسطے...... تو ہے کوئی جو کہ راضی ہو مر مٹ کر ان مٹ ہونے کے واسطے...... اِک نیا جنم بھی لینے کے واسطے تو ہے کوئی کیا......؟

☆☆☆

"کل کیا ہماری لڑائی فوجیوں کی وجہ سے بال، بال ہوتے بچی تھی۔" سموسوں کی چٹنی بھری پلیٹ سے انصاف کرتی وہ ثنا تھی۔

"ہاں......" وہ مسکرائی جو کہ خود بھی ثنا کی طرح ہی سموسوں سے انصاف کرنے میں مشغول تھی۔

"ہا......" اور پھر یک دم اس نے چیخ چھوڑ کر دونوں بازوؤں کو فضا میں بلند کیا تھا اور گرنے کے سے انداز میں کرسی کی بیک سے ٹیک لگائی تھی۔

"کون سا دن...... کون سا وہ دن ہوگا کہ جب میں آرمی آفیسر......"

"بس کرو دو ہنیا......" اور اس کی بات کو مکمل ہونے نہ دیا گیا تھا۔ بیچ میں ہی بیزاری سے ٹوک دیا گیا۔ ہنیا بدمزہ ہوئی منہ بنا کر وہ بے اختیار سیدھی ہوئی اور گھور کر ثنا کو دیکھا۔

"آرمی، آرمی، آرمی...... میرے تو کان پک گئے ہیں سن، سن کر...... ایک بھدا، بے سرا راگ بن چکا ہے اب یہ...... رحم کرو اور ترس کھاؤ مجھ پر۔" ثنا نے تنگ آ کر دونوں ہاتھ ماتھے پر رکھ کر جوڑے تھے۔ ہنیا کو حد درجہ غصہ آ رہا تھا۔

"تم......" دانت پیس کر کہتے ہوئے اس نے چمچ ثنا پر تان کر کہا اور پھر جب یہ خیال آیا کہ ابھی کھائے جانے والے یہ سموسے کل کی لڑائی کی پنالٹی تھے تو غصہ، پینے کی کمال درجہ ایکٹنگ کی تھی۔

"نہیں، نہیں بولو، بولو غصہ کرو، بھڑاس نکال لو یونہی......" بڑا ہی پچکارتا ہوا انداز تھا۔

"میں ابھی ایک اور سموسوں کی پلیٹ کھا سکتی ہوں۔" ثنا اسے چھیڑتے ہوئے بولی تھی اور جواباً وہ یوں سموسے کھانے میں مصروف ہوگئی تھی جیسے بات سنی نہ گئی۔ ثنا اس کے اس انداز پر سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے خود بھی پلیٹ کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ تو یہ تھیں وہ دو دوستیں جو ایک جان اور شاید ایک قالب بھی تھیں۔ اِک ہنیا ذوالفقار اور دوسری ثنا عباسی۔

☆☆☆

"یہ ایک بڑا سا ڈائننگ ہال تھا جس کے عین وسط میں بارہ کرسیوں والی کھانے کی میز رکھی گئی تھی۔ میز کے عین اوپر ایک فانوس لٹک رہا تھا اور وہ فانوس اس وقت روشن تھا۔ فانوس کی کرسٹل کی لڑیوں سے جب روشنی منعکس ہو کر بکھرتی تھی تو بے حد خوب صورت سی دکھائی دیتی تھی۔ اس روشن جگمگ کرتے فانوس کے نیچے موجود میز کی بارہ کرسیوں میں سے چار پہ اس وقت افراد موجود تھے اور رات کا کھانا تناول کر رہے تھے۔ گو کہ میز پر چار ہی افراد تھے مگر چہل پہل معمول سے بڑھ کر تھی، ڈائننگ ٹیبل پر چند مخصوص ڈشز کا اضافہ بھی نظر آ رہا تھا اور ان

کے مسکراتے چہرے، ان کی خوشی کا اظہار بھرپور طریقے سے کر رہے تھے۔ کرنل صاحب اپنی مخصوص سربراہی کرسی پر براجمان تھے۔ ان کے دائیں طرف ان کی بیگم اور بیگم کے ساتھ بہو بیٹھی تھی۔ بائیں طرف ان کا بیٹا اور اسی کی وجہ سے آج یہ رونق ان کے چہروں کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔

"ینگ مین شادی کا کیا پلان ہے؟ کرنی بھی ہے یا......؟ کرنل صاحب نے اسے مخاطب کرتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ انداز چھیڑنے جیسا تھا۔ وہ چونکا اور پھر کھل کر ہنس دیا۔

"انکار کس کافر کو ہے پاپا......" جواب بھی شرارت ہی سے آیا تھا۔

"تو پھر......؟ تمہاری ماں تو کب سے یہ مہم شروع کر دینا چاہتی تھی، وہ تو میں نے ہی بند باندھ رکھے ہیں۔" ان کی اس بات پر ان کی بیگم نے انہیں گھور کر دیکھا اور وہ ایک بار پھر ہنس دیا تھا۔

"بند کو تھوڑا اور مضبوط کریں پاپا...... فی الحال میرا ارادہ اسپیشل سروسز کو جوائن کرنے کا ہے۔ ٹیم بس آج کل وزٹ کرنے ہی والی ہے۔" وہ کھانے سے ہاتھ روک کر بولا تھا اور اسپیشل سروسز کے نام پر سب نے اسے چونک کر دیکھا تھا۔

"جانتے بھی ہو، اسپیشل سروسز ہے کس بلا کا نام...... دوزخ ہے دوزخ۔" کرنل صاحب نے جس انداز میں کہا تھا اس انداز نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

"آپ بھی پاپا......؟"

"چھوڑو یار کیا پرانے کھاتے کھولتے ہو۔" ان کے یوں کہنے پر اس نے سر جھکا کر مسکراہٹ دبائی۔ یقیناً کرنل صاحب اسپیشل سروسز کو جوائن کرنے میں ناکام رہے تھے۔

"چلیں، اس دنیا کی دوزخ کا مزہ بھی چکھنے دیں ذرا...... آرمی کی جنت میں تو بہت مزے ہو گئے اب تک۔" کہہ کر وہ ایک بار پھر کھانے کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"سیریس ہو تو ضرور جوائن کرو...... ٹرائی کرنا محض حماقت ہوگی کیپٹن......"

"جانتا ہوں پاپا...... ملٹری مین کے پاس بھلا کہاں حماقتوں کی گنجائش ہوا کرتی ہے۔"

"اینی ہاؤ...... بیسٹ آف لک......" کرنل صاحب نے ہاتھ بڑھا کر اس کا کندھا تھپتھپایا تھا۔ وہ ایک گہری سانس لے کر مسکرایا...... یہ ایک مشکل فیصلہ تھا۔ وہ پُرعزم ضرور تھا مگر وہ خوفزدہ بھی تھا گو کہ خوفزدہ کا لفظ ایک فوجی کے ساتھ انتہائی آکورڈ لگتا ہے جتنا کہ کسی بزدل کے لیے بہادر لکھنا...... مگر ہاں وہ تھا خوفزدہ...... اسپیشل سروسز کوئی مذاق نہیں تھا۔ ہر دفعہ اسپیشل سروسز کے لیے ہونے والے recruit کا محض 25 فی صد ہی کامیاب ہو پاتا ہے۔ آسان لفظوں میں کہو تو سو کا چوتھا حصہ یعنی چند تھے گنے چنے بے حد خاص اور قیمتی لوگ...... سخت جسمانی تربیت، بے حد غیر معمولی حالات میں، صحراؤں، دریاؤں، جنگلوں اور پہاڑوں میں آماجگاہ، کھانے کے نام پر روسٹ کیا ہوا سانپ اور کولڈ ڈرنک کے طور پر مرغی کا خون...... ویلکم ٹو دا ایس ایس جی ریسٹورنٹ...... یہ ان کی دنیا ہے کہ جہاں انسانوں والا کوئی کام نہیں کیا جاتا۔ دور دراز کے علاقے میں واقع ٹریننگ کیمپ، کیمپ کم اور آدم خور جانداروں جیسا مسکن زیادہ لگتا ہے۔ ہر کامیاب ہونے والے فوجی کی صلاحیتوں کا جائزہ لیا جاتا ہے اور ان کی بہترین صلاحیتوں کو مزید ابھار کر اس انتہا تک پہنچا دیا جاتا ہے کہ جہاں پہ پہنچ کر یہ انسانوں سے زیادہ کچھ اور محسوس ہوتے ہیں۔ فولادی جسم، آہنی ارادے اور کبھی نہ ٹوٹنے والا عزم...... ان کی گھٹی میں یہ چیز ڈال دی جاتی ہے کہ انہیں زندہ رہنا ہے، ہر حال میں، ہر قیمت پر، چاہے کھانے کو کچھ ہو یا نہ ہو...... اور چاہے تمہیں اپنے ہاتھ کی انگلیاں چبا کر ہی زندہ کیوں نہ رہنا پڑے۔ "you have to live" تمہیں لڑنا ہے، مرنا نہیں، جیتنا ہے، ہارنا نہیں...... تو عام فوجی حضرات اسے دوزخ، کہتے ہیں اور مہذب الفاظ میں یہ سخت ٹریننگ کہلائی جاتی ہے جس کے مختلف مراحل کو کامیابی سے عبور کرنے والا کہلاتا ہے "کمانڈو......" اور ایسی ٹریننگ

کہ امیدواروں میں 100 کا کمس چوتھا حصہ ہی کامیاب ہو پاتا ہے تو...... خاص لوگ...... خاص سروسز اور خاص الخاص تربیت تو ایس ایس جی کی دنیا میں خوش آمدید۔

☆☆☆

''بابا آپ مجھے ایسا فون لیں دیں جس میں تصویر بھی آتی ہو، ٹی وی کی طرح آپ جہاں، جہاں بھی جائیں گے میں آپ کو دیکھا کروں گی۔'' یہ مجیب عالم کو گھر آئے چوتھا دن تھا جب مومی کو اچانک یاد آیا تھا۔ مجیب عالم کو اس کے مطالبے سے زیادہ اس مطالبے میں چھپی محبت نے ساکت کیا تھا۔ یہ کیا تھا؟ ایک بیٹی کا باپ سے محبت کا اظہار، مجیب عالم کا دل، دل نہیں رہا تھا وہ یک دم ایک بھرا پیالہ ہو گیا تھا۔ جس میں محبت نامی محلول ابل، ابل کر پورے بدن میں پھیل رہا تھا اتنا کہ وہ سرتاپا محبت ہو گئے تھے۔ اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے...... اس طرح جیسے آج لفظ محبت سے آشنا ہوئے ہوں۔ اس طرح جیسے آج یہ لذت ملی ہو، کیسا خوب صورت احساس ہوتا ہے ناں باپ ہونا اور وہ بھی بیٹی کا باپ ہونا۔ انہوں نے بے اختیار ہو کر مومی کو گود میں اٹھایا اور اس کا منہ چوما۔

''بابا کی جان! بابا کے بس میں ہوتا تو کبھی وہ خود کو مومی کی آنکھوں سے دور نہ کرتے۔'' مومی الفاظ کو بھلے سمجھ نہ پائی ہو لیکن ایک زبان دنیا کا ہر شخص سمجھتا ہے۔ شیر خوار بچے سے لے کر بڑے تک اور بڑے سے لے کر بوڑھے تک ہر شخص...... اور وہ ہے محبت کی زبان...... آنکھوں کی زبان...... اور وہ دو آنکھیں جو کہ اس کے باپ کی تھیں اور جو محبت کے احساس سے چمکتی تھیں تو مومی کو سمجھنے میں دیر نہ لگی تھی۔ اس نے باپ کے سینے پر دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر خود کو اٹھایا اور ان کا گال چوم لیا تھا۔ مجیب عالم بے ساختگی سے مسکرائے۔ وہ ایک نسبتاً صاف رنگت کی حامل، بھرے، بھرے گالوں والی بچی تھی۔ جس کے سیدھے باب کٹ بال اس کی چن لائن (chin line) کو چھوتے تھے۔ مجیب عالم نے انگلی سے اس کے بالوں کو کان کے پیچھے کرتے ہوئے ایک دفعہ پھر سے اس کا ماتھا چوما تھا۔

''آپ کہاں چلے جاتے ہیں بابا؟'' اس نے عادتاً سوال کیا۔

''آپ کے بابا جہاز اڑاتے ہیں۔''

''کون سا جہاز......؟'' مجیب عالم نے اک لمحے کے لیے سوچا اور پھر وہ اٹھ کر کمپیوٹر ٹیبل تک آئے تھے۔ pc آن کرنے کے بعد انہوں نے اسے کمپیوٹر میں محفوظ کچھ جہازوں کی تصویریں دکھائیں۔

''مومی کے بابا یہ پلین اڑاتے ہیں۔'' ماؤس سے کلک کرتے ہوئے وہ باری، باری اسے وہ تصاویر دکھا رہے تھے۔

''اس کا نام کیا ہے بابا؟'' اور مومی کے اس سوال پہ وہ یک دم ہنس دیے تھے۔ جہاز کا نام پوچھنے والی مومنہ ہی ہو سکتی تھی۔

''اس کا نام C-130 ہے۔'' ایک اور تصویر دکھاتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

''آپ کو جہاز اڑانا اچھا لگتا ہے بابا؟'' اس نے منہ اٹھا کر باپ کے چہرے کو دیکھتے ہوئے پھر سے سوال کیا تھا۔

''بہت اچھا...... بہت ہی زیادہ اچھا...... اتنا کہ مومی کے بابا اگر جہاز نہ اڑاتے تو جان بابا یقین کرو اور کچھ کر ہی نہ پاتے۔'' اس بات پر مومی نے باپ کے چہرے پر پھیلتی اس عجیب روشنی کو محسوس کیا اور وہ روشنی...... وہ روشنی پھیل کر بھلا گئی کہاں تھی؟ کہاں گئی تھی وہ روشنی...... وہ، وہ سیدھا مومنہ مجیب عالم کی آنکھوں سے ہوتی ہوئی اس کے دل میں جذب ہو کر رہ گئی تھی۔ اور وہاں صرف روشنی ہی منتقل نہیں ہوئی تھی وہ محبت بھی منتقل ہو گئی تھی جو اس کے باپ کو جہازوں سے تھی، اپنی سرزمینِ وطن پاکستان ائرفورس سے تھی۔

"your baba loves PAF Momi" مجیب عالم اب کہہ رہے تھے اور مومی نے سنا...... اور سن کر حفظ کر لیا...... باپ کو گر PAF سے محبت تھی تو مومی کا تو عشق کرنا بنتا ہی تھا ناں......

اولاد میں صرف ماں، باپ کی عادات ہی منتقل

نہیں ہوتیں کچھ جذبات بھی منتقل ہوتے ہیں اور ہمیشہ اگلی نسل میں چاہے عادات ہو یا جذبات زیادہ شدت کے ساتھ منتقل ہوتے ہیں۔ مومی کی جینز میں بھی یہ "محبت" عشق بلکہ جنون بن کر منتقل ہوگئی تھی اور یہ تو اسی دن ہوگیا تھا کہ جس دن وہ پیدا ہوئی تھی۔ آج تو محض آگہی کا دن تھا مومی کا تعلق اس خاندان سے تھا کہ جن کی نسلیں پشت در پشت پاکستان آرمی سے وابستہ تھیں، ہیں اور رہیں گی بھی...... اس نے کمپیوٹر اسکرین پر نظر آنے والے پلین پہ ہاتھ پھیرا۔

"مومی جہاز اڑائے گی؟" مجیب عالم نے یوں ہی پوچھا تھا۔ مومی نے اس سوال پر گردن موڑ کر باپ کو دیکھا اور پھر جہاز کو...... اور پھر اس نے زور شور سے سر ہلایا تھا۔

"مومی پائلٹ بنے گی...... فائٹر پائلٹ PAF کی فائٹر پائلٹ!" کمپیوٹر آف کرتے ہوئے مجیب عالم نے اِک عزم سے کہا تھا۔ انہیں مومنہ کو پاکستان کی پہلی فائٹر پائلٹ بنانا تھا۔ اور مومی...... اس نے ایک بار پھر سے سنا اور اس طرح سے سنا کہ حفظ کرلیا تھا۔

☆☆☆

یہ ذوالفقار انجم کا گھر تھا اور اس وقت وہ گھر سے زیادہ کوئی میدانِ جنگ معلوم ہوتا تھا اور ایسا ہوتا تبھی تھا کہ جب ہنیا اور اس کے ابو کے درمیان کوئی معرکہ زوروں پر ہوتا ہے اور ابھی ایسا کیا ہوا کہ گھر، گھر سے زیادہ میدان جنگ دکھتا ہے۔ ہا...... ! یہ تو لمبی داستان مگر سننی تو پڑے گی ہی بات دراصل یوں تھی کہ پچھلے دو سال سے ہنیا کیڈٹ کالج ایبٹ آباد کا ورد صبح شام کے علاوہ دوپہر میں بھی کرتی دکھائی دیتی۔ نظر تو آتا امی اور ابو کو مگر وہ خموشی سے بس تماشا ملاحظہ کیا کرتے تھے۔ ان کے لیے کیڈٹ کالج ایبٹ آباد کا راگ...... وہ راگ بن چکا تھا کہ جس نے پانی میں کیا خاک آگ لگانی تھی۔ البتہ ان کے سر میں درد ضرور کردیا تھا لیکن ہنوز وہ خاموش تھے۔ اچھا، کیا ہوا وہ جو ذرا زیادہ ہی بڑ، بڑ کرتی تھی لیکن وہ کیا ہے کہ وہ اس طرح سے بڑ، بڑ کرتے ہوئے بھی پیاری لگتی تھی۔ بس یہی "پیار" ہنیا کو لے ڈوبا۔ وہ پیار، پیار کھیلتے رہے اور ہنیا صاحبہ چین کی بانسری بجا، بجا کر ہی سمجھتی رہیں کہ امی، ابو راضی ہیں۔ اس کی ہر بات کچھ اس طرح سے شروع ہوتی تھی کہ "جب میں ایبٹ آباد جاؤں گی ناں تو......" اور کچھ اس طرح سے ختم ہوا کرتی تھی کہ "جب میں ایبٹ آباد سے آؤں گی ناں تو......"

اب وہ میٹرک کرچکی تھی اور رزلٹ کا انتظار تھا۔ فوج میں بھرتی ہونا چاہتی تھی۔ آرمی انجینئر بننا چاہتی اور پھر ساری عمر (کسی فوجی سے شادی کرکے) فوج کی خدمت میں گزار دینا چاہتی تھی لیکن آہ...... کہ اس کے امی، ابو دشمن نہیں تھے پر بن گئے تھے اور ابو...... ہر معاملے میں ہر بات میں آزادی دے کر طنابیں ڈھیلی چھوڑ کر اب انہیں یک دم ہی اس کی طنابیں کسنا، لگام میں کھینچنا یاد آگیا تھا۔ پھر معرکہ تو ہونا ہی تھا۔ آخر کو ناز نخروں سے پالی گئی اولاد تھی۔ غلط، صحیح، چھوٹی، بڑی ہر طرح کی فرمائشیں پوری کرنے کے بعد جب "نہ" بولا جائے تو پھر معرکہ تو ہونا ہی تھا ناں...... اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ آخر معاملہ کیا ہے، ہوا کیا تھا آخر۔ تو معاملہ کچھ یوں تھا کہ آنسہ ہنیا ذوالفقار جو کہ اتنے عرصے سے مجنوں کی طرح، فوج اور فوجیوں کے عشق میں مبتلا رہتی تھی۔ ہر وقت ایبٹ آباد، ایبٹ آباد کا راگ الاپتی رہتی تھی اس کو یہ گمان گزرا ہے کہ امی، ابو راضی ہیں۔ نہ صرف راضی بلکہ راضی بہ رضا ہیں اور ویسے بھی آج تک بھلا کون سی ایسی چیز ایسی فرمائش یا پھر ایسی خواہش تھی ہنیا کی کہ جس کے لیے لفظ نہ یا منفی صیغہ استعمال کیا گیا ہو تو بس اسی آگہی کے تحت ہنیا نے ایبٹ آباد کالج کے داخلہ ٹیسٹ کے لیے اپلائی کردیا تھا۔ اخبار میں اشتہار دیکھ کر یوں جیسے کالج میں داخلہ لینا ایسا تھا جیسے اپنی مرضی سے کوئی جوڑا خریدنا۔ راز تو تب کھلا جب ٹیسٹ کی ڈیٹ آئی تھی اور اس نے ابو کے کندھے سے لٹک، لٹک کر ٹیسٹ کے بارے میں انفارم کیا تھا اور بس...... اسی کی تو کمی تھی یہ ایک خودکش دھماکا تھا یا چلیں اس کے قریب، قریب ہی کچھ تھا...... ابو نے حیرت کے 440 وولٹ کے جھٹکے کے زیر اثر اسے دیکھا۔

"کب، کب اپلائی کیا تم نے؟"

"فلاں ڈیٹ کو، فلاں اخبار میں اشتہار دیکھ کر

فلاں دن اپلائی کیا تھا ابو۔"
"باپ سے کوئی بات پوچھنا گوارا ہے کہ نہیں؟"
ابو گرجے۔
"اس میں پوچھنے والی کیا بات تھی؟" اور وہ حیران ہوئی۔
"یعنی کہ تم اتنا بڑا فیصلہ کر لو گی اور پھر آ کر مجھ سے کہو گی کہ اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے؟" اب کہ ابو گرجنے کے ساتھ ساتھ کڑکے بھی تھے۔ وہ سہمی تھی۔
"ابو! آپ کو معلوم تو ہے کہ مجھے آرمی جوائن کرنے کا کتنا شوق ہے۔ میں کیڈٹ بننا چاہتی ہوں۔" وہ بیچاری خواہ مخواہ میں ہی رونے والی ہو گئی تھی۔
"نہیں، میں تمہیں خود سے دور نہیں کر سکتا ہنیا...... کم از کم یہ شوق میں تمہارا پورا نہیں کر سکتا۔ کیڈٹ کالج کوئی جنت نہیں ہے، یہ وہ ڈھول ہے جو دور سے ہی سہانا لگتا ہے۔ جس طرح کا نازک مزاج ہے تمہارا اور جن، جن آسائشات کی عادی ہو تم دوسرے ہی دن تم گھر بھاگو گی۔" وہ ذرا بھی نرم پڑے بغیر سخت لہجے میں بولے چلے جا رہے تھے۔
"چلیں دوسرے دن ہی سہی...... بھاگ کر آنے کو ہی سہی مجھے جوائن تو کرنے دیں ابو...... مجھے دیکھنے تو دیں کہ میں یہ کر بھی سکتی ہوں یا نہیں......" اور بس جی ہو گیا شروع رونا...... امی جو اس دھواں دھار مکالمے کے دوران لاؤنج میں آئی تھیں۔ انہوں نے اِک گہری سانس بھر کر اس کو دیکھا اور پھر دوسری تحریتی نظر ٹشو کے ڈبے پہ ڈالی تھی جو کہ مجھو ہنیا کے ہاتھ تلے ہی رکھا پڑا تھا۔
"ایکسکیوزمی......! میں کیا اپنا پیسہ تمہارے تجربات پر برباد کروں گا؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا، نیور......" وہ اس لہجے میں اب بولے تھے کہ ہنیا کی آنکھوں سے بہنے والا پانی سیلِ رواں ہو گیا تھا۔ پیسہ تو بس اس کو روکنے کا ایک بہانہ تھا ورنہ انہیں کوئی پیسہ ہنیا سے پیارا تھا...... بالکل بھی نہیں تھا۔ اس آخری بات پہ ہنیا نے بے ساختہ ہاتھ ٹشو کے ڈبے کی طرف بڑھایا اور اس کی امی نے دل پہ...... یہ بلا مبالغہ چوتھا ڈبا تھا جو لاؤنج کی سائڈ ٹیبل پر محض تین ہفتوں کے دوران رکھا گیا تھا۔
"ابو، اب آپ پیسے سے کمپیئر کریں گے مجھے......؟" اس نے ایک ٹشو سے ناک رگڑ کر صاف کرتے ہوئے اسے پھینکا اور دوسرے کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولی۔
"ہنیا پیسے کی بات مت کرو تم مجھ سے...... تم جانتی ہو کہ مجھے کون زیادہ پیارا ہے، پنڈی کے جس بھی اچھے سے اچھے کالج میں کہو میں بھیجنے کو تیار ہوں مگر ایبٹ آباد کا نام مت لو بیٹا...... بہت مشکل کام ہے اور بہت سخت روٹین ہے وہاں کی۔ بچے تم تو PT پیریڈ میں ہی بے ہوش ہو جاؤ گی اور ذرا یہ تو بتاؤ بھلا کہ صبح پانچ بجے کیسے اٹھ پاؤ گی؟"
"صبح اور پانچ بجے......" سن کر دل کو دھکا تو ضرور لگا تھا مگر وہ پی گئی تھی۔ "ابو میں کر لوں گی...... سب کچھ کر لوں گی۔ وہ چاہے مجھ سے کپڑے دھلوا لیں یا برتن منجھوا لیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں کر لوں گی۔" اور پتا نہیں کتنواں ٹشو تھا کہ جو آنکھوں کو صاف کر کے پھینکا گیا تھا۔
"ہو گئی ناں ثابت بات، اب تمہاری نظر میں دنیا کے مشکل کاموں میں سے ایک کپڑے دھونا اور دوسرا برتن مانجھنا ہے۔ مجھے یہ بتاؤ تم کیڈٹ کالج کی سخت روٹین کیسے فالو کر پاؤ گی؟ وہاں کے اصول، سخت نظام اور جس کے پاؤں محض چار انچ کی ہیل پہننے سے ہی دکھنے لگتے ہیں وہ جائے گی کیڈٹ کالج......؟" انہوں نے بس ہونہہ نہیں کہا تھا باقی انداز بالکل ویسا ہی تھا۔ اس دوران ٹشو گرتے رہے، ہنیا نے منہ بسور کر ماں کو دیکھا اور بلا مبالغہ کوئی پندرھویں ٹشو کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ اور امی نے بے اختیار پہلو بدل کر سوچا تھا...... "گیا یہ ڈبا بھی۔"
"تو آپ مجھے ایبٹ آباد جانے نہیں دیں گے؟" منہ کے ٹیڑھے میڑھے زاویے بناتے ہوئے اس نے لڑائی کو واائنڈ اپ کرنا چاہا۔
"قطعاً نہیں......" کیسا ہی بے لچک سا لہجہ

تھا ابو کا۔

ہنیا نے بری طرح سے منہ بسور کر آنسو بہائے اور پھر رونا روک کر خطرناک سے انداز میں ان کو دیکھنے لگی تھی۔ اکلوتی ہوں کا رعب بھی تو جتانا تھا ناں آخر......

"ٹھیک ہے......" اور پھر سسکیاں بھرتے ہوئے بے دردی سے گالوں کو ہاتھوں سے رگڑ رگڑ کر صاف کیا تھا۔

"شکر ہے ڈبا بچ گیا۔" اسے ہاتھ استعمال کرتے دیکھ کر بے ساختہ امی نے شکر کی سانس لی تھی۔

"ٹھیک ہے، آپ مجھے ایبٹ آباد نہیں جانیں دیں گے، نہ سہی...... میں اس سے بہتر مرنا پسند کروں گی۔" ایک دفعہ پھر گالوں کو بے دردی سے رگڑ کر دھمکی دی گئی تھی۔ امی کا دل دہلا...... ابو کا بھی پسیجا مگر بہر حال وہ ابو تھے۔

"تمہاری مرضی......" بے پروائی سے کہہ کر وہ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے تھے۔

"ہائے......" ان کا یہ بے پروا انداز اس قدر شاق کر کے سینے پر لگا تھا کہ سیلِ رواں ایک بار پھر سے رواں دواں ہو گیا تھا۔

"امی۔" وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے امی کے گلے آن لگی تھی۔

"بس میرا بچہ...... بس، تم جانتی ہو ناں تمہارے ابو نے کبھی نہیں ٹالی تمہاری بات...... بس دل کے ہاتھوں مجبور ہیں ناں...... کیسے بھیج دیں تمہیں اتنی دور......؟ اور پھر وہاں سے چھٹی تو کم کم ملتی ہے۔ اکلوتی اولاد ہو کچھ تو خیال کرو ہمارا......" امی اسے بچوں کی طرح پچکارتے ہوئے سمجھا رہی تھیں۔

"چلو شاباش بند کرو رونا...... اٹھو اور کھانا کھاؤ۔" اسے خود سے الگ کرتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اس کے نم چہرے کو پیار سے صاف کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

"نہیں کھاؤں گی کھانا......" وہ ایک دم سے پھر بدکی تھی اور پاؤں پٹخ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔

"ہیں...... تو مرنے کا مطلب بھوک ہڑتال تھا کیا؟" امی اب بھی نہیں سمجھیں۔

☆☆☆

اس نے پہلی بار یہ جملہ "موی پائلٹ بنے گی...... PAF کی پائلٹ......" ساڑھے چار سال کی عمر میں سنا تھا اور اس طرح سے سنا تھا کہ حفظ کر لیا تھا اور حفظ کی ہوئی چیزیں بھی کبھی بھول جایا کرتی ہیں مگر... موی اپنا حفظ شدہ سبق نہیں بھول سکی تھی۔ کیونکہ اسے بھولنے نہیں دیا گیا تھا۔ بے حد چھوٹی عمر سے اس کا یہ محبوب سا مشغلہ تھا۔ جہازوں کو دیکھنا، اسے اس میں بڑی کشش محسوس ہوا کرتی تھی۔ وہ راولپنڈی کے علاقے چکلالہ کے رہائشی تھے۔ یہ علاقہ ائرپورٹ کے قریب تھا اور اکثر جہاز نیچی پرواز کرتے ہوئے بے حد واضح دکھائی دیتے تھے۔ فوجی ہیلی کاپٹرز، طیارے اور پسنجر جہاز...... یہ بھی اس کا دل پسند مشغلہ تھا کہ گھنٹوں منہ اٹھا کر آسمان پر نمودار ہونے والے ان جہازوں کو دیکھنا اور پھر دیکھتے ہی رہنا...... وہ کتنے مسحور کن لگتے تھے۔ یوں فضا میں پرواز کرتے ہوئے...... موی کے لیے تفریح اسی چیز کا نام تھی۔ وہ اکثر بابا کے ساتھ بائیک پر بیٹھ کر ائرپورٹ کے رن وے کے پاس علاقے میں چلی جایا کرتی تھی اور پھر طیاروں، جہازوں کو ٹیک آف کرتے، لینڈ ہوتے دیکھا کرتی تھی۔ رات میں یہ منظر اتنا دل فریب لگتا تھا کہ وہ چاہتی تھی کہ اسے دیر تک وہاں ہی بیٹھا رہنے دیا جائے۔

"بابا! یہ والا کون سا جہاز ہے؟" ہر دفعہ نئے آنے والے جہاز کو لینڈ کرتے دیکھ کر وہ پوچھتی تھی۔

"یہ فوکر ہے، یہ ائربس ہے، یہ جمبو جیٹ ہے یہ C-130 ہے وغیرہ، وغیرہ......" موی کو جہازوں کے نام مع ان کے ماڈلز کے حفظ ہونے لگے تھے۔ اس کے سارے مشاغل جہازوں کے گرد گھومنے لگے تھے۔ اس کے پاس کھیلنے کو گڑیا یا ڈول ہاؤس نہیں تھا اس کے پاس جہاز تھے، ریموٹ سے چلنے والے پلین، چھوٹے، بڑے مختلف ماڈلز کے عام سے عام پلاسٹک کے رنگ برنگے جہازوں سے لے کر بیٹریز سے چلنے والے پلین تک...... اور یہ سب پسندیدگی سے نکل کر جنون کی حدوں میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے پاس ریڈنگ بکس

کے نام پر جہازوں سے متعلق لٹریچر تھا۔ جسے اس کے بابا پڑھ کر سناتے اور سمجھاتے تھے وہ کسی سنو وائٹ، سنڈریلا، یا رابن ہڈ کو نہیں جانتی تھی۔ وہ C-130، معراج JF17، مشاق کو جانتی تھی وہ ایم ایم عالم کو جانتی تھی۔ یہ اس کی بیڈ ٹائمز اسٹوریز تھیں۔ کلر بکس کے نام پہ جہازوں کی تصاویر اور اسکیچز سے بھری بکس تھیں اس کے پاس جو کہ اس کے بابا.... معلوم نہیں کہاں سے لا کر دیا کرتے تھے اس کا کمرا کسی اسٹفڈ ٹوائے سے بھرا ہوا نہیں تھا، وہ جہازوں کے ماڈلز سے بھرا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے بیڈ پر ڈالی گئی بیڈشیٹ پہ بھی رنگ برنگے چھوٹے بڑے جہاز بنے ہوئے تھے۔ گل نے بیڈشیٹ اس کے کریز کو دیکھ کر خریدی تھی۔ چھ سال کی عمر میں ہی وہ PC آن کرنا اور آپریٹ کرنا جانتی تھی۔ وہ چند مخصوص چیزوں کو ہی کھول پاتی تھی۔ جن میں سرفہرست Image files تھیں جو کہ ڈیسک ٹاپ پہ ہی پڑی ہوئی تھیں۔ کمپیوٹر آن کرنے کے بعد وہ مخصوص فائلز کھولتی اور پھر جہازوں کی تصاویر دیکھتی رہتی تھی۔ اس فائل کو اس کے بابا وقتاً فوقتاً اپ ڈیٹ کرتے رہتے تھے۔ اس دن بھی وہ وہی فائل کھولے بیٹھی تھی کہ یک دم دماغ کو ایک خیال سوجھا، جہاز کی ایک تصویر کو دیکھتے ہوئے اس نے اسے ڈرا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ ایک T.37 جہاز تھا۔ کمپیوٹر ٹیبل پر PC کے ساتھ رکھی اسکیچ بک اس نے کھولی اور اس تصویر کو دیکھ کر اس نے وہ اسکیچ بنانا شروع کیا تھا اور جب مجیب عالم آئے تو اس دفعہ ان سے ملنے کے بعد دوسرا کام اس نے وہ اسکیچ دکھانے کا کیا تھا۔ وہ اِک لمحے کے لیے گنگ رہ گئے تھے۔

"یہ تم نے بنایا ہے موی؟" وہ بے حد بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

موی نے اثبات میں سر ہلایا گو کہ تصویر کو دیکھ کر معلوم پڑتا تھا کہ وہ کسی بچے کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہے لیکن یہ معلوم نہیں پڑتا تھا کہ وہ بچہ محض چھ سال کا ہوگا۔ مجیب عالم نے کچھ بے ساختگی کے عالم میں اس کا ماتھا چوما۔

"میری بیٹی جینئس ہے، جینئس اور تمہاری ذہانت کا حقدار یقیناً PAF کے علاوہ اور کوئی نہیں۔" اور موی کو ساری بات میں محض PAF کے الفاظ سمجھ آئے تھے۔

"میں پائلٹ بنوں گی بابا...... اور یوں جہاز اڑاؤں گی۔" وہ اب ہاتھ کو ہوا میں لہراتے ہوئے بابا کو جہاز اڑا کر دکھا رہی تھی۔ اور مجیب عالم نے مسکرا کر بے حد چمکتی آنکھوں کے ساتھ اس دن کا خواب دیکھا کہ جس دن ان کی موی، کسی فوجی جنگی جہاز کو اڑاتی ہوئی شاید پاکستان کی پہلی خاتون فائٹر پائلٹ بنے گی۔

"ہاں اسے ہی تو بننا تھا...... پاکستان کی پہلی خاتون فائٹر پائلٹ......"

☆☆☆

ایک دن اسکول سے واپسی پر اسے چاچو حبیب عالم پک کرنے آئے تھے۔ موی اسکول سے باہر آئی تو چاچو نے اس کی پشت پر موجود اسکول بیگ کو اتار کر بائیک کے ہینڈل کے ساتھ لٹکایا اور موی کو اٹھا کر بائیک پر بٹھایا تھا۔

"موی تمہارا بھائی آیا ہے؟" بائیک اسٹارٹ کرنے سے پہلے انہوں نے موی کو اطلاع دی تھی۔

"بھائی......؟" موی نے اچنبھے سے انہیں دیکھا۔ یوں جیسے کہتی ہو مجھے تو ایسی کوئی اطلاع نہیں تھی۔

"کہاں سے آیا ہے چاچو......؟"

"اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے۔"

"کیسے بھیجا ہے؟ وہ تو آسمانوں پہ ہوتے ہیں ناں تو پھر کیا وہ خود آئے تھے زمین پر؟" یہ سوال پوچھتے ہوئے موی کی آنکھیں حیرت سے کچھ پھیل گئی تھیں۔ چاچو ٹپٹائے تھے...... موی کے سوالوں کا جواب دینا کب آسان ہوا تھا۔

"نہیں، وہ خود نہیں آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے موی کے لیے گفٹ بھیجا ہے ناں......"

"گفٹ......؟ کیسے؟ کیا پلین سے بھیجا ہے؟" وہ ابھی پھر سوچ میں غرق ہوئی اور اس کے بعد جوش سے بولی تھی۔

"ہاں، ہاں پلین سے ہی بھیجا ہے۔" جان چھڑاتے ہوئے چاچو نے بائیک اسٹارٹ کی تھی۔

"تو کیا ہم اسے لینے ایئر پورٹ جائیں گے؟"

صرف بائیک ہی تو اسٹارٹ نہیں ہوئی تھی منہ موڑ کر موی بھی شروع ہوگئی تھی۔

"تمہیں وہ اسپتال میں آیا ہے۔" چاچو کے منہ سے پھسلا۔

"کیا پلین اسپتال آیا تھا؟" موی اور حیران ہوئی۔

"ارے بیٹا یہ باتیں ابو، امی سے پوچھ لینا، یہ بتاؤ تمہیں گفٹ نہیں لینا کیا بھائی کے لیے؟" چاچو نے مزید سوالوں سے بچنے کے لیے اس کی توجہ دوسری جانب مبذول کی تھی۔

"لینا ہے، لینا ہے۔" وہ مچل سی گئی تھی۔ سواُن کی بائیک ایک ٹوائے شاپ پر رکی تھی اور ذرا ملاحظہ فرمائیں۔ موی نے بھائی کے لیے کیا گفٹ خریدا تھا۔

"ایک پلین......" کھلونے کے نام پر اور خریدنے کے واسطے موی کے ذہن پر صرف اور صرف ایک ہی چیز کسی وائرس کی طرح موجود تھی۔

"جہاز......" وہ بڑے اشتیاق سے ریپ کیا ہوا گفٹ ہاتھ میں پکڑے بھائی کو دیکھنے اور اسے گفٹ دکھانے کے واسطے اسپتال کے کاریڈور میں چاچو کے آگے، آگے بھاگتی جارہی تھی۔ جیسے ہی اس نے روم کا دروازہ کھولا۔

ممی کے ہاتھوں میں موجود چھوٹے بچے کو دیکھ کر اسے عجیب سا محسوس ہوا اور سارا اشتیاق کافور ہوا۔

"موی! اِدھر آؤ......" گل نے مسکراتے ہوئے اسے پاس بلایا۔

"یہ بھائی ہے؟" اس نے بے دلی سے سوال کیا۔

"ہاں! یہ بھائی ہے۔" وہ اسے بیڈ کے پاس کھڑی موی کے قریب بیڈ پر ہی لٹاتے ہوئے بولی تھیں۔ موی چند لمحے اسے دیکھتی رہی، وہ سو رہا تھا۔ بے ساختہ اس کے دل میں خواہش ابھری کہ وہ اس کی ناک دبائے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ناک کو چھوا تھا اور دبایا تھا۔ بھائی بے اختیار چیخا تھا۔ یوں جیسے ناک کوئی بٹن تھا جس کے دبانے پر وہ چیخ اٹھتا تھا۔ موی بدک کر دو قدم دور ہٹی تھی۔ گل ہنس پڑی تھیں۔

"میں نے اسے نہیں مارا......" وہ گھبرائی۔ بے بی کا منہ سرخ ہوگیا تھا رونے کی وجہ سے۔

"اِدھر آؤ۔" ممی نے بھائی کو گود میں اٹھا کر اسے بلاتے ہوئے بیڈ پر اپنے قریب بٹھایا تھا۔

"چھوٹا ہے ناں، اس لیے اسے آرام سے ہاتھ لگانا ہے۔ یہ دیکھو۔" گل نے موی کے ہاتھ کی شہادت کی انگلی اپنے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے بھائی کی ناک کو چھوا تھا۔ بے حد آرام سے ہلکے سے، وہ اب کی بار نہیں رویا تھا۔ موی بے ساختہ خوش ہوئی تھی۔ اس نے گل سے ہاتھ چھڑوا کر پھر سے ناک کو چھوا۔ وہ پھر نہیں رویا تھا۔ خوشی اور بڑھی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" گل نے اس کے ہاتھ میں موجود گفٹ پیک کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بھائی کے لیے ہے۔" موی نے گفٹ کھول کر جہاز بھائی کے اوپر رکھا تھا۔ گل کی ہنسی بے ساختہ تھی۔ وہ ایک چھوٹا سا ٹوائے پلین تھا۔

"بھائی کا نام کیا ہے ممی......؟"

"سعد......سعد مجیب عالم......" گل نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

سعد کے سینے پر ٹوائے پلین پڑا تھا اور وہ سو رہا تھا۔ یہ ماں کے دودھ اور گھٹی کے بعد تیسری چیز تھی جس سے وہ بے خبری کے عالم میں آشنا ہوا تھا۔

☆☆☆

"من جانبازم......من جانبازم......من جانبازم......"

"میں وہ ہوں جو جان کی بازی لگا دیتا ہوں، ان تمام جانوں کے لیے جو میرے ملک پاکستان میں جیتی ہیں۔"

"من جانبازم......"

"میں وہ ہوں جسے ہر دوسری جان اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ بہادری میرا پہلا وصف ہے اور بزدلی وہ چیز ہے جو میرا آخری وصف بھی نہیں۔"

"من جانبازم......!"

"میں وہ ہوں کہ جہاں جاتا ہوں تو موت وہاں سے بھاگ جاتی ہے۔ خوف کو میں نے خود میں جگہ نہیں دی اور موت کا خوف......تم کون ہو بھلا......؟ جس سے لوگ خوف کھاتے ہیں، میں نہیں جانتا تمہیں اور یاد رکھو۔ میں وہ ہوں جو کہ تمہارے تعاقب میں ہے۔"

"من جانباز م......"

"میں وہ ہوں کہ جسے زندگیوں کا رکھوالا بنایا گیا اور یہ رکھوالی کسی امانت کی طرح ہے میرے لیے...... میں خائن کیسے ہو سکتا ہوں کیونکہ یہ ممکن ہو سکتا ہے بھلا؟ میں کیسے وہ سبق بھول جاؤں جو میرے پیارے نبیؐ نے شیر خداؓ کو پڑھایا۔ میں اسد اللہؓ کے قبیلے سے ہوں۔ میں سیف اللہؓ کے نقش قدم پر ہوں۔ مجھے امین بنایا گیا تو میں کیسے خیانت کر سکتا ہوں۔ میں امین ہوں، میں خائن کیسے ہو سکتا ہوں کہ خیانت کی سزا ذلت کی موت کے علاوہ کچھ نہیں...... اللہ مجھے کبھی ایسی موت نہ دے...... کبھی نہیں، کبھی نہیں......"

"من جانباز م......"

"میں وہ ہوں کہ جس کی پہلی خواہش شہادت اور آخری خواہش غازی ہونا...... شہادت میرا مطلوب و مقصود ہے۔ میری آرزو ہے کہ میری ہر آرزو شہادت کے لفظ سے شروع ہو کر شہادت کے رتبے پر ختم ہو۔ غازی ہونا میرے لیے ایسے ہی ہے جیسے میں ناکام رہا۔"

"من جانباز م......"

"میں وہ ہوں کہ جس نے اپنے ہر جذبے کو صرف ایک ہی جذبے میں ڈھال دیا ہے۔ میری دھڑکنوں کو شمار کرو تو وہ ایک ہی ورد کرتی سنائی دیں گی۔ حق ہو، اللہ ہو......"

"میں کون ہوں...... کیا ہوں؟ کیسا ہوں؟ مجھے میرے چہرے، میری شناخت اور میرے نام سے مت کھوجو...... مجھے جانو تو بس ایسے جانو...... من...... جان...... باز م......"

"مجھے کھوجو تو ایسے ہی مانو...... من...... جان...... باز م۔"

"میری شناخت......Maroon beret"

"میری پہچان......black storks"

"من جانباز م...... من جانباز م...... من جانباز م"

☆☆☆

بھوک ہڑتال کا قریب کوئی پانچواں دن تھا اور بھوک ہڑتال بھی وہ جو کہ بظاہر تھی۔ اور ظاہر ہے... ذوالفقار صاحب اس بات سے آگاہ بھی تھے...... انہیں کون بتاتا؟ وہ اچھی طرح سے جانتے تھے کہ ایک وقت کا کھانا تو دور کی بات ہے محض چپس کے پیکٹ ہی نہ ملنے پر...اس کا بی پی کم ترین سطح پر آجایا کرتا تھا۔ اتنے چپس، کولڈ ڈرنک کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ اس کی پرورش دودھ پہ ہوئی ہے۔

"امی......"

"ہاں کیا ہے؟"

"ابو آپ سے اتنا پیار کس وجہ سے کرتے ہیں کہ آپ کی ہر بات مانتے ہیں؟" اس سوال پر امی نے اس کے تھکے ہوئے چہرے پر اک خفگی بھری نظر ڈالی تھی اور یاد رہے کہ یہ تھکاوٹ محض جھوٹی بھوک ہڑتال کی وجہ سے تھی۔

"ہنیا کوئی ڈھنگ کی بات بھی کر لیا کرو۔"

"نہیں...... دراصل میں صرف یہ سوچنا چاہ رہی تھی کہ آپ اپنی ہر بات کیسے منوا لیا کرتی ہیں؟ تاکہ میں بھی وہی حربہ آزماؤں۔" وہ بیچارگی کی بالکل آخری اسٹیج پر تھی۔ ٹیسٹ کی ڈیٹ نزدیک تھی اور ابو تھے کہ مان کر ہی نہیں دے رہے تھے۔

"تمہارے ابو ہر وہ بات مان لیتے ہیں جو عقل سے کہی گئی ہو۔"

"تو آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ آرمی کو جوائن کرنا ایک بے عقلا فیصلہ ہے؟" اسے خواہ مخواہ میں ہی غصہ آیا تھا۔ "اور وہ ساری عوام بھی بے عقل ہی ہے جو دھڑا دھڑ آرمی کو جوائن کرتی ہے؟" غصہ ذرا اور شدید ہوا۔

"بات آرمی کو جوائن کرنے کی نہیں ہے۔ بات تمہارے آرمی کو جوائن کرنے کی ہے۔ خود کو دیکھا ہے کبھی......؟ زیرو سائز ہو تم...... نظر آتی نہیں ہو، سبزی بھر کر تھیلا اٹھایا نہیں جاتا۔ ذرا ایک وقت کی چائے نہ پیو تو سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ ذرا سی ڈانٹ پڑ جائے تو چھینکیں مار، مار کر اپنا حال خراب کرتی ہو، دوسروں کا بھی ستیاناس کرتی رہتی ہو۔ انجکشن کی سوئی سے تمہیں خوف آتا ہے۔ ذرا کوئی جو اونچی آواز میں بات کرے تمہیں ہارٹ پرابلم ہونا شروع ہو جاتا

ہے۔ مرضی کے خلاف بات سننا گوارا نہیں۔ غصہ سوا نیزے سے بھی کہیں اوپر ہوتا ہے اور تم جوائن کرو گی آرمی کو...... ہونہہ......'' امی نے تو گویا آج آنکھوں کے سارے پردے ہٹانے کا ارادہ کرلیا تھا۔ ہنیا کا جو منہ کھلا تو بس کھلا ہی گیا۔

''امی......!'' اور پھر ہمیشہ کی طرح پانی بھری آنکھوں کے ساتھ حتی الامکان بھرائی آواز میں کہا گیا تھا۔ یوں جیسے وہ ناراض سی ہو۔ اس کے اس طرح کے کریکٹر اسکیچ پہ۔

''دیکھ لو..... چار باتیں سنائی نہیں آنسو آئے نہیں اور پھر بات کرتی ہے کہ آرمی جوائن کرنی ہے۔ بی بی کرلینا کسی آرمی والے سے شادی اور ہو جائیں گے سارے شوق پورے۔ ہم تو بس اتنا ہی کرسکتے ہیں آپ جناب کے لیے۔'' امی نے ایک دفعہ پھر اسے آئینہ دکھایا تھا۔ وہ کھسیا کر چپ سی ہوگئی تھی۔ دل میں چھپے راز تک امی کیسے جا پہنچیں؟ ابھی مزید کچھ دنوں تک یہ بھوک ہڑتال کا ڈراما چلنا تھا۔ ابو کو ایموشنل بلیک میل کرنے کے لیے، وہ الگ بات...... ابو بلیک میل، کیا ایموشنل بھی نہیں ہورہے تھے۔

☆☆☆

''ابو کل ٹیسٹ ہے میرا......'' وہ سارے حوصلے اکٹھا کر کے ابو کے پاس آئی تھی۔ آریا پار...... ابو نے فوکل گلاسز کے اوپر سے اسے گھورا اور ان کی ایسی گھوری خواہ مخواہ میں ہی جسم کے رونگٹے کھڑے کردیا کرتی تھی۔ ہنیا نے بہ مشکل تھوک نگلا۔

''کس وقت ہے ٹیسٹ......؟'' انہوں نے بے حد بے پروائی سے پوچھا تھا۔

''ہیں......؟'' ہنیا نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا۔ ''یہ اس کے ابو ہی تھے ناں......؟'' اور پھر اگلا احساس...... پورے بدن میں لہر کی طرح دوڑتی خوشی کے احساس کا تھا۔ خوشی سے مرتے، مرتے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ اس نے ٹیسٹ کے وقت اور سینٹر کا بتایا تھا۔

''ٹھیک ہے لے چلوں گا ہنیا! مگر یاد رکھو کالج

رشتے

رشتوں کو بہت ہی احتیاط سے نبھانا چاہیے کیونکہ رشتوں کی ڈور بہت ہی نازک ہوتی ہے۔ ذرا سی بات پر کیسے ایک رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ مثال دیکھیے۔

مونگ پھلی میں دانہ نہیں
ہم تمہارے نانا نہیں

کیا واقعی رشتے اتنے کمزور ہوتے ہیں؟

ثنا مرتضی، کراچی

قارئین پاکیزہ کے لیے دعا

ہر موڑ پر خوشیاں تیری جھولی میں گریں
اتنی ہو مسرت کہ سنبھالی نہ جائے
دل سے دعا ہے میری یہ خدا سے
غم تیرے مقدر میں تو کیا تصور میں بھی نہ آئے

ازطرف: نگہت غفار، کراچی

والے تم پہ under weight کا objection لگا کر تمہیں کک آؤٹ کردیں گے۔ آخر کو انہیں ایک صحت مند lot چاہیے۔'' ابو نے خالصتاً اسے چھیڑا تھا اور وہ چھڑ بھی گئی۔

''ابو!'' غصے سے اس کے نتھنے پھڑپھڑائے اور اس نے ابو کو خالص ابو کے ہی سے انداز میں اس طرح پکارا تھا کہ جس طرح وہ غصے میں اسے ہنیا کہا کرتے تھے۔

''ہاہاہا......'' ابو نے ایک دل ہلا دینے والا قہقہہ لگایا تھا اور وہ غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے وہاں سے واک آؤٹ کرگئی تھی۔

یہ جو ابونامی قوم ہوتی ہے ایمان سے بڑی چیز ہوتی ہے۔ انہوں نے جان بوجھ کر پہلے انکار کیا اور اب جان بوجھ کر عین ٹائم پر اقرار...... اور اس انکار و اقرار کے درمیان کے عرصے میں ہنیا کیا کرتی رہی تھی؟

کیا وہ ٹیسٹ کی تیاری کرتی رہی تھی؟

نہیں تو...... وہ تو بس ابو کو منانے کی ترکیبیں

ڈھونڈتی رہی اور بھوک ہڑتال کے جھوٹے مظاہروں میں مشغول رہی تھی۔

''یہ ابو نامی قوم بھی ناں...... قسم سے بڑی ہی چیز ہوتی ہے۔''

☆☆☆

یہ ایک ڈرائنگ بک تھی جس کے صفحے پر ایک جہاز کا اسکیچ بنا ہوا تھا۔ اور جسے آٹھ سالہ موی کو لیبل کرنا تھا۔ لاؤنج میں ہی کچھ فاصلے پر رکھے گئے بے بی کاٹ میں ایک سال کا سعد مجیب عالم کھلونوں سے نہیں جہازوں سے کھیل رہا تھا۔ مجیب عالم نے اسکیچ پر پھونک مار کر اسے صاف کیا تھا۔ ربڑ استعمال کرنے کی وجہ سے وہاں گند سا پھیلا ہوا تھا۔ مجیب عالم اب لیڈ پنسل سے بنائے گئے جہاز کی ڈرائنگ پہ مختلف لائنز کھینچ رہے تھے۔ جو جہاز کے کسی نہ کسی پارٹ کو ظاہر کر رہی تھیں۔ موی کو اسے لیبل کرنا تھا۔ ڈرائنگ بک ٹیبل کے اوپر رکھی تھی اور ٹیبل کے سامنے مجیب عالم بیٹھے ہوئے تھے۔ مجیب عالم نے اسکیچ بک کا رخ گھما کر موی کے سامنے کیا تھا۔ وہ زمین پر بیٹھی ٹیبل کے اوپر دونوں کہنیاں ٹکائے ہاتھوں میں چہرہ لیے باپ کو دیکھ رہی تھی۔

''لیبل کرو......'' باپ کے کہنے پر موی کے ہاتھ حرکت کرنے لگے تھے۔

"engine, flaps, wings, elevators, rudders ailerons, vertical stabilizer, horizontal stabilizer, fuselage,cockpit"

وہ تیزی سے لیبل کر رہی تھی۔ مجیب عالم کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔

''گڈ......'' انہوں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ سے اسکیچ بک کا رخ اپنی طرف کیا تھا۔

''engine کیا کرتا ہے؟'' تو سبق شروع ہو چکا تھا۔

''جہاز کو پاور دیتا ہے۔'' موی نے جواب دیا۔

"flaps?"

''ہائی لفٹ ڈیوائس ہے۔'' ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا گیا۔

"rudders?"

''دائیں، بائیں حرکت کرنے کے لیے۔'' اور موی کے ہاتھ ساتھ، ساتھ وضاحت کرتے جا رہے تھے۔

"ailerons?"

''جہاز کو رول کرنے کے لیے......'' وہ پوچھتے جا رہے تھے اور موی بتاتی جا رہی تھی۔

"elvevators?" اور وہ پہلی بار اٹکی...... اس نے معصوم سی شکل بنا کر مجیب عالم کو دیکھا...... وہ یقیناً بھول چکی تھی۔

''کوئی بات نہیں......'' وہ اس کی شکل کے زاویوں کو دیکھ کر ہنس پڑے تھے اور اسے پھر سے سمجھانے لگے تھے۔

''یہ مشکل ہے۔'' ان کے سمجھانے کے بعد وہ بولی تھی۔

''چلو ٹھیک ہے، اسے فی الحال چھوڑ دیتے ہیں، یہ تمہاری عمر سے بڑا concept ہے۔ اب کیا سمجھاؤں تمہیں کہ pitch up اور pitch down کیا ہوتا ہے۔'' اسکیچ بک کو بند کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

''پلین لینڈ ہوا؟'' صوفے پر ریلیکس ہو کر بیٹھتے ہوئے انہوں نے دونوں ہاتھوں کو سر کے پیچھے رکھا تھا۔

''نہیں!'' ہر دفعہ کریش ہو جاتا ہے۔'' وہ چیزیں سمیٹتی بولتی جا رہی تھی، وہ ایک جدید طرز کے ریموٹ کنٹرول سے چلنے والے پلین کو لینڈ کرنے کی کوششوں میں تھی۔ بحفاظت زمین پر اتارنا چاہتی تھی مگر کر نہیں پا رہی تھی۔ مجیب عالم نے اسی کی بابت استفسار کیا تھا جہاز نوک کے بل زمین پر جا گرتا تھا۔ وہ اسی چیز کو کریش ہونا کہہ رہی تھی۔

''ہو جائے گا، کوشش جاری رکھو......'' جواب میں موی نے مسکرا کر انہیں دیکھا تھا۔ وہ جب چیزیں سمیٹ کر اٹھی تو نظر بے ساختہ سعد پر جا پڑی تھی۔

''بابا......'' وہ بے اختیار مڑ کر بولی اور جب اس نے پکارا تو مجیب عالم آنکھیں بند کر کے ریلیکس سے انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔

''جی بیٹا......'' اس کے بلانے پر آنکھیں کھول کر

وہ سیدھے ہوئے تھے۔

"سعد بھی پائلٹ بنے گا؟" اس سوال پر مجیب عالم نے چونک کر سعد کی جانب دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ کچھ کہہ نہ پائے تھے پھر مسکراتے ہوئے نظریں سعد سے ہٹا کر انہوں نے مومی کو دیکھا۔

"ہاں......سعد بھی پائلٹ بنے گا...... PAF کا فائٹر پائلٹ.........." بے حد یقین سے انہوں نے کہا تھا۔ مومی پُرجوش ہوئی تھی۔

"ہم دونوں پائلٹ بنیں گے؟" اسی جوش کے ساتھ پوچھا گیا تھا۔ مجیب عالم نے اب کہ مسکراتے ہوئے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا اور یہ محض تصدیق نہ تھی، یہ بات نقش ہو کر رہ گئی تھی، ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔ بھلا کہاں؟ مومنہ مجیب عالم کے دل پر اور بھلا کہاں......؟

☆☆☆

عموماً چھوٹے بہن بھائی اپنے سے بڑے بہن بھائی کے زیر تسلط ہوتے ہیں۔ سعد کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ شروع کے چند سالوں کے علاوہ وہ ماں کے بجائے مومی کے ساتھ زیادہ رہا تھا۔ اس کے ساتھ وہ زیادہ اٹیچڈ تھا تو پھر ایسے میں یہ بھلا کیونکر ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ مومی جیسی عادتیں اس جیسے مشاغل اور اس کے جیسے کھیل نہ اپناتا۔ اور یہ بات تو طے ہو چکی تھی کہ اسے بھی پائلٹ ہی بننا تھا تو ایک جیسے مقاصد کے ساتھ وہ دو ایک جیسے لوگ تھے۔ ماں، باپ سے صرف عادتیں ہی نہیں لیتے بچے کچھ جذبات بھی جینز کے ساتھ خون میں منتقل ہو جایا کرتے ہیں... اور یہ ہو چکا تھا۔ فرق بس اتنا کہ منتقل ہوتی محبت کو جنون، مومی کے جنون نے بنایا تھا۔ مومی اور اس کا روم اکٹھا تھا۔ جیسے جیسے سعد بڑا ہوتا گیا۔ کمرے کی دیواروں پہ جہازوں کے پوسٹرز چسپاں ہوتے گئے۔ ٹوائے اسٹف میں نئے سے نیا اور اچھا سے اچھا پلین شامل ہوتا گیا۔ کمپیوٹر ٹیبل پر ان سی ڈیز کی تعداد بڑھنے لگی جن میں ساری گیمز جہازوں کے حوالے سے تھیں۔ بک شیلف میں ایئر ویپنز سے متعلق لٹریچر بڑھنے لگا۔

مومی ایم، ایم عالم کے بہادری کے قصے سنا، سنا کر سعد کے خون کو گرماتی تھی۔ وہ ہی قصے جو کہ اس نے بیڈ ٹائم اسٹوریز کے طور پر اپنے بابا سے سن رکھے تھے۔

پلٹنا، جھپٹنا، جھپٹ کے پلٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ

وہ دونوں بہن، بھائی پاکستان ڈے کے موقع پر ہونے والی پریڈ میں محض Aerobatics show دیکھنے جایا کرتے تھے۔

کتنا مسحور کن نظارہ تھا کیا ہی دلفریب منظر تھا...... کیسے دل کو موہ لینے والے لمحات تھے...... خون میں کوئی چیز جوش مارتی تھی اور بری طرح سے مارتی تھی۔

یہ مومی ہی جانتی تھی اور سعد ہی سمجھتا تھا۔ ان دونوں کی ہر بات جہازوں سے شروع ہو کر PAF پر ختم ہوتی تھی۔ وہ جاگتی آنکھوں سے اس دن کا خواب دیکھا کرتے تھے کہ جس دن وہ پاکستان ائر فورس میں ہوں گے۔

PAF رسالپور...... ہاں...... کون سا سہانا دن چڑھے گا کہ جب مومی رسالپور میں PAF کی اکیڈمی میں آنکھیں کھولے گی۔ کیا وہ زندگی میں ایسا سورج دیکھ پائے گی کہ جس کی صبح رسالپور کی اکیڈمی کے کونے کھدروں تک پھیل جائے گی۔

کیا وہ زندگی میں ایسی رات کو دیکھ پائے گی کہ جس رات، چاند عین رسالپور کی اکیڈمی کے آسمان پہ طلوع ہو گا۔

وہ لڑکی تھی...... پر لڑکیوں جیسے خواب نہیں تھے اس کے...... اسے کسی لہنگے، شرارے، غرارے، گھاگرے یا چولی، رنگ برنگے کپڑے، پراندے کسی ایسی شے کا شوق نہیں تھا وہ تو بس اس لباس کو پہننے کے لیے مرتی تھی جو PAF کے پائلٹس پہنا کرتے تھے۔

وہ دن بھی آئے گا کبھی کہ جس دن سورج بس یہ ذرا سے ہاتھ بھر کے فاصلے پر ہو گا۔ وہ زمین سے دور...... آسمان کے پاس...... فضاؤں میں......بادلوں کے بیچ......سنہری کرنوں کے سنگ......جہاز کو یوں اڑائے گی کہ گویا وہ ہزاروں ٹن وزنی ایلومینیم باڈی نہ ہو بلکہ اس کا ریموٹ کنٹرول ٹوائے پلین ہو...... مومنہ کو انتظار تھا اپنے خوابوں کی تعبیر کے دن کا، اس عظیم دن کا...... ہر پل،

ہر لمحہ، ہر ساعت...... اور وہ جانتی تھی کہ محض انتظار اس کے لیے یہ دن لانے والا نہیں ہے۔ محنت اور بھرپور محنت۔

اور اس نے کی بھی' میٹرک امتیازی حیثیت کے ساتھ پاس کیا تھا اس نے' ابھی دو سال اور تھے...... انتظار اور محنت کے اسے FSC بھی اور زیادہ ڈسٹنکشن کے ساتھ پاس کرنا تھی۔ اور پھر چار سال PAF رسالپور کے محنت اور بھرپور محنت...... پھر جا کر آنا تھا وہ دن...... اِک عظیم دن...... اِک ایسا دن کہ جو اس قابل تھا کہ اس کے لیے جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھے جائیں۔ اور جب وہ طلوع ہو تو اس کا آغاز 21 توپوں کی سلامی کے ساتھ کیا جائے......

پلٹنا، جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اِک بہانہ

☆☆☆

نتیجہ بالکل ابو کے حسب توقع تھا۔ وہ ماشاء اللہ سے بہت ہی اچھے طریقے سے فیل ہوگئی تھی۔ اگرچہ وہ نالائق بچی نہیں تھی اس نے میٹرک بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا تھا مگر یہ ٹیسٹ کوئی مذاق تھا؟ لوگ اس کے لیے اللہ جانے کیا، کیا کرتے ہیں اور کس، کس طرح کی کتابیں گھول، گھول کر پیتے ہیں۔ ذہن کو ذہن نہیں کمپیوٹر بنا لیتے ہیں۔ معلومات ہیں کہ بس فیڈ کیے چلے جاتے ہیں...... کیے ہی چلے جاتے ہیں۔ وہ الگ بات کہ عین ٹیسٹ کے دن exam,s fear نامی وائرس ساری معلومات کو بھک سے اڑا دینے کا سبب بن جائے۔

اب اس ڈر سے دنیا کیا لکھنا پڑھنا چھوڑ دے؟ ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں بچے...... یہ جو بچے کیڈٹ کالج جوائن کرنے کے لیے ٹیسٹ کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں ناں اور جس کے لیے لڑکے اپنی صحت اور لڑکیاں اپنی اسکن جیسی قیمتی چیزوں کی بھی پروا نہیں کرتیں، یہ ایسا صرف اس خواب کی تعبیر کو پالینے کے لیے کرتے ہیں جو اُن کی آنکھوں میں آرمی بن کر چمکتا ہے۔

خوابوں کی تعبیر کو پانے کے لیے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ بہت ہی کڑی محنت...... تو وہ سب کچھ ایسی ہی کڑی محنت کے دور سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ اور وہ محترمہ...... ہنیا ذوالفقار صاحبہ...... وہ بھی یقیناً کڑی محنت کے دور سے گزر رہی تھی مگر اس محنت کی ڈائریکشن غلط تھی۔ کتابوں کے بجائے وہ ابو پہ محنت کرتی ہوئی پائی گئی تھی تو پھر نتیجہ ابو کی حسب توقع کیوں نہ نکلتا۔ اور اب ہنیا صاحبہ تھیں اور ٹشوز کا ڈبا...... پورا گھر tissue thunderstorm سے متاثرہ دکھ رہا تھا۔ رو، رو کر برا حال...... اتنا برا کہ آنکھیں سرخ اور سوج سی گئی تھیں اور اب رونا اس وجہ سے آرہا تھا کہ آنکھوں میں درد ہو رہا ہے۔ ناک بار، بار صاف کرنے کی وجہ...... چھلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی...... اور قدرے سرخی مائل دکھتی تھی۔ گوری رنگت اب پیلی پڑ رہی تھی نہ کھانے اور بے تحاشا رونے کی کمزوری کی وجہ سے...... امی، ابو خاموشی سے اسے یوں روتا بلکتا ملاحظہ فرما رہے تھے۔

ہر بات کا آغاز وہ اس جملے سے کرتی تھی۔

”ابو اگر آپ مان گئے ہوتے ناں پھر یہ نہ ہوتا...... وہ نہ ہوتا......“ اور اختتام اس پر کرتی تھی...... ”تو میں اچھے نمبروں سے پاس ہو چکی ہوتی۔“ اور ابو...... وہ تو نہایت ہی تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے تھے۔

”چلو اب بس بھی کرو......“

امی کا دل اب حقیقت میں اسے یوں بے حال ہوتے دیکھ کر ہول، ہول جا رہا تھا۔ اکلوتی بچی تھی وہ۔

”چھوڑو مٹی ڈالو، جو ہونا تھا ہو گیا...... اب سوچو کہ آگے کیا کرنا ہے۔“ امی نے اسے بہلانا چاہا۔

”آگے کیا سوچنا...... میں پورا سال پڑھوں گی اور نیکسٹ ٹائم پھر سے ٹیسٹ دوں گی۔“ اور ابو......

اسے تو جیسے سر پر لگی اور بجھی کہیں بھی نہ۔

”اب آپ کی کوئی بھی چال کامیاب نہیں ہونے دوں گی میں...... آپ نے بھی کیا ہی سازشی عورتوں کا سا دماغ پایا ہے۔“

ابو غصے میں آئے نہیں، وہ بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔ اور وہ انہیں لال سرخ آنکھوں سے گھورتی رہی تھی۔

(باقی آئندہ)

بدصورت

ہاجرہ ریحان

"بدصورت......" پہلی بار میں نے یہ لفظ کب سنا تھا؟ یاد آیا شاید نرسری یا اس سے ایک یا دو کلاس اوپر نیچے...... مجھے میری آرٹ ٹیچر بہت پسند تھیں...... وہ بہت خوب صورت تھیں...... جیسے بچپن میں ہر بچے کو اپنی ہر ٹیچر سے عشق ہوتا ہے، چاہے وہ خوب صورت ہو نہ ہو مگر بچے کے لیے وہ خوب صورت ترین سے بھی کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ تو آرٹ ٹیچر مجھے حد سے زیادہ پسند تھیں۔ وہ بھی اکثر میرے پاس آ کر بیٹھ جاتیں اور مجھ



سے پوچھتی جاتیں یہ کیوں، وہ کیوں؟ جب میں انہیں ٹھہر، ٹھہر کر، رک، رک کر اٹک، اٹک کر سمجھاتی تو وہ ہنستی جاتیں اور پھر آخر میں کہتیں۔

''اچھا تو یہ بات ہے؟ خوب ہو تم بھی۔''

ایک دن انگلش کے پیریڈ میں وہ دو لڑکیاں جو ہر وقت آپس میں جڑی، جڑی سی رہتی تھیں نے اچانک مجھے بھی خود سے جوڑلیا...اور پوچھا۔

''تم آرٹ ٹیچر کے پاس ہی کیوں بیٹھتی ہو......؟''

''مجھے نہیں معلوم مگر وہ خود آ کر میرے برابر میں بیٹھ جاتی ہیں۔'' میں نے سکون سے جواب دیا۔

''تمہیں پتا ہے میں نے امی سے پوچھا تھا کہ آرٹ ٹیچر تمہارے ساتھ ہی کیوں بیٹھتی ہیں تو انہوں نے بتایا کہ ہر اسکول کا ایک اصول ہوتا ہے اور یہاں کا اصول یہ ہے کہ ٹیچر ہمیشہ سب سے نالائق اور بدصورت بچے کو سب سے زیادہ توجہ دیتا ہے اور اس کے ساتھ بیٹھتا ہے تاکہ اسے احساسِ کمتری نہ ہو۔'' میرے جواب پر اُن میں سے ایک نے کہا۔

میرا دل بجھ گیا اور مجھے سمجھ نہیں آسکا کہ میں کیا کروں مگر پھر میں اس آرٹ ٹیچر کے پاس بیٹھنے سے کترانے لگی......یہی خیال آتا کہ اس کا میرے ساتھ بیٹھنے کا مطلب ہے کہ میں نالائق ہوں...... بدصورت ہوں......

اسکول کی والدین، استاد کی ماہانہ ملاقات کے دن میری آرٹ ٹیچر بھی میری امی سے ملیں اور بہت سالوں بعد امی کو مجھے بتانا یاد آیا کہ آرٹ ٹیچر نے میری کہانی بُننے کی عادت کو بہت سراہا تھا......اس دن امی جب گھر آئیں تو انہوں نے مجھے بہت پیار کیا پھر خوش دلی سے پوچھا کہ اچھا بتاؤ تو سہی آرٹ ٹیچر تمہارے ساتھ ہی کیوں بیٹھتی ہیں......میں نے شرم سے سر جھکا لیا اور ہلکے سے کہا۔

''کیونکہ میں بدصورت ہوں ناں۔''

دوسری بار، میں آٹھویں جماعت میں تھی۔ ہمارے حساب کے استاد ویسے تو بہت سخت تھے اور حساب کے علاوہ کوئی زبان جانتے ہی نہیں تھے مگر جب کبھی معجزہ ہوتا اور وہ مسکراتے تو میں دیکھتی کہ ان کے دونوں گالوں پر بڑے، بڑے گڑھے پڑ جاتے تھے۔

''ہائے۔'' میں دل میں سوچتی......''کتنے پیارے ہیں سر کلیم......بالکل دولہا لگتے ہیں۔'' مگر میری قسمت کہ میں حساب میں حد سے زیادہ نالائق تھی مگر اُن کی وجہ سے باقاعدہ کلاس ضرور لیتی تھی۔ پھر ایک دن وہ میری نالائقی پر ایسا تپ گئے کہ ان کے ہاتھ میں جو گز بھر والا فٹا تھا انہوں نے چٹاخ سے میرے بازو پر مارا۔

آٹھویں کلاس کی لڑکیاں نہ تو بچیاں ہوتی ہیں نہ لڑکیاں......ان سے آپ کو لڑکیوں جیسا لحاظ کرنا پڑتا ہے اور بچیوں کی طرح سلوک روا رکھنا پڑتا ہے......میں شرم سے پانی، پانی ہوگئی......میں نے نظریں اٹھا کر اُن کی طرف دکھ سے دیکھا ہی تھا کہ میری ایک آنکھ میں آنسو امنڈ آیا اور لمحے بھر میں لڑھک بھی گیا......ان کو بھی شاید اپنی غلطی کا اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی کر گئے ہیں لہٰذا باقی وقت وہ مجھے نظر انداز کرتے رہے مگر کیونکہ وہ سخت مزاج استاد تھے لہٰذا کسی نے اس بات کا نوٹس نہیں لیا اور کلاس بالآخر اختتام پزیر ہوگئی۔

تیسرے دن میری حساب کی کاپی چیکنگ کے بعد مجھے ملی تو اس میں ایک کارڈ ملا......اوپر لکھا تھا۔

''آئی ایم سوری......'' اندر لکھا تھا۔

''اس پیاری اسٹوڈنٹ سے معافی کا طلب گار جو صرف ایک آنکھ سے روتی ہے۔'' میں نے سرشار ہو کر جھٹ کارڈ اپنی ایک دوست کو دکھایا۔ اس نے پہلے مجھے پھر کارڈ کو پھر مجھے دیکھا اور پھر گویا ہوئی۔

''بڑے چیٹر ہیں یہ تو......''

''کیسے؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

اس نے بتایا وہ ایسے کہ آج میں جب اسٹاف روم میں کاپیاں لینے گئی تو وہ سر رحیم سے باتیں کر رہے تھے اور کچھ یوں کہہ رہے تھے۔ ''دیکھا تو یہی گیا ہے کہ بدصورت لوگ بڑے لائق فائق ہوتے ہیں مگر یہ...

بدعقل ہی رہ گئی بیچاری...... ''ان کے ہاتھ میں تمہاری ہی کاپی تھی۔ پھر وہ دونوں خوب ہنسنے لگے اور مجھے دروازے پر کھڑے دیکھ کر ایک دم چپ ہوگئے......''اس کے بعد میری دوست مجھے دلاسا دینے والے انداز میں بولی۔

''میری مانو وہ تم کو بنا رہے ہیں۔''میرا دل بجھ گیا۔ان کا پیریڈ ہفتے میں دو دفعہ صبح کے وقت ہوتا تھا میں نے پھر ان کا پیریڈ لیا ہی نہیں کبھی دیر سے جاتی کبھی چھٹی ہی کر لیتی...... رزلٹ لینے میں اپنی امی کے ساتھ گئی تو وہ لپک کر آگے آئے......امی سے سلام دعا کی۔

''یہ تو کافی دنوں سے میری کلاس میں غیر حاضر ہو رہی ہے۔''سر کلیم نے امی سے کہا۔

''ہاں یہ کچھ دنوں سے بیمار رہی......اس وجہ سے چھٹیاں ہو گئیں......''امی نے میرا ساتھ یوں دیا۔

''کیوں......؟''انہوں نے پہلی دفعہ مجھ سے نظریں ملائیں اور گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

''میں نے سر جھکا لیا اور دل میں کہا......''کیونکہ میں بدصورت ہوں۔''

☆☆☆

کالج میں میری ہم جماعتوں سے کم بنتی تھی......میں تنہائی پسند تھی اور زیادہ دیر مجھ سے باتیں کی ہی نہیں جاتی تھیں...... پہلے سمسٹر کے سالانہ امتحان ہو رہے تھے اور وہ میرے برابر والی کرسی پر بیٹھا تھا......میں جو ایک سوال پر اٹکی ہوئی تھی یہی سوچ رہی تھی کہ کیسے کروں......میری نظر گھومتے گھماتے اس پر ٹھہری تو وہ مسکرایا۔

''کیا ہوا......پانچواں، لازمی ہے کر لیا؟

''کہاں سے کروں اتنا مشکل ہے۔''میں نے جھنجلا کر کہا۔

اس نے جھٹ ایک چھوٹا سا کاغذ کا بنڈل میری گود میں ڈال دیا۔آئی ہوئی نعمت کو کیسے ٹھکراتی۔

''مجھے چیٹنگ نہیں آتی، پکڑی جاؤں گی تو آپ کا بنڈل بھی جائے گا۔''میں نے معصومیت سے کہا۔

''کوئی بات نہیں میں خیال رکھ رہا ہوں تم جلدی، جلدی ہاتھ چلاؤ۔''میں ابھی آخری سطروں پر ہی تھی کہ اس نے گھسیٹ کر کھلے ہوئے بنڈل کو دوبارہ سمیٹا اور اپنے ایک کلاس فیلو عمران جو کلاس کی دوسری سمت بیٹھا ہوا تھا اس کی طرف اچھال دیا۔

''لے تو بھی کر لے کیا یاد کرے گا۔''

میں نے دل میں سوچا......''کتنا اچھا انسان ہے......چیٹنگ بھی کتنے خلوص سے کرواتا ہے۔''فائنل سمسٹر کے بعد اس کی بھابی اور بہن ہمارے ہاں آئیں تو مجھے ایسے نظر انداز کرتی رہیں جیسے میں نے کوئی سلیمانی ٹوپی پہن رکھی ہے اور ان کو نظر ہی نہیں آرہی...... حالانکہ وہ میری وجہ سے ہی آئی تھیں۔وہ دونوں امی سے ہی باتیں کرتی رہیں۔

''فیصل تو بہت رنگین مزاج ہے۔''بھابی نے امی کے کسی کام سے ڈرائنگ روم سے باہر جاتے ہی اپنی نند سے کہا۔

''ہاں ایک سے ایک خوب صورت لڑکی سے دوستی کر رکھی ہے بھیا نے۔''بہن بھی جھٹ بولی۔

''صحیح کہہ رہی ہو......بس یہ پہلا اتفاق دیکھ رہی ہوں۔''بھابی پھر بولیں۔اور ایک دفعہ پھر میرا دل بجھ سا گیا۔اس کے بعد اس کی امی نے ہمارے یہاں آنے کا کہا تو امی نے مجھ سے پوچھا۔میں نے صاف انکار کر دیا۔امی نے یوں تو کچھ نہیں کہا بس مجھ سے اتنا ہی بولیں کہ......

''اگر ایسی بات نہیں تھی......تو تم کو لڑکے کو ایسی امید دینی ہی نہیں چاہیے تھی۔''میں ان کی بات پر حیران رہ گئی۔

پھر ان کے ہاں سے دو تین بار فون آیا مگر امی نے ٹال دیا۔

''آج تو شادی میں جا رہے ہیں۔پھر کبھی سہی......''

''آج تو پھپو کے ہاں دعوت ہے پھر کبھی

سہی......"

"اس ہفتے تو بڑی بہن کے ہاں رہنے جارہے ہیں......لہٰذا......" اب خاموش کالز آنے لگیں...... ایک دن امی تنگ آگئیں اور آکر مجھ سے کہنے لگیں۔

"جاؤ جاکر فون اٹھاؤ اور دوٹوک الفاظ میں بات ختم کرو......"

"ہیلو......" میری آواز پر دوسری طرف سے لمبی سانس لی گئی اور وہی سوال دُہرایا گیا۔ "کیوں......؟"

میرے پاس بھی وہی جواب تھا۔ "کیونکہ میں... بدصورت ہوں۔"

☆☆☆

عمر کی پختگی نے سمجھایا کہ خوب صورتی یا بدصورتی کچھ نہیں ہوتی......ہم سب اللہ کی مخلوق ہیں، ہم میں اگر ایک کے پاس نرم مزاج دل ہے، مثبت اور اچھی سوچ رکھنے والا دماغ ہے اور صحت مند جسم ہے تو وہ ایک بہتر انسان کہلایا جاسکتا ہے۔ جس کے ساتھ زندگی بھی گزاری جاسکتی ہے......پھر اس پر خوب صورت یا... بدصورت کا لیبل لگا کر اسے کمتر یا برتر نہیں بنا سکتے......مگر یہ تو میرے خیالات تھے ناں......دنیا تو اسی رفتار سے خوب صورت اور بدصورت کی دوڑ میں لگی ہوئی تھی......اور ایسے میں ہم جیسے بدصورتوں کے ایسے خیالات پر دنیا یہی جواب دیتی ہے کہ......"انگور کھٹے ہیں تب ہی۔" میں چلتے، چلتے خود کو سمجھاتے، سمجھاتے تھک گئی......میں اپنا راستہ الگ کرلینا چاہتی تھی مگر یہ بھی جانتی تھی کہ امی کے ہوتے یہ ناممکن ہے۔ آخر وہ ماں تھیں جیسے، جیسے میری عمر بڑھ رہی تھی امی بھی ہر طرح کے رشتوں کو گھر پر بلانے لگی تھیں۔

چچی جان نے امی کو باور کرایا کہ آنے والے رشتے کی جو ڈیمانڈز ہیں وہ جائز ہیں۔

"دیکھیں ناں آپ کی بڑی بیٹی کی شادی تو فوراً ہی ہوگئی تھی......خوب صورت تھی ناں......آج کل تو آپ کی لڑکی بہت خوب صورت ہو یا پھر اس کے ساتھ خوب سارا جہیز ہو......تب ہی لڑکے والے ہاں کرتے ہیں۔"

اور یوں وہ لوگ میری پریڈ دیکھنے بلا لیے گئے......بابا جانی امیدوار کی بات جان کر بجھے، بجھے سے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے......میں دل ہی دل میں تقریر بنا رہی تھی......میں جو زبان ہلانا نہیں جانتی تھی آج زبان چلانے کے موڈ میں تھی۔ امی بھی کچھ بوجھ چکی تھیں لہٰذا انہوں نے مجھے تھوڑی ہی دیر میں واپس کمرے میں بھیج دیا تھا۔ مگر ان امیدوار نے خود کو مختلف بتانے کے چکر میں امی سے کہا۔

"بھئی میں تو لڑکی سے سننا چاہتا ہوں کہ اسے میں پسند ہوں......یا...؟"

امی نے انہیں یقین دلایا کہ لڑکی آپ کی تصویر دیکھ چکی ہے مگر وہ بضد ہوگئے۔ آخر امی مجھے لے کر آئیں وہاں زور و شور سے کھانا پینا چل رہا تھا۔ سب میری طرف متوجہ ہوگئے اور بچے کونے کھدروں میں ٹی کھی کرنے لگے......اور اس سمے جو بھی میں نے یاد کیا تھا سب بھول گئی......جو تقریر بنائی تھی اس کا سرا تک پکڑائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک دو بار منہ کھولا بھی تو الفاظ زبان پر نہ آئے......تبھی وہ صاحب شانِ بے نیازی سے گویا ہوئے۔

"جی جناب......آپ سے پوچھنا ہے کہ آپ کو میرا رشتہ پسند ہے......آپ راضی ہیں ناں......؟"

میں ڈگمگا گئی......دھڑکن تیز ہوئی اور کانوں میں سائیں، سائیں ہونے لگی......میرے منہ سے... یہ مشکل نکلا......

"میں معافی چاہتی ہوں مگر مجھے یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔"

سب کو سانپ سونگھ گیا......بابا جانی کھل اٹھے۔

"کیوں؟" صاحب کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

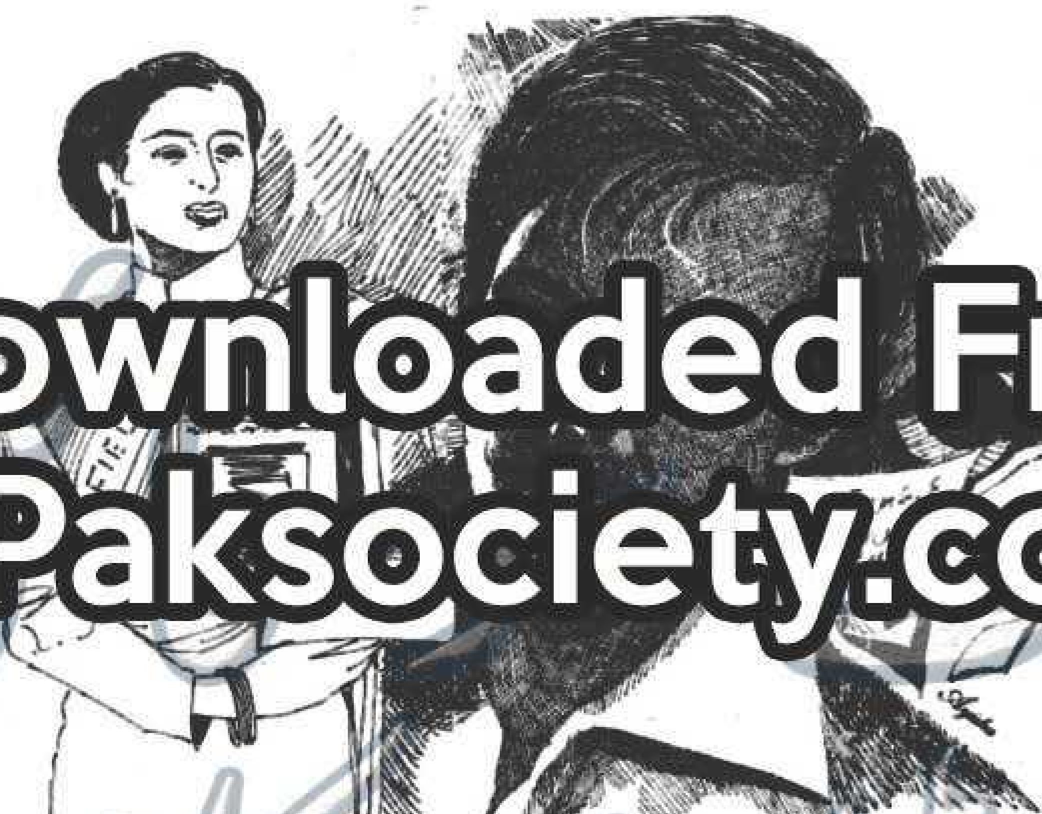
اب تک میں پُرسکون ہوچکی تھی......اسی سرد سے میں نے پھر جواب دیا۔

"کیونکہ میں بدصورت تو ہوں مگر بے وقوف نہیں ہوں۔"

✲

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-





ندامت

صبا اکرم

رشید صاحب اپنے آفس میں پریشانی سے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ گزشتہ رات جب انہیں پولیس اسٹیشن سے اپنے بیٹے کے ہیروئن بیچنے کے کیس میں پکڑے جانے کی اطلاع موصول ہوئی تو انہیں ایسا محسوس ہوا کہ ان کی پوری زندگی کی عزت خاک میں مل گئی ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کے حوالے سے کیا کیا خواب دیکھے... اسے اپنے بڑھاپے کا سہارا سمجھتے تھے لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ وہی بیٹا عمر کے اس حصے میں

اب انہیں تھانے کچہریوں کے چکر لگوائے گا۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی عاجزی وانکساری میں گزاری تھی، انہیں نہیں یاد پڑتا کہ کبھی انہوں نے کسی کے ساتھ کچھ برا کیا ہو۔ پھر ایسا کیوں ہو رہا تھا کہ انہیں اپنی اولاد کی طرف سے ذلت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

وہ معاشرے کی ایک جانی پہچانی شخصیت تھے ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا مگر اب یہ بات انہیں معاشرے میں منہ دکھانے کے لائق نہ چھوڑتی۔ اپنے ذہن میں بہت سی سوچوں کا بھنور لیے وہ اپنے آفس سے گاڑی لے کر نکلے۔ ان کی ذہنی حالت اتنی ابتر تھی کہ انہیں سامنے سے آتی دوسری گاڑی دکھائی نہ دی۔ دونوں گاڑیوں کے تصادم سے جانی نقصان ہونے سے تو بچ گیا لیکن ان کے جسم پہ جابجا چوٹیں ضرور آ گئیں۔ بے ہوشی کی حالت میں ہی انہیں اسپتال منتقل کیا گیا۔ ہوش میں آنے پر انہوں نے اپنے جسم کو حرکت دینے کی کوشش کی لیکن بازو میں شدید درد کی وجہ سے ان سے اٹھا نہیں گیا۔ بازو پہ بندھا پلستر دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جب اولاد ہی بازو نہ بن پائی تو یہ بھی کیسے سلامت رہتے۔

انہیں اٹھتا دیکھ کر نرس جلدی سے ڈاکٹر کو بلا لائی۔ ڈاکٹر نے انہیں پرسکون رہنے کی تلقین کی اور ان کا بازو آہستہ سے سہلانے لگا۔ رشید صاحب نے بہت غور سے ڈاکٹر کے چہرے کی طرف دیکھا انہیں اس کا چہرہ کچھ شناسا سا لگ رہا تھا آخر کار وہ پوچھے بنا نہ رہ سکے۔

”بیٹا آپ کا نام کیا ہے۔“

”افراہیم ارسلان۔“ ڈاکٹر نے مشفقانہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ رشید صاحب کے دماغ میں ایک دم جھماکا ہوا۔ وہ آج سے پندرہ سال پہلے کسی واقعے میں محو ہو چکے تھے جب ایک دفعہ کچھ ڈاکو ان کے آفس میں گھس آئے تھے اور ان کی کنپٹی پہ پستول کی نالی رکھ کر روپیہ پیسہ ان کے حوالے کرنے کا حکم دے رہے تھے تب ہر کسی کو اپنی جان بچانے کی فکر تھی حتیٰ کہ سیکیورٹی گارڈ بھی کچھ نہیں کر پایا تھا ایسے میں ان کے آفس کے چپڑاسی محمد ارسلان نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر پولیس کو انفارم کیا تھا کچھ ہی دیر میں پولیس کی گاڑی کا سائرن سن کر ڈاکو سارا مال چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے تھے اس واقعے کے بعد انہوں نے محمد ارسلان کو انعام دینے کی کوشش کی لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جان بچانا تو اس کا فرض تھا۔

وہ اب اس پر پہلے سے بھی زیادہ بھروسا کرتے تھے اس واقعے کے کچھ دن بعد ہی ان کے آفس میں.... پندرہ لاکھ روپے کی چوری ہوئی ان کے آفس کے کچھ آدمیوں نے کہا کہ انہوں نے ارسلان کو ان کے آفس سے مشکوک انداز میں نکلتے دیکھا تھا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا بھی لگ رہا تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ ڈاکو بھی ارسلان کے ہی بھیجے ہوئے تھے اور خود ہی وہ انہیں پکڑوا کر آپ کا اعتماد جیتنے میں کامیاب ہو گیا اور اب آسانی سے چوری بھی کر لی۔ یہ بات ان سے اتنے وثوق سے کی گئی کہ انہیں اس بات کا یقین آ گیا۔ بدگمانی کی پٹی ان کی آنکھوں پر بندھ چکی تھی انہوں نے ارسلان کو اپنے آفس میں بلایا اور بغیر تفتیش کے ہی سب کے سامنے اس کی بے عزتی کی۔ ارسلان نے انہیں کئی بار کہا کہ سر میں ایک ایماندار انسان ہوں اور ایک عرصے سے آپ کے ہاں ملازمت کر رہا ہوں، چوری میں نے نہیں کی لیکن رشید صاحب نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔ ارسلان کا ایک ہی بیٹا تھا جو رشید صاحب کے ہاں اپنے باپ کے ساتھ کام کرتا تھا۔ اس نے رشید صاحب کی بہت منتیں کیں کہ اس کا باپ بے قصور ہے انہوں نے کچھ نہیں کیا لیکن بجائے اس چودہ سالہ بچے پہ ترس کھانے کے انہوں نے اسے چور کا بیٹا کہہ کر دھکے دے کر باہر نکال دیا۔

پولیس کی تفتیش کے تحت اصل مجرم وہ تھے جنہوں

نے ارسلان پہ تہمت لگائی تھی تب انہیں ایک بار احساس ہوا تھا کہ انہوں نے محمد ارسلان کے ساتھ اچھا نہیں کیا لیکن چوری شدہ پیسے ملنے کے بعد معاملہ رفع دفع ہو گیا تو انہوں نے بھی پھر کبھی اس بات کی طرف توجہ نہیں دی تھی کہ اس سے قبل کر وہ اپنی غلطی کا ازالہ کر لیتے اب تک تو یہ بات ان کے ذہن سے بالکل ہی محو ہو چکی تھی۔ ''تو کیا یہ اسی غلطی کی سزا ہے میرے لیے جیسے میں نے اسے ذلیل کر کے اپنے آفس سے نکالا تھا ویسے ہی اب میں دنیا کے سامنے رسوا ہو جاؤں گا۔'' وہ سرگوشی کے انداز میں خود سے مخاطب تھے۔ ندامت کے آنسو ایک روانی سے ان کی آنکھوں سے رواں تھے۔

''مجھے تو شاید معافی مانگنے کا بھی حق نہیں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے دونوں ہاتھ ڈاکٹر افراہیم کے سامنے باندھ دیے۔ ڈاکٹر افراہیم نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور انہیں بتانے لگا۔

''میں نے اور میرے والد نے کبھی بھی آپ کے بارے میں برا نہیں سوچا۔ ہمیشہ آپ کے لیے دعا ہی کی کیونکہ ہم جانتے تھے کہ ہمارے خلاف آپ کو بھڑکایا گیا تھا اور آپ محض ایک غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔ اگر آپ ہمارے ساتھ ایسا نہ کرتے تو شاید میں آج اس مقام پہ نہ کھڑا ہوتا۔'' وہ ان سے نہایت انکساری سے بات کر رہا تھا۔

''آپ نے جب مجھے دھکے دے کر آفس سے نکالا تو میں سڑک پہ بے مقصد گھومتا رہا پریشانی کی حالت میں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں اچانک سڑک پہ پڑے پتھر سے ٹکرا کر منہ کے بل گر پڑا میرے پاس ایک گاڑی آ کر رک گئی اس میں موجود فرشتہ صفت انسان نے مجھے اٹھایا اور اسپتال منتقل کیا۔ میں نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتایا تو اس نے میرے والد کو نہ صرف نوکری دی بلکہ میری تعلیم کے تمام اخراجات بھی انہوں نے اٹھائے۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی وہ مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھتے ہیں۔''

وہ عجیب سی کہانی سنا رہا تھا اور رشید صاحب اپنی تکلیف بھول کر اس کی کہانی سن رہے تھے۔

''میرے والد تو اب کافی ضعیف ہو چکے ہیں اب وہ گھر پہ ہی ہوتے ہیں۔''

''بیٹا! مجھے اپنے والد سے ملوا سکتے ہو؟ مجھے ان سے معافی مانگنی ہے۔'' رشید صاحب نے اسے التجائی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا پھر انہوں نے اپنے بیٹے کے بارے میں بتانا شروع کیا کہ کس طرح وہ جیل میں گیا اور اس سب کا وہ خود کو ذمے دار سمجھ رہے تھے کہ انہیں ان کے غلط فیصلے کی سزا مل رہی تھی۔ ڈاکٹر افراہیم کا جواب نہ پا کر انہوں نے دوبارہ اصرار کیا کہ ان کا ضمیر مطمئن نہیں ہوگا جب تک کہ وہ ان سے یعنی ارسلان سے معافی نہ مانگ لیں گے۔

ڈاکٹر افراہیم نے ان سے نہ صرف اپنے والد سے ملوانے کا وعدہ کیا بلکہ اس نے ان کے بیٹے کے کیس کے بارے میں بھی خود سے تفتیش کروانے کا بھی وعدہ کیا۔

اگلے دن ڈاکٹر افراہیم اپنے والدِ محترم کو ہمراہ لایا تا کہ رشید صاحب سے ملوا سکے اور جب رشید صاحب نے محمد ارسلان کو دیکھا تو بھیگی آنکھوں کے ساتھ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ محمد ارسلان مالی طور پر مستحکم ہو چکا تھا مگر وہ پھر بھی رشید صاحب سے کسی کمزور ماتحت کی طرح ہی ملا۔ ڈاکٹر صاحب نے رشید صاحب کے بیٹے کے کیس کی تفتیش کروائی تو پتا چلا کہ محلے کے لڑکوں کی انتقامی کارروائی کے نتیجے میں اسے اندر کرایا تھا۔ اگر ڈاکٹر افراہیم اس کی مدد کو نہ آتے تو وہ جیل میں ہی پڑا رہتا۔ آج رشید صاحب کو اپنے کیے پر سخت ندامت تھی مگر ڈاکٹر افراہیم اور محمد ارسلان نے انہیں دل سے معاف کر دیا تھا۔

یہ کہاں آ بچیں کہ دل ہے......

رفعت سراج

بنی اسرائیل کا سونے کا بچھڑا آج ڈالر، پونڈ، یورو، درہم و دینار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔
دل جذبات کا استعارہ ہے مگر اب وہ دل کہاں...
سونے کے بچھڑے میں دل بھی سونے کا ہے...
دل کو رویا جاتا ہے، جگر کو پیٹا جاتا ہے...
کبھی ناقدروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، یاریاں ٹوٹ جاتی ہیں۔
الزام تراشیوں کا ایک طوفان بد تمیزی برپا ہو جاتا ہے۔
دل سے دل کو راہ بھی ہوتی ہے...
آج کا انسان بہ راہ سٹیلائٹ کے ذریعے search کرنے کی کوشش کرتا ہے۔
دل اور سونے کا بچھڑا...
عبادات، معاملات...
جنتِ گم گشتہ کی ہے دخل باسیوں کی ازلی کہانی...

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

قسط: 3

''شکاگو سے بڑی ہاٹ نیوز آئی۔ ڈیموکریٹک پارٹی نے روز ویلٹ کو تیسری مرتبہ صدر بنانے کی تجویز دی۔ امریکی جتنا خوش ہوئے ہوں گے اتنا ہی برطانیہ میں خوشی کا اظہار کیا گیا۔ 8 اگست 1940ء کو میری تیرھویں سالگرہ ہوئی......ٹھیک نو دن بعد جرمنی نے برطانیہ کے سمندروں کے اردگرد اپنی طاقت کا مظاہرہ کیا......اور یہ سب ہمیں اچھا نہیں لگ رہا تھا۔'' لیڈی صوفیہ خانزادہ نے خاصے وقفے کے بعد سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور اپنی سوئس لان کی پھول دار ساڑی کا آنچل سنبھالا۔

پرنس کافی مگ ہاتھ میں لیے اٹالین ونڈو سے لان میں نئے کھلنے والے پھولوں پر نظر جمائے پر دادی کی یادداشتوں کو ہمیشہ کی طرح بہت صبر سے سن رہا تھا۔



''گریٹ مام آپ نے فرینکلن روز ویلٹ کی بات کی تو مجھے روز ویلٹ کی ایک بہت خوب صورت بات یاد آگئی۔اس نے کہا تھا۔

"happiness lies in the joy of achievement and the thrill of creative effort"

what,s a" لیڈی صوفیہ نے اپنی پیشانی پر بے ساختہ ہاتھ رکھا۔ "good,God" تم کتنے لکی ہو پرنس۔تم نے خوشیوں کے راستے تلاش کر لیے ہیں مگر میں تو happiness, what,s a joy سورج مکھی کا پھول ہوں......اگر چہ سورج ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا ہے مگر میرے ذہن کے پردے پر تو ہر پل روشن ہے......میں تو سورج کی ڈائریکشن کے ساتھ ہوں۔'' لیڈی صوفیہ کی آواز بھرا گئی......آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

''عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ غم زندگی کم کرتا ہے......مگر یہ اللہ کی رحمت ہے کہ آپ کو اچھی عمر ملی......اور میری گڈ لک کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔'' پرنس نے لیڈی صوفیہ کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''تم بھول رہے ہو پرنس......اور میرے لیے یہ مزید دکھ کی بات ہے کہ تم مجھ پر ٹوٹنے والی قیامت بھول چکے ہو۔یاد رہے کہ میری اوپن ہارٹ سرجری ہو چکی ہے۔'' لیڈی صوفیہ کی آواز کا زور ٹوٹتا گیا۔

''آئی ایم سوری مام......میں واقعی بھول گیا تھا۔'' پرنس نے عجلت کے انداز میں غم کی فضا زائل کرنے کی کوشش کی۔

''باقی داوے تکلیف وہ وقت کو بھلانے کی کوشش کرنی چاہیے۔'' یہ سن کر لیڈی صوفیہ غصے سے کانپنے لگیں۔

''ایک یاد کے سوا مجھے کچھ یاد نہیں......اس کا خیال آتے ہی بے شمار منظریوں گرنے لگتے ہیں جیسے خزاں کے پتے ہلکا سا جھونکا پاکر اڑ کر اپنی اوقات بتا دیتے ہیں،تم میرے درد کو سمجھ ہی نہیں سکتے......ایک ہی شخص تھا جو میری ذات کے سارے رنگوں کو پہچانتا تھا۔میں اب تمہیں کمپنی نہیں دے سکتی......آئی ایم سوری......مجھے کبھی کسی کے سامنے آنسو بہانا اچھا نہیں لگا......مگر تمہارے سامنے ہزاروں بار روئی ہوں،اس امید کے ساتھ کہ شاید تم میرے رونے پر نہیں ہنسو گے۔'' یہ کہہ کر وہ مغموم چہرے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

پرنس بھی ان کے مقابل سرو قد کھڑا ہو گیا۔

''آئی ایم سوری گرینڈ مام......میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا میں تو آپ کو agony (روحانی اذیت) سے نجات دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔آپ ہی تو میری ٹوٹل فیملی ہیں۔میری گرینڈ مام میرے ساتھ رہتی ہیں،یہ آنر ہے میرے لیے......ورنہ میں سوسائٹی میں کس کس کو بتاتا کہ میں کون ہوں؟ میں تو آپ کے بغیر اپنی زندگی کو ادھورا دیکھتا ہوں،گریٹ مام...... extremely sorry ,sorry again'' پرنس نے دادی کے سامنے عاجزی سے ہاتھ جوڑ دیے۔

لیڈی صوفیہ نے پرنس کے بندھے ہوئے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چوم لیے۔

''میں ہمیشہ تمہارے لیے بہت دعا کرتی ہوں......اور ایک دعا تو روز کرتی ہوں کہ خدا نہ کرے تم کسی کے عشق میں مبتلا ہو......یہ عشق انسان سے اپنا آپ چھین لیتا ہے۔عشق تو ایسی زنجیر ہے جو روح کو جکڑ لے تو قبر تک باندھے رکھتی ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے پرنس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔پھر اس کی آنکھوں کے بوسے لیے۔

''ہر پل دعا کرتی ہوں کہ تم ہمیشہ خوش رہو۔عشق کی آگ سے اللہ بچائے۔پیارا سا ساتھی تمہیں ملے......شادی کو بس سوشل کانٹریکٹ کی طرح چلاؤ،اسی میں سکھ ہے۔عشق تو ایک جہنم ہے۔'' آخری جملہ بڑبڑاہٹ کے انداز میں ادا کیا اور محتاط قدم رکھتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔پھر پلٹ کر ذرا کی ذرا مسکرائیں۔پرنس



بھی مسکرا دیا۔ پردادی کے عشق کی آنچ چار سو پھیلی ہوئی تھی...... دوشیزگی کے آغاز میں دل جس سے مل گیا تھا دوبارہ نہیں ملا۔

ہی پردادی کی بدولت اس پر انکشاف ہوا تھا کہ وہ ایک تخلیق کار ہے۔ نوعمری ہی میں ذہن کے وہ دریچے بھی کھل گئے تھے۔ جو شاذ و نادر کسی حادثے کے بعد ہی کھلتے ہیں۔

پردادی کے عشق کی یادداشتیں، ریاضتیں ایک سُر کی طرح بکھرتی تھیں اور اس کا برش کینوس پر رقص کرتا تھا۔

☆☆☆

''اماں کچھ تو خیال کریں...... اتنا غریب مینجر رکھا ہوا ہے آپ نے۔'' زارا اپنے بے ڈھب انداز میں چلتی ہوئی تاجور کے بیڈروم میں داخل ہوئی اور بولنا شروع کر دیا۔

تاجور ایک بزنس پارٹی میں جانے کے لیے اپنی تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ بالوں میں رولر لگے ہوئے تھے، کلینزر سے چہرہ صاف کر رہی تھیں۔ انہوں نے سرسری آئینے میں زارا کی طرف دیکھا۔

''بہت بری عادت ہے تمہاری...... چیپٹر انا ؤنس کیے بغیر پیراگراف پڑھنا شروع کر دیتی ہو۔'' انہوں نے سرزنش کے انداز میں کہا۔

''اماں آج کل سب کچھ شارٹ کٹ میں چلتا ہے۔ میں نے مینجر کہا تو اس کا مطلب آپ خود سمجھ جائیں کہ میں کس کی بات کر رہی ہوں...... اماں بیچارے کو بنیادی فیسلیٹیز تو دیں ناں...... مین روڈ پر اپنی پرانی

بائیک کے ساتھ بیٹھا ہوا بہت ہی غریب لگ رہا تھا۔"

"اوہ...... کہیں روڈ پر دیکھا ہے تم نے؟ خیر، وہ ابھی نیا ہے ناتجربہ کار ہے ذرا میں خود اس سے مطمئن ہو جاؤں تو سب کچھ مہیا بھی کر دوں گی...... تمہیں زیادہ ہمدرد بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ its... mind it none of your buisness" تاجور نے گویا اچھی خاصی جھاڑ پلادی تھی۔

"اماں، بزنس ہے ناں...... کسی کو پتا چل گیا یہ غریب سا بندہ ہماری کمپنی کا منیجر ہے تو انسلٹ تو ہماری ہی ہوگی ناں......" اس نے سائڈ ٹیبل سے ایک خوب صورت سا جار اٹھایا جس میں بھنی ہوئی سونف اور مصری کے ٹکڑے تھے۔

"کیا اتنی دیر سے غریب، غریب کیے جا رہی ہو...... اچھا خاصا ہے، کوئی غریب وریب نہیں لگتا۔ اس کی پرسنالٹی کی وجہ سے تو میں نے اسے یہ سیٹ دی ہے۔"

"اماں، کار بھی دے دیں۔" زارا نے جلدی سے قطع کلامی کی، انہوں نے اسے گھور کر دیکھا۔

"کار ہے ڈیری ملک پیک نہیں ہے۔ انسان کو کوئی چیز محنت کے بعد ملتی ہے تو اسے اس کی ویلیو کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ میرے ذاتی معاملات ہیں، تمہیں انٹرفیئر کرنے کی ضرورت نہیں۔" تاجور نے چہرے کی صفائی سے فراغت پا کر اس کے قریب آ کر باقاعدہ اس کا شانہ ہلا کر اپنی بات کا وزن محسوس کرانے کی کوشش کی۔

"او کے...... بس یونہی مجھے غریب لوگوں کو دیکھ کر کوفت ہوتی ہے۔"

"اسٹوپڈ...... غریب لوگوں کو دیکھ کر دکھ ہوتا ہے، کوفت نہیں، سمجھیں۔" تاجور نے اب مصنوعی غصے سے اس کا کان پکڑ کر تصحیح کی۔

"نہیں ناں...... مجھے سچ مچ کوفت ہوتی ہے۔ میں تو دعا کرتی ہوں کہ اللہ میاں ہر غریب کو کم از کم ایک فریج، ایک اسپلٹ، ایک ٹیکو گیس اوون، ایک آئرن ضرور دے ورنہ سب مر ہی جائیں...... اتنی مشکل زندگی کس کو اچھی لگتی ہوگی اماں......؟" زارا نے ہتھیلی پر سونف جمع کریں، دیکھا جیسے پرندہ اڑان سے پہلے پر تولتا ہے پھر ایک لمحے میں پھانک لی۔

"بیٹا...... انسان جس ماحول کے لیے پیدا ہوتے ہیں اسی کے مطابق ان کا ذہن ہوتا ہے...... وہ پیدا ہوتے ہیں پھر وہیں کے عادی ہو جاتے ہیں۔" تاجور نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگانے پر اکتفا کیا۔

"اُف، اتنی مشکل زندگی کے عادی...... پھر تو ان سب کو آرمی جوائن کرنی چاہیے۔" اس نے جار کا ڈھکن لگا کر بہت احتیاط سے رکھتے ہوئے کہا۔

تاجور ہنس پڑی تھیں۔

"بڑی ہو جاؤ...... کب تک بے بی بنی رہو گی؟" وہ وارڈ روب کھولتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"اماں جب میں چھوٹی تھی تو آپ مجھے بے بی کہتی تھیں مجھے بہت اچھا لگتا تھا...... اب زارا کہتی ہیں لگتا ہے زور سے مارا ہے...... کیسا فضول سا نام ہے میرا...... جلدی میں رکھ دیا ہوگا۔" وہ باہر کی طرف جاتے ہوئے منہ بنا کر بڑبڑا رہی تھی۔ تاجور کے چہرے پر لمحے بھر کے لیے سایہ سا لہرا گیا۔

"چلو میں تمہیں اجازت دیتی ہوں کہ اپنی پسند کا نام رکھ لو......" تاجور ڈریس نکالتے ہوئے مسکرا رہی تھیں۔

"لوگ پنکچر بائیک کے ساتھ گزارہ کر لیتے ہیں میرا ابھی گزارہ ہو ہی رہا ہے اس نام کے ساتھ۔" کہتی ہوئی وہ باہر نکل گئی تھی۔ تاجور نے وارڈ روب کا پٹ بند کرتے ہوئے گہری سانس لی۔

"شاید میں نے کہیں loose کیا ہے، اب ڈبل محنت کرنا ہوگی۔" وہ اپنی کوتاہی کا اعتراف کر رہی تھیں۔

☆☆☆

پرنس اسٹوڈیو سے اپنی خواب گاہ کی طرف دھیرج پاؤں دھرتا آرہا تھا مگر اسے چونک کر رکنا پڑا لیڈی صوفیہ غصے میں بھری اسی کی طرف آرہی تھیں۔ سیسے اور چاندی کی ملاوٹ سے تیار شدہ چھڑی فرش پر ٹکائی غضب ناک نظروں سے پرنس کو گھورتی ہوئی۔

چھڑی کا ہاتھی دانت کا دستہ مٹھی میں اس طرح دبو چا ہوا تھا جیسے بھوکی بلی نے کبوتر کی گردن دبوچ لی ہو۔

''میں بھول گئی تھی...... اس لیے کہ میں بوڑھی نہیں بہت بوڑھی ہو چکی ہوں۔ فرسٹ ورلڈ وار کی آگ ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی تو میں پیدا ہوئی تھی۔ میں چشم دید گواہ ہوں دوسری جنگِ عظیم کی......''

''آپ کیا بھول گئی تھیں مام...... میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا؟'' پرنس نے حیران پریشان ہو کر سوال کیا۔

''میں روز ویلٹ کو اچھا نہیں کہہ سکتی...... تم میرے سامنے اس کی تعریف کرنے سے پرہیز کیا کرو۔''

''مگر وہ کامیابی کی باتیں کرتا رہا ہے جس کو آج کی نسل کوٹ کرتی ہے۔''

''اس کی کامیابیوں میں میرے پیارے خاوند کا لہو بھی شامل ہے، یہ بھی یاد رکھو۔''

''آئی ایم سوری مام...... آئندہ خیال رکھوں گا۔'' پرنس نے فوراً معذرت کر کے دادی کو اذیت سے نجات دلانے کی کوشش کی۔

''امریکا جنگ میں سب سے آخر میں کودا...... پرل ہاربر پر جاپان نے حملہ کر دیا تھا۔ ٹھیک ہے جواب دینا بنتا تھا...... مگر وہ تو جنگ بڑھاتا چلا گیا، جنگ جلدی رک جاتی تو وہ بھی گھر آہی جاتا...... اُف یہ جنگی جنونی...... میرے دل کے دشمن......'' پرنس کی معذرت و یقین دہانی کے بعد ان کا غصہ فوراً اتر گیا تھا اب بڑبڑاتی ہوئی وہ واپس پلٹ رہی تھیں۔

☆☆☆

tear no bear(TNB) ایک متحرک و فعال این جی او کے زیرِ اہتمام فنِ مصوری کی نمائش منعقد کی گئی تھی۔

آرٹ گیلری شائقین سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ مصور اپنے فن پاروں کے ساتھ موجود تھے...... اپنے پرستاروں کو آٹوگراف دے رہے تھے...... تاجور کو انویٹیشن ملا تو انہوں نے زارا کو بھیج دیا...... انہیں فنِ مصوری سے لگاؤ تھا نہ زیادہ سمجھ تھی۔ سب سے بڑھ کر ان کی اپنی نہ ختم ہونے والی مصروفیات

زارا کو تو لائف انجوائے کرنے کے لیے بہانوں کی تلاش رہتی تھی، وہ تو موسم کے حساب سے بہترین پوشاک زیب تن کر کے آرٹ گیلری پہنچ گئی۔ لوگ چیریٹی کے جذبے سے سرشار ہو کر مہنگی سے مہنگی پینٹنگ بھی خرید رہے تھے۔

پینٹنگز کے خریداروں کو دیکھ کر قسم کھائی جا سکتی تھی کہ پاکستان میں سب ٹھیک ہے، پرنس شہپر کی پانچ پینٹنگز اس نے گن لی تھیں مگر سب سے زیادہ مہنگی بھی بکی تھیں...... اسے تاجور کی ڈانٹ اور سفینہ کی ملامت کے خوف نے بھی تذبذب میں مبتلا کر دیا تھا۔ خواہش کے پورا نہ ہونے کے احساس نے مزاج میں غم و غصے کی کیفیت پیدا کر دی۔

''کس کے لیے بزنس ایمپائر بنا رہی ہیں اماں......؟ میں اس پینٹنگ کے لیے اپنے ڈائمنڈ ٹاپس سیل کر سکتی ہوں۔'' وہ وہیں کھڑے کھڑے نقد و زر کے حصول کے لیے ذرائع تلاش کرنے لگی...... نظر پینٹنگ پر تھی۔

بڑے، بڑے سرخ گلابوں پر برف گر رہی تھی...... پس منظر میں سفید، سفید برف سے ڈھکے پہاڑ تھے۔ لکڑی سے بنے ہٹ کی کھڑکی سے یہ منظر دکھایا گیا تھا۔ وہ حسرت بھری نظر سے ٹکٹکی باندھ کر مصوری کا شاہکار

دیکھ رہی تھی۔

''اتنی دولت ہے ہمارے پاس......کھڑے، کھڑے کوئی مال خرید سکتے ہیں بس ایک پینٹنگ نہیں خرید سکتے......'' اس کے اردگرد اور بہت سے لوگ مرد وخواتین جمع ہو چکے تھے۔ اسے لگا یہ پینٹنگ اس کے ہاتھ سے نکل رہی ہے۔

وہ کیمرے کی آنکھ سے اس شاہکار کا عکس محفوظ کر سکتی تھی...... مگر اسے تو اصلی...... اور خالص پینٹنگ چاہیے تھی...... جس پر ہاتھ پھیر کر مصور کے برش کا لمس محسوس کیا جا سکتا ہو۔

مقابل بھر کے لیے خاموشی چھا گئی...... یوں جیسے عظیم شخصیت یا کسی واقعے کی یاد میں ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی ہو...... اس نے گردن موڑ کر مجبوراً دیکھا تھا کہ خواہش تجسس پر حاوی تھی۔

سامنے راؤ سلک کا آف وائٹ کرتا اور وائٹ تنگ پاجامہ زیب تن کیے پرنس جلوہ افروز ہوا تھا۔ اس کا پی اے سائے کی طرح اس کے عقب میں تھا اور مخصوص پاؤچ ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھا۔ اس مخملی پاؤچ میں رومال، سگار، لائٹر اور کوئی مہنگی منفرد خوشبو (پرفیوم اسپرے) ہوتی تھی...... اس کا پی اے اتنا تجربہ کار تھا پرنس کا پھیلا ہاتھ دیکھ کر سمجھ جاتا تھا کہ وہ کیا طلب کر رہا ہے۔ پرنس کو اپنے درمیان پا کر شائقین کے جوش وخروش میں اضافہ ہو گیا۔

زارا مبہوت سی دیکھ رہی تھی...... اس نے سوچا اسے پرنس کا کوئی اسنیپ محفوظ کرنا چاہیے تا کہ سفینہ کو دکھا سکے کہ وہ بھی پرنس سے مل کر آئی ہے۔

زارا کا مبہوت انداز...... فنکار کی نگاہ کے کیمرے میں محفوظ ہو گیا مگر بظاہر شانِ بے نیازی تھی۔

عام لوگوں کا خیال ہے فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے خبطی، مدہوش، بے خبرے ہوتے ہیں...... مگر یہ طبقہ سب سے زیادہ چوکس اور موجود لمحے کی نبض پر انگلی رکھ کر اپنے وجود میں دوڑتی زندگی کو محسوس کرتا ہے۔ پرنس کو اپنی انفرادیت، مردانہ حُسن، فنکارانہ صلاحیت، طبقۂ اشرافیہ (ہائی سوسائٹی) کا ایک غیر معمولی رکن ہونے کا بھرپور ادراک و شعور تھا مگر اسے وقت اور انسانوں سے کھیلنے کی خُو...... نہیں تھی۔ اس کا وقار، ساکھ، نیک نام شہرت اس کے حقیقی اثاثہ جات تھے۔

زارا کو بننے سنورنے اور بہترین لباس پہننے کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا اتنے اہتمام سے تیار ہوتی تھی کہ کوئی کسر نہیں رہ جاتی۔ readly کا قیمتی لیدر بیگ شولڈر پر لٹکائے وہ خود حیرت وشوق کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

پرنس یوں اس سے گزر گیا...... جیسے سوار سنگ میل سے گزرتا ہے، زارا کو چونک کر پلٹ کر دیکھنا پڑا۔ اب اس کی آنکھوں کے سامنے پرنس کی پشت تھی۔ بہت سے لڑکے، لڑکیاں اب آٹوگراف کے لیے اس پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ زارا ابھی تصویر دیکھتی کبھی مصور...... ابھی تک اپنی جگہ پر قائم تھی، ایک انچ نہ ہلی تھی۔

عقل پہلے سے زیادہ عالم بیچارگی میں تھی۔ دل پوری قوت سے اڑان بھر رہا تھا۔ وہ تو بڑی سے بڑی خواہش بھی یوں کرتی تھی جیسے بچے بھاگتے ہوئے لان سے پھول توڑ لیتے ہیں۔

دل ٹوٹ کر بے اختیاری میں مبتلا ہوا...... اس وقت فوری ادراک نہیں ہوا...... مگر خواہش معنی میں ڈھل چکی تھی۔

تصویر کے ساتھ، ساتھ مصور بھی چاہیے...... یہ تو اسے بہت آگے جا کر سوچنا تھا۔ لاشعور سے شعور میں اترنے تک خواہش سفر میں ہوتی ہے۔ ابھی تو وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اسے اپنی طرف متوجہ کیسے کرے؟

''اوہ...... آٹوگراف......'' اسے فوراً راہ سوجھ گئی...... شانے سے ہینڈ بیگ اتار کر جلدی، جلدی کھولا اور آٹوگراف کے لیے کوئی کاغذ ڈھونڈنے لگی...... مگر ہینڈ بیگ میں تو ہیئر برش، باڈی اسپرے، لوشن، لپ اسٹک، آئی

پنسل، ویزا کارڈ، لائسنس، کچھ مڑے تڑے نوٹ...... وہ بیگ ٹٹولتے ہوئے ساتھ ساتھ پرنس کی حرکات و سکنات بھی نوٹ کر رہی تھی۔ وہ ابھی تک اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ رش اتنا تھا کہ وہ آگے قدم بڑھا ہی نہیں سکتا تھا۔

بیگ کے اندر موجود اسٹائلش والٹ میں سو، سو کے چند نوٹوں کے ساتھ ایک کڑک پانچ ہزار کا نوٹ بھی نظر آیا...... جو جانے کیسے اس کے ہاتھ سے سرکنے سے بچ گیا تھا۔ ATM سے جس حالت میں ہاتھ آیا تھا اسی طرح ابھی تک بالکل سیدھا تھا۔

اس نے جلدی سے نوٹ نکالا...... بیگ زپ اپ کر کے دوبارہ شانے پر لٹکایا اور تیر کی طرح پرنس کی طرف بڑھی۔ انداز ایسا تھا گویا کمان سے تیر نکل کر نشانے پر پہنچا۔

اس نے بڑھ کر بے ڈھب انداز میں جگہ بنائی اور بڑے بے تکے طریقے سے رش میں گھس گئی۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ پانچ ہزار کا نوٹ فوراً پرنس کی طرف بڑھایا۔ حاضرین نے چونک کر نوٹ والے ہاتھ پھر ہاتھ والی کو دیکھا تھا۔

''آپ کیا خریدنا چاہتی ہیں؟'' پرنس کی حیرت آمیز مسکراہٹ بڑی جان لیوا تھی۔

''آٹو گراف پلیز......''

''امیزنگ...... آپ سے کس نے کہا آٹو گراف سیل ہوتا ہے؟'' پرنس حیرت زدہ سا سوال کر رہا تھا...... اس کے گرد موجود افراد اپنا جوش و خروش بھلا کر بڑی دلچسپی سے زارا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''میں آٹو گراف اس نوٹ پر لینا چاہتی ہوں...... جلدی میں اپنی آٹو گراف بک بھول آئی۔'' اس نے بہت سی نظروں کی تپش سے بوکھلا کر کہا تھا۔

''اس آٹو گراف کے بعد پانچ ہزار، پانچ کروڑ ہو جائیں گے۔ بزنس کا نیا اسٹائل...... واہ بھائی واہ......'' کسی من چلے نے گرہ لگائی۔

''کیوں اتنا اماؤنٹ بلاک کر رہی ہیں......؟ کسی غریب کو دے دیں...... دعا دے گا۔'' پرنس نے نوٹ لینے کے بجائے دوسری لڑکی کی خوب صورت سی آٹو گراف بک تھام لی اور دستخط کرنے لگا۔

''غریب پانچ ہزار زندگی بھر نہیں چلا سکتا...... اور آپ کے آٹو گراف کی کوئی قیمت نہیں لگائی جا سکتی۔ پلیز اسے نوٹ مت سمجھیں اس وقت اسے اچھا سا پیپر سمجھ لیں۔'' زارا بے اختیار سی ہو کر کہہ رہی تھی۔

''میں آپ کو اپنی آٹو گراف بک سے ایک صفحہ پھاڑ کر دیتا ہوں، آپ یہ نوٹ مجھے دے دیں۔'' ایک نو عمر لڑکا جس کی پشت پر کرکٹ بیگ لٹکا ہوا تھا جیسے تڑپ کر بولا تھا۔ زارا نے اس کی طرف گھور کر دیکھا تھا۔

''آپ اپنی حد میں رہیں...... ایکسکیوز می......'' پرنس نے ایک گہری، تولتی ہوئی بظاہر سرسری نظر زارا پر ڈالی اور نوٹ اس کے ہاتھ سے لے کر اس پر بڑے، بڑے جلی حروف میں انگریزی کے دو الفاظ لکھے۔

''stay blessed''

اور نیچے اپنے دستخط کر دیے...... تاریخ بھی ڈال دی اور نوٹ زارا کو تھماتے ہوئے بڑے اعتماد سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ اور ایک دلنواز مسکراہٹ بھی عنایت کی۔

''سر ان کو اپنی ایک پینٹنگ گفٹ کر دیں...... یہ بھی کیا یاد کریں گی۔ کس سخی سے پالا پڑا تھا۔'' کسی شوخ نے فقرہ چست کیا۔

''میں بہت کنجوس ہوں......'' پرنس نے بڑے انداز سے کہا اور آگے بڑھنے لگا۔

جرنلسٹس اور مختلف چینلز کے رپورٹرز کوریج کر رہے تھے۔ بہت دلچسپ لمحات بہت سے کیمروں میں محفوظ ہو گئے۔

زارا بہت غور سے پرنس کے آٹوگراف پر نظر جمائے کھڑی تھی آس پاس سے بے خبر پرنس کے مصوری کے شاہکار دستخط دیکھ رہی تھی۔ جو اس کی پینٹنگز پر نظر آتے تھے۔ "P" کے دائرے میں پرنس کے باقی حروف لکھے ہوتے تھے مگر انگریزی کے بجائے اردو میں یعنی "ر"، "ن"، "س"۔ اس نے خود پر پڑنے والی نظروں کو نظر انداز کر کے بڑے اطمینان سے نوٹ بیگ میں اسی جگہ رکھا جہاں سے نکالا تھا۔

اتنی دیر میں پرنس شہر کی معروف شخصیات کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اپنے پی اے سے ٹشو پیپر لے کر اپنی پیشانی پر چمکنے والا پسینہ پونچھ رہا تھا۔

اپنے بلند قامت ہونے کی وجہ سے وہ بہت نمایاں نظر آتا تھا۔ اندازِ نظر بہت منفرد تھا...... بہت اعتماد سے جم کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا تھا۔ ہمکلام ہوتے ہوئے پلک نہیں جھپکتا تھا اور اس کی آنکھیں مراقبے کی عادی ہونے کی وجہ سے ایک خاص مقناطیسیت کی حامل تھیں جو کسی بھی عام آدمی کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔

ایک عظیم الشان خاندانی پس منظر، روٹی روزی کی کشاکش سے آزاد زندگی، وجاہت، بے نیازی، تخلیق کے عمل سے حاصل ہونے والی بے پایاں مسرتیں...... وہ امتیاز دیتی تھیں جس کا وہ تمنائی نہیں تھا...... مگر زندگی کی طرح خود بخود مل گیا تھا۔ زارا دور کھڑی اسی کو دیکھ رہی تھی، اسی کو سوچ رہی تھی...... پرنس ماحول میں اسی طرح چوکس ہو کر جذب ہوتا تھا جیسے خشک مٹی میں پانی کے قطرے جذب ہوتے ہیں۔

وہ مصور تھا، فن کار تھا جو برش سے انسانی جذبات واحساسات اور صدیوں پر محیط انسانی رویوں کو اجاگر کرتا ہے۔ اس نے زارا کو کھڑے، کھڑے پڑھ لیا کہ وہ اپنی قدر و قیمت سے کماحقہ واقف تھا...... زارا پہلی لڑکی نہیں تھی جس کو "مبہوت" دیکھا تھا...... البتہ پانچ ہزار کے نوٹ پر آٹوگراف لینے والی وہ یقیناً پہلی لڑکی تھی۔ اس نے بہت کچھ محسوس کرتے ہوئے بہت اہتمام سے نظر اٹھا کر زارا کی طرف دیکھا اور اپنی دو انگلیاں wave کرتے ہوئے بطور شکریہ ایک مسکراہٹ ارسال کی اور دائیں طرف گھوم کر شہر کے بہت بڑے بینکر کی طرف متوجہ ہوا...... جو اپنی الٹرا ماڈرن فیشن ایبل بیگم کے ساتھ پرنس سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے آئے تھے۔ زارا کا دل معمول سے بالکل ہٹ کر دھڑکا تھا...... کچھ لوگ اب بھی اِدھر اُدھر آتے جاتے زارا کی طرف دلچسپی سے دیکھ لیتے تھے جن میں زیادہ تر میڈیا کوریج کے لیے آنے والے صحافی خواتین و حضرات تھے...... وہ اس وقت تک وہاں رکی...... جب تک پرنس موجود رہا۔

☆☆☆

سفینہ تین، چار گھنٹے مسلسل اسٹڈی کرنے کے بعد شل ہو کر بیڈ پر آڑی ترچھی ہو کر تقریباً لڑھک گئی تھی۔ ماہین کسی کلاس فیلو کے ساتھ ڈنر کرنے گئی ہوئی تھی، اس نے سفینہ کو صرف آفر ہی نہیں کی تھی بلکہ ہاتھ دھو کر پیچھے پڑ گئی تھی مگر سفینہ سیر ہو کر کھانے کے موڈ میں نہیں تھی۔

نڈھال انداز میں آنکھیں ضرور بند تھیں مگر نیند نہیں تھی...... حالانکہ وہ چاہتی تھی کہ وہ دو تین گھنٹے کے لیے گہری نیند سو جائے۔ شاید زیادہ تھکاوٹ کے باعث نیند اچاٹ ہو گئی تھی۔

کمرے کی گہری خاموشی میں سیل وائبریشن کا تاثر آواز جیسا ہی تھا اس نے چونک کر پٹ سے آنکھیں کھولیں۔ ہاتھ بڑھا کر سیل فون اٹھایا۔ سامنے زارا کا نام جگمگا رہا تھا۔

"اوہ......" اس نے بے دم انداز میں بے اختیار کہا تھا...... اس نے طوعاً و کرہاً کال وصول کی۔

''ہیلو...... السلام علیکم...... دیکھو کوئی بھی بات کرنی ہے تو کل کرنا...... کل سنڈے ہے، کل مجھے صرف کپڑے پریس کرنا ہیں۔ اس لیے بہت ساری باتیں کر سکتی ہوں۔''

''سفینہ، سفینہ...... تم نے ایک ہی سانس میں اتنا سارا کہہ دیا...... اب تو تمہیں میری باتیں سننا ہی پڑیں گی...... کس قدر سیلفش ہو تم...... بلکہ انتہائی مطلبی شاعر جیسی ہو جو اپنا کلام سنا کر بھاگ جاتا ہے۔ دوسروں کا نہیں سنتا......'' وہ بھی جلدی، جلدی بولی کہ کہیں پھر فون ہی بند کر دے۔

''سنو میں پرنس سے مل کر آ رہی ہوں...... تم کیا اس سے ملی ہو گی جس طرح میں مل کر آ رہی ہوں...... واہ...... کیا بات ہے میری......'' اس نے خود کی خود ہی تعریف کی۔

زارا کو شکست دینا سفینہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ بڑے حوصلے سے سن رہی تھی آخری جملے نے اسے واقعی چونکا دیا۔

''پرنس! کہاں ملیں تم......؟ اور کیا گلے مل کر آ رہی ہو؟ اتنا مشکل کام واقعی میں نہیں کر سکتی...... مگر تم تو بہت... باہمت ہو۔'' پرنس کا ذکر چھیڑتے ہی اس کے لہجے میں تازگی سی اتر آئی۔

''انشاء اللہ یہ کام بھی ایک دن کر دکھاؤں گی۔ میں کے ٹو کی چوٹی سر کرنے کی اسپرٹ رکھتی ہوں...... یہ تو بیچارہ پرنس ہے۔'' جملے کے اختتام پر زارا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اب چوکس پن اور تازگی دونوں طرف تھی...... مگر زارا کھل کر اظہارِ مسرت کر رہی تھی جبکہ سفینہ کے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔ ایسا کچھ کہ بڑی نامعلوم سی کیفیت تھی۔ جسے کوئی نام دینے سے وہ قاصر تھی...... وہ توانائی جو الفاظ کو سرگرمی اور حرارت بخشتی ہے یوں معدوم ہوئی گویا جیب کٹ گئی ہو۔

''اچھا تو پھر کیا ہوا......؟ ملنا کس طرح ہوا؟ کسی پارٹی میں گئی تھیں یا ٹریفک جام میں دیکھ لیا تھا؟'' سفینہ نے خیالات کی یورش میں سوال کیا۔

''اُف...... ٹریفک جام میں دیکھتی تو اپنی گاڑی چھوڑ کر اس کی گاڑی میں بیٹھ جاتی...... اور دعا کرتی کہ اللہ میاں پورے دو گھنٹے ٹریفک جام رہے تاکہ میں اس کا پورا انٹرویو کر لوں......'' زارا فطری بے ساختگی سے گویا ہوئی۔

''اور اس انٹرویو کے تمہیں کتنے پیسے ملتے......؟'' سفینہ نے مذاقاً پوچھا۔

''ارے وہ لیجنڈ ہے...... پرسنالٹی ہے...... ایسے بندوں کو پیسوں سے کون تولتا ہے۔ خیر چھوڑو، میں تمہیں بتاتی ہوں میں اس سے کیسے ملی......'' اب زارا نے جلدی، جلدی جذباتی انداز میں تفصیل بتانا شروع کی۔

''اوہ...... پانچ سو کے نوٹ کو تیتیوں کی طرح دیکھنے والی پورے پانچ ہزار قیامت تک کے لیے بلاک کر دیے......؟'' سفینہ نے گویا سر پیٹ لیا...... ساتھ ہی ورطۂ حیرت میں اتر گئی...... یہ شدتیں ایک پرستار کی ہیں یا وہ خیالات کی اڑان کے اثر میں ہے۔

''پانچ بلین کا نوٹ ہے وہ اب...... مائنڈ اٹ...... بیس سال بعد پرنس کی یادگار چیزوں کی نیلامی ہوئی تو زیادہ میں بھی جا سکتا ہے۔'' زارا نے یوں کہا جیسے کوئی بہت عام سی بات کر رہی ہو۔

''اوہ۔'' ہر وقت خرچ کرنے کے پروگرام بنانے والی نے بڑی دور کی سوچی تھی...... اور اپنی فطرت کا انجانے میں اظہار بھی کر دیا تھا۔

''جو دنیا سے چلے جاتے ہیں، یادگاریں تو ان کی ہوتی ہیں۔ تم اب پتی بننے کے لیے کیا پرنس کی جان لو گی خدانخواستہ؟'' سفینہ نے اصلاح بھی کی اور تعجب کا اظہار بھی۔

''اب سب کچھ ابھی تو نہیں بتا سکتی کہ آنے والے دنوں میں کیا ہونے جا رہا ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا

"میں تمہیں آٹو گراف والے نوٹ کی فوٹو بھیج رہی ہوں۔

ہے۔" زارا نے بے پروائی سے جواب دیا۔

اوکے......؟" زارا کا پیٹ اب ہلکا ہو چکا تھا۔

"مگر میں نے کب تم سے فرمائش کی......؟" سفینہ نے تجاہل برتا۔

"دل تو چاہ رہا ہوگا...... آخر تم بھی تو اس کی فین ہو۔"

"میں وہ فین نہیں ہوں جو آٹو گراف سے بہل جاتا ہے۔" سفینہ کے منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا تھا۔ پھر خود ہی شپٹا بھی گئی...... جلدی سے بولی۔ "اچھا...... بس ناں...... مجھے بہت زور سے نیند آرہی ہے...... باقی باتیں کل کر لینا۔"

"ارے، ارے ایک مزے کی بات تو سن لو......" زارا پر عجلت سوار ہوگئی۔

"نیند آرہی ہو تو سونے میں مزہ آتا ہے، گڈ نائٹ......" سفینہ نے حتمی انداز میں کہہ کر اپنی طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا...... پھر سیل پاور ڈ آف بھی کر دیا اور سیدھی ہو کر ٹھیک سے لیٹ گئی۔

ایک وودھیا غبار آنکھوں کے سامنے اڑنے لگا...... پھر اس میں دلفریب رنگ چمکنے لگا...... رنگ منظم ہوئے اور دل نشیں تصویر بن گئی۔ دنیا میں بے شمار لوگ سامنے آتے ہیں مگر کچھ چہرے ناقابلِ فراموش ہوتے ہیں...... ان کی روح خاص اجزائے ترکیبی کا مجموعہ ہوتی ہے...... وہ اجزائے ترکیبی جو خاص خمیر سے اٹھائے جاتے ہیں اور ایک صدائے کُن پر رقصاں ہو جاتے ہیں۔

☆☆☆

"مسٹر ساحل ذمے دارانہ پوسٹ پر کام کرنے والے کے پاس پراپر کنوینس ہونا چاہیے۔ آپ نئی بائیک لے لیں...... کیونکہ آپ کی وجہ سے موسٹ امپورٹنٹ میٹنگز کا شیڈول چینج نہیں کیا جاسکتا۔" تاجور کا انداز دوٹوک تھا۔

"جی میم......" ساحل پیٹ پر دونوں ہاتھ باندھے بہت مؤدبانہ انداز میں بولا۔

"آپ نے اپنے انٹرویو میں کہا تھا کہ آپ کے پاس کنوینس ہے مگر بہت پرابلم کرنے لگی ہو تو آپ کو ضرور بدل لینی چاہیے۔ بجٹ اگر اجازت نہیں دیتا تو انسٹالمنٹ پر لے لیں۔" انہوں نے مشورہ دیا۔

"اور پلیز آئندہ مجھے مت سنایئے گا کہ آپ کی بائیک پرابلم کر رہی ہے۔" تاجور نے ظاہر کیا اب انہیں مزید کچھ نہیں کہنا۔

"اوکے میم...... آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔"

"گڈ......" تاجور آگے بڑھ گئیں۔

ساحل گرنے کے سے انداز میں اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"یار، یہ رئیس لوگ اتنا جمع کر کے مر جائیں گے۔ مگر اپنے ایمپلائی کو پانچ چھ لاکھ کی 800cc کار نہیں دے سکتے۔ جس کی زندگی ذاتی سواری کے بغیر گزری ہو اس کے لیے تو 800cc کار بھی لینڈ کروزر یا مرسڈیز سے کم نہیں، ہاں مفت کا مشورہ ضرور دے دیتے ہیں...... نئی بائیک لے لو، وہ بھی قسطوں پر ہونہہ......" ساحل کے احساسِ محرومی نے شدید حسد کی شکل اختیار کر لی تاریک شیشوں کی لینڈ کروزر میں سفر کرنے والی باس کا مشورہ نیزے کی انی کی طرح مغز میں اتر اتھا۔

اونچے خواب، اونچی اڑان پھر دھڑام پتھریلی زمین پر......

"مسٹر ساحل!" انٹرکام پر سیتا کی آواز ابھری۔ وہ کچھ ہدایات دے رہی تھی۔ وہ کرسی سے یوں اٹھا گویا واقعی کپڑے جھاڑتا فرش سے اٹھا ہو۔ موڈ بہت خراب تھا لیکن جاب بہت بڑی مجبوری تھی...... آؤٹ ڈور پلانر سے مسکرا

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماءے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ،
حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ،
سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دستر خوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی،
جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

کر باتیں کرنا تھیں۔ خوش اخلاقی کا سکہ بٹھانا تھا...... کیونکہ وہ اپنی کمپنی کی نمائندگی کرنے جا رہا تھا۔

چند سیکنڈ اِدھر اُدھر ٹہل کر اپنا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش کی چند گہری، گہری سانسیں کھینچی۔ پھر دراز سے اپنا لیٹر پیڈ نکال کر کچھ اشعار لکھے۔

یہ تمہارے ستم
تمہارے کرم
صبح دم آنکھیں نم
ہر شام شاکر الم
بے نیازی کے خوگر ہیں
خدا ہو یا میرا صنم
بہر طور گزر رہی ہے
دکھ بہت خوشی کم
ساحل رکھ لیتا ہے
سرکش موجوں کا بھرم

پیڈ دراز میں رکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ زیرِ لب گنگنایا......

مایوس کیوں ہوتے ہو ساحل
وہ سب کا خدا میرا بھی تو ہے

☆☆☆

''اوہ گڈ...... گاڈ......'' ماہین نے پونی ٹیل بناتے ہوئے حیرت آمیز دلچسپی سے سفینہ کی طرف دیکھا۔

''کمال کر دیا زارا نے...... ویسے وہ بہت بولڈ ہے۔ وہ بہت کچھ کر سکتی ہے...... وہ کسی بھی وقت پرنس کو ڈنر کی آفر بھی کر سکتی ہے۔''

''ہوں...... وہ بہت کچھ کر سکتی ہے مگر یہ کوئی اچھی بات تو نہیں، برابری کی بنیاد پر سب کچھ ہو تو ٹھیک ورنہ بلاوجہ خود کو ڈی گریڈ کرنا کوئی عقل مندی تو نہیں۔'' سفینہ نے گہری سوچ کے دوران کہا۔

''کم آن سفینہ...... پرنس پبلک پراپرٹی ہے...... اسے تو روز ہی نرالے چاہنے والے ملتے ہوں گے۔ آخر کو وہ ایک نمایاں شخصیت ہے۔'' ماہین اب ایک لاحاصل بحث سے اکتا کر بولی۔

''ہوں......'' سفینہ کی عجیب سی کیفیت تھی گویا کچھ کھو گیا ہو اور اسے ڈھونڈنے میں پڑ گئی ہو...... اسے اپنی کیفیت کی خود بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

زارا کا پرجوش اور رجائیت بھرا انداز بار، بار ذہن پر چوٹ سی لگا رہا تھا...... طبیعت بوجھل سی ہو رہی تھی۔

ماہین کسی کام سے باہر جا چکی تھی...... اور وہ سوچ رہی تھی کہ اسے تو نیند آ رہی تھی...... کہاں چلی گئی؟

☆☆☆

''میری برتھ ڈے سے دو دن پہلے جاپان پر پہلا ایٹم بم گرایا گیا اور پھر 9 اگست کو دوسرا ایٹم بم گرایا...... 8 اگست کو میں نے تنہا اپنی برتھ ڈے منائی اور سوچا آخر میں پیدا ہی کیوں ہوئی...... سنا ہے ہیروشیما پر ایٹم بم گرتے ہی ننھی تھاؤزنڈ انسان جل کر راکھ ہو گئے تھے...... وہ تو تتلیوں سے پیار کرنے والا انسان تھا...... قاتلوں میں اس کا نام لکھا گیا۔'' یہ کہہ کر لیڈی صوفیہ بچوں کی طرح رونے لگیں۔

پرنس اس وقت اپنی پردادی کے ساتھ بالائی منزل کے وسیع ٹیرس پر ٹھنڈی نرم ہوا سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ایک لطیف خیال کے بے ترتیب رنگ اسے بے چین کیے ہوئے تھے وہ ان بے ترتیب رنگوں کو منظم کر کے کوئی زندہ و جاوید پیغام کینوس پر نقش کرنے کا موڈ بنا رہا تھا۔

لیڈی صوفیہ کا ماضی دھویں کے مرغولوں کی طرح اس کے سر پر بالا ہی بالا اڑ رہا تھا۔

''میں جانتی ہوں تمہیں سیکنڈ ورلڈ وار کے واقعات زبانی یاد ہو چکے ہوں گے...... پھر بھی میں تم سے اپنی میموری شیئر کرتی ہوں...... تمہاری ماں میری بیسٹ فرینڈ تھی...... وہ مجھے پراپر کمپنی دیتی تھی، وہ مجھ سے بہت اٹیچڈ تھی۔ اس کا کھلا ثبوت ہے کہ تم میرے شوہر اور اپنے پردادا کی ڈٹو کاپی ہو...... تمہارے باپ کی شکل تو اپنے ماموں پر تھی وہ قیمتی اعلیٰ نسل گھوڑوں کا بیوپاری تھا...... خود بھی بہترین رائڈر تھا...... آہ...... ہاں دولت تو ہمارے خاندان میں بہت آئی، دروازے کھڑکیاں توڑ کر آئی مگر زندگی بہت مختصر ملی...... مجھے عمر اور دولت دونوں ملیں مگر روح کی آسودگی اور خوشی سے محروم رہی......'' اب جیسے لیڈی صوفیہ بول بول کر تھک گئیں۔

چند ثانیے گہری خاموشی ماحول پر طاری رہی...... پرنس اپنے تخیل کے اڑتے بکھرتے رنگوں کو پکڑنے کی تگ و دو میں تھا اسے نہیں معلوم ہوا کہ اتنی دیر میں گرینڈ مام نے ماضی کے کس حصے کو چھیڑا اور کن لوگوں کو یاد کیا۔

اس کی نظریں سیاہ اندھیرے میں چمکتے روپہلے افق پر تھیں ایک رنگ زندگی سے بھرپور چمکدار آنکھوں میں ڈھلنے لگا۔ بے ساختگی اور آبشاروں جیسی بے ساختگی...... زندگی اور بھرپور زندگی...... جیسے ایک مقام پر ہزاروں سورج کی توانائیاں ٹھہر گئی ہوں...... پھر وہ آنکھیں نیم باز ہو گئیں...... بکھری روشنی مدھم پڑ گئی......

''میں تمہاری شادی کسی پڑھی لکھی مگر غریب لڑکی سے کرنا چاہتی ہوں...... زندگی بھر میری خواہشات کا مذاق اڑایا گیا...... کیا تم میری خواہش پوری کر سکو گے؟'' لیڈی صوفیہ کے الفاظ تیز بارش کی طرح برسے اور سارے رنگ دھل گئے۔

''غریب لڑکی......؟ ویری انٹرسٹنگ'' پرنس دلچسپی سے مسکرایا۔

''اوہ...... یس...... آف کورس...... وہ تمہاری اور تمہاری دولت کی قدر کرے گی...... لائف انجوائے کرے گی تو کرنسی کی ویلیو پہچانے گی...... اپنے اور اپنے بچوں کے لیے تمہاری دولت کو اچھی طرح سنبھالے گی۔ یہ رئیسوں کی بیٹیاں بہت سیلفش ہوتی ہیں...... کسی کا دل جیتنے کے لیے محنت نہیں کرتیں۔ مال اور محبت کو اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی ہیں...... میں نے جو اس زندگی سے سیکھا ہے وہ تمہارے کام آنا چاہیے پرنس......'' لیڈی صوفیہ نے درحقیقت پرنس کو چونکا کر رکھ دیا تھا۔

''لیکن مام...... آپ نے تو میرے گرینڈ فادر سے عشق کیا ہے، آپ کے پاس ان کی بات کے سوا کوئی اور بات نہیں ہوتی تو آپ تو فارمولا بنا رہی ہیں...... جسٹ امیزنگ......'' پرنس خوشگوار انداز میں حیرت کا اظہار کر رہا تھا۔

''میں ہمیشہ سے رئیس نہیں تھی...... پرنس...... میرے DNA میں غربت کا سوفٹ کلر موجود ہے۔'' لیڈی صوفیہ نے اتنا کہا اور اٹھ کر ٹہلنے لگیں، پرنس حیرت سے سر اٹھا کر دیکھنے لگا۔

''ہاؤ انٹرسٹنگ'' منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

''میری نانی انڈونیشیا کے ایک ڈیری فارم میں کام کرتی تھیں۔ وہ بہت حسین تھیں۔ جتنی حسین...... اتنی ہی غریب تھیں۔ ان کے ماں، باپ جلد فوت ہو گئے تھے وہ چھوٹے معذور بھائی کی گارجین تھیں جو انیمیا کا پیشنٹ بھی تھا، محنت مزدوری سے پیسہ کماتیں اور بھائی کے علاج پر خرچ کر دیتی تھیں خود شہتوت سے روٹی کھا لیتی تھیں۔''

پرنس حیرت واستعجاب کی کیفیت میں مبتلا ایک ٹک لیڈی صوفیہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔
''میرے نانا آرمی ٹروپ کے ساتھ جنگی مشق پر گئے تو انہوں نے میری نانی پر دل ہار دیا۔ میری نانی لینڈ لارڈز کی بہو بنیں...... مگر ان کے خون میں وہی شہتوت اور باسی روٹی کا ذائقہ تو تھا ناں...... تمہارے خاندان میں صرف دولت اور نام تھا محبت، عشق، قربانی یہ عظیم جذبے میری ماں کی طرف سے گفٹ ہوئے...... انڈر اسٹینڈ؟'' لیڈی صوفیہ اب تھک کر دوبارہ اپنی آرام دہ لیدر چیئر پر بیٹھتے ہوئے پرنس سے پوچھ رہی تھیں۔
''یس ماما...... ویری انٹرسٹنگ...... آپ کا کیا خیال ہے مجھے بھی انڈونیشیا کے ڈیری فارمز کا وزٹ کرنا چاہیے......؟'' پرنس نے اب لطافت سے ماحول کا بوجھل پن مٹانا چاہا۔
''oh silly boy میں تو تمہیں الرٹ کر رہی ہوں، جیمزی کی نظریں تم پر ہیں...... تمہیں بہانے بہانے سے پارٹیز، فنکشن میں انوائٹ کیا جاتا ہے۔ تم کسی دھوکے میں نہ آ جانا...... کسی بھی وقت کوئی بھی تمہیں پھنسا سکتا ہے۔'' لیڈی صوفیہ کے جھریوں سے اٹے چہرے کی ایک، ایک لکیر میں تشویش جھلک رہی تھی۔
''کم آن مام...... مائی گریٹ مام...... میں پینٹر ہوں دل پر چلتا ہوں...... جال اور پھندوں سے بہت اونچا ہو کر اڑتا ہوں...... ڈونٹ وری......'' پرنس دھیرے سے ہنس دیا تھا۔ مردانہ وجاہت سے بھرپور ہنسی کو ٹمٹماتے ستاروں نے بھی دل تھام کر دیکھا اور سنا۔
''بائی داوے مام اگر کسی ویل آف لڑکی میں غریب لڑکی جیسی سادگی ہو اور وہ بہت باوقار ہو تو اس پر آپ کیا کمنٹس پاس کریں گی؟''
سفینہ...... دودھیا غبار کی طرح اڑتی ہوئی افق پر چھا گئی تھی۔ پرنس کے لیے بھی یہ انکشاف تھا۔ دل کے کس کونے میں وہ چھپ کر بیٹھ گئی تھی...... عین تھکا دینے والے تفکر کے دوران اس نے مظاہرہ کر دیا تھا۔
''اوہ گاڈ...... وہی ہوا جس کا مجھے خطرہ تھا۔'' لیڈی صوفیہ نے سہم کر پرنس کی طرف دیکھا۔ پرنس پھر دھیرے سے ہنس دیا۔
''مام...... ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا...... پلیز ریلیکس۔''
''بہت کچھ ہو گیا پرنس...... unvisual (نظر نہ آنے والا) visual ہو رہا ہے۔ کسی بھی وقت کیمسٹری، فزکس میں ڈھل جائے گی...... اور وہ اس گھر میں چلتی پھرتی دکھائی دے گی۔ پرنس مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ...... سچ، سچ بتاؤ...... وہ کون ہے؟ مجھے اپنی نسل کے لیے بہت اسٹرانگ بیک گراؤنڈ چاہیے۔''
''مام، مام جسٹ ریلیکس......'' پرنس نے لیڈی صوفیہ کی جذباتیت کو لگام لگانے کی کوشش کی۔
''نہیں، نہیں تمہیں آج اور ابھی بتانا ہوگا...... وہ کون ہے؟''
''مام پلیز آپ سکون سے میری بات تو سنیں...... پلیز مام......'' پرنس کو اندیشہ ہوا کہ دادی کی طبیعت نہ خراب ہو جائے۔
''مام یہ تو کرنٹ ڈسکوری ہے...... وہ مجھے دو بار ملی تو ہے مگر میں نے اس کے لیے کچھ بھی فیل نہیں کیا تھا۔ ابھی...... ابھی swear 9...... بالکل ابھی ابھی یونہی اچانک مجھے اس کا خیال آیا۔''
''اوہ مائی گاڈ......'' لیڈی صوفیہ نے شدید خوفزدہ ہو کر پرنس کی طرف دیکھا تھا۔
''یہ تو عشق کی شروعات ہے۔ زندگی کی بھاگ دوڑ میں کوئی بہانے، بہانے سے یاد آنے لگتا ہے......'' وہ بے قرار ہو کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔

''یہ اندر کی خبریں مجھے باہر سے کیوں مل رہی ہیں......؟'' پرنس نے مسکرا کر لاابالی پن سے بات ہوا میں اڑانے کی کوشش کی۔

''پرنس میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں...... آئندہ تم اس سے نہیں ملو گے...... میں یہ ساری دولت تمہاری خوشی پر قربان کرسکتی ہوں، عشق تکلیف و درد کے سوا کچھ نہیں...... آپ جس سے عشق کرتے ہو، وہ آپ پر حکومت کرتا ہے...... میں اپنے بیٹے کو کسی کی غلامی میں نہیں دے سکتی...... نو، نیور......'' لیڈی صوفیہ بے کلی کی کیفیت میں اٹھ کر چل پڑیں...... آواز آہستہ، آہستہ بڑبڑاہٹ میں ڈھل گئی۔ پرنس چند ثانیے دم بخود رہا...... مگر جلد ہی خود کو مرتب کرلیا۔

''سوئٹ مام...... سونا جب تک آگ میں نہیں تپتا اس کا کھوٹ، ملاوٹ الگ نہیں ہوتے۔ آرٹ عشق کی آنچ کے بغیر ادھورا رہتا ہے...... اسی لیے تو مجھے اپنی کسی پینٹنگ میں کمال نظر نہیں آتا۔ لوگ جو مرضی کہتے رہیں...... کتنی بھی تعریف و توصیف کریں یہ تو میرا دل جانتا ہے ابھی تک میری ہر پینٹنگ ادھوری ہے۔'' آسمان پر اڑتی چکوری کی آواز نے اسے عشق کے طلسم سے نکال کر جہانِ آب و گل کی پتھریلی زمین پر پٹخ دیا تھا۔

☆☆☆

زارا بڑی ترنگ میں ڈرائیو کررہی تھی۔ وہ کالج سے ایک پیریڈ چھوڑ کر نکل گئی تھی۔ اس کی بیسٹ فرینڈ کی انگیجمنٹ تھی۔ اس کا ڈریس تیار تھا مگر میچنگ سینڈل اس کی مرضی کی نہیں مل سکی تھی۔ آج وہ تہیہ کرکے مالز چھاننے نکلی تھی کہ وہ سینڈل لے کر ہی گھر میں داخل ہوگی۔ وہ مالز میں تلاش بسیار کے اسے حسبِ خواہش کچھ نہ ملا تو کلفٹن کے ایک مشہور مال کا خیال آیا۔

اس نے ٹریفک کے رش سے بچنے کے لیے خیابانِ اتحاد والا روڈ لیا تھا جو شیطان کی آنت کی طرح چلتا چلا جاتا ہے۔ سنڈے بازار کی ڈائریکشن سے پہلے اسے یوں لگا جیسے دو کاریں اسے فالو کررہی ہوں۔ پہلے پہل تو اسے اپنا وہم محسوس ہوا...... مگر جب ایک کار اوور ٹیک کرتی اس کے آگے دوڑنے لگی اور دوسری پیچھے تو اس کا ماتھا ٹھنکا اس نے کار سواروں کو دیکھنے کی کوشش کی مگر دونوں کاروں کے شیشے بلیک تھے...... اس کے دل میں گھبراہٹ پیدا ہونا فطری تھا۔ اس نے ایک ہاتھ اسٹیرنگ سے اٹھا کر اپنے سیل پر پولیس ہیلپ لائن نمبر ڈائل کیا وہ ہینڈ فری استعمال کررہی تھی۔

کال ریسیو ہوتے ہی اس نے بولنا شروع کردیا۔

''میں کار میں ہوں خود ڈرائیو کررہی ہوں۔'' اس نے لوکیشن بتائی۔ ''دو کاریں مجھے فالو کررہی ہیں...... میری کار کا نمبر فلاں فلاں ہے۔ پلیز ہیلپ می۔'' اس نے اپنے اعصاب پر کنٹرول کرتے ہوئے بڑے اعتماد سے مدد طلب کی وہ کار 60 سے کم اسپیڈ پر لے آئی تھی۔ آگے پیچھے دوڑنے والی کاروں کی اسپیڈ بھی خود بخود کم ہوگئی تھی۔

زارا اِکا دُکا گزرنے والی کاروں کی طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ شاید کوئی اسے دیکھ لے اس کے چہرے سے بھانپ لے کہ وہ کسی مشکل میں ہے۔ اسپیڈ کم کرنا سب سے بڑی حماقت ٹھہری اور وہ بہت آرام سے دونوں کاروں کے نرغے میں آگئی۔ دونوں کاروں نے اسے بریک لگانے پر مجبور کردیا تھا۔

کار رکتے ہی ایک شخص تیزی سے اپنی کار سے اتر کر آیا اور ڈرائیونگ ڈور کے شیشے پر چمکتی ہوئی گن لگادی...... زارا نے حواس قابو میں رکھتے ہوئے شیشہ نیچے کیا...... اس شخص کی طرف دیکھا۔

''میم...... زیادہ ایفی شنسی دکھانے کی کوشش کی تو یاد رہے اس میں سائلنسر فٹ ہے گولی چلنے کا کسی کو بھی پتا

نہیں چلے گا...... ہلکی سی دوسمنٹ'' کی آواز آ رہی تھی۔'' ورنہ کتے کی سی غراہٹ تھی۔ زارا کے اوسان خطا ہونے لگے...... اس نے شیشہ نیچے کر دیا تھا سو اب گن کی نوک اس کی گردن میں چبھ رہی تھی۔

''کار کی چابی دو اور شرافت سے باہر آ جاؤ...... شاباش...... ہری اپ بے بی...... کم آن......''

زارا نے دونوں کاروں کی طرف دیکھا دونوں کاروں کی ونڈوز کے شیشے ادھ کھلے تھے ایک کار میں چھ لڑکے ٹھنسے ہوئے تھے اور جس کار سے گن مین اتر کر آیا تھا اس میں صرف ایک لڑکا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا دکھائی دیا۔

اس نے اس بحرانی صورتِ حال میں تیزی سے اپنا ذہن دوڑایا۔

''دیکھو اگر کڈنیپ کرنا چاہتے ہو تو شوٹ کر دو اگر کار چاہیے تو میں چابی دے دیتی ہوں۔'' چابی لینے سے بہتر ہے دو میں سے ایک شے تو ضرور ملنی چاہیے۔

وہ اشارے سے چابی مانگ رہا تھا۔ زارا نے اگنیشن سے چابی نکال کر غنڈے کی طرف بڑھا دی۔ ساتھ ہی اپنی طرف کا ڈور کھولا۔ چابی لیتے ہی وہ اتنا پیچھے ہٹا کہ زارا آسانی سے باہر آ سکے۔ زارا باہر آئی اور وہ غنڈہ فوراً ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور کھٹاک سے دروازہ بند کر لیا۔

سیکنڈ میں انجن اسٹارٹ ہوا...... یہ دیکھ کر زارا کی حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ ایک غنڈہ جیک پانا لیے اس کی کار کے پچھلے ٹائر پر کام کرتا نظر آیا یعنی ایسا ظاہر کیا جا رہا تھا گویا کار کا ٹائر پنکچر ہو گیا ہے اور اتارا جا رہا ہے۔

انجن اسٹارٹ ہوتے ہی گاڑی ہوا ہو گئی اور اس غنڈے کا ساتھی جیک پانا اٹھا کر دوسری کار کی طرف بڑھا جس کا انجن اسٹارٹ تھا، کار گیئر میں تھی۔ اس غنڈے کے بیٹھتے ہی کار اسپیڈ میں آگے بڑھی دروازہ بعد میں بند ہوا۔

تینوں کاریں چند سیکنڈ میں گویا دھواں بن کر تحلیل ہو گئیں۔ زارا چند ثانیے معطل حواس کے ساتھ آنکھیں پھاڑے اس طرف دیکھتی رہی جس طرف کاریں دوڑ رہی تھیں۔

معاً اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کے دائیں طرف آ کر کھڑا ہوا ہو...... اس نے چونک کر دیکھا ایک سیکیورٹی گارڈ یونیفارم میں ملبوس اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میم صاحب گاڑی چھن گیا ہے......؟'' اس نے زارا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم دیکھ رہے تھے پھر بھی کچھ نہیں کیا...... اب سوال کرنے آ گئے ہو؟ دفع ہو جاؤ...... یہاں اسی طرح ہوتا ہے، کوئی کچھ نہیں کرتا۔ سب تماشا دیکھنے آ جاتے ہیں...... شرم نہیں آتی...... ایک لڑکی کی مدد نہیں کر سکتے۔'' وہ اب ہذیانی انداز میں چیخنے لگی، کھلی فضا میں اس کی آواز گونج رہی تھی جیسے اپنے ذاتی ملازم کو ڈانٹ رہی ہو اور گھر سے نکل جانے کا حکم دے رہی ہو۔

''میم صاحب ام اُدھر سامنے بنگلے پر ڈیوٹی کرتا ہے، ہمارے کو پہلے کچھ سمجھ نہیں آیا، جب سمجھ آیا تو ہم بھاگا...... پر وہ تو بھاگ گیا، امارا پاؤں اے انجن تو نئیں اے...... ابھی بولو ام آپ کا کیا مدد کرے......؟'' گارڈ اپنے مردانہ ظرف کا مظاہرہ کر رہا تھا جس کو ذلیل کرنے میں زارا نے ذرا دیر نہیں لگائی تھی۔ مگر وہ لٹنے والی لڑکی پر غصہ کھا کر اسے بے یار و مددگار چھوڑ کر جانا گوارا نہیں کر رہا تھا۔

اس کی بردباری اور تحمل کا زارا پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اب اس نے چند گہری، گہری سانسیں کھینچ کر خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور فوراً ہی ماں کا خیال آیا...... ماں کا خیال آتے ہی دل بھر آیا اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

گارڈ بڑی ہمدردی سے دیکھ رہا تھا۔

''سنو، تمہارے پاس موبائل ہے؟'' اس نے ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے پوچھا۔

گارڈ نے جواب دینے کے بجائے جیب سے موبائل نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

زارا نے بے تابی سے موبائل ہاتھ میں لیتے ہی نمبر ڈائل کرنا شروع کیا مگر رک گئی آخری تین ڈی جٹ اسے گھبراہٹ میں یاد نہیں آرہے تھے اس کے اپنے سیل میں تو نمبر سیو تھے کبھی یاد کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔

البتہ اسے ماں کے آفس کے لینڈ لائن نمبرز زبانی یاد تھے سو اس نے ملا دیے پہلی گھنٹی پر سیتا نے کال اٹینڈ کرلی۔

''ہیلو سن لائٹ گروپ آف کمپنیز'' سیتا کی آواز ریکارڈنگ کی طرح سماعت سے ٹکرائی۔

''سیتا، زارا بات کررہی ہوں۔ پلیز اماں سے بات کراؤ، ہری اپ۔''

''میم اس وقت میٹنگ میں ہیں کوئی میسج ہ'' سیتا پروفیشنل انداز میں پوچھ رہی تھیں۔

''میٹنگ؟ گوٹو ہیل مجھے نہیں پتا...... بس اماں سے بات کرنی ہے......'' وہ روہانسی ہوکر پھاڑ کھانے کو دوڑی۔

''سوری...... میم اس وقت... ایک فارن ڈیلی گیشن کے ساتھ ہیں، میں ڈسٹرب نہیں کرسکتی...... میں ان کو کہہ دوں گی وہ آپ کو کال کرلیں گی......'' سیتا نے بہت مؤدبانہ انداز میں کہا تھا۔

''ابھی کہو جاکر میں ان سے بات کرنا چاہتی ہوں...... بلکہ ان کے روم میں کال ٹرانسفر کرو...... یہ میرا آرڈر ہے۔'' وہ غصے سے پھٹ پڑی۔

''پلیز مس آپ سمجھنے کی کوشش کریں...... یہ روٹین کی میٹنگ نہیں ہے۔ جیسے ہی میٹنگ ختم ہوتی ہے میں آپ کا میسج انہیں پہنچادوں گی۔''

''میں کلائنٹ نہیں ہوں سیتا، ان کی بیٹی ہوں...... اس وقت بہت ڈسٹرب ہوں، مجھے ابھی اسی وقت ان سے بات کرنی ہے۔'' زارا کی ذات پر سیتا کے کسی جواب سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

''جسٹ آمنٹ پلیز...... مس آپ امیر الدین ساحل سے بات کریں۔'' سیتا غالباً پریشان ہوگئی تھی، ویسے بھی آج اسے تاجور سے تین چار مرتبہ جھاڑیں پڑی تھیں اس لیے اس کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔ اسی لیے اس نے جان چھڑانے کے لیے ریسیور ساحل کو تھما دیا ساتھ ہی اس کی آواز زارا نے سنی۔

''مسٹر ساحل، مس زارا......'' اور فوراً ہی ساحل کی آواز ائرپیس سے ابھری۔

''السلام علیکم......''

''اوہ...... ساحل پلیز ہیلپ می......'' اس وقت زارا کی ساری اکڑ، نخرہ، اسٹائل خاک دھول ہوچکی تھی۔ بہت ہی فطری اور بے ساختہ انداز تھا۔

''زہے نصیب، بندہ اس قابل کہاں کہ آپ کو کوئی فیض پہنچا سکے۔''

''میں نے تمہاری فضول سی اردو سننے کے لیے فون نہیں کیا......'' زارا نے ہذیانی انداز میں چلا کر کہا۔

''لیکن آپ نے تو مجھے فون ہی نہیں کیا...... وہ تو پتا نہیں کیوں مس سیتا نے اس وقت کون سے احسان کا بدلہ اتارا ہے۔'' ساحل کا انداز غیر محتاط اور شوخ ہونے لگا اور شاید اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ مالکان کی اولاد سے یہ طرز کلام مناسب نہیں۔

''میں اس وقت روڈ پر کھڑی ہوں کسی گارڈ کے سیل سے فون کررہی ہوں...... پتا نہیں اس میں کتنا بیلنس ہے

جلدی سے اماں کی گاڑی یا فوراً ویل لے کر یہاں آجاؤ۔'' اس نے جگہ بتائی ''جلدی کرو، خدا حافظ۔'' اس نے سیل آف کر کے اب قدرے سکون کی سانس لی اور گارڈ کی طرف دیکھا۔

''تھینک یو گن مین...... ابھی میرا ملازم آرہا ہے میں اس سے پیسے لے کر تمہیں دے دوں گی تم بیلنس لوڈ کرا لینا...... مگر جب تک وہ نہیں آتا، تم اِدھر ہی کھڑے رہو...... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' زارا بے سوچے سمجھے دیوانوں کی سی کیفیت میں جو منہ میں آرہا تھا بولتی جا رہی تھی...... جیسے گارڈ نہ ہو اس کا کوئی انکل ہو۔

☆☆☆

''میم کو نہ بتانا...... مجھے کوئی گڑ بڑ لگ رہی ہے......'' ساحل دراز سے اپنا والٹ نکالتے ہوئے سیتا سے کہہ رہا تھا۔

''مس زارا کیا کہتی ہیں؟ ڈسٹرب تو بہت لگ رہی تھیں۔'' سیتا نے فکر مندی و تشویش سے ساحل کا چہرہ بہت غور سے دیکھا۔

''لگتا ہے ان کی کار میں کوئی پرابلم ہو گئی ہے...... گاڑی منگوا رہی ہیں۔''

''تو میم کے ڈرائیور کو بولو ناں...... وہ جا کر مس زارا کو لے آئے گا۔'' سیتا نے قدرے الجھے ہوئے انداز میں کہا کیونکہ اسے کچھ سمجھ نہیں آئی تھی کہ ڈرائیور اور کار دونوں میسر ہیں تو ساحل کو جانے کی کیا ضرورت ہے۔

''میں خود جا رہا ہوں تو کوئی بات ہی ہو گی۔'' ساحل نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر کہا...... سیتا خاک نہیں سمجھی......

''آپ میم کی کار لے کر جا رہے ہیں؟'' سیتا نے پوچھا۔

''نہیں، میں اپنی وفادار بائیک لے کر جا رہا ہوں۔''

''لیکن یہ بائیک تو بہت بے وفا ہے، بار، بار آپ کو دھوکا دیتی ہے۔''

''ارے نہیں، یہ تو اس کی ادائیں ہیں، خدا حسن دیتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی ہے۔''

''ہے بھگوان......'' سیتا نے اپنی پیشانی پر زور سے ہاتھ مارا۔

''اتنی کھٹیچر بائیک، جس میں سائلینسر بھی فٹ نہیں ہوتا اتنی ڈیمج ہو چکی ہے۔ اس کو حسین کہہ رہے ہیں؟''

''حسن دیکھنے والے کی نگاہ میں ہوتا ہے، بھلے اپنے بھگوان سے پوچھ لو...... سنا ہے کبھی کبھی پتھر بھی بول پڑتے ہیں۔'' ساحل بائیک کی چابی مٹھی میں دبا کر دوڑ گیا۔

سیتا یوں دیکھ رہی تھی گویا فلسفہ سر سے نہیں چھت سے گزر گیا ہو۔

☆☆☆

''کل میری بائیک کا خوب مذاق اڑایا تھا...... آج اسی بائیک پر سیر کرواؤں گا۔'' وہ آفس سے نکلتے ہوئے سوچ رہا تھا......

''وہ رئیس لوگ کیا کہتے ہیں......'' بائیک کے شور میں یادداشت بھی ٹھیک سے کام نہیں کر رہی تھی۔

''ہاں...... وہ...... fun آج بائیک پر بیٹھ کر fun کرنا...... کیا یاد کرو گی کبھی fun کیا تھا۔''

وہ شارٹ کٹ استعمال کرتا ہوا بہت جلد خیابانِ اتحاد پر آ گیا تھا۔ بائیک ہوا کی رفتار سے دوڑ رہی تھی۔ سامنے زارا گارڈ کے ساتھ کھڑی نظر آ گئی تھی...... مگر وہ تو بے کار نظر آ رہی تھی...... اس نے اِدھر اُدھر نظر گھمائی دور تک کوئی کار کھڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔

(جاری ہے)



سنگ سفر سائبان ہے (4)

فرحین اظفر

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی اسے کروٹیں بدلتے ہوئے پر کسی کروٹ چین، آرام نہیں تھا۔ کبھی یوں لگتا جیسے بستر کے نیچے کسی نے انگیٹھی جلا رکھی ہے اور کبھی یوں ہو جاتا گویا برف کی سلوں پر اکڑا ہوا جسم پڑا ہو۔

ایسا بخار اس سے پہلے تو کبھی نہیں آیا۔ بے بسی اور بے کسی بھرا ہوا مرتپش بھی اور کبھی یخ بستہ اور ناقابل برداشت بھی۔ حالانکہ ایسے اور اس سے بھی کڑے دن

اس کی زندگی میں پہلے ہی آ چکے تھے مگر جانے اب کیا ہو گیا تھا۔

☆☆☆

''میں تو بے سہارا عورت ہوں؟'' اس نے بہت بچپن سے اماں کو یہ بات بولتے سنا تھا۔ جب وہ ہر بات پر یہی کہتیں اور سوں، سوں کرتی ناک پونچھتیں، آنکھیں رگڑنے لگتیں۔

تب وہ اپنے پتلے، پتلے ڈنڈوں جیسے گندمی ہاتھ ان ہی کے جیسی پتلی پتلی ڈنڈوں جیسی ٹانگوں والے گھٹنوں کے گرد لپیٹے، اماں کو اِدھر سے اُدھر آہستگی سے چلتے پھرتے دیکھتی اور سوچتی۔

''اچھی بھلی ٹانگوں پر چل پھر رہی ہیں پھر بھلا خود کو بے سہارا کیوں کہتی ہیں۔'' گرمیوں میں خوشبو دار پاؤڈر کے چھپاکوں میں نہائے اور جاڑے میں گلاب کی مہک والی چپچپی ویزلین منہ پر چپڑ کے اماں کے ساتھ مل کر ابا کا انتظار کرتی۔ پہلے اماں اور بعد میں ذرا سی سمجھداری پکڑنے پر اس نے ابا کی آمد پر بھاگ کر دروازہ کھولنے کا کام سنبھال لیا۔

وہ دروازہ کھولتی اور زوردار سلام کر کے ابا سے لپٹ جاتی۔ ابا بھی جانے کون سی خوشی کے انمول احساس میں گھر کر اس کے کھلکھلاتے وجود کو چوم لیتے۔

''آہا میری بیٹی، میری رانی، میری گڑیا، میری شہزادی......'' ان کے پاس اس کے لیے روز نت نئے نام ہوتے اور اسی طرح اس کے چھوٹے سے ننھے منے چندماہ کے بھائی کے لیے بھی۔ ''میرا پیارا بیٹا، میرا شیر، میرا شہزادہ، میرا چاند۔'' بھاپ اڑاتی چائے کی پیالیوں کے ساتھ وہ، اماں اور ابا بیٹھ کر باتیں کرتے اور ساتھ، ساتھ وہ ابا کے لائے ہوئے سموسے، بسکٹ اور کبھی پکوڑوں پر ہاتھ صاف کرتی...... بڑی پُرسکون زندگی تھی، خوش باش اور بے فکر زندگی پھر کیا ہوا...... سرخ آندھی چلی اور...... ابا کو لے گئی۔ سب کہتے تھے وہ اب کبھی واپس نہیں آئیں گے کیونکہ وہ وہاں چلے گئے ہیں جہاں انسان خود چل کر نہیں بلکہ چار کندھوں پر سوار ہو کر جاتا ہے۔

اس دن اس نے گھر میں لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ اماں کو ہوش نہ تھا اور اس کا بھائی...... جو فقط ایک سال کا تھا۔ نیا، نیا پاؤں سے چلنا سیکھ رہا تھا۔ بار، بار کھڑے ہو کر چلنے کی کوشش کرتا مگر گھر میں جمع لوگوں کی وجہ سے گر پڑتا اور پھر رونے لگتا۔ اسے خیال آیا، اماں اس کا کتنا خیال رکھتی تھیں اور ابا اسے کبھی گرنے نہیں دیتے تھے۔ اسے رُلانا تو بہت دور کی بات...... اب وہ رو رہا تھا اور کوئی اس پر توجہ دینے والا نہیں تھا۔ تب وہ اٹھی۔ اور جا کر اپنے بھائی کو گود میں بھر لیا۔

☆☆☆

اس دن کے بعد سے اماں کی آنکھوں سے کاجل اور رخساروں سے سرخی روٹھ گئی۔ اب ان میں نہ وہ پھرتی رہی تھی، نہ وہ شادمانی کی کیفیت نظر آتی۔ وہ یا تو گھر کے تھوڑے بہت کام بہت بے دلی سے نمٹاتیں یا کسی کونے میں بیٹھ کر روتی رہتیں۔ گھر کے آنگن میں جہاں سال کے چاروں موسموں میں شامل اپنے...... جدا رنگ لے کر اترتی تھیں۔ وہاں اداسی کا رنگ ٹھہر گیا۔

''اماں میری گڑیا کب لائیں گی؟'' ایک دن گھر کی خاموشی اور سناٹے سے گھبرا کر اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق اس نے تدارک کرنے کی کوشش کی تھی مگر......

اماں ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھے گئیں۔ پھر بازوؤں میں بھر کے رونے لگیں۔ کبھی اسے لگتا کہ اماں کی آنکھیں ہر وقت رونے سے دھندلی ہو گئی تھیں، پتلیاں سفید ہوتی جا رہی تھیں، بادامی رنگ اُڑ رہا تھا۔ آنسوؤں کے نمکین ذائقے سے پھیکا پڑنے لگا تھا۔

''کہیں بالکل غائب نہ ہو جائے۔'' اس نے دہل کر سوچا تھا۔

ایسا تو نہیں ہوا ہاں لیکن اس کی ساری گڑیاں ایک، ایک کر کے ٹوٹتی چلی گئیں۔ یوں اس کی گڑیاں ضرور ختم ہو گئیں۔ اس نے اصرار کرتے، کرتے اماں کے انکار اور ان کی ویران آنکھوں میں جمی کہر سے تنگ

آ کر گڑیا کی ضد کرنا ہی چھوڑ دی اور اپنے دو سالہ بھائی کو گڈے سا کھلونا بنا کر اس میں دل لگا لیا۔

وہ دن بھر اس کے چھوٹے، چھوٹے کام نمٹاتی، کبھی، کبھی اسکول سے واپسی پر اس کے لیے کھٹی میٹھی ٹافیاں بھی لے آتی۔ روز اس لیے نہیں کہ روز، روز اسے جیب خرچ ملتا ہی نہیں تھا۔ جب ابا کے مرنے کے بعد وہ پہلے دن بنا جیب خرچ کے اسکول گئی اور سارا دن بھوکے گزارنا پڑا۔ تب پہلی بار اندازہ ہوا کہ ابا کے نہ ہونے سے اسے بھی نقصان پہنچا ہے۔ اس کے شعور میں اس وقت نقصان صرف اسی حد تک تھا۔ نہ اسے لفظ خسارے کا کچھ پتا تھا نہ اس کے مفہوم سے آگاہی......

''اگر ابا زندہ ہوتے تو آج میں یہاں بھوکی کھڑی ہوتی؟'' ہاف ٹائم میں بچیوں کو ٹھیلوں سے رنگ برنگی چیزیں کھاتا دیکھ کر اس کے دل میں سوال ابھرا۔ جس کا جواب لیے بنا ہی اس پر اوس پڑ گئی۔

☆☆☆

اماں نے سلائی مشین سنبھال لی۔ یہاں تک کہ دس سال گزر گئے۔ نانی امی اور نانا ابو آتے تو ان بہن، بھائیوں کے لیے ڈھیروں چیزیں لاتے...... پھل، دودھ اور جوس کے ڈبے۔ اماں اور ان کے لیے کپڑے...... اس نے بہت چاہا کہ اپنی گڑیا کے لیے بھی ان سے کہہ دے لیکن اماں کو اس کے ارادے کی بھنک مل گئی اور انہوں نے اس طرح جھڑکا کہ آئندہ کبھی سوچنے کی ہمت بھی نہ ہو سکی...... پتا نہیں کیوں......

ایک، ایک کر کے وہ دونوں دنیا سے رخصت ہوئے تو یہ ذمے داری بڑی خالہ نے سنبھال لی۔ بڑی خالہ بہت اچھی تھیں بالکل اماں کی دوسری کاپی، ان ہی کی طرح بانہوں میں بھر کر چٹاچٹ پیار کرنے والی اماں کے پیار کا انداز تو خواب وخیال مگر خالہ کی محبت پر کبھی وقت کی گرد نہیں پڑی۔

''بڑی خالہ...... بڑی خالہ!'' اس نے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر انہیں آواز دینی چاہی مگر اول تو اس بخار نے اتنی جان ہی نہیں چھوڑی تھی کہ وہ چلا سکتی، دوسرے باہر شاید تیز ہواؤں کے ساتھ بارش ہو رہی تھی۔ گرج چمک کے ساتھ کھڑکی دروازوں کے پٹ کنڈیوں کی قید سے آزاد ہونے کے لیے زور لگا رہے تھے اور سوائے کھڑکھڑاہٹ کے دوسری کوئی آواز نہیں تھی۔ تیسرے بڑی خالہ یہاں تھیں ہی کب، جو اس کی آواز سنتیں۔ ''بڑی خالہ...... آپ کیوں چلی گئیں، مجھے چھوڑ کر اتنی دور...... یتیم بھانجی پر اکلوتے بیٹے کی محبت غالب آ گئی تھی ناں......'' تھک ہار کر ایک شکوہ اس کے کپکپاتے لبوں سے نکلنے سے پہلے ہی دم توڑ گیا۔ البتہ آنکھوں کا احتجاج شروع ہو چکا تھا۔

☆☆☆

اگلی صبح کہر آلود، سرمئی اور سرد تھی۔ باورچی خانے سے کسی کے کھٹر پٹر کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس کی آنکھ کھلی تو پہلا احساس طبیعت کے ہلکے پن کا تھا۔

شاید بخار کا زور ٹوٹ چکا تھا بارش کی طرح۔

تھوڑی دیر بعد کسی نے اس کا لحاف سر پر سے سرکایا۔

''بجو......!''

''ہوں......'' وہ مندی آنکھیں کھول کر مسکرائی۔

سامنے اس کا واحد رشتے دار ایک مہربان چہرہ کھڑا تھا۔ وہی بادامی آنکھیں، روشن چہرہ، گلابی لب ہاں مگر تفکر آمیز انداز......

''کیسی طبیعت ہے اب...... بخار اترا یا نہیں؟''

''اتر گیا، اللہ کا شکر ہے اب بہت بہتر ہے۔'' وہ لحاف ہٹا کر اٹھنے لگی تو ایک دم چکر سا آ گیا۔ وہ واپس بیٹھ گئی۔

''میرا خیال ہے ابھی کمزوری باقی ہے، کچھ کھا لو تو بخار اتر جائے گا۔ میں ناشتا لاتا ہوں۔'' ارمان بولتا ہوا کچن کی طرف چلا گیا...... وہ دوبارہ اٹھی مگر آہستگی سے اٹھی اور چلتی ہوئی صحن تک آئی۔ رات کی آندھی اور بارش کے آثار صحن میں بکھرے ہوئے تھے سوکھے پتوں کی صورت مرجھائے، زرد۔

''اماں اس صحن کو کتنا صاف ستھرا اور چمکا کر رکھتی تھیں۔'' صحن کے سرمئی پکے سیمنٹ والے فرش کو تکتے

ہوئے اس نے پھر ماضی کے جھروکوں میں جھانکا۔ جبھی ارمان نے اسے آواز دے لی۔

''جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کرو اور دوا لے لو بجو! میں نے آج آفس سے چھٹی کی ہے مگر روز، روز نہیں کر سکتا۔'' وہ احسان نہیں صرف محبت جتا رہا تھا، وہ جانتی تھی۔ وہ مسکراتی ہوئی واش بیسن تک چلی آئی۔ دو تین چھپاکے منہ پر مارے تو ٹھنڈے پانی سے سردی کا احساس رگ و پے میں اتر گیا۔ اس نے جلدی، جلدی کلیاں کر کے برش کرنے کا ارادہ موقوف کیا اور برآمدے میں پڑے تخت پر بیٹھ کر کمبل میں چھپ گئی۔

''ایک تو اتنی سردی اوپر سے یہ بخار...... اُف...... ہڈیاں کڑ کڑا گئیں میری تو......'' بات ختم ہوتے ہوئے پھر اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ حالانکہ یہ کوئی دکھ کی بات تو نہیں تھی۔ اس سے بڑے بلکہ پہاڑ جتنے جانے کتنے صدمے اس کا نازک دل بہت کم عمری سے سہتا چلا آرہا تھا...... اور ابھی تک یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا پھر......

شاید وہ خود ترسی کا شکار ہو چلی تھی اور انتہائی درجے پر کھڑی تھی جبھی ارمان کو اپنا والٹ کھنگالتے اور اس کی بڑبڑاہٹ پر توجہ نہ دیتے ہوئے دیکھ کر پھر دل بھر آیا تھا۔ حالانکہ کسی زمانے میں تو وہ بہت بہادر ہوتی تھی۔ اسے لگے نہ لگے مگر دوسرے تو یہی سمجھتے تھے، اور منفی انداز میں خوب، خوب پرچار بھی کیا تھا اس بات کا...... آہ...... یوں لگتا تھا آج یادوں کی سالگرہ کا دن ہے۔ جانے کون، کون سے بھولے بسرے لوگ گھر کے در و دیوار کی تنہائی سے چمٹے آج یاد آجانے تھے۔ اسے معلوم تھا تنہائی اور اکیلے پن کے احساس نے اسے ہمیشہ گھیرے رکھا اور وہ ہمیشہ اس گھیرے کو توڑ کر نکل جانے کی کوشش میں دکھی ہوئی تھی۔

ابا کی تصویر تو بہت دھندلی تھی۔ بھلا بیس سال پہلے کی باتیں جب سات واں سن لگا ہی تھا...... کہاں یاد رہ سکتی تھیں اتنی اچھی طرح۔ ہاں اسے اماں کی یاد ہر وقت آتی تھی۔ انہیں گزرے زیادہ عرصہ تو نہیں ہوا تھا، دل میں اماں کی جدائی کا ایسا آبلہ پڑا تھا کہ ہر وقت پیپ بھرے پھوڑے کی طرح دکھتا تھا۔

اور ماں کی جدائی کا غم ماند بھی کیسے پڑ سکتا ہے۔

(کبھی ماں کی ممتا اس کے جیتے جی ماند پڑی ہے جو۔)

جب کسی اور کے ملن کی خوشی بھی رائگاں گئی ہو اور اس سے جڑی زندگی میں بھی اس کے وجود میں خزاں چیخنے لگی۔ ہارے ہوئے جواری کے مانند اس نے گھر کے دوسرے اور آخری مکین کو چوکھٹ پار کرتے دیکھا...... وہ گھر سے نکلنے سے پہلے اسے کچھ کہہ کر گیا تھا...... کیا؟ اس نے سنا نہیں اور سنا بھی تھا تو سمجھا نہیں۔ بس خالی الذہن سی بیٹھی ٹھنڈی چائے میں توس بھگو کر منہ تک لے جاتی رہی اور بنا دانتوں کو زحمت دیے حلق سے اتارتی رہی۔

☆☆☆

بڑی خالہ نے اس سے صرف منہ دیکھے کی محبت نہیں کی تھی۔ وہ واقعی اس کی ماں جیسی تو تھیں۔ جبھی اپنی تین بیٹیوں کے اکلوتے بھائی کے لیے نکاح کا پیغام لے آئیں۔ اسے اندازہ تھا کہ خالہ کی محبت ضرور رنگ لائے گی مگر افسوس کہ وقت بڑا بے رحم نکلا۔ اس سے پہلے ہی کسی اور کی چاہت نے اس کے من مندر میں دیوالی سجالی۔ روشنیاں، جھلملاہٹیں اسے وقت بے وقت کسی کی شوخ نظروں اور میٹھی یادوں کی گھنٹیاں بجتی سنائی دیتیں اور وہ ان کی آواز پر بے خودسی ہو جاتی۔

ان دنوں اماں اسے سلائی سکھانے کے کتنے جتن کر رہی تھیں اور اس کے چاروں طرف ایک انوکھی خوشی آگہی کے گھنگرو باندھے رقص کرتی رہتی۔ وہ دوسراہٹ کا پہلا، پہلا احساس تھا جو اس کے کچی کلیوں جیسے نوخیز حسن کو خراج دینے دل کی چار دیواری میں اترا تھا۔

وہ اماں کی لعن طعن سنے جاتی، ہنسے جاتی اور قینچی چل جاتی، غلط، سلط، الٹی، سیدھی، کبھی سیدھا کپڑا ترچھا کٹ جاتا اور کبھی صاف ستھرا چھوٹا سا کپڑا کترنوں میں بدل جاتا۔

''یہ کچھ نہیں کر سکتی۔'' اماں جھلا کر فیصلہ سناتیں۔

اور ایسے میں اگر خالہ پاس ہوتیں تو اسے لپٹا لیتیں۔

''بس کر دو بتول...... سارے گھر کے کام میری بچی کرتی ہے اور تم اسے ایک اور نئی چیز سکھانے چلی ہو۔ تھوڑا وقت تو لگتا ہے ناں......''

وہ منہ بسور کر خالہ کی تائید میں گردن ہلاتی جاتی۔

مگر...... پھر ایک دن...... اس کی سیاہ آنکھوں میں حیرانی اتر آئی۔ وہ اتنی ساکت ہوگئی کہ تائید یا تردید تو کیا نظر تک نہ ہلا سکی۔ اتنی بے خود ہوئی کہ دو جہاں بھول کر بس بڑی خالہ کے چہرے کو تکتی رہ گئی۔

''تم فکر نہ کرنا، دھوبی، باورچی، درزی سب لگوا کے دوں گی میری گڑیا کو کسی کام کی فکر نہیں کرنی پڑے گی ارے ملکہ بناؤں گی ملکہ......'' خالہ اس کی محبت میں کسی قسم کی دروغ گوئی سے دریغ نہیں کرتی تھیں۔

وقت دھیرے، دھیرے دبے پاؤں آگے کی اور چلا...... اس کی رگ، رگ میں بے چینی آسمائی جتنی جلدی خالہ کو لگی تھی اس سے زیادہ جلدی خود اسے لگ گئی تھی۔ مگر اس کی قسمت کو کوئی جلدی نہیں تھی بلکہ شاید اس کی اپنی قسمت تو کہیں تھی ہی نہیں...... بس دوسروں کی مرضی ہی مرضی تھی۔

تبھی ایک دن وہ بہت ہمت کر کے وہاں پہنچی تھی۔

سفید چونا پھری دیواریں اور کھلی چھت کی طرف کھلتے دریچے سے جھانکتی گلابی پھولوں سے لدی بیل...... اس پر شاید جوبن اترا ہوا تھا مگر اس کے اپنے من میں تو ہجر کا وسواس گھات لگائے بیٹھا تھا۔

''لو میری جان پر بنی ہے اور خود کتنے آرام سے پڑے سو رہے ہیں۔'' اس نے بستر پر محو خواب وجود کو جھنجوڑ ڈالا تھا۔ اور خوب دیر تک لعن طعن کی...... اپنی بے بسی اور خالہ کی چوکسی کے قصے سنائے۔ جدائی کی ڈراؤنی کہانی کی قسطیں نشر کیں اور محبت کے منطقی انجام تک پہنچنے کے مرحلے گنوائے تھے۔ بستر کے اونچے چوبی سرہانے سے ٹیک لگائے ہوئے وجود کے لبوں کی مسکراہٹ دم بہ دم گہری ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اس کی فراٹے بھرتی زبان اٹکنے لگی۔

''آپ سمجھ گئے ناں، جو میں کہنے آئی تھی۔'' آخر میں نظریں جھکا کر اس نے اپنی تشفی کرنی چاہی تھی۔

''بالکل سمجھ گیا جناب...... آج کل میں آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا اور کوئی حکم......'' چند لمحے خاموشی رہی وہ اس کی گہری نظروں کے معنی خیز حصار سے پھسلتی اٹھنے کے لیے ہمت مجتمع کر رہی تھی کہ وہ بول پڑا۔

''ایک بات کہوں شان......؟'' وہ جذب سے اس کی طرف جھکا۔

''تم جتنی کم عمر ہو، اتنی ہی معصوم اور نادان بھی ہو۔ یوں شانِ بے نیازی سے میرے دل کی دنیا تہ و بالا کرتی ہو کہ میں صدائے احتجاج تک بلند نہیں کر سکتا۔ بہتر ہوگا کہ یہ تباہی مچانے سے گریز کیا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ میں کسی دن بدلہ لینے کا سوچوں اور تمہارا واپس گھر جانے کا جی ہی نہیں چاہے۔'' اتنا بے باک انداز اور کھلی دھمکی۔

اس کے لیے وہاں سے اٹھ کر دروازے تک جانے کے چند قدم اٹھانا دوبھر ہو گئے اور جب وہ وہاں سے سیڑھیاں اتر کر اپنے گھر کی طرف جا رہی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے قدم زمین پر نہیں کہکشاں پر سفر کر رہے ہیں وہ چل نہیں رہی تھی وہ اڑ رہی تھی۔

☆☆☆

میری سوچوں کو نئے موڑ پہ لانے کے لیے
ہاں وہ آیا تھا مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے
دن گزرتا ہے قیامت کی طرح اکثر اور
شام آتی ہے نیا حشر اٹھانے کے لیے

ہاں وہ شام بھی حشر اٹھانے کے لیے آئی تھی۔

وہ شام، جتنی خاموشی سے آئی تھی اتنا ہی طوفان و تباہی اپنے ساتھ لائی تھی اور اپنے پیچھے فقط آنسو، پچھتاوے اور عزت کی دھجیاں فضاؤں میں چھوڑ گئی۔ ایک نامہربان، سخت آواز کی بازگشت کے ساتھ۔

''پوچھ اپنی بچی سے بتول، کیوں آئی تھی یہ چھپ چھپاتے میرے گھر اکیلی بھری دوپہر میں...... میں پوچھتی ہوں باپ سر پر نہیں اور اس کی دیدہ دلیری تو دیکھو، میرا

سب سے کم عمر اور معصوم بیٹا ہی ملا تھا پھانسنے کے لیے...... ساری دنیا جہان کے لڑکے مر گئے تھے کیا......؟''

عزت کی چادر پر بہتان کے تیر چلانے والے کبھی نشانہ نہیں باندھتے...... کیونکہ انہیں علم ہوتا ہے کہ انگارے کی طرح دہکتے سروں والے یہ پتھر نیک نامی کے چھپر میں جہاں بھی جا لگے، کردار کا بدن وہیں سے راکھ کا ڈھیر بن جائے گا۔

وہ بھی جل گئی تھی۔ اس کی روح جل گئی تھی۔ اب اس کے جیتے جاگتے جسم میں راکھ ہوئے خوابوں کے سرمئی ڈھیر کے سوا کچھ باقی نہیں بچا تھا۔

☆☆☆

گنگناتے ہوئے دن اماوس میں بدل گئے۔ زندگی جو کبھی شوخ ہرنی کے مانند آگے ہی آگے قلانچیں بھرتی جا رہی تھی۔ کسی اپاہج بھکارن کی طرح گھسٹنے لگی۔

اماں نے خفا ہو کر منہ کیا پھیرا...... بے سائبانی کے احساس نے اپنے بڑے، بڑے سیاہ پر کھول کر اسے آغوش میں سمیٹ لیا اس نے اچھی نصیحت پکڑی۔

''میرا باپ زندہ نہیں، میں محفوظ نہیں۔'' (حالانکہ اللہ تو ہے ہمیشہ سے اور......) محبت وحبت کھیل تماشا تو ہو سکتا ہے پر زندگی کی سچائی نہیں۔ جبکہ اس کی اپنی زندگی تو تھی ہی سچائی سے عبارت پیدائش سے لے کر انیسویں سال تک اس میں کوئی جھوٹ سرے سے تھا ہی نہیں پھر......؟

''ایسی باتیں بھلا کب تک چھپتی ہیں......؟''

لوڈ شیڈنگ کے طویل دورانیے میں سلائی مشین کی ہتھی گھماتے ہوئے اماں کی بھرائی ہوئی خود کلامی اس کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔

''ایسی کیا ویسی باتیں تو سب چھپ سکتی ہیں چھپائی جا سکتی ہیں مگر انسانوں میں اتنے ضبط کا یارا کہاں......'' جب ہی بڑی خالہ جو اسے بہو بنانے کے لیے اتاؤلی ہوئی جا رہی تھیں۔ اچانک بیٹے کے پردیس جانے کا سندیسہ لیے چلی آئیں۔

جو کبھی دل میں بستا ہی نہیں تھا اس کے دور جانے کا غم کیا مناتی۔ اس کے پچھتاوے ہی بہت تھے۔ اسے سنگسار کرنے کے لیے...... جو اس کی محبت کی برہنہ لاش پر سر پھوڑ ڈالنے رو تے رہتے تھے۔ آدھا کلو مٹھائی کا ڈبا ارمان نے اکیلے ہی کھا کر ختم کیا۔ اماں کی شوگر ہائی ہو گئی تھی اور ساتھ ہی اس کا بھائی بلند فشار خون بھی آ موجود ہوا اور خود اس کا تو جی ہی نہیں چاہتا تھا کہ سر اٹھا کر ہی دیکھ لے۔

''واہ، واہ...... کھا کے تو دیکھو بجو......'' اسے مٹھائی کی ترغیب دینے والا سات سال چھوٹا بھائی سر سے اونچا جا رہا تھا اور وہ اتنا بھی نا سمجھ نہیں تھا جتنا وہ خیال کرتی تھی...... اپنی پڑھائی کا خرچہ ایک دکان میں اٹھا پٹخ کر کے خود ہی برداشت کر رہا تھا۔ قسمت نے اڑان بھرتے سے جو مشقت اس کی گود میں پھینکی تھی اس نے بلا چون وچرا...... وقت سے پہلے اٹھا لی تھی اور وقت سے پہلے ختم کر کے پھل کھانا چاہتا تھا۔ اور ایک وہ تھی۔

''شانِ فاروق......''

اس کے ابا عمر فاروق نے اس کا نام بہت فخر اور طمطراق سے شان رکھا تھا اور ایک بے رحم شام سے پہلے اسے بھی اپنا وجود ماں، باپ کی شان ہی لگا کرتا تھا۔ پھر اس نے خود اپنے ہاتھ سے اس فخر کو مٹی میں ملا دیا۔ کیوں؟ کاش کوئی جواب لا سکے۔

وہ نادانی تھی یا معصومیت، دانستہ یا نادانستہ...... کوئی کھیل تھا یا غلطی...... اسے خود پتا نہیں تھا وہ کسی اور سے کیا پوچھتی۔

نہ تو پا سکا نہ بھلا سکا...... میرا مسئلہ بھی عجیب ہے
نہ پلٹ کے گھر ہی کو جا سکا میرا مسئلہ بھی عجیب ہے
میں کسی کے دل میں ضرور تھا، اسی بات کا تو غرور تھا
سو کسی کو کچھ نہ بتا سکا، میرا مسئلہ بھی عجیب ہے

☆☆☆

زرد مریل دھوپ دیواریں کود کر صحن تک اتر آئی تھی۔ اس نے بے دم ہو کر کمبل سے سر نکالا۔

سرد موسم اپنے ساتھ اتنی وحشتیں کیوں سمیٹ لاتا ہے، پتا نہیں...... ابھی تو دن جوان تھا، ابھی تو شام

بہت دور تھی۔ اس نے کسلمندی سے پیر سبل سے نکال کر انگڑائی لی پھر واپس اندر کر لیے...... معمولی سی گرماہٹ کا احساس دلاتے تلوے لحظہ بھر میں یخ ہو چکے تھے۔

اس نے صحن میں لگی الگنی پر ٹنگی جرابوں پر نظر ڈالی۔ کل ارمان کے اصرار پر اس نے بڑی وقت کے بعد جرابیں اتار کر دھوئی تھیں۔ جب ارمان نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایسی گرم جرابوں کی پوری پانچ جوڑیاں لا کر دے گا۔ مگر اس شرط پر کہ اب وہ کبھی رات کے وقت جرابیں پہن کر نہیں سوئے گی۔

''کچھ پتا بھی ہے ٹمپریچر کہاں سے کہاں جا پہنچا تھا۔ حد ہے بجو...... ! پڑھ لکھ کر گنوایا۔'' وہ اس کا چہرہ پڑھتی سوچتی رہی۔

''میں نے تو بس گنوایا ہی گنوایا ہے زندگی نے کچھ کمانے ہی کب دیا۔''

☆☆☆

وچولن کی وساطت سے لایا گیا رشتہ اماں نے بھی نیم دلی سے ہی قبول کیا تھا۔ کیونکہ خالہ نے اس کو بہو بنانے کا سبق رٹنا بند کر دیا تھا۔ البتہ ان کا آنا جانا اور محبت ویسی ہی تھی پہلے جیسی...... جبھی اس کا رشتہ طے ہوا تو ان کے لبوں پر ''رشتے داروں کا پہلا حق'' جیسے شکوے، شکایات کے بجائے اس کی شادی کی تیاریوں میں حصہ بٹانے والی چیزوں کی لمبی فہرست تھی۔ انہوں نے نہ صرف بڑے بھرپور طریقے سے اس کی شادی میں شرکت کی بلکہ اماں کی مالی مدد کرنے کے علاوہ بھی بہت سی چیزوں اور انتظامات کی ذمے داری بخوشی اپنے کندھوں پر اٹھالی۔ (شاید احساسِ ندامت یا جرم......؟)

خالہ زاد بہنوں نے اسے ہفتے بھر کے لیے مایوں بٹھا دیا۔ ابٹن اور چنبیلی کے خوشبو دار آمیزے سے اس کے ہاتھ پاؤں رگڑ، رگڑ کر شفاف کر دیے۔

یہ سات دن یوں تھے گویا اس کے آنے والے ازدواجی حیات کے اولین، حسین دنوں سے زیادہ رنگین۔ وہ کسی شہزادی کی سی آن بان کے ساتھ کاٹن کے سفید پردے کے پیچھے کمرے کے کونے میں ہاتھ پیر پھیلا کر بیٹھی رہتی اور ہر تھوڑی دیر کے بعد کبھی شبینہ عرف شبو......

''شانی چندا تھوڑا دودھ پی لو، ناشتا کیے ہوئے دیر ہو گئی ناں......'' کبھی قرینہ المعروف رینا آپی آجاتیں۔

''شان سیب کھالیے تم نے، لو یہ ماسک بنا کر لائی ہوں تین دن لگاؤ دیکھنا اسکن کیسی گلو کرے گی۔''

اور تو اور...... ان تینوں سے چھوٹی امینہ جو بیوٹیشن کا کورس کر رہی تھی۔ اس کے لیے پتا نہیں کون، کون سی فیس واش اور مینی کیور، پیڈی کیور آئٹمز اٹھا لائی تھی۔ ویکسنگ، تھریڈنگ، رگڑائی، ساج...... پیشانی سے لے کر گردن کے پچھلے حصے تک، ناخن سے لے کر بازوؤں تک...... اور پیر کے پنجوں سے لے کر پنڈلیوں سے اوپر تک ان سات دنوں میں اس نے خود کو اپنے ہی خول سے نکل کر ایک نیا جنم لیتے دیکھا۔ اس کی گرومنگ، اس کا میک اپ اور میک اوور اتنا شاندار اور تیز رفتار تھا کہ وہ بارات سے ایک دن پہلے آئینے میں بس اپنی لشکارے مارتی جلد ہی دیکھے گئی۔ آنے والے دنوں کی فکر، تنہ، نئے شخص کی ہمراہی کے خدشے...... جو ہلکی، ہلکی خمار آلود خوشی لیے ہوئے تھے۔ کبھی دل کے کواڑوں پر دستک دیتے اور کبھی ہاتھ باندھ کے ایک طرف ہو جاتے اور وہ آئینہ لے کر بیٹھ جاتی۔

شہد کا مستقل استعمال، آنکھیں چمکدار اور بال لچکدار ہو چلے تھے۔ ان سات دنوں نے اس کے وجود پر گویا زندگی کا سب سے حسین روپ چڑھا دیا تھا۔

☆☆☆

''شانو!'' کسی کے استحقاق بھرے لہجے نے اسے ایک نیا محبت بھرا نام دیا تھا۔ اور وہ خاندان بھر میں شانو بھابی مشہور ہو گئی۔

خدا کا شکر تھا کہ تہی دامنی کی جتنی شکایات اور حسرتیں اس کے اپنے مہربانوں نے اس کے دل میں ڈالی تھیں اس شخص نے اپنے حسنِ سلوک اور نرم نگاہوں

سے زخم دل میں پیوست کانٹوں کی طرح چن، چن کر نکال دیں۔

سال بھر بعد زندگی میں پہلی بار اس کی سالگرہ منائی گئی اور اس دن افتخار صمد نے یہ گدگداتا ہوا انکشاف کر کے اسے گنگ کر دیا کہ اس نے خود کی شادی کی تاریخ اس کی سالگرہ والے دن رکھوائی تھی۔

"ارے! اتنا خیال کون کرتا ہے بھئی......" وہ خوشی بھری حیرت کے سمندر میں ڈوب مرتی تب بھی کم تھا۔

اس دن پہلی بار ارمان اس کے لیے تحفہ لے کر آیا۔ موٹے، موٹے جھلملاتے نگینوں جڑے کڑے اور ان کے درمیان رکھی کانچ کی رنگ برنگی چوڑیاں......

وہ اپنے ماں جائے سے لپٹ، لپٹ گئی اور چپکے، چپکے آنکھیں مسل کر ان نمکین پانیوں کو ڈپٹا جو بے موقع اس کی شادی کی سالگرہ میں شرکت کرنے چلے آئے تھے۔

"بھلا تمہیں کیا پتا میرے بھیا، تم نے کیسی انمول خوشی سے نواز دیا ہے آج چاہے اپنے بچپنے کے کھیل میں ہی سہی پر بڑی بہن کو یاد تو رکھا۔"

وہ پندرہ سالہ ارمان کے آگے رکھی پلیٹ کو بار، بار بھرے گئی۔ وہ بار بار دہائیاں دیتا رہا۔

"بس بجو بس کرو...... کیا جن سمجھ رکھا ہے مجھے۔"

اس کی ساس نے نظروں ہی نظروں میں افتخار کو بیوی کی بلائیں لیتے دیکھا...... تو اس میں تعجب ہی کیا تھا۔ افتخار اپنی عمر کا چوتیسواں نکال رہا تھا اور وہ تو ابھی محض بائیس کی ہوئی تھی۔

"دس، گیارہ، بارہ......" انہوں نے کچھ چونک کر انگلیوں پر حساب لگایا اور...... "ارے۔"

بس وہ دن اس کی خوشیوں کا... آخری دن تھا۔ اماں کی بے فکری کے اختتامی لمحات اور ایک الجھنوں، طعنوں بھری راہ گزر کی طرف پہلا قدم...... واپسی پر اس کی ساس اپنی پیشانی کے بل اماں کے جھریوں بھرے ماتھے پر لکھ چکی تھیں۔

"ایک سال گزر گیا اور خوشخبری کا کچھ اتا پتا ہی نہیں......"

☆☆☆

اماں کے دل کے سکون اور رات کی میٹھی نیند والے دن اڑنچھو ہو گئے۔ وہ دل ہی دل میں کئی بار خود پر ہنس دیتیں۔ ایک نمناک ہنسی...... کرب کے دامن میں منہ چھپا کر روتی ہوئی ہنسی۔

"میں بھی کیسی باؤلی نکلی بھلا...... بیٹی بیاہ کر خود کو صرف بیٹے کی ماں سمجھ بیٹھی تھی...... ہک ہا......"

اماں کی سلائی مشین پھر ان کے بوڑھے ہاتھوں نے سنبھال لی۔ اور نماز کی چوکی دن کے زیادہ تر حصوں میں دعاؤں سے آباد رہنے لگی۔

"میرے سوہنے رب کے یہاں اندھیر تو نہیں، ہاں...... دیر ضرور ہے۔" شادی کے بعد روز بروز میکے کے بڑھتے چکروں کے پیچھے دل میں کالا ہونے کی خبر، کسی کے سنائے بغیر ہی ان کا دل سن لیتا۔ اور وہ اس کے کچھ کہے بغیر اس کا ہر دکھ اس کے باہم پیوستہ لبوں سے اٹھا کر اپنے دل میں چھپا لیتیں اور اس کے جانے کے بعد اپنے ہمراز و دمساز کے آگے آنسوؤں میں بہا دیتیں......

بھلا اور تھا ہی کون...... جس سے وہ یہ راز و نیاز کر سکتیں۔ میکے کے نام پر ایک بہن جو تینوں بیٹیاں بیاہ کر بیٹے کے پاس جا بیٹھی تھی۔ شوہر سمیت سسرال کے نام پر ایک جیٹھانی جن سے تعلق نہ ہونا تکلیف دہ تھا اور تعلق ہونا اور زیادہ تکلیف دہ۔

اب شانی کو افتخار زیادہ تر گھر سے باہر اتار کر چلتا بنتا...... وہ روز بروز مرجھاتی چلی گئی۔ جس چہرے پر گلاب کھلتے تھے۔ وہاں زردیاں کھنڈنے لگیں۔ جن زلفوں کو دیکھ کر آبشار یاد آتے تھے، وہ محض جھاڑ جھنکار یا جھنجٹ بن کر رہ گئیں۔ آنکھوں میں چمک اور لبوں کا گداز خواب ہوا اور وہ کھال چڑھے ڈھانچے میں بدل گئی۔

"بجو! اپنا خیال کیا کرو ناں......" اب تو ارمان بھی بول ہی پڑتا تھا۔

"کس کی خاطر......"

بات تھی کہ آہ......

☆☆☆

عصر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ اس نے وضو کر

کے جائے نماز بچھائی اور ادائیگی فرض کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ کتنی دیر محض گہرے چہرے کے ساتھ ہاتھوں کو تکتی، ان کے خالی پن کا مرثیہ پڑھتی رہی پھر بدقت تمام الفاظ کو کھینچ کھانچ کر لبوں تک لائی۔

"اے میرے پاک پروردگار! میں تیری بہت گناہ گار بندی ہوں، سمندر کے جھاگ بھی کم ہی ہوں گے اگر گننے لگ جاؤں...... پر میرے گناہوں میں، میری عیب دار بندگی اور تیری بے عیب ذات کی رحمت میں یہی تو فرق ہے۔ تیری رحمت سب سے بڑی ہے میرے مولا...... میں اسی رحمت کے سہارے امید لے کر بہت عاجزی اور انکساری سے یہ التجا لے کر آئی ہوں میرے مالک! میری زندگی میں تو یہی دو سہارے ہیں۔ ایک میرا بھائی اور ایک تو اگر یہی تیری مرضی ہے تو میں بہت شاد و مطمئن ہوں...... بس میری التجا سن لینا...... میرے کسی عمل کی لغزش کو میری تربیت کی کجی ٹھہرا کر میری ماں کو اس کی سزا نہ دینا...... انہیں کوئی آزار نہ سہنا پڑے۔ ان کی قبر کو اپنے نور سے منور کردے، میرے مالک! میرے پیاروں کو سکون دے اور میرے دل کو اپنی یاد سے کبھی غافل نہ کرنا۔ میں...... میری ماں...... اماں۔" ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ جائے نماز پر سجدے میں گری پھوٹ، پھوٹ کر رودی۔

اپنی ماں کو یاد کر کے...... جس نے زمانے کے سرد و گرم سے بچانے کے لیے ہمیشہ اپنی پناہ میں رکھا تھا۔ افتخار کو یاد کر کے...... جس نے زندگی بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا پر وفا نہ کرسکا۔

☆☆☆

"اللہ جیتا رکھے...... ماشاء اللہ، خیر خیریت سے وہ دن لائے۔ کتنی مرادوں سے میرے مولا نے یہ دن دکھائے۔ رب سوہنا آگے بھی خیر کرے۔" اماں دروازہ کھولتے ہی سمجھ گئی تھیں۔ اس کے کھلے، کھلے چہرے اور وجود سے خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں۔ وہ دروازہ کھولتے ہی کھلکھلا کر اماں کے گلے لگ گئی...... اور چپکے سے ان کے کان میں سرگوشی کر ڈالی۔

پیچھے، پیچھے افتخار بھی مٹھائی کا ڈبا لیے چلے آئے تھے۔ ارمان اسی وقت کہیں سے لوٹا تھا، اماں نے الٹے پیروں سموسے اور جلیبیاں لینے واپس کردیا۔ افتخار کے سر پر ہاتھ رکھا اور شان کے سر سے سو کا نوٹ وارا پھر دعائیں دیتی دل ہی دل میں نو مہینے آگے کی پلاننگ کرنے لگیں۔

"ایک چوڑی توڑ کر بالیاں بنوا دوں گی۔" ان کی پلاننگ کا سب سے پہلا فیصلہ ہوا۔

"دوسری چوڑی سے ارمان کی دلہن۔"

کتنے سال لگے تھے یہ وقت آنے میں، ارمان کی تعلیم کا آخری سال چل رہا تھا مگر ماں تو پھر ماں ہوتی ہے ناں......

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر 5-L / 79 ڈاکخانہ 5.L / 78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

بچوں کی پیدائش کے ساتھ ہی بلکہ شاید اس سے بھی پہلے سے اس کی ممتا بھی حاملہ ہو جاتی ہے، بچوں کے جنم کے ساتھ ان سے جڑے خوابوں کو ممتا جنم دیتی ہے اور پھر اولاد کی تعلیم و تربیت ماں کرتی ہے اور ان سے جڑے خوابوں کو اور خود سے باندھے ارادوں کی ساتھ، ساتھ پرورش اور سینچائی ماں کی ممتا شروع کرتی ہے۔ اولاد کی عمر کے ادوار آگے بڑھتے ہیں تو خوابوں کا رنگ بدلتا ہے۔ پر ماں...... ماں اور ممتا...... آپس کے اس گٹھ جوڑ کو کبھی ٹوٹنے نہیں دیتیں۔

افتخار کی محبت جو مایوسی کی دھوپ تلے زرد پڑ گئی تھی پھر سے بن بادل برسات کی طرح شان کے وجود پر برسنے لگی۔ مگر...... پھر وہی مگر...... وہی لیکن...... بن بادل برسات، بن موسم بھی تو ہوتی ہے۔ جس کی عمر مختصر اور خوشی ناپائدار...... ابھی تو اس کی کوکھ میں سانس لیتے وجود نے اپنا احساس تک دلانا شروع نہ کیا تھا۔ جب اطلاع آگئی۔

اب کہیں جا کے تو چہرے پر روٹھی ہوئی قوسِ قزح واپس اتری تھی کہ اس کا دوپٹا سفید ہو گیا۔

ارمان اسے ایک پہلو میں لیے، دوسرے کندھے تک بازو پھیلائے ستے ہوئے چہرے کے ساتھ تھپک رہا تھا۔ منا رہا تھا اور وہ کسی صورت ایمر جنسی وارڈ میں جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔

''نہیں، نہیں...... ارمان...... وہ نہیں ہو سکتے، تو نے کسی اور کو دیکھا ہو گا۔'' وہ نفی میں سر ہلاتی جاتی اور پیچھے ہٹتی جاتی اور ارمان کے بازو جھٹک دیتی۔

''نہیں، مجھے نہیں جانا، مجھے کسی کو نہیں دیکھنا، مجھے واپس لے چلو۔ وہ...... افتخار خود ہی واپس آ جائیں گے' وہ آفس گئے ہیں تم لوگ جھوٹے ہو، جھوٹ بولتے ہو، نہیں...... نہیں ناں......'' آرام سے بات نہیں بنی تو اس نے زور سے چیخ کر حقیقت کو رد کرنا چاہا۔

وہ حقیقت جو ازل سے اس کی تقدیر کا حصہ تھی۔ اس سے جڑے رشتوں کے چہرے پر آنسو بن کر پھیل گئی تھی۔ وہ حقیقت جو سچائی جو کسی اور کے ساتھ، ساتھ اس کی اپنی زندگی کو بھی ختم کرنے کے درپے تھی۔

بھلا وہ ایسی آسانی سے، چلانے سے پلٹ سکتی تھی کیا...... اور وہ پلٹنے کے لیے تو نہیں آئی تھی ناں......

یہاں تک کہ اسے ایمر جنسی وارڈ تک لے جانے اور افتخار کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے مجبور کرتا ارمان خود ہی اسے سینے میں بھینچ کر رو پڑا۔

وہ کہاں سے اتنا بڑا دل لے کر آتا ہے، اس نے خود کو لاچاری کی چوٹی پر کھڑا پایا۔ وہ کیسے بتائے اپنی بہن کو کہ مکمل خوشی اس کے نصیب میں نہیں، کیوں...... کیوں...... اسے کچھ کہنے سے پہلے وہ خود ہی اس تقدیر کے آگے ڈھال نہ بن جاتا...... اگر بس میں ہوتا تو...... جو بس میں تھا وہ بھی کب کر پایا وہ......

شان کو راضی نہیں کر پایا، وہ مانی ہی نہیں۔ بس شیشے کی دیوار کی دوسری جانب بیٹھی ہتھیلیاں رگڑتی پھر ان ہی سے اپنا گیلا چہرہ پونچھ لیتی، روتی رہی، ہتھیلیاں رگڑتی رہی۔ یہاں تک کہ اس کی ہتھیلیاں سرخ ہو گئیں اور خالی بھی......

افتخار کے بے جان وجود نے بہت خاموشی سے بے آواز آئی سی یو سے سرد خانے تک کا سفر کیا...... تب وہ صرف اپنی امید کو زندہ رکھنے کے لیے اس سرد خانے کے یخ بستہ کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

اسے یقین تھا کہ بم دھماکے کے بعد مچنے والی بھگدڑ میں افتخار معمولی زخمی ہو گیا ہے اور وقتی طور پر لاپتا اور بس......

وہ اس جگہ گیا ہی نہیں تھا جہاں کا نیوز چینل والے چیخ، چیخ کر شور مچا رہے تھے۔ سفید وردی والے ایک ادھیڑ عمر مرد نے اس کے سامنے ایک بڑی چوکور سی دراز کھینچی، اس کی انگلیاں آپس میں الجھ کر سختی سے جکڑ گئیں۔ ارمان نے سفید چادر سرکائی اور ایک چہرہ سامنے آیا، جسے آسانی سے شناخت نہیں کیا جا سکتا تھا مگر وہ شناخت ہو ہی گیا۔ اس کی آنکھیں پھٹ گئیں، وجود ریت کا ڈھیر بن گیا۔ تلوؤں میں ببول اُگ آئے اور کھڑے رہنا دشوار ہو گیا۔ چند لمحے، فقط چند لمحے

لگے تھے اسے پہچاننے میں...... پھر...... سامنے کھڑا بھائی اور انجان بزرگ جو ترحم آمیز انداز میں اسے دیکھ رہے تھے سرد کمرے کا فرش، دیواریں، چھت سب گول، گول گھوم گیا۔

اس سے پہلے کہ ارمان اس کی کیفیت سمجھ کر اسے تھامتا وہ کھڑے، کھڑے پورے قد سے زمین پر گر چکی تھی۔

☆☆☆

لوگ کہتے ہیں زیادہ رونے سے آنسو ختم ہو جاتے ہیں۔ اسے تو لگتا تھا کہ وہ صدیوں سے آنسو بہا رہی ہے پر جانے کہاں سے امڈے چلے آتے ہیں۔

''میرے آنسو تو ختم نہیں ہوئے۔'' وہ حیرت سے خود کلامی کرتی پھر رو دیتی۔

''میری بیٹی کی قسمت بھی میرے جیسی...... کیا ضروری تھا...... یا اللہ۔'' اماں کو اس کا غم اسی دن آدھا کر گیا تھا۔ جب اس نے خود سے جڑی دو، دو زندگیوں کا نوحہ پڑھا تھا۔ اس نے دیکھی تھی درد کی ریکھا...... اس پر وچھوڑے کا آسیب قابض ہو گیا تھا۔ ایک جو دل میں تھا...... اور دوسرا جو...... وہ اسپتال کے بیڈ پر بیچارگی سے پڑی دن میں کئی بار پیٹ پر ہاتھ پھیرتی اور بلک پڑتی...... کون تھا جو اسے اس ناقابلِ تلافی نقصان کا بدلہ چکا سکتا تھا۔ کم از کم اس روئے زمین پر تو کوئی نہیں تھا...... اماں کو لگتا اس کا وجود ان ہی آنسوؤں میں بہہ جائے گا...... اور ارمان کو لگتا وہ اپنی آنکھیں گنوا دے گی۔

''میں نے دو زندگیاں گنوائی ہیں ارمان...... اب ایسے چھوٹے موٹے نقصان سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

☆☆☆

خوشیوں کی بارات ادھوری چھوڑ گئے ہو
ساجن دل کی بات ادھوری چھوڑ گئے ہو
تم تو خود تھے پیاس بجھانے والا بادل
تم کیونکر برسات ادھوری چھوڑ گئے ہو
اِک، اِک کر کے میری ساری نیندیں اور خواب
میری اِک، اِک رات ادھوری چھوڑ گئے ہو

رات کا سیاہ آنچل ڈھلک کر سرمئی شام کے ماتھے پر گرا ہی تھا۔ جب اس نے مغرب کا سلام پھیرا اور مسلسل بجتا دروازہ کھولا۔

سامنے ارمان کسی اجنبی کے ساتھ کھڑا تھا وہ فوراً منہ پر دوپٹا ڈال کر ایک طرف ہو گئی۔

''آیئے سلمان بھائی۔''

وہ کسی کو ساتھ لیے اپنائیت سے بولتا صحن سے اوپر کی طرف جاتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ وہ سیدھی کچن میں آئی، جانتی تھی دو کپ چائے کا آرڈر آنے ہی والا ہے۔

''اوپر والا پورشن دیکھنے آئے ہیں، جلدی سے دو کپ چائے، بخار تو نہیں ہوا دن میں دوا لے لی تھی۔'' وہ تیز، تیز بولتا ہوا اندر داخل ہوا۔ پھر چائے نکالتی شان کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

''نئے کرائے دار ہیں۔'' اس نے اپنے پیچھے ارمان کی آواز سن کر پوچھا۔

''ہاں کرائے دار تو نئے ہیں پر جاننے والے پرانے...... خدا کا شکر ہے، کافی دن کے بعد سہی مگر ڈھنگ کے کرائے دار تو ملے...... چھوٹی سی فیملی ہے، بس سلمان بھائی، ان کی امی اور ایک بیٹی...... بیوی بیچاری کی ڈیتھ ہو گئی۔''

''اوہ!'' اس کے دل کو بہت محسوس ہوا۔ کسی انجان شخص کا جانا پہچانا دکھ......

''پتا نہیں کیسے...... خیر، ان کی امی آئیں گی تو گھل مل کر رہنا...... اچھا ہے تمہارے اکیلے پن کا علاج بھی ہو جائے گا۔'' وہ بولتے ہوئے ٹرے تھام کر باہر نکل گیا اور اس کی پشت دیکھتی شان کے لب سل گئے۔

''اکیلے پن کا علاج...... ہونہہ......'' اس نے تلخی سے سر جھٹکا۔

''جو اکیلا پن روح میں اتر کے اپنے بے رحم پنجے گاڑ دے اس کا علاج صرف موت ہے۔'' اسے ایک بار پھر بچھڑے ہوؤں کی یاد نے کھسوٹا تھا۔

☆☆☆

شہناز آنٹی بہت شفیق تھیں...... اس سے بہت محبت سے ملیں اور دیر تک وہیں برآمدے کے تخت پر بیٹھی باتیں کرتی رہیں، اس نے چائے بنائی اور ساتھ میں پکوڑے بھی تل لیے۔

''ارے یہ تکلف کیوں کرلیا تم نے بیٹی......! میں کہاں کھا سکتی ہوں یہ بیسن کی بنی اور بادی چیزیں...... اس گیس کی بیماری نے تو سمجھو سارا دم خم نکال دیا۔'' پھر پلیٹ اٹھا کر...... اپنے پہلو سے جڑی پوتی کے آگے کی۔

''لو تم کھاؤ...... اور شرما کیوں رہی ہو اتنا۔''

شان نے ذرا سا آگے جھک کر بچی کا چہرہ دیکھا۔ گول چہرہ اور معصومیت بھری آنکھیں۔ اسے بے اختیار پیار آگیا۔

''اکیلی پڑ گئی ہے، معصوم...... ماشاء اللہ میری بہو اللہ بخشے بہت اچھی عورت تھی پھرتیلی، ہنسوڑ اور خدمت گزار...... ہک ہا...... بس اتنی ہی زندگی لکھوا کر لائی تھی غریب سرطان چاٹ گیا اسے۔ مت پوچھو، زندگی ایک، ایک دن کر کے کم ہوتی ہے تو دل پر کیسے آرے چلتے ہیں، ارے میں تو کہتی ہوں جو لوگ اچانک چھوڑ جاتے ہیں سمجھو جدائی کا آدھا غم تو ساتھ ہی لے جاتے ہیں پر جو آنکھوں کے سامنے قطرہ، قطرہ مرتے ہیں وہ تو......'' انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر چادر کے پلو سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔

''یوں لگتا ہے ساتھ جیتے لوگ بھی ساتھ ہی مر جائیں گے، خدا کسی کو یہ اذیت بھرے دن نہ دکھائے۔ ہر روز موت کے ہیبت ناک سائے گھر پر منڈلاتے دیکھا...... اور پھر اس کا انتظار کرنا۔''

ان کا چہرہ تکتی ہوئی شان سن سی بیٹھی تھی۔

اس نے بھی وچھوڑا سہا تھا۔ کسی کی دائمی جدائی دیکھی تھی۔ پر جو اذیت ان بوڑھی آنکھوں سے بہتی تھی، وہ تو سوچ کر ہی کانپ اٹھی۔

کیسا لگتا ہوگا جب پتا چلتا ہے کہ جس کے دم سے زندگی ہے وہ تو ایک مہینے، چھ مہینے یا سال بھر زندہ رہے گی بس......

''اُف میرے خدا......!'' اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

تکلیف، دکھ، اذیت سب ہی الفاظ ہیچ ہیں۔ جس دل پر گزرتی ہے وہی جانتا ہے۔ اور بے خبری کتنی بڑی نعمت ہے، اسے زندگی میں پہلی بار احساس ہو رہا تھا۔ وقتِ قضا سے بے خبر رکھ کر خدا تعالیٰ نے ہم پر کتنا بڑا احسان کیا تھا۔ اس نے جھر جھری لے کر اس خوفناک احساس سے نجات چاہی۔

''اور تم اپنے رب کی کون، کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔'' اس نے خود ترسی اور تنہائی کا احساس دلاتی تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر سچے دل سے خدا کا شکر ادا کیا۔

☆☆☆

دن رات آنکھ مچولی کرتے کافی آگے نکل گئے۔ گھر کے اوپر والے پورشن میں کافی رونق ہوگئی تھی۔ چار سالہ معصوم سی اسریٰ بھی اس کے تو کبھی اپنی دادی کے پاس اوپر نیچے چکر لگاتی رہتی۔ کسی حد تک اس کا اپنا دھیان بھی بٹ گیا تھا۔ اور وہ ارمان سے اپنی اس معمولی سی مصروفیت کا ذکر کرنے ہی والی تھی۔ جب ایک دن ارمان نے اس سے کچھ اور ہی ذکر چھیڑ دیا۔

وہ اس دن آفس سے جلدی گھر آگیا تھا۔

''بجو! میرے پاس بیٹھو، مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' وہ اسے چائے کا کپ دے کر پلٹی ہی تھی۔ دوبارہ مڑ کر تعجب سے اسے دیکھنے لگی۔

کوئی بھی بات کرنے سے پہلے ارمان کو یوں اسے روک کر کہنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ بات یقیناً خاص تھی مگر جب وہ بولا تو...... وہ سخت رنجیدہ ہوگئی۔

''تم کیا مجھے بوجھ سمجھنے لگے ہو ارمان؟''

''تم کیا مجھے ایسا سمجھنے لگی ہو بجو......!'' وہ بالکل اسی کے انداز میں بولا۔ اس سنجیدہ ماحول میں بھی اسے

ہنسی آگئی۔

''بکواس مت کرو، میں سنجیدہ ہوں۔''

''میں بھی سنجیدہ ہوں...... اور تم بتاؤ، کیا اکیلی زندگی گزاروگی۔ مگر کیسے اور کب تک، تم جانتی ہو اچھی طرح عورت کو ہمیشہ مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''تو تم ہو تو میرا سہارا......''

ارمان نے گہری سانس لی۔

''اور اگر میری جاب کی کال آگئی اور میں ملک سے باہر چلا گیا تو......''

''ہیں......'' وہ گھبراسی گئی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو، کیا واقعی......؟''

''اوہو...... کہیں نہیں جا رہا میں۔'' ارمان نے بغور اس کا سہما ہوا انداز دیکھا۔

''مگر میں تمہیں بتا تو رہا ہوں کیا پتا ویسا ہو جائے تو کیا تم اپنے آپ کو میری ترقی کی راہ میں رکاوٹ بننے دوگی؟''

''میں تمہاری......'' اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''میں رکاوٹ ہوں تمہاری ترقی کی راہ میں......''

''اوہو...... بجو، میں یہ کب کہہ رہا ہوں میں تو......''

''بس چپ ہو جاؤ ارمان...... خدا کے لیے، یہی وقت آنا باقی تھا۔ تم ہی میرے آخری سہارے ہو، تم ہی میرا ساتھ چھوڑ جاؤ گے دوسروں کی طرح۔''

''تو یہی تو میں کہہ رہا ہوں، اپنے لیے اور سہارے ڈھونڈو، جب تک زندہ ہو جینے کا سامان کرتی رہو۔ ورنہ نہ زندوں میں شمار ہوگی نہ مردوں میں گنی جاؤ گی کیونکہ زندگی نہ تو ایک بندے کے جانے سے ختم ہوتی ہے اور نہ مرنے والوں کے ساتھ مرا جاتا ہے۔ جو لوگ کسی کے جانے پر دنیا چھوڑنے کی بات کریں، وہ یا تو جھوٹے ہیں یا جمود کا شکار اور اگر صاف شفاف پانی کہیں زیادہ دیر رکا رہے تو اس میں بھی کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ وہ سڑنے لگتا ہے۔'' وہ بہت دھیرے، دھیرے اسے سمجھا رہا تھا۔

''زندگی حرکت کا نام ہے، جمود کا نہیں، جب تک سفر لکھا ہے چلنا تو ہے ناں......'' اس نے سر جھکا کر بیٹھی شان کو دیکھا...... وہ جانتا تھا اس کے لیے یہ فیصلہ آسان نہیں تھا مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مشکل سہی مگر بہتر یہی تھا۔

''اور زندگی موت کا کوئی بھروسا ہے کیا...... کیا پتا کل کو میں بھی......''

''ارمان!'' وہ اس قدر زور سے چیخی کہ ارمان کی بات لبوں میں رہ گئی۔

''خبردار جو آئندہ تم نے مجھ سے بات کی یا مجھے آواز بھی دی تو...... مجھے سخت ناراض کر دیا ہے تم نے اس طرح کی بات کر کے۔'' وہ زور، زور سے روتی باہر نکل گئی۔ ارمان نے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔

☆☆☆

شہناز آنٹی مٹھائی کی پلیٹ تھامے اسے اپنے ہاتھوں سے کھلا رہی تھیں اور وہ شرمندہ ہو کر اپنے ہاتھ رگڑ رہی تھی۔

''بھئی ہم نے تو بغیر دیکھے ہی رضامندی دے دی تھی۔ اماں نے آپ کی تعریفیں ہی اتنی کی تھیں۔'' اس کے پہلو سے لگی بیٹھی سلمان کی چھوٹی بہن نادیہ بہت شگفتہ مزاج کی تھی۔

کمرے میں اس کے علاوہ سلمان کے بڑے بہن، بھائی بھی موجود تھے۔

''تو غلط تو نہ تھیں تعریفیں......'' آج تو شہناز آنٹی بھی خوب چہک رہی تھیں۔ وہ گھبرائی، گھبرائی سی سب کی باتیں سنتی رہی۔

کمرے کی سب سے سنجیدہ شخصیت کونے کے صوفے پر منہ بنا کے بیٹھی تائی امی تھیں۔ جنہیں گھر کے بزرگ کی حیثیت سے بلایا گیا تھا۔ باقی بڑی خالہ نے فون کر کے ارمان کو اس فیصلے پر بہت شاباش دی تھی اور اس کی بہت ہمت افزائی کی تھی۔

''بہت اچھا اور بر وقت فیصلہ کیا تم نے شان...... میری جان! زندگی کا سفر بہت کٹھن ہوتا ہے، اسے صرف ایک ہی چیز سہل بنا سکتی ہے۔ اپنے خالقِ

مرسل میاں کی شادی شوکت آپا کا دیرینہ خواب تھی۔ ایک ہی ایک بیٹے کی اماں تھیں خیر سے شوکت آپا...... جو چار بہنوں کا اکلوتا بھائی اور اپنے دادا، دادی کا اکلوتا پوتا بھی تھا۔ مرسل میاں کے حوالے سے خواب دیکھنے والی آنکھیں دو نہیں بے شمار تھیں لیکن سب آنکھوں پر بھاری تو شوکت آپا ہی کی آنکھیں تھیں ناں...... جن میں مرسل میاں کی زندگی کے زینے کے قدمچوں کے حساب سے ہر بار نئے خواب سجتے رہتے تھے۔ مرسل

ناولٹ

آبنوسی رُخ

عنیزہ سید



میاں کی پیدائش سے لے کر اسکول میں ان کے پہلے دن تک کے خواب، مرسل میاں گاہ، گاہ منزل، منزل زندگی کا سفر طے کر رہے تھے اور شوکت آپا کی آنکھوں میں بسے خوابوں کی جھتیں، روشنیاں اور روشنیوں کی جھلملاہٹیں بھی اپنا سفر آگے بڑھاتی رہی تھیں اور پھر ادھر مرسل میاں کمپیوٹر سائنس کے انجینئر بن کر یونیورسٹی سے نکلے اُدھر شوکت آپا کی آنکھوں میں من موہنی صورت، کامنی سی شرمائی لجائی بہو کو اپنے آنگن میں اتارنے کے خواب نے آن بسیرا کرلیا۔

''صورت بھی مانگتی ہو، سیرت بھی، کردار اور تعلیم بھی، اعلیٰ حسب، خاندان اور پس منظر بھی......''

شوکت آپا کے میاں سلطان بھائی کبھی کبھار اس نئے خواب کی تفصیلات سن کر قہقہہ لگاتے ہوئے کہتے۔

''جب یہ سب ایک ساتھ ڈھونڈنے نکلو گی تو یا تو تمہاری جوتیاں چٹخیں گی یا پھر اس فہرست میں سے دو تین شرائط پر لکیر پھیرنی پڑے گی۔''

''ارے آپ نے عمر بھر سے منہ سے کوئی اچھی بات نہ نکالنے کی قسم کھا رکھی ہے۔'' شوکت آپا پان کی گلوری منہ میں رکھتے ہوئے جواب دیتیں۔ ''آپ دیکھیے گا میری نظر پر مجھے خود کو اتنا بھروسا ہے کہ ایسی بہو یوں ڈھونڈ نکالوں یوں......'' وہ چٹکی بجاتے ہوئے کہتیں۔

''اور پھر یہ کیا......؟'' اگلا جملہ بولتے ہوئے ان کی پیشانی پر سو سو بل پڑ جاتے۔ ''کہ جوتیاں چٹخیں گی یا شرائط پر لکیر پھیرنی پڑے گی۔ چار بچیاں تو ہم بھی بیاہے بیٹھے ہیں، ان چاروں کے سسرال والوں کو کیا صورت نہ ملی یا سیرت نہ ملی، کردار اور تعلیم نہ ملی یا اعلیٰ حسب، خاندانی پس منظر نہ ملا۔''

سلطان بھائی اس تقریر پر شوکت آپا سے نظریں چرا جاتے۔

''ہم نے تو کبھی نہیں دیکھا کہ ہمارے دروازے تک آتے، آتے کسی کی جوتیاں گھس چکی تھیں یا پھر دل میں دبی فہرست کی کسی شرط پر لکیر پھر چکی ہو۔'' بی بی اماں (شوکت آپا کی ساس) کا عطا کردہ سروتہ کٹاک، کٹاک چھالیا کترتا چلا جاتا اور شوکت آپا کی زبان و بیان سے ہار کر وہ اس منظر ہی سے کھسک لیتے۔

قریب تھا کہ آنکھوں میں بسے نئے خواب کو عملی تعبیر دینے کے لیے شوکت آپا اپنی چاروں بیاہی ہوئی سمجھدار بیٹیوں کے ہمراہ چندے آفتاب چندے ماہتاب دلہن کی تلاش میں گھر سے نکلتیں، مرسل میاں کو امریکا کی کسی بھلی سی یونیورسٹی میں مزید تعلیم حاصل کرنے کا وظیفہ مل گیا۔ کہاں کی دلہن اور کیسی دلہن...... پورے کا پورا گھرانا مرسل میاں کے سفر کی تیاریوں اور ان کی جدائی کے غم کے اظہار میں مگن ہوگیا۔

''یہ جو امریکا سے حاصل کی گئی تعلیم کا تمغہ ہے ناں یہ تمہارے مرسل میاں کو ایک ایسے بلند پہاڑ پر بٹھا دینے والا ہے شوکت آرا بیگم جسے سر کرنے کے لیے اچھے سے اچھے خاندان اپنی اعلیٰ سیرت، خوب صورت اور بلند کردار و تعلیم سے مزین بچیوں سمیت آپ کے آپ تم تک پہنچ جائیں گے۔'' سلطان میاں، بیٹے سے تین طویل سالوں کی جدائی کے خیال سے نمناک آنکھیں لیے بیٹھی شوکت آپا کو سمجھاتے ہوئے بتاتے...... ''تمہاری جوتیاں بھی نئی نکور رہیں گی اور شرائط کی فہرست میں بھی کوئی کمی نہیں آئے گی۔ اضافہ ہی ہو تو ہو......'' سلطان بھائی کی تسلیوں کا سہارا لیتے ہوئے شوکت آپا اٹھ کھڑی ہوتیں اور مرسل میاں کے سفرِ امریکا کی تیاریوں میں مشغول ہو جاتیں۔

☆☆☆

وہ تین سال یا تین صدیاں جن کے دوران مرسل میاں، ماں، باپ، دادا، دادی، بہنوں، بہنوئیوں اور ان کی اولادوں سے دور رہے تھے۔ یہ وہ دن تھے جب ذرائع آمد و رسل ایسے جدید نہ ہوئے تھے جیسے آج سن دو ہزار سولہ میں ہیں۔ کمپیوٹر کی سہولت بھی کسی، کسی گھر میں موجود تھی۔ مرسل میاں کی خاطر سلطان بھائی نے کمپیوٹر خریدا اور اپنے منجھلے داماد سے اسے چلانے کی تربیت بھی حاصل کی۔ اِدھر مرسل میاں کی طرف سے برقی ڈاک موصول ہوتی اُدھر سلطان بھائی کھٹا کھٹ اس کا جواب تحریر کرنے کے لیے کمپیوٹر کی بورڈ کے بٹن دباتے چلے جاتے۔ ابا میاں، بی بی

اماں اور شوکت آپا دائیں بائیں موجود ہوتے۔ ذرا، ذرا سے وقفے کے بعد جنہیں ایسی باتیں یاد آتی چلی جاتیں جن سے مرسل کو باخبر رکھنا ضروری ہوتا۔ اسی برقی ڈاک کے ذریعے کبھی کبھار مرسل میاں اپنی تصویر بھی ارسال کر دیا کرتے۔

"پورے کے پورے انگریز شہزادے نظر آنے لگے ہیں مرسل میاں تو۔" ابا میاں اپنے چشمے کی کمانیوں کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھامتے ہوئے کمپیوٹر اسکرین سے نظریں جوڑتے ہوئے کہتے۔

"انگریز نہیں امریکی شہزادے......" بی بی اماں شوہر کے بیان کی صحیح کرتے ہوئے کہتیں۔

"نہ بھئی نہ......" ابا میاں ضعیفی کے باعث پہلے سے ہی لرزتی گردن کو مزید ہلاتے ہوئے کہتے۔ "امریکا کی تاریخ میں شہزادے وہزادے نہیں ہوا کرتے، امریکی تو خود غلامی سے اٹھ کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ شہزادے تو انگریز ہوئے یا پھر ترک یا پھر ہندوستانی۔"

"ارے ہٹائیں ابا میاں......" شوکت آپا الجھ کر بولتیں...... "ہمیں مرسل میاں کو شہزادہ وہزادہ بنانا ہی نہیں ہے۔ وہ تو بس ہماری آپ کی آنکھوں کے نور، دلوں کے سرور ہی کافی ہیں۔ ہماری ایسی کون سی سلطنت ہے جس کا شہزادہ بنا کر ہم مرسل میاں کو دربار سجا کر دینے والے ہیں۔"

"دل کی سلطنت بہو بیگم، سلطنتِ دل۔" ابا میاں اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے فرماتے۔ "مرسل میاں، ہم سب کی سلطنتِ دل کے شہزادے نہیں ہیں کیا......" اور ابا میاں کی اس بات پر ہزار جان سے نثار ہوتی شوکت آپا ان کی درازیٔ عمر کی دعا دل ہی دل میں دُہرانے لگتیں۔ ان ساس، سسر نے شوکت آپا کو عمر بھر زبان سے بہو بیگم کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ حقیقت میں تو کوئی اپنی سگی بیٹیوں سے بھی اتنی محبت نہ کرتا ہوگا جتنی ان دونوں نے شوکت آپا کو دی تھی۔

"اب ایسا ہے کہ بس تم سلطنتِ دل کے اس شہزادے کے لیے من چاہی شہزادی تلاش کرنے کی تگ ودو شروع کر ہی دو......" مرسل میاں کی پڑھائی کے آخری سال کے وسط میں ایک روز سلطان بھائی نے کمپیوٹر مانیٹر کی اسکرین بند کرتے ہوئے شوکت آپا سے کہا تھا۔ "چند ہی ماہ جاتے ہیں کہ مرسل میاں خیر سے واپس ہمارے پاس آنے والے ہیں۔"

"ارے ہاں۔" شوکت آپا کی آنکھوں میں ڈھائی سال سے وقتی نیند سوتے خواب دوبارہ سے جاگنے لگے اور انہوں نے پیروں میں لڑکی کی تلاش کو جانے کے لیے نئی جوتیاں ڈال لیں۔

"خاندان نجیب الطرفین ہونا چاہیے۔" بی بی اماں کی تلقین تھی۔

"مالی لحاظ سے ہم سے اوپر نہیں تو کم بھی نہیں ہونا چاہیے لڑکی کے والدین کو۔" ابا میاں نے کہہ رکھا تھا...... "تعلق ہمیشہ ہم پلّہ خاندانوں سے جوڑنے چاہئیں تاکہ فریقین میں سے کسی کے دل میں غرور آئے نہ کسی کو کم مائیگی کا احساس ہونے لگے۔"

"لڑکی گھر گرہستی کا ہنر ضرور جانتی ہو، صرف تعلیم اور کردار ہی کافی نہیں، لڑکی وہ جو شوہر کے گھر کو اپنا گھر بنانے میں لمحہ بھر کی دیر بھی نہ کرے......" سلطان بھائی نے بھی اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔

اور شوکت آپا اور ان کی چاروں بیٹیوں کی فہرست کی تو کیا ہی بات تھی۔ خوب صورت لڑکی، اچھے قد بت والی لڑکی، اجلی، اجلی رنگت، سیاہ دراز بال، غلافی آنکھوں والی لڑکی...... چلے تو ایسی لگے، اٹھے تو ایسی، بیٹھے تو ویسی۔

ایسی ماہ رو کی تلاش کوئی آسان کام تو نہیں تھا۔ آسان تو خیر بالکل نہیں تھا لیکن بہت سوچ سمجھ کر کرنے کا بھی تھا۔ شوکت آپا خاصے غور و تفکر کے بعد گھر سے قدم نکال رہی تھیں۔ کسی عزیز، رشتے دار، دوست یا پھر رشتے کرانے والی خالہ کے بتائے ہوئے ہر رشتے کو دیکھ لینے کی قائل اس لیے نہیں تھیں کہ انہیں یونہی لوگوں کے گھر جانے اور اپنی خاطر مدارات کرانے کا شوق ہرگز نہیں تھا۔ "جو راستہ دل کو لگے چلنا صرف اسی پر چاہیے......" وہ خلوصِ نیت سے کہا کرتی تھیں۔

☆☆☆

لیکن شوکت آپا کے اس خلوصِ نیت، ان کے شوق، آنکھوں میں بسے خواب، گھر کے ہر فرد کے سلطنتِ دل میں بسے دربار کی مرسل میاں کو یاد آئی تھی نہ ہی پروا رہی تھی۔ جب ہی امریکا میں قیام کے تیسرے سال کے اواخر میں انہوں نے پورے خلوص دل اور ذوقِ نظر کے ساتھ انجلینا سے بیاہ رچالیا۔

شوکت آپا اور ان کے گھرانے پر مرسل میاں کی طرف سے ارسال کردہ یہ مختصر سی اطلاع یقیناً بم بن کر ہی برسی تھی۔

کم گو، فرمانبردار مسکین طبیعت مرسل میاں سے تو کوئی ایسی بغاوت کی توقع بھی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ پاکستان میں رہتے ہوئے اپنے لیے کوئی لڑکی خود پسند کر کے اماں، باوا کو اطلاع کردیں کجا امریکا اور امریکا کی گوری میم...... جس نے سنا انگشت بدنداں رہ گیا۔

''ہائے بیچاری شوکت آپا کے ارمان......'' سب کے لبوں پر شوکت آپا کے لیے ہی ہمدردی بھرے الفاظ تھے۔ یہ اور بات کہ عزیز، رشتے داروں میں کئی ایسے بھی تھے جن کے دلوں میں ایک۔ برنام سی خوشی اور طمانیت کا احساس بھی ابھرا تھا۔ ظاہری بات ہے ہر کوئی ویسا... پُرخلوص تو نہیں ہوتا جیسا بظاہر دکھتا ہے۔ کئی ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں آپ کی تکلیف خوشی دے جاتی ہے۔

☆☆☆

''کوئی ضرورت نہیں ہے گھر میں یہاں سے لے کر وہاں تک صفِ ماتم بچھانے کی......'' گھر میں اس خبر کو سن لینے کے کچھ دن بعد حواس ذرا سے قابو آنے پر ابا میاں نے اپنی لرزتی آواز پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے ذرا سی مضبوط آواز میں حکم سنایا۔

''شادی ہی کی ہے ناں مرسل میاں نے، کون سا بنا شادی رہے جارہے ہیں گوری میم کے ساتھ۔''

''وہ انہوں نے بتایا تو ہے کہ باقاعدہ نکاح ہوا ہے۔'' شوکت آپا کی دوسرے نمبر کی بیٹی منمنائی۔

''نکاح!'' سلطان بھائی اپنے غم میں ڈوبے دل سے سر نکال کر بولے۔ ''ہم......'' انہوں نے ذرا سا غور کیا۔ ''نکاح کا مطلب تو یہ ہوا کہ اسلامی، شرعی انداز میں رشتہ جوڑا ہے مرسل میاں نے۔ ورنہ یہ بھی تو کہہ سکتے تھے کہ شادی رجسٹر کرالی ہے۔''

''ارے ہاں، بڑے داماد نے تیزی سے سسر کی طرف یوں دیکھا جیسے ان کے کانٹے کے ساتھ بھاری مچھلی منہ پھنسا بیٹھی ہو۔'' بڑی دور کی سوجھی چچا جان آپ کو، اس بات کی طرف تو کسی کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔''

''ضروری تو نہیں کہ سب کی سب گوریاں عیسائی ہی ہوں، کوئی، کوئی مسلمان بھی تو ہوتی ہوگی۔'' بی بی اماں کی سوچ بھی مثبت راستے کی طرف لپکی۔

''پوچھو تو، ذرا پوچھو تو میاں، مرسل میاں سے دلہن کی ذات پات، حسب نسب کیا ہے۔'' شوکت آپا کو یہ ساری گفتگو سننے کے بعد ذرا سا حوصلہ ہوا تو دوپٹے سے اپنی بھیگی آنکھیں رگڑتے ہوئے بڑے داماد کا کندھا ہلایا۔

بڑے داماد اپنی جگہ سے اٹھ کر کمپیوٹر ٹیبل پر جابیٹھے۔

''آن لائن ہیں...... مرسل میاں آن لائن ہیں۔'' کچھ دیر تک بٹن کھٹکھٹانے کے بعد انہوں نے گردن موڑ کر اپنی طرف اٹھے سب منتظر چہروں کو نوید سنائی تھی۔ سب کے سب اسی طرح چہرے اٹھائے اپنی، اپنی جگہوں سے اٹھ کر بڑے داماد کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے۔ اب سب کی نظریں مانیٹر اسکرین پر یوں جمی تھیں جیسے اس میں سے کوئی معجزہ چھم کر کے باہر آکودنے کو تھا۔

''مذہباً وہ عیسائی ہی ہے لیکن مجھ سے اس نے شادی میرے مذہب اسلام سے متاثر ہونے کی وجہ سے کی ہے۔ نکاح سے پہلے اس نے اسلام قبول کیا اور پھر اس کے بعد ہمارا نکاح ہوا ہے۔'' مرسل میاں نے بہنوئی کے استفسار پر جواب دیا تھا۔

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔'' ابا میاں بلغمی گلا کھنکھار کر بولے۔ ''بچہ ایک غیر مسلم کو اسلام کے دائرے میں لانے کا سبب بنا، نہ جانے کتنی نیکیاں اس نے اپنے نام لکھوالیں......''

''جنت کا ٹکٹ تو کھرا سمجھو مرسل میاں کا......'' بی بی اماں نے یوں اعلان کیا جیسے ان کی جنت کے

دار وغہ سے گاڑھی دوستی ہو۔

"لو بھئی شوکت جہاں، ہمارے مرسل میاں نے ہمارا سر فخر سے بلند کر دیا۔" سلطان بھائی پر ان سب فرمودات کا خاصا مثبت اثر ہونے لگا تھا۔ مرسل میاں کی بغاوت، گوری میم بہو کا غم، عزیزوں، رشتے داروں کی چہ مگوئیوں کا خدشہ...... سب بھلا کر خوش ہوتے ہوئے بولے تھے۔

"ارے ہاں......" غم میں ڈوبے دل سے ذرا کی ذرا نکل کر شوکت آپا نے کمزور سی آواز میں کہا۔

"جب سب ایسا کہہ رہے ہیں تو ایسا ہی ہوگا۔"

"بس تو پھر مرسل میاں اور بہو بیگم کے استقبال کی تیاریاں شروع کر دو......" سلطان بھائی بیگم کی طرف سے مثبت جواب پا کر اور بھی خوش ہوتے ہوئے بولے۔

"ولیمہ تو ہم دھوم دھام سے کریں گے مرسل میاں کا...... باراتی بننے کے ارمان تو دل میں ہی رہ گئے۔"

"بہت بھولے ہیں آپ چچا جان۔" تیسرے نمبر کے داماد نے سنا تو بولے۔ "مرسل میاں نے گوری امریکن سے شادی وطن واپس آکر اس سے آپ کی خدمت کرانے کو تھوڑی کی ہوگی۔ یہ شادی تو وہیں مستقل قیام کا پروانہ ہوگا جناب...... اب مرسل میاں کی واپسی بھول جائیں آپ......" اور شوکت آپا کا دل اندر ہی اندر کہیں بہت دور ڈوبنے لگا لیکن داماد صاحب کی یہ پیش گوئی بالکل ہی غلط ثابت ہوئی۔ مرسل میاں نے چند ہی دنوں کے بعد نہ صرف اپنی اور اپنی دلہن کی واپسی کا اعلان کر دیا بلکہ یہ عندیہ بھی ظاہر کیا کہ وہ اور ان کی دلہن پاکستان میں مستقل قیام کے لیے آرہے ہیں۔

"ارے واہ جی واہ...... شوکت جہاں تم تو بڑی نصیبوں والی نکلیں، بنا جوتے چٹخائے گھر بیٹھے بٹھائے گوری چٹی پٹ پٹ انگریزی بولتی بہو بھی مل گئی اور ایسا بھی نہیں ہوا کہ مرسل میاں کو صاف اچٹ لے گئی ہو۔"

شوکت آپا کی بڑی بھابی نے مرسل میاں کی واپسی کی خبر پر تبصرہ کیا تھا۔ خدا جانے اب یہ سادہ تبصرہ تھا یا پیچ دار طنز...... شوکت آپا اس وقت چاروں طرف سے کان بند رکھ لینے کا فیصلہ کر چکی تھیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں نئی صورت حال کو قبول کر لینا پڑ رہا تھا اور وہ اس پر معترض بھی نہیں تھیں کہ مرسل میاں کی خوشی میں خوش ہو جانے کا سبق انہیں سلطان بھائی زیر، زبر، پیش کی درستگی کے ساتھ پڑھا چکے تھے۔

مرسل میاں اور ان کی دلہن کے استقبال کی تیاریاں زور شور سے شروع ہو چکی تھیں۔ پورے گھر کو نئے سرے سے رنگ و روغن کرایا گیا۔ مرسل میاں اور ان کی بیگم کے لیے چھت پر دو نئے کمرے تعمیر کرائے گئے جدید طرز کا غسل خانہ بھی بنوایا گیا۔ جس کا سب سامان سلطان بھائی خود خرید کر لائے تھے۔ اس دور کے حساب سے سب کچھ جدید اور خوب صورت ہو گیا۔

شوکت آپا نے دلہن کے لیے چند نئے جوڑے اور سونے کے دو ہلکے، ایک بھاری سیٹ بھی بنوا لیے۔ جوڑوں کے رنگ تیز اور بھلے، بھلے تھے۔ گوری میم پر پھیکے رنگوں کے کپڑے تو ذرا بھی نہیں سجتے۔ یہ شوکت آپا کا اپنا خیال تھا۔ بی بی اماں نے بھی دلہن کے لیے کندن کے کڑے سنبھال کر رکھے تھے۔ جھٹ نکال کر اجلوا لیے۔ مرسل میاں کی دلہن کے لیے سب کے دل میں ارمان ہی بہت تھے۔ چاروں بہنیں الگ تحفے تحائف خریدے بیٹھی تھیں۔

اللہ، اللہ کر کے مرسل میاں کی وطن واپسی کا دن آیا۔ گھر کے مرد حضرات صبح سے ائرپورٹ جا کر نئے جوڑے کے استقبال کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ صاف ستھرا، قرینے سے ہوا گھر نئی دلہن کا منتظر تھا۔ مرسل میاں کی پسند کے سب ہی پکوان خصوصی طور پر تیار کیے گئے تھے۔ سہ پہر چار بجے کی پرواز سے واپس آنے والے مرسل میاں کو ہوائی اڈے سے لینے سب مرد حضرات دوپہر ایک بجے ہی گھر سے نکل گئے تھے اور خواتین موسم کی مناسبت سے نئے کپڑے پہنے بک سک سے تیار بیٹھی تھیں۔

"کیا تھا جو مرسل میاں، دلہن کی ایک آدھ تصویر ہی ای میل کر دیتے۔ اتنی بے چینی اور ایسا اشتیاق تو نہ ہوتا آج جو سب کے چہروں پر نظر آرہا تھا۔" شوکت آپا کی بڑی بیٹی انتظار کی کوفت سے الجھتے ہوئے بولی تھی۔

"میں سمجھی ہوں جان بوجھ کر تصویر نہیں بھجوائی مرسل میاں نے۔" بڑی سے چھوٹی نے بڑی بہن کا ہاتھ دبا کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"ہو گی تو وہ سفید چمڑی مگر سب گوریاں پیاری بھی ہوں یہ کب ہوتا ہے۔ بھورے تلوں سے بھرے چہرے ہوتے ہیں اکثر...... جلے سڑے سنہری بال، مرسل میاں نے سوچا ہوگا ایک بار ہی سب دیکھ لیں گے۔ اصلی والی صورت وہ بھی براہِ راست...... تصویر کا کیا ہے سو عیب چھپا جاتی ہے۔"

"ارے تم کوئی اچھا بول منہ سے نکالو......" بڑی والی جل کر بولی۔ "بھورے تلوں اور جلے بالوں والی ہمارے مرسل میاں کو کاہے کو پسند آئے گی، تم دیکھنا ابھی ابا میاں کی گاڑی سے کیسی لش لش کرتی میم نکلے گی۔"

سب بہنوں کی نظریں ایک بار پھر محوِ انتظار ہوئیں۔

طویل انتظار کے بعد...... شام ساڑھے پانچ بجے سلطان بھائی کی گاڑی گھر کے پورچ میں آ کر رکی۔ سب کی سب خواتین ہڑ بڑا کر اٹھیں اور پھولوں کی پتیوں سے بھری اپنی اپنی پلیٹ اٹھا کر ہال کمرے کے دروازے کے قریب جمع ہو گئیں۔ گلاب اور موتیے کے دو ہار بھی بنوا لیے گئے تھے، مقصد دلہن اور مرسل میاں کا بھرپور استقبال تھا۔ شوکت آپا نے استقبال سے پہلے ایک بار پھر اپنا چشمہ لان کے دوپٹے سے چمکایا اور آنکھوں پر لگا کر اندر آنے والوں کو دیکھنے لگیں۔ ایک، ایک کر کے سلطان بھائی، ابا میاں، چاروں داماد کمرے میں داخل ہوئے۔ "یہ کیا۔" شوکت آپا کا ماتھا ٹھنکا۔ "ان سب کے چہرے پر ایسی گہری سنجیدگی اور ہونٹوں پر جامد خاموشی کیوں......" ان کا دل دہلا ایک بار پھر سلطان بھائی پر نظر ڈالی جو بازو پیچھے باندھے اپنے مخصوص صوفے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چہرے پر ایسی سنجیدگی کہ الامان، شوکت آپا، سلطان بھائی کے چہرے کے تاثرات پر غور کرنے میں مصروف تھیں کہ بیٹیوں کی پُرمسرت آوازوں نے انہیں چونک کر دوبارہ داخلی دروازے کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا...... اونچے لمبے، گورے، چٹے، سجیلے مرسل میاں سیاہ پتلون کوٹ میں ملبوس کمرے میں داخل ہو رہے تھے اور ان کے پیچھے...... شوکت آپا کو ایک لمحے کے لیے اپنی بصارت پر شک ہوا لیکن اگلے ہی لمحے انہیں اپنی اس بصارت پر یقین کر لینا پڑا۔

"السلام علیکم امی جان......!" مرسل میاں ان کے سامنے جھک کر آداب کہہ رہے تھے اور ان کے پیچھے لیس کی سفید میکسی میں ملبوس گردن تک کٹے گھنگرالے بالوں والی انجلینا کھڑی تھی۔ شوکت آپا نے اپنی آنکھیں جھپکیں، مسلیں۔ چشمہ ایک بار پھر سوتی دوپٹے سے صاف کر کے آنکھوں پر لگایا مگر یہ سب کرنے کا انہیں کوئی فائدہ نہ ہوا تھا۔ مرسل میاں کے عقب میں کھڑی انجلینا جو سفید میکسی میں کپاس کے پھولوں سے بھرے کھیت میں بیٹھا سیاہ کوا لگ رہی تھی سو ویسی ہی نظر آتی رہی۔

"ہیں، ہائیں۔" شوکت آپا نے فق چہرے کے ساتھ گردن گھما کر اپنے دائیں بائیں کھڑے گھر کے دیگر افراد کی طرف دیکھا۔ ان سب کے چہروں کے تاثرات بھی شوکت آپا سے مختلف نہ تھے۔

گوری امریکی میم کے بجائے مرسل میاں، سیاہ فام افریقین بیاہ لائے تھے جو سفید لباس میں کپاس کے کھیتوں کا کوا دکھتی تھی اور جو مسکرانے کی کوشش کرتی تو اس کے سفید دانت سیاہ ہونٹوں کے ہالے میں یوں چمکتے جیسے شب دیجور میں قطار در قطار ننھے ستارے چمکتے ہوں۔

☆☆☆

باقی گھر والوں پر تو مرسل میاں کی محبت کی اس شادی کا ردِعمل کیا ہوا تھا نہیں معلوم لیکن خود شوکت آپا گھر بھر سے سنیاس لے کر اپنے کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔ اپنے بستر پر گم صم بیٹھی در و دیوار کو یوں حسرت سے تکتی رہتیں جیسے ہر طرف محرم چھایا ہو۔ ذہن اور دل تھا کہ اس اچانک صدمے سے نکل ہی نہیں پا رہا تھا۔ کہاں کی دلہن، کیسا استقبال اور کدھر کی تقریب ولیمہ...... سب بھول بھال گئی تھیں۔ مرسل میاں نے ان کی آنکھوں میں بسے اب تک کے سب سے حسین خواب کو بری طرح اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ایسی آگ

خوابوں کی دنیا کو گئی کہ سب جل کر راکھ ہو چکا تھا۔
شوکت آپا کو رہ، رہ کر مرسل میاں کے پہلو میں کھڑی سیاہ فام انجلینا کا چہرہ یاد آتا۔ ساتھ کے ساتھ گھر والوں کے چہروں کے تاثرات اور پھر عزیز رشتے داروں کی وہ چہ مگوئیاں یاد آتیں جو انہوں نے سنی ہی نہیں تھیں اور کسی نے ابھی کی بھی نہیں تھیں۔ وہ سوچوں میں گم اکیلی بیٹھی بار، بار تاسف کے ساتھ اپنے ہاتھ یوں ملتیں جیسے ان کا کوئی بہت بڑا نقصان ہو گیا ہو۔

شوکت آپا کی حالت ایسی تھی کہ جسے دیکھ کر گھر کے کسی فرد کی بھی ان سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی یوں بھی شروع میں تو باقی سب ہی غم اور حیرت کی اتھاہ گہرائیوں میں گم تھے۔ سب سے پہلے سلطان بھائی خود کو صدمے کی اس کیفیت سے نکالنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ خود پر سے تاسف اور دکھ کے سائے جھاڑنے کے بعد انہوں نے شوکت آپا طرف رخ کیا۔

''وہ بیٹے کی خوشی ہے شوکت جہاں جس میں ہمیں خوش ہی ہونا چاہیے۔'' گلا کھنکھار کر انہوں نے بیوی سے بات کرنے کی ہمت مجتمع کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''اور پھر مرسل میاں نے جو اس سے پسند کی شادی کی تو کچھ دیکھ کر، کچھ سوچ، سمجھ کر ہی کی ہو گی۔ اگر مرسل میاں کو رنگ و نسل کی پروا نہیں ہوئی تو ہمیں بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اس لڑکی میں یقیناً ایسی خوبیاں ہوں گی جن کے آگے رنگ، نسل، قوم، مذہب جیسے سوال بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔''

''ارے جانے دیں آپ......'' شوکت آپا بھڑک کر بولیں۔ ''نسل، قوم، مذہب پر سمجھوتا تو ہم بھی کیے بیٹھے تھے مگر یہ رنگ...... اللہ، اللہ، توبہ، توبہ......'' انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگا کر ہل، ہل کر توبہ کی گردان شروع کر دی۔

''تو کیا ہو گیا شوکت جہاں......'' سلطان بھائی، شوکت آپا کی کیفیت سمجھ رہے تھے۔ ''ہم خود کون سا گورے ہیں، دیکھیں تو......'' انہوں نے دل کڑا کر کے اپنے ہاتھ شوکت آپا کے سامنے پھیلائے۔ ''یہ میرے ہاتھ کیسے سیاہی مائل گندمی ہیں...... ہیں ناں......'' انہوں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔

''سلطان صاحب۔'' شوکت آپا کو لگا صدمے کے مارے ان کے شوہر کا دماغ چل چکا ہو۔ ''کس کو بہلاتے ہیں، اے میں نے تو عمر بھر کبھی سیاہ کپڑا نہ خود پہنا نہ چاروں لڑکیوں، نہ آپ کو اور مرسل میاں کو پہننے دیا...... میں کیسے اس کالی بھجنگ بہو کو قبول کر لوں جس کے پاس نہ نین ہیں نہ نقش......''

''خیر وہ تو ہیں......'' سلطان بھائی نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''غور سے دیکھو ذرا اسے تو پتا چلے نین نقش تو اچھے ہیں اس کے۔''

''ایسے موٹے، بھدے ہونٹ خدا کی پناہ......'' شوکت آپا نے ایک بار پھر کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''اور نین سیاہ نینوں کے گرد سفید کٹورے...... سیاہ چہرے پر یوں دکھائی دیتے ہیں مانو انڈے کی سفیدی میں زردی کے بجائے سیاہ رنگ مادہ گھوم رہا ہو۔''

''توبہ کرو شوکت جہاں......'' سلطان بھائی ایسے کڑے الفاظ پر لحہ بھر کے لیے کانپ سے گئے۔ ''اللہ، رسولؐ کی ماننے والی ہو۔ بھول گئیں سرکار رسالت مآبؐ نے کیا فرمایا تھا۔''

''چلو جی......'' شوکت خانم روٹھ کر بولیں۔ ''اب مذہب کے سبق آپ پڑھائیں گے ہمیں سلطان صاحب۔''

''نہیں میں سبق نہیں پڑھا رہا، صرف یاد دلا رہا ہوں۔ سمجھتی تو تم مجھ سے بہتر ہی ہو۔'' سلطان بھائی نے سر ہلایا۔

''مجھے نہ تو کوئی سبق یاد کرنا ہے، نہ کوئی وعظ و نصیحت سننی ہے، نہ ہی سمجھوتے اور صبر کے درس پڑھنے ہیں۔'' شوکت آپا قطعیت کے ساتھ بولی تھیں۔ ''میرے خوابوں کی دنیا اجڑ گئی۔ مجھے اس کی راکھ پر ماتم کرنے دیں سلطان صاحب...... مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔'' وہ بین کر کے رونے لگیں۔

''کب تک ماتم کرو گی شوکت جہاں، یہ ایک آدھ دن کا معاملہ نہیں...... ایک ایسا رشتہ ہے جسے عمر بھر نبھانا ہے تمہیں۔''

''نہیں نبھانا مجھے کوئی رشتہ......'' شوکت آپا بین

روک کر فیصلہ کن انداز میں بولیں۔
''جس رشتے کو میں ماننے سے ہی انکاری ہوں اس کو نبھانا کیسا؟''

شوکت آپا نے ''انجلینا'' کو بہو ماننے سے جو پہلے دن انکار کیا تھا تو پھر ان کا یہ انکار برسوں تک اقرار میں تبدیل نہیں ہوسکا۔ گھر کے باقی افراد نے چند دن کا سوگ منانے کے بعد بالآخر گھر کے افراد میں اضافہ بن کر آنے والی انجلینا کو قبول کرلیا۔ ابا میاں اور بی بی اماں نے مرسل بہو کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں بھی دے ڈالیں۔ توفیق بھر سب نے سلامیاں اور تحفے تحائف بھی دیے۔ یوں باقاعدہ اسے گھر میں خوش آمدید کہہ دیا گیا۔ مرسل میاں، اپنے باپ، دادا، دادی اور بہنوں کے دل سے ممنون تھے۔ سب کی طرف سے جس شدید ردِ عمل کی وہ توقع کررہے تھے وہ خود مرسل میاں سے سب کی محبت کے دریا میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا تھا۔ سلطان بھائی نے انجلینا کو مسجد لے جا کر مولوی صاحب کے سامنے باقاعدہ کلمہ پڑھوایا۔ خاندان بھر میں مٹھائیاں تقسیم کیں اور پھر انجلینا سے سب کو بہو کے طور پر متعارف بھی کروا ڈالا۔ اتنا کچھ گھر ہی میں ہوتا رہا اور سب شریک ہوتے رہے، ایک الگ رہیں تو شوکت آپا...... کسی بھی ایسے موقع پر سب کی خوشامدوں اور سمجھانے بجھانے کے باوجود انہوں نے کمرے سے باہر قدم نہیں نکالا۔ مرسل میاں کو ماں کے اس رویے کا غم تھا اور گلہ بھی...... وہ ماں جس نے زندگی بھر ان کی ہر فرمائش، ہر شوق کو یوں جی جان سے پورا کیا تھا جیسے اسے پورا کرنا ان کا فرض ہو۔ وہی ماں ان کی زندگی کے اس اہم ترین فیصلے پر، ان کی محبت، ان کے شوق سے انکاری ہوکر روٹھی بیٹھی تھی۔ وہ خود بھی دل میں ماں سے خفا سے ہوگئے۔

''مجھے ڈانٹ لیتیں، برا بھلا کہہ لیتیں، میں منا لیتا، انہیں اپنا جواز بتاتا، انہیں سمجھا لیتا لیکن اماں کا یہ رویہ مجھ سے ہضم نہیں ہورہا۔'' وہ ایک آدھ بار باپ کے سامنے اپنی خفگی کا اظہار بھی کر بیٹھے تھے اور انہی کے سمجھانے پر ماں کو منانے بھی اٹھے تھے۔

''اماں، یہ بھی افریقی نہیں امریکی ہے، گوری نہیں تو کیا ہوا۔ آپ امریکن بہو کو تو قبول کیے بیٹھی تھیں ناں......؟'' انہوں نے کہا تو شوکت آپا نے سر جھٹک کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ''اماں آپ چند دن اسے سمجھنے پرکھنے میں تو لگا کر دیکھیں، آپ اس کی خوبیوں کی معترف نہ ہوگئیں تو میرا نام بدل دیجیے گا۔'' انہوں نے وضاحت دیتے ہوئے کہا۔ ''ان تین سالوں میں عروس نے جتنا میرا ساتھ دیا ہے وہ مجھے میسر نہیں ہوتا تو میں کچھ سیکھے پڑھے بغیر کب کا وطن واپس آچکا ہوتا۔''

''عروس......'' شوکت آپا نے مرسل میاں کی باقی باتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے جھٹکا کھا کر مرسل میاں کی طرف دیکھا۔

''جی عروس......'' مرسل میاں مسکرا کر بولے۔

''آپ کو خبر نہیں ابا میاں نے انجلینا کا پاکستانی نام عروسہ رکھا ہے اور ابا میاں سے لے کر مجھ تک سب کے سب اسے عروسہ کے بجائے عروس کہہ کر بلانے لگے ہیں۔ ابا میاں کہتے ہیں وہ عروس بن کر یعنی دلہن بن کر جو خاندان میں شامل ہوئی ہے۔''

''ارے کہاں کی عروس......!'' شوکت آپا کے تیور مزید بگڑ گئے۔ ''ابا میاں کا تو ضعیفی کے مارے دماغ چل گیا ہے، عروس نہیں اسے آبنوس کہہ کر پکاریں سب، تو کوئی تک بھی ہے نام بدلنے کی۔ آبنوسی رنگت والی دلہن عروس نہیں آبنوس ہوتی ہے منحوس ماری۔'' وہ نخوت سے بولیں۔ ''اور تم۔'' اگلے ہی لمحے انہوں نے آنکھیں نکال کر بیٹے کی طرف دیکھا۔ ''کبھی مجھ سے یہ توقع نہ کرنا کہ میں اسے تمہاری دلہن کے طور پر قبول کر کے عروس کہنے لگوں گی۔ میرے خوابوں کو خاکستر کرنے والی آبنوس، عروس ہو بھی کیسے سکتی ہے۔'' وہ ایک بار پھر قطعیت سے بولی تھیں۔ اس کے بعد مرسل میاں شوکت آپا کے پاس سے جو مایوس ہو کر اٹھے تو دوبارہ انہوں نے منانے، سمجھانے والا موضوع ماں کے ساتھ بھی چھیڑا ہی نہیں۔ ماں کے سخت الفاظ ان کے دل پر لگے تھے۔ یہ وہی ماں تھیں جو عمر بھر انہیں رواداری،

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



اخلاقیات اور محبت، خلوص کے سبق پڑھاتی رہی تھیں۔ جن کی اپنی نیک مزاجی الگ بات لیکن دوسروں کا دل نہ دکھانے کا درس مرسل میاں کو خوب سکھا رکھے تھے۔ آج ایک ایسی بات پر منہ باندھ کر بیٹھ گئی تھیں جس پر اگر ذرا سا دل کو سمجھا لیتیں تو انہیں مرسل میاں کی محبت کو سینے سے لگا لینے میں شاید کبھی تامل نہ ہوتا۔

☆☆☆

پھر یوں ہوا کہ مرسل میاں کی انوکھی شادی، اس پر ہونے والی بحثا بحثی اور چہ مگوئیوں پر وقت کی گرد پڑتی چلی گئی اور یہ بات پرانی سے پرانی تر ہوگئی۔ شوکت آپا کی توقع کے برعکس ان چاہی دلہن انجلینا جسے اب گھر کے سب فرد عروس کہہ کر پکارتے تھے خود بخود اپنے لیے اس گھر میں اور گھر والوں کے دلوں میں جگہ بناتی چلی گئی یوں کہ شوکت آپا کے سامنے ہی سب کے سب گھر والے اس کی تعریف میں رطب اللسان رہنے لگے۔

''اپنی آنکھوں سے غصے سے اور تعصب کی پٹی اتار کر دیکھو دلہن، تمہیں آپ سے آپ پتا چل جائے گا مرسل میاں کیسا ہیرا بیاہ کر لائے ہیں۔'' بی بی اماں نے دو ایک بار شوکت آپا کو بھی سمجھانا چاہا۔

''ہیرا، ویرا کچھ نہیں ہے اماں......'' شوکت آپا نے ہر بار انہیں کچھ ایسا ہی جواب دیا تھا۔ ''یہ تو وہ کوئلہ ہے جو ہیرا بننے کی آرزو میں ہی سلگتا رہے لیکن عمر بھر کوئلے کا کوئلہ ہی رہے۔''

''ارے کہاں دلہن۔'' ابا میاں بھی بساط بھر کوشش کرتے۔ ''ہیرے کی پہچان تو جوہری کی نظر میں ہوتی ہے۔ ذرا اپنی نظر کو جوہر شناس بنا کر تو دیکھو...... عروس نے خود کو ہیرا ثابت کر کے دکھایا ہے، یہ تو میں ضعیف نظر بڈھا بھی پہچان چکا ہوں۔''

''ہونہہ!'' شوکت آپا سر جھٹکتیں۔ ''ادھر امریکا کے کسی بھنگی کی اولاد تو لگتی ہے بھنگیوں کے گھر میں ہیرے پیدا نہیں ہوتے۔''

غرض ہر کسی کی بساط بھر کوشش کے باوجود شوکت آپا کے دل سے عروس کے لیے نفرت ختم نہ ہوگئی تھی۔ پہلے دن اسے جو اس کی حیثیت میں قبولنے سے انکار ان کے منہ سے نکلا تو وہ انکار اقرار میں نہ بدلا جاسکا۔

دوسری طرف وہ پردیسن تھی جس نے مرسل میاں کے دیس میں پہنچ کر جیسے پہلی بار آنکھیں کھولی تھیں۔ غریب کی شادی سے پہلے کی عمر ادھر ادھر کے دھکے کھاتے ہی گزری تھی۔ امریکن کالے باپ اور گوری ماں کی یہ اولاد ماں، باپ کے درمیان علیحدگی کے بعد کے وقت سے برے دن گزار رہی تھی۔ امریکا میں سب پیسے والے مالدار نہیں ہوتے بہت سے ''انجلینا'' جیسے بھی ہوا کرتے ہیں۔ کھانے، پینے کی اشیا کے بڑے اسٹوروں کے کچرے سے چن کر اپنے لیے کھانے کا اہتمام کرنے والے، وہ بھی جن کو رات گزارنے کے لیے گھر کی چھت تک میسر نہیں ہوتی اور وہ پبلک پارکوں کے کونوں میں، فٹ پاتھوں پر یا ہائی وے انڈر گراؤنڈز میں سوئے نظر آتے ہیں۔ انجلینا پُرکشش اور دلکش امریکا کی بدصورت تصویر تھی۔ اسی دلکش امریکا میں جو انجلینا ایسوں پر قطعی مہربان نہیں تھا کہیں پھرتے پھراتے وہ اتفاق سے مرسل میاں سے ٹکرائی تھی۔ مرسل میاں نئے، نئے اپنے وطن سے امریکا در آمد ہوئے تھے......نئی جگہ، نئے حالات، نیا ماحول، گھبرائے، گھبرائے سے مرسل میاں کو دیکھ کر خدا جانے کیوں انجلینا کو ان کے ساتھ ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ وہ بھلے اس امریکا کی کیسی بھی شہری تھی تو امریکن ناں......اس ملک میں رہنے بسنے کے سب رنگ ڈھنگ، طور طریقے جانتی تھی۔ یوں ایک غریب الوطن اور ایک وطن میں غریب ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔ کہتے ہیں ذاتی ضرورتیں ہی بندے کو بندے کے لیے دوا بنا دیتی ہیں۔ یہ ہی حال مرسل میاں اور انجلینا کا تھا۔ ان تین سالوں کے دوران دونوں کی دوستی مضبوط ہوتی چلی گئی۔ پہلے دونوں غرض مند تھے اگر مرسل میاں کو نئے دیس میں سہارا درکار تھا تو انجلینا کو بھی ایک ہمدرد کی توجہ اور خلوص کے دو بولوں کی صدا سے خواہش تھی۔ شروع کی

غرض بعد کی بے غرضی، خلوص اور پھر محبت میں ڈھلتی چلی گئی۔ مرسل میاں کے مطابق انہوں نے انجلینا کو دل کی آنکھ سے دیکھا تھا اور اس جیسی خوبیاں انہیں ملک کے اندر نہ باہر کسی دوسری لڑکی میں نظر نہیں آئی تھیں۔ جو بھی تھا ایسا کچھ تو ضرور تھا جو مرسل میاں نے ماں، باپ خصوصاً ماں، خاندان، برادری، معاشرے، معاشرتی قدروں تک کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے انجلینا سے شادی کر لینے کا فیصلہ کر ڈالا تھا۔ وہ یقیناً اس شادی کے نتیجے میں سامنے آنے والے ردِعمل سے بخوبی واقف تھے لیکن انہیں اپنی اگلی زندگی کی شاہراہ پر انجلینا جواب عروسہ عرف عروس تھی کی ہمراہی پر پھول ہی پھول کھلتے نظر آرہے تھے۔ سو وہ بلا خوف و خطر اسے بیاہ کر اپنے ہمراہ وطن لے آئے تھے۔

مرسل میاں کا اندازہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ عروسہ عرف عروس نے مرسل میاں کے گھر پہنچ کر شروع کے چند ہفتوں کے علاوہ جن میں وہ نئے حالات، ماحول اور افراد کو مشاہدہ کر رہی تھی، کبھی اجنبیت کا احساس ظاہر نہیں کیا تھا۔ ایک بار گھر کے طور طریقوں اور افراد کے مزاج سمجھ میں آنے کی دیر تھی اس نے خود پر سے امریکیت کا چولا یوں اتار کر پھینکا جیسے سدا سے یہیں کی رہنے والی ہو۔ شوکت آپا کی طرف چند دن امید افزا نظروں سے دیکھنے اور پھر مایوس ہو جانے کے بعد اس نے بی بی اماں کے ساتھ گاڑھی دوستی بنا ڈالی۔ کیا اُدھر کی زبان اور کیا گھر داری کے طور طریقے انہیں پتا بھی نہیں چلا اور نئی دلہن نے یوں کے یوں سیکھ ڈالا...... گھر کا نظام تو خیر پہلے ہی ساس، بہو نے خوب چلایا تھا لیکن عروسہ کے انداز میں کچھ اور ہی بات تھی۔ گھر کی صفائی، ستھرائی، کپڑے، برتن کی دھلائی، باورچی خانے کے امور، وہ صبح سویرے اٹھ کھڑی ہوتی اور اِدھر سے اُدھر ہاتھ چلاتی دن کے گیارہ بجے تک تقریباً ہر کام سے فارغ ہو چکی ہوتی۔ خلوص اور محبت تو اس کے اندر کوٹ، کوٹ کر بھرا تھا سو ابا میاں اور بی بی اماں جیسے بڑھیا، بڈھے اور سلطان بھائی جیسے... بامروت، نفیس انسان کا دل جیتنے میں اسے زیادہ عرصہ نہیں لگا۔ سلطان بھائی سے وہ اردو زبان سیکھنے اور قرآن پڑھنے اور سمجھنے کے بہانے قریب ہوئی تھی اور ابا میاں اور بی بی اماں عمر کے جس حصے میں تھے ان کے لیے تو ذرا سی توجہ ہی کافی تھی اور تو اور مرسل میاں کی چاروں بہنیں، بہنوئی اور ان کی اولادوں کے لیے بھی عروس سراپا محبت بن گئی۔ چاروں بہنیں جنہوں نے پہلے پہل بھائی کے انتخاب پر مایوسی اور ماں کے رویے کی وجہ سے میکے آنا تک چھوڑ دیا تھا۔ عروس ان سب کے گھر مرسل میاں کے ہمراہ تحفے تحائف لے کر پہنچ جاتی رہی۔ اس کے انداز میں کچھ ایسی بے ساختگی تھی کہ لاکھ نظر انداز کرنے اور بے نیازی دکھانے کے باوجود ایک دن چاروں بہنوں کو قائل ہونا پڑا کہ مرسل میاں کا انتخاب ہرگز غلط نہیں تھا۔

عروس کا کردار اور اس کی سیرت، اس کے رنگ و نقوش پر حاوی ہو گئی تھی، یوں کہ اب جو بھی اس کے پاس بیٹھتا اس سے باتیں کرتا اُسے اس کے رنگ اور نقش کے غیر معمولی ہونے کا احساس تک بھی نہیں ہوتا۔

یوں اس اللہ کی بندی نے چند ہی سالوں کے اندر سب کے درمیان وہ مقام بنا لیا جو شاید ماں، باپ کی اپنی انتخاب کردہ لڑکی عمر بھر نہ بنا پاتی۔ شوکت آپا کھلی آنکھوں سے دیکھتیں اور پھر دانستہ نظریں پھیر لیتیں، گاہے بہ گاہے عروس کی طرف طنزیہ لفظ اور جملے پھینکنے سے بھی نہ چوکتیں۔ عروس صبح مرسل میاں اور باقی گھر والوں کو ناشتا بنا کر دیتی تھی۔ شوکت آپا نے سختی سے منع کر رکھا تھا ان کے کھانے، ناشتے کو وہ ہاتھ بھی نہ لگائے۔ وہ خود اٹھ کر اپنے کھانے کا بندوبست کرتیں۔ عروس نے پہلی بار برتن میں آٹا گھول کر گوندھنا چاہا تو جھپٹ کر اس سے آٹا چھین لیا۔

"خبردار جو ان کالے بھدے ہاتھوں سے آٹا گوندھنے کی کوشش کی......" وہ چلائی تھیں۔ "توبہ توبہ میں تو اس کے ہاتھ کے گوندھے آٹے اور اس کے ہاتھ سے بنی چپاتیوں کی طرف کبھی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھوں۔"

"ارے دلہن، ہم مسلمانوں سے بڑھ کر پاکی پلیدی کا خیال رکھتی ہے وہ بیچاری۔" بی بی اماں نے

ہولا کر سمجھانا چاہا۔" جب سے سلطان میاں نے اسے سمجھایا ہے ہر وقت باوضو رہنے کی کوشش کرتی ہے۔
آئے ہائے پھر کس بات پر اعتراض ہے تم کو۔"

"پاکی پلیدی کا تو مجھے کچھ علم نہیں لیکن میں ان آبنوسی ہاتھوں سے گندھا آٹا، پکی چپاتی اور پکا کھانا... ہرگز نہیں کھاؤں گی۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولی تھیں۔

اس کے بعد لاکھ عروس نے چاہا، لاکھ سب نے سمجھایا۔ شوکت آپا نے کھانے کے علاوہ نہ تو اسے کبھی اپنے بستر کو ہاتھ لگانے دیا نہ ہی کبھی اس سے اپنے کپڑے دھلائے۔ وہ گھر کے سب کمروں میں جھاڑ پونچھ کرتی، بستر جھاڑ کر سیدھے کرتی سب کے کپڑے دھو کر استری تک کر دیتی مگر شوکت آپا کی چیزوں اور کاموں کو ہاتھ لگانے کی کبھی اسے جرأت نہ ہو سکی۔ اور اس بات کا اس کے دل میں بہت رنج تھا۔ اسے پاکستانی شوہر کے دل اور گھر میں بسنا تھا اور اس بسیرے کے لیے اس نے اپنے ماضی کو یکسر بھلا دیا تھا۔ وہ شوہر کے رنگ، ماحول اور رہن سہن میں ڈھلتی چلی گئی تھی۔ جواب میں اس نے سب کی محبتیں بھی وصول کر لی تھیں اور سب کے دلوں میں گھر بھی کر لیا تھا لیکن ایک دل جسے وہ اپنی ہر کوشش کے باوجود نہ جیت سکی تھی وہ اس کے شوہر کی ماں کا دل تھا۔

"مرسل صاحب! اِدھر پاکستان کے اندر بھی گورے، کالے کی تمیز اتنی ہی سخت ہے جتنی دنیا کے باقی ملکوں میں ہے؟" کبھی وہ اپنے سیاہ ہاتھوں کی ہتھیلیاں نظروں کے سامنے پھیلاتے ہوئے حسرت سے سوال کرتی۔ مرسل میاں کے دل میں شرمساری گھر کرنے لگتی۔

"اِدھر آپ کے دین میں جواب میرا دین بھی ہے گورے کالے کے فرق کو فرق نہ سمجھنے کا حکم دیا گیا ہے، ہے ناں......" وہ دوسرا سوال کرتی۔ "تقویٰ کی فوقیت کا حکم ہے، ہے ناں......؟" تیسرا سوال آتا۔

"تم اماں کی باتوں اور رویے کو عمومی رویہ مت سمجھا کرو عروس، ہم لوگوں کے دل بہت کھلے اور بڑے ہیں۔ ہم میں سے اکثر ان احکامات کی دل سے پابندی کرتے ہیں جن کا تم ذکر کر رہی ہو۔" مرسل میاں صفائی دینے کی کوشش کرتے۔

"نہیں مرسل صاحب......" وہ آنکھوں میں بھرے آنسو روکتے ہوئے کہتی۔ "اِدھر بھی کالوں کے لیے وہی رویہ ہے جو سفید فام امریکی روا رکھتے ہیں۔ yankies سمجھتے ہوناں آپ......" وہ مرسل میاں کی طرف دیکھتی۔ "اُدھر کے yankies یہاں کے آبنوس ہیں۔ آبنوس کا مطلب سمجھتے ہوناں آپ......؟" وہ ہلکی آواز میں کہتی۔ مرسل میاں کا دل کٹنے لگتا۔ انہوں نے برا کیا جو اس صاف دل، پُرخلوص لڑکی کو بیاہ کر یہاں بسانے لے آئے تھے۔ وہاں کم از کم وہ اپنے ملک میں تو تھی۔ امریکی نژاد پاکستانی تو نہ تھی۔

"میں نے ابا میاں سے پوچھ لیا اور سمجھ بھی لیا آبنوس، سیاہ رنگ کو کہتے ہیں۔ سیاہ رنگ جو اجلی سفیدی کو داغدار کر دیتا ہے۔ اماں مجھ سے اسی لیے ناراض ہیں، صرف اسی لیے، ہے ناں......؟" وہ چھوٹے، چھوٹے سوال کرتی چلی جاتی اور اس کے دل کی چبھن بڑھتی چلی جاتی۔ بھلے مرسل میاں کے عزیز، رشتے دار، دوست، محلے دار کتنے ہی کھلے دل سے اسے قبول کر چکے تھے۔ لیکن اس کی رنگت پر بات اب بھی کی جاتی۔ اس کی طرف اب بھی تمسخرانہ نظروں سے دیکھا جاتا۔ وہ سب سمجھتی تھی۔ ایسے رویوں اور نظروں کی عادی ہو چکی تھی۔ لیکن ایک انسان جن کے اس رویے پر وہ زیادہ دکھی ہو جاتی تھی وہ شوکت آپا ہی تھیں۔ اس کے دل میں حسرت تھی وہ مرسل میاں کی ماں کا دل جیت لے۔ وہ رنگ، قوم نسل کی تمیز کو دل سے نکال کر اسے سینے سے لگا لیں۔ اسے آبنوس کے بجائے سب کی طرح عروس کہہ کر پکاریں۔ مگر دن گزرتے گئے، ہفتے، مہینے اور پھر سال گزر گئے۔ شوکت آپا کے رویے میں ذرا سی بھی لچک آئی نہ دل میں عروس کے لیے گنجائش پیدا ہو سکی۔

گزرتے برسوں کے ساتھ گھر اور زندگی میں کئی تبدیلیاں آتی گئیں۔ ابا میاں اور بی اماں آگے پیچھے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ سلطان بھائی کو فالج کے ہلکے

حملے نے بستر کا ہی کر کے رکھ دیا۔ شوکت آپا کے بالوں میں بھی سفیدی چمکنے لگی۔

چاروں بیٹیوں کے بچے بڑے ہو رہے تھے۔ اپنے، اپنے گھروں میں ذمے داریاں نبھاتی وقت گزار رہی تھیں لہٰذا میکے آنا جانا بہت کم ہو گیا تھا۔ خود مرسل میاں اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریاں نبھاتے، ترقی کرتے اعلیٰ عہدے پر پہنچ چکے تھے۔ اللہ نے عروسہ عرف عروس سے ان کو دو بیٹے عطا فرمائے تھے اور یہ شوکت آپا کی دعاؤں کا نتیجہ تھا یا خود عروس کی دعاؤں کا کہ دونوں ہی بچے باپ، دادا کی سی رنگت و نقش لے کر دنیا میں آئے تھے۔ عروس نے دونوں ہی کی پیدائش کے بعد جتنا شکر خدا کی ذات کا اس مہربانی پر کیا تھا اس سے پہلے شاید ہی کسی رحمت پر کیا ہو۔

”یہ دونوں بچے پاکستانی ہیں، پاکستانی ہی لگتے ہیں۔ مرسل صاحب کے بیٹے۔ خدا بھی ان پر انجلینا عرف آبنوس کی قسمت کا سایہ نہ ڈالے۔“ ایک بار اس نے سلطان بھائی کے بازو کی مالش کرتے ہوئے حسرت سے کہا تھا۔ سلطان بھائی کا دل دکھ سے بھر گیا۔ اب بات کرنے میں انہیں دقت پیش آتی تھی۔ جواب میں زبان سے تسلی نہ دے سکتے تھے، ہاتھ عروس کے دوپٹے سے ڈھکے سر پر ٹک گیا۔ شوکت آپا کے رویے نے عروس کو ایک عجیب سے احساسِ کمتری میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اس احساسِ کمتری کے آگے وہ زندگی کے کسی بھی اعزاز کے باوجود سر نہ اٹھا سکی تھی۔ وہ کم تر اور حقیر سی شاید اسی سلوک کی مستحق تھی جو شوکت آپا نے اس کے ساتھ عمر بھر روا رکھا تھا۔ اس کی نیک فطرتی، خلوص، محبت، خدمت گزاری، سگھڑاپا، شوہر کے دل پر راج پاٹ...... کوئی بھی خوبی اس ازلی و ابدی منحوس حقیقت کو مٹا نہ سکتی تھی جو اس کے رنگ و نقوش کی بنا پر روزِ روشن کی طرح ہر سمت سے اس کے سامنے آن کھڑی ہوتی باوجود اس کے کہ مرسل میاں نے عروس کو اپنے دل اور گھر میں مرکزی حیثیت دے رکھی تھی۔ وہ اسے اپنے لیے ہمیشہ ہی خوش بختی کی علامت سمجھتے اور کھلے دل سے اس کا اعتراف بھی کرتے تھے۔ اپنے گھر کو گھر بنائے رکھنے، گھر کے سب افراد کو ایک دوسرے سے جوڑے رکھنے کو عروس کی ہمت اور محبت ہی قرار دیا کرتے۔ لیکن ایک اپنی ماں کو وہ پہلے دن سے اب تک اس بات کا قائل کر پائے تھے نہ ہی اب اس کی ہمت و کوشش کیا کرتے تھے۔ ماں کے رویے کو ناممکن قرار دے کر انہوں نے شوکت آپا سے اب اس موضوع پر کبھی بات تک نہیں کی تھی۔ ہاں، ماں کے ادب و احترام اور تابعداری میں کبھی کوئی فرق نہیں آنے دیا تھا۔ مرسل میاں اور ان کے دونوں بیٹے سلطان بھائی اور شوکت آپا کے آگے پیچھے پھرا کرتے تھے۔ شوکت آپا دیکھتی تھیں اور جانتی تھیں عروس نے گھر کا نظام کیسے سلیقے سے چلا رکھا تھا۔ سسر کی کیسے دل و جان سے خدمت کرتی تھی۔ اپنے بیٹوں کی کیا خوب تربیت کر رہی تھی۔ مرسل میاں کی نکھری شخصیت کے پیچھے بھی اس کا ہاتھ تھا۔ وہ دیکھتی تھیں، سمجھتی تھیں جب ہی تو وقت کے ساتھ عروس کے لیے جگہ چھوڑتی چلی گئیں۔ اب عملاً عروس گھر کی کرتا دھرتا تھی سوائے شوکت آپا کے تین وقت کے کھانے، ان کے کپڑے، لتے کا دھیان رکھنے اور ان کی خدمت گزاری کے جس کے لیے اب ایک ملازمہ کا بندوبست کر لیا گیا تھا۔ شوکت آپا کی یہ ذاتی خدمت گزار عورت مہینے کی تنخواہ عروس سے وصولنے کے باوجود پہروں شوکت آپا کے پاس بیٹھی عروس کی برائیاں کیا کرتی۔ شوکت آپا کی دیکھا دیکھی یہ عورت بھی عروس کو آبنوس بی بی کہہ کر پکارنے لگی تھی۔ دونوں اپنی گفتگو کے دوران عروس کو گھر میں اِدھر اُدھر پھرتے دیکھ کر معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتیں اور پھر ٹھٹھا لگا کر ہنس دیتیں۔ عروس غریب یہ سب دیکھتی اور دل مسوس کر رہ جاتی۔ کاش مرسل میاں کی اماں ایک بار اسے اپنا سمجھ کر سینے سے لگا لیں۔ وہ سوچا کرتی اور تنہائی میں شیشے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنے چہرے کی طرف دیکھتی تو اپنی کم مائیگی کا احساس اور بھی گہرا ہوتا چلا جاتا۔

”معمولی شکل و رنگت والی لڑکیاں تو اس ملک

میں بھی ہیں لیکن کاسمیٹکس اور سرجریز کے ذریعے اپنے رنگ و شکل کے عیب مٹا سکتی ہیں۔ ایک میرا رنگ اور میرے نقوش ہیں کہ کچھ بھی کرلوں ان کو بدل نہیں سکتی۔ ٹھیک ہی کہتی ہیں مرسل صاحب کی اماں، میں ان سب بہنوں میں وہ کوا نظر آتی ہوں جو اپنی بدصورتی بھی چھپا نہیں سکتا۔ کاش جو کبھی میں ان کی ہمسری کر سکتی......'' اس کے دل میں ہوک اٹھتی جسے دل میں ہی دل میں چھپا کر وہ اپنی تنہائی سے باہر نکل کر ایک بار پھر سب کی خدمت میں حاضر ہو جاتی۔

☆☆☆

زندگی یونہی گزرے چلی جا رہی تھی۔ جب نومبر کی اس نکھری ہوئی صبح شوکت آپا نے مرسل میاں کو بتایا تھا کہ ان کی بڑی بہن کی بیٹی کی شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی اور اس شادی کے لیے وہ بیٹی، نواسی اور خود اپنے لیے خریداری خود کرنا چاہتی تھیں۔ عموماً اب شوکت آپا گھر سے باہر بہت کم جایا کرتی تھیں۔ ان کے لیے خریداری کا فرض کسی نہ کسی بیٹی کو ہی سونپا جاتا تھا۔

''ٹھیک ہے اماں......!'' مرسل میاں ماں کی فرمائش پر مسکرا کر بولے تھے۔ ''میں دفتر پہنچ کر گاڑی اور ڈرائیور بھیج دوں گا۔'' انہوں نے خریداری کے لیے ایک بڑی رقم شوکت آپا کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ اس کے ساتھ چلی جائیے گا۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولے تھے۔

''اور ہاں۔'' کمرے سے باہر جاتے جاتے، وہ رک کر مڑے تھے۔ ''عروس کو بھی اسی سلسلے میں خریداری کرنے آج بازار جانا ہے اچھا ہے وہ آپ کے ساتھ ہو گی تو مجھے آپ کی فکر نہیں ہو گی۔''

''مگر میں......'' شوکت آپا نے عادتاً بھڑک کر انکار کرنا چاہا لیکن پھر کچھ سوچ کر رک گئیں۔ ''مجھے کیا فرق پڑتا ہے جو وہ ساتھ ہو گی بھی تو...... میں کون سا اپنے ہاتھوں پیروں پر نہیں ہوں جو سہارے کے لیے کوئی ساتھ ہو گا اور رہ گیا بازار اور اس کی دکانیں، وہ میرے لیے نئی تو نہیں ہیں، سب دکاندار پرانے واقف ہیں خریداری میرے لیے کون سا مشکل ہو گی۔'' وہ دل ہی دل میں سوچنے لگیں اور مرسل میاں ماں کی خاموشی پر خوش ہو کر مسکرانے لگے۔ ''لیکن اسے بتا دینا وہ اگلی سیٹ پر بیٹھے گی بھلے ڈرائیور ہی ساتھ کیوں نہ بیٹھا ہو۔ میرے ساتھ بیٹھنے کی حماقت نہ کرے۔'' انہوں نے ماتھے پر بل ڈال کر مرسل میاں سے کہا۔

''ٹھیک ہے اماں...... میں کہہ دیتا ہوں۔'' مرسل میاں معترض نہ ہوئے۔ ''یوں بھی اسے کیا فرق پڑتا ہے۔ سرتاپا عبایہ اور نقاب میں ملبوس ہوتی ہے وہ۔''

''ہاں، ہاں جانتی ہوں۔'' شوکت آپا نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا...... ''اس عبایہ کے اندر بیچاری اپنی آبنوسی رنگت ہی تو چھپاتی ہے بھلا ہو عبایہ کا جو اس آبنوس کے لیے تو بڑا سہارا ثابت ہوئی یہ۔'' وہ منہ پر دوپٹا رکھ کر ہنس دیں۔ مرسل میاں نے کڑوے گھونٹ کی طرح ماں کا یہ جملہ حلق سے اتارا۔ ان کی مسکراہٹ پھیکی پڑ چکی تھی سر کو ہلکا سا ہلا کر وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔ شوکت آپا نے ان کے اس انداز پر نخوت سے سر جھٹکا اور گردن گھما کر ساتھ والے بیڈ پر بے بسی سے لیٹے سلطان بھائی کی طرف دیکھا جو حلق سے عجیب آوازیں نکالتے ہوئے شوکت آپا سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شوکت آپا جانتی تھی سلطان بھائی تنبیہ کرنا چاہ رہے تھے۔ انہیں ایسی جلی کٹی سنانے سے منع کرنا چاہ رہے تھے۔ شوکت آپا نے تمسخرانہ نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا تھا۔ وہ اب بھی اسی طرح دہک رہی تھیں اور اس کے شعلے اسی طرح بلند تھے جیسے پہلے دن بھڑکے تھے۔

☆☆☆

شوکت آپا نے عروس سے نفرت کی اس آگ کے ساتھ عمر کاٹ دی تھی لیکن وہ ایک مختلف دن تھا۔ جب وہ اسی آبنوس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر بازار خریداری کرنے گئی تھیں۔ وہ شان سے پچھلی سیٹ پر پھیل کر بیٹھی تھیں جبکہ عروس، مرسل میاں کی ہدایت کے مطابق اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھی

تھی...... ہلکی آواز میں ڈرائیور سے اس کے بیوی بچوں کی خیریت پوچھ رہی تھی، اس کے بچوں کی بیماریوں کے گھریلو علاج بتا رہی تھی اور پیچھے بیٹھی شوکت آپا دل ہی دل میں اس کی اس گفتگو پر تبصرہ کرنے میں مگن تھی۔

''میسنی، گھنی، اچھی بننے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ پاگل ہے بے وقوف عورت، بھلا یہ ڈرائیور کیا نہیں جانتا کہ اس عبایہ کے اندر کیسی بھوت، سیاہ رنگت عورت چھپی بیٹھی ہے۔ دل ہی دل میں ہنستا ہوگا، اس پر بھی اور مرسل میاں پر بھی...... ایسے شاندار صاحب کی ایسی بی کوٹی بیوی، مرسل میاں نے بھی خود ایسے چاند کو کیا گرہن لگایا جس نے عمر بھر کے لیے ان کے شاندار سراپے کو گہنائے رکھا...... اوپر سے اس گھنگر بالوں والی سیاہ چڑیل نے اللہ جانے کیا جادو کر رکھا تھا مرسل میاں پر کہ کبھی میری ناراضی خاطر مین لائے نہ دوسری شادی پر راضی ہوئے، خیر ہمیں کیا......'' انہوں نے سر جھٹکا۔ ''ہم کسی پر اختیار رکھتے ہوں نہ ہوں خود پر تو رکھتے ہیں ناں...... جب ہی تو اسے اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیا۔ اللہ ماری اجاڑ صورت، منحوس رنگت، خدا جانے کس چمارن کی اولاد تھی جو ہمارے گھر پر راج کرنے اِدھر آبیٹھی۔'' وہ سوچتی رہیں اور نخوت سے سر جھٹکتی رہیں۔

اس روز بازار میں خوب رونق تھی۔ شادیوں کا موسم اپنے عروج پر تھا...... کپڑوں کی دکانوں پر خاصا رش تھا۔ شوکت آپا اپنے واقف دکانداروں کی دکانوں پر بیٹھ کر بھاؤ تاؤ کرتی، کپڑے دیکھتیں، خریدتی رہیں۔ عروس نے ان کا ساتھ دینے کی حتی المقدور کوشش کی۔ لیکن اس کی کیا مجال تھی جو چلتے ہوئے ان کا ہاتھ پکڑ لیتی یا تھک جانے پر سہارا دے کر انہیں کہیں بٹھا سکتی۔ شوکت آپا کے پیچھے چلتی ان کی چال پر نظر رکھتی۔ وہ اپنے لیے خریداری بھی کر نہیں پائی تھی۔

شوکت آپا نے اپنی خریداری مکمل کرنے کے بعد اس پلازہ کی سڑک کی طرف اترتی سیڑھیوں پر قدم رکھا۔

''اماں میرا ہاتھ پکڑ لیں۔ کہیں گر نہ جایئے گا۔''

شوکت آپا کا پیر ذرا سا لڑکھڑاتا دیکھ کر وہ بے چین ہوکر آگے بڑھی تھی اور غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیا تھا۔

''ارے جاؤ۔'' شوکت آپا نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کی طرف حقارت سے دیکھا۔

''خبردار جو اپنے یہ سیاہ کوّے جیسے آبنوسی ہاتھ مجھے لگائے تم نے۔ میرے ہاتھوں میں ابھی اتنا دم موجود ہے کہ خود کو سنبھال سکوں...... اور اگر نہ بھی سنبھال پاؤں تو تمہارے ہاتھ کا سہارا لینے سے مرجانا بہتر سمجھوں گی میں۔'' انہوں نے تحقیر آمیز تیز نظر عروس پر ڈالی اور اگلی سیڑھی پر قدم بڑھایا عروس نئے سرے سے اس ذلت آمیز احساس سے دوچار ہوئی جو اس کی زندگی کا حصہ بن کر رہ گیا تھا اور جس سے وہ چاہ کر بھی چھٹکارا حاصل نہیں کر پائی تھی۔

گہری سانس لیتے ہوئے وہ بھی ساس کے پیچھے سیڑھیاں اترنے لگی، آخری سیڑھی پر قدم رکھ کر شوکت آپا نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ بازار میں بھیڑ بڑھ چکی تھی اور ان کی گاڑی سڑک کے اس پار کھڑی تھی۔ ڈرائیور گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا سامنے ہی دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے ڈرائیور کو گاڑی اپنی طرف لانے کو کہنا چاہا ہی تھا کہ ان کے اور ڈرائیور کے درمیان بازار کی بھیڑ سے نکل کر کوئی آموجود ہوا تھا۔

''آئے ہائے یہ آج کل کے شوخ لڑکے موٹر سائیکلوں کو گاڑیوں اور انسانوں کے درمیان یوں گھماتے، نکالتے ہیں جیسے سرکس کے بازی گروں کی اولادیں ہوں۔'' شوکت آپا جھنجلا گئیں...... اور ایک سیڑھی آگے اتر کر فٹ پاتھ پر آن کھڑی ہوئیں...... دوبارہ ڈرائیور کی طرف دیکھنا چاہا مگر یہ کیا کہ اب ان کے اور ڈرائیور کے درمیان گرد و غبار کا دھواں سا حائل ہونے لگا تھا۔ فضا میں موٹر گاڑیوں، رکشاؤں اور موٹر سائیکلوں کی آوازوں کا شور مدھم پڑنے لگا تھا اور عجیب سی تڑتڑاہٹ کی آوازیں ہر سو پھیل گئی تھیں۔

''ارے یہ کیا......'' اپنی نظروں کے سامنے

لوگوں کو ہراساں ہو کر بھاگتے، دوڑتے جان بچاتے دیکھ کر وہ دہل کر پیچھے ہٹی تھیں، اس دم انہیں اپنے وجود میں گرم سیسے جیسی کوئی چیز اترتی محسوس ہوئی تھی۔ انہوں نے خوف سے پھٹی آنکھوں سے دیکھنا چاہا اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتیں پہلے جیسی دوسری چیز اُن کے وجود کو کاٹتی اندر گھستی محسوس ہوئی، وہ تکلیف کی اذیت سے چلّانا چاہ رہی تھیں لیکن ان کی آواز اندر ہی کہیں گھٹ چکی تھی۔

دھویں اور گرد کے غبار میں انہوں نے موٹر سائیکل سواروں کی شبیہوں کو معدوم ہوتے دیکھا جو ہنستے بولتے چلتے پھرتے انسانوں کے اس ہجوم میں موت تقسیم کرنے آئے تھے اور اپنے حصے کا کام کر کے پورے اطمینان کے ساتھ اِدھر اُدھر زخمی اور بے جان وجود گرا کر ان کے درمیان سے نکل گئے تھے۔

شوکت آپا کے جسم کے اندر سے کچھ سیال کی طرح بہہ کر باہر بکھرنے لگا تھا۔ ان کی ٹانگوں کی طاقت ختم ہو رہی تھی وہ لڑکھڑائیں اور پھر زمین پر گرتی چلی گئیں۔

دہشت گردی، جس کے بارے میں آئے روز وہ خبریں ٹیلی ویژن پر سنا اور اخباروں میں پڑھا کرتی تھیں اور یہ سن کر کہ آئے روز ملک میں کسی نہ کسی جگہ اسی دہشت گردی کا شکار ہو کر کتنے لوگ جان سے چلے جاتے ہیں انہیں کبھی گمان بھی نہیں ہوا تھا کہ اسی دہشت گردی کا کوئی اگلا یا اس سے اگلا شکار وہ بھی ہو سکتی تھیں۔

''موت......'' انہوں نے ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ سوچنے کی کوشش کی...... برحق تو تھی لیکن وہ یوں انہیں اچانک آدبوچے گی وہ یقین نہیں کر پا رہی تھیں۔

''اور وہ......'' اپنے پیاروں کے چہروں کو یاد کرتے، کرتے اچانک انہیں اس کا خیال آیا جو یہیں کہیں تھی ان کے ساتھ ہی خریداری کرنے گھر سے نکلی تھی۔ اپنے پیچھے دو معصوم بچے اور خود پر جان نچھاور کرنے والا شوہر پیچھے چھوڑ کر آئی تھی۔ انہوں نے اپنے بے جان پڑتے وجود کو کہنیوں کے بل ذرا سا اوپر اٹھانے کی کوشش کی اور پھٹی نظروں سے اسے تلاش کرنا چاہا۔

''ہائے یہی تو ہے مجھ سے ذرا فاصلے پر گری پڑی،'' انہوں نے اس کی عبایا کا رنگ پہچانتے ہوئے سوچا۔ ''ارے اس کا وجود تو شاید مجھ سے بھی زیادہ چھلنی ہوا ہے۔'' ان کا دل لرز گیا۔ ان کا سر آپ سے آپ ہی جیسے کسی چیز کے انکار میں ہلا۔

''میری تو شاید عمر بھی تھی اور میں نے تو دنیا میں زندگی کو ہر طرح سے برت بھی رکھا تھا لیکن یہ اس کے تو ابھی جانے کے دن نہیں تھے۔ لیکن موت......'' انہوں نے خون ملی تھوک کو حلق سے اتارا۔ ''وہ تو شاید مجھ سے بھی پہلے اس کو آن لے۔''

''آب...... آب نوس...... ان کے حلق سے اس کے نام کی پکار یوں نکلی جیسے کسی کٹے بکرے کے حلق سے آخری، آخری کراہیں نکلتی ہیں۔ اور اس گٹھڑی کی شکل میں گرے وجود نے جیسے ان کی پکار سن لی تھی۔ اس کے بے دم پڑتے وجود میں حرکت سی ہوئی تھی شوکت آپا نے دیکھا وہ اپنا مردہ پڑتا ہاتھ اوپر اٹھا کر ان سے کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ رہی تھی یوں جیسے کسی بچے نے اچانک سے کچھ ایسا پالیا ہو جس کی اسے خواہش تھی۔ شوکت آپا نے بے یقینی سے اس کے چہرے پر پھیلے خوشی کے احساس کو دیکھا وہ پوری ہمت جمع کر کے کان لگا کر سننے کی کوشش کی...... سرخوشی کے احساس میں ڈوبا وہ آخری جملہ ان کی ختم ہوتی ساعتوں سے ٹکرایا تھا۔

''اماں، دیکھیں تو اماں...... میرے اور آپ کے خون کا رنگ ایک جیسا ہے، بالکل ایک جیسا...... مم...... میرے سیاہ رنگ وجود میں بھی سرخ رنگ لہو اور آپ کے بھی۔''

شوکت آپا نے بیچارگی اور بے بسی کے ساتھ آخری نگاہ اس پر ڈالی اور اگلے ہی لمحے اس کا فضا میں معلق لہو، لہو ہاتھ نیچے گر گیا تھا۔ اس روز موت نے آبنوس کو لہو میں نہلا کر شوکت آپا کی دنیا کو دیکھتی الوداعی نظروں کے سامنے عروس بنا دیا تھا۔

تھی...... ہلکی آواز میں ڈرائیور سے اس کے بیوی بچوں کی خیریت پوچھ رہی تھی اس کے بچوں کی بیماریوں کے گھریلو علاج بتا رہی تھی اور پیچھے بیٹھی شوکت آپا دل ہی دل میں اس کی اس گفتگو پر تبصرہ کرنے میں مگن تھی۔

"میسنی، گھُنی، اچھی بننے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ پاگل ہے بے وقوف عورت، بھلا یہ ڈرائیور کیا نہیں جانتا کہ اس عبایہ کے اندر کیسی بھوت، سیاہ رنگت عورت چھپی بیٹھی ہے۔ دل ہی دل میں ہنستا ہوگا، اس پر بھی اور مرسل میاں پر بھی...... ایسے شاندار صاحب کی ایسی بی کوٹی بیوی، مرسل میاں نے بھی خود ایسے چاند کو کیا گرہن لگایا جس نے عمر بھر کے لیے ان کے شاندار سراپے کو گہنائے رکھا...... اوپر سے اس گھنگر بالوں والی سیاہ چڑیل نے اللہ جانے کیا جادو کر رکھا تھا مرسل میاں پر کہ کبھی میری ناراضی خاطر مین لائے نہ دوسری شادی پر راضی ہوئے، خیر ہمیں کیا......" انہوں نے سر جھٹکا۔ "ہم کسی پر اختیار رکھتے ہوں نہ ہوں خود پر تو رکھتے ہیں ناں...... جب ہی تو اسے اپنے قریب بھی پھٹکنے نہیں دیا۔ اللہ ماری اجاڑ صورت، منحوس رنگت، خدا جانے کس چمارن کی اولاد تھی جو ہمارے گھر پر راج کرنے ادھر آ بیٹھی۔" وہ سوچتی رہیں اور نخوت سے سر جھٹکتی رہیں۔

اس روز بازار میں خوب رونق تھی۔ شادیوں کا موسم اپنے عروج پر تھا...... کپڑوں کی دکانوں پر خاصا رش تھا۔ شوکت آپا اپنے واقف دکانداروں کی دکانوں پر بیٹھ کر بھاؤ تاؤ کرتی، کپڑے دیکھتیں، خریدتی رہیں۔ عروس نے ان کا ساتھ دینے کی حتی المقدور کوشش کی۔ لیکن اس کی کیا مجال تھی جو چلتے ہوئے ان کا ہاتھ پکڑ لیتی یا تھک جانے پر سہارا دے کر انہیں کہیں بٹھا سکتی۔ شوکت آپا کے پیچھے چلتی ان کی چال پر نظر رکھتی۔ وہ اپنے لیے خریداری بھی کر نہیں پائی تھی۔

شوکت آپا نے اپنی خریداری مکمل کرنے کے بعد اس پلازہ کی سڑک کی طرف اترتی سیڑھیوں پر قدم رکھا۔

"اماں میرا ہاتھ پکڑ لیں۔ کہیں گر نہ جایئے گا۔"

شوکت آپا کا پیر ذرا سا لڑکھڑاتا دیکھ کر وہ بے چین ہو کر آگے بڑھی تھی اور غیر ارادی طور پر اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیا تھا۔

"ارے جاؤ۔" شوکت آپا نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کی طرف حقارت سے دیکھا۔ "خبردار جو اپنے یہ سیاہ کوّے جیسے آبنوسی ہاتھ مجھے لگائے تم نے۔ میرے ہاتھوں میں ابھی اتنا دم موجود ہے کہ خود کو سنبھال سکوں...... اور اگر نہ بھی سنبھال پاؤں تو تمہارے ہاتھ کا سہارا لینے سے مرجانا بہتر سمجھوں گی میں۔" انہوں نے تحقیر آمیز تیز نظر عروس پر ڈالی اور اگلی سیڑھی پر قدم بڑھایا عروس نئے سرے سے اس ذلت آمیز احساس سے دوچار ہوئی جو اس کی زندگی کا حصہ بن کر رہ گیا تھا اور جس سے وہ چاہ کر بھی چھٹکارا حاصل نہیں کر پائی تھی۔

گہری سانس لیتے ہوئے وہ بھی ساس کے پیچھے سیڑھیاں اترنے لگی، آخری سیڑھی پر قدم رکھ کر شوکت آپا نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ بازار میں بھیڑ بڑھ چکی تھی اور ان کی گاڑی سڑک کے اس پار کھڑی تھی۔ ڈرائیور گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا سامنے ہی دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے ڈرائیور کو گاڑی اپنی طرف لانے کو کہنا چاہا ہی تھا کہ ان کے اور ڈرائیور کے درمیان بازار کی بھیڑ سے نکل کر کوئی آ موجود ہوا تھا۔

"آئے ہائے یہ آج کل کے شوخ لڑکے موٹر سائیکلوں کو گاڑیوں اور انسانوں کے درمیان یوں گھماتے، نکالتے ہیں جیسے سرکس کے بازی گروں کی اولادیں ہوں۔" شوکت آپا جھنجلا گئیں...... اور ایک سیڑھی آگے اتر کر فٹ پاتھ پر آن کھڑی ہوئیں...... دوبارہ ڈرائیور کی طرف دیکھنا چاہا مگر یہ کیا کہ اب ان کے اور ڈرائیور کے درمیان گرد و غبار کا دھواں سا حائل ہونے لگا تھا۔ فضا میں موٹر گاڑیوں، رکشاؤں اور موٹر سائیکلوں کی آوازوں کا شور مدھم پڑنے لگا تھا اور عجیب سی تڑتڑاہٹ کی آوازیں ہر سو پھیلی تھیں۔

"ارے یہ کیا......" اپنی نظروں کے سامنے

"آپ کے ساتھ بیٹھا اس گنجے ولی سے تو بہتر لگتا ہوں......" اقصم نے شرارت سے کہا اور ٹیبل سے اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا۔ ہر اخبار میں کل ہونے والے اقصم کے کنسرٹ کے چرچے تھے۔ وہ راتوں رات ایک فیمس راک اسٹار بن گیا تھا۔

"رات کہاں گئی تھیں آپ؟" ایک لمحے کے لیے اخبار سے نظریں ہٹا کر اس نے پوچھا۔

"جہنم میں......" زہر میں ڈوبا جواب آیا۔

"مجھے بھی ساتھ لے لیتیں...... آپ کی فکر میں ساری رات نیند نہیں آئی۔" اس نے اخبار کا صفحہ پلٹا۔

"میں تم سے الجھنا نہیں چاہتی۔" اس نے کافی کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

"تو میں کون سا جنگ کا اعلان کرنے آیا ہوں...... میں بھی تو یہی چاہتا ہوں کہ ہم پہلے کی طرح اچھے دوست بن جائیں۔" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

"اب یہ ممکن نہیں ہے......اور پلیز اب اس ٹاپک پہ مجھ سے کوئی بات مت کرنا...... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔" وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔

"کچھ ایسی محبت اس کے دل میں بھر دے یارب
کہ وہ جس کو بھی چاہیے وہ میں بن جاؤں"

اقصم نے بے بسی سے شعر پڑھا...... "اچھا خاصا ہینڈسم شخص ہوں ہزاروں لڑکیاں مرتی ہیں مجھ پر اگر ان لڑکیوں کو پتا چل جائے کہ اس مشہور راک اسٹار کی بیوی گھر میں اس کا کیا حشر کرتی ہے تو خودکشی کر لیں گی وہ سب......" اقصم کی بات پہ وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔ اسی اثنا میں چوکیدار ایک خوب صورت فلاور باسکٹ لیے ان کے قریب آیا۔

"سر یہ آپ کے لیے بھجوایا ہے کسی نے۔" اقصم نے ہاتھ بڑھا کر فلاور باسکٹ لی۔ چوکیدار واپس چلا گیا...... اقصم نے باسکٹ ٹیبل پر رکھ کر فلاور کے اندر سے ایک کارڈ نکالا۔

"مائی فرسٹ کرش اقصم چوہدری، آئی لو یو سو مچ...... میں آپ کی دیوانی ہوں اور آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔" اقصم نے مسکراتے ہوئے کارڈ پڑھا اور ٹیبل پر رکھ دیا۔ "ایک کریزی فین ہے میری...... میرے عشق میں مبتلا ہے، شادی کرنا چاہتی ہے مجھ سے اب بتائیں کیا جواب دوں؟" اس نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے سنجیدہ انداز میں کہا۔

"تو کر لو شادی......" جھٹ سے مشورہ دیا گیا۔



"ایک کو تو ہینڈل نہیں کر پا رہا..... دوسری کو کیسے سنبھالوں گا۔" اقصم نے مسکراتے ہوئے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔
وہ کافی کا خالی مگ ٹیبل پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوگئی۔ بولی کچھ نہیں۔
"اچھا رکیں ایک منٹ......" اقصم نے پکارا۔
وہ رک گئی۔
"کچھ سونگز ہی لکھ دیں مجھے......؟" فرمائش کی گئی۔
"کسی اور سے لکھوالو میں نہیں لکھ سکتی۔" اس نے دوٹوک جواب دیا۔
"مگر آپ سے اچھا کوئی نہیں لکھ سکتا۔" انداز التجائیہ تھا۔
"سوری اگین...... میں نہیں لکھ سکوں گی...... میری ذہنی حالت ابتر ہے آج کل......" وہ اسے ٹکا سا جواب دے کر اندر بڑھ گئی تھی۔
"آج کل تیرے ستارے گردش میں ہیں اقصم...... خدا خیر کرے......" اقصم نے ایک طویل سانس لی اور خود سے مخاطب ہوا۔ جب سے اقصم نے اسے دھمکی دی تھی اسے رات سے ڈر لگنے لگا تھا۔
وہ کافی دیر بڑی اماں کے پاس بیٹھ کر ٹائم گزارتی رہی...... پھر بڑی اماں نے خود ہی اسے کمرے میں جانے کو کہہ دیا تھا کیونکہ اقصم آج گھر پر ہی تھا...... وہ اپنا تکیہ لینے کمرے میں آئی تو اقصم گٹار بجا رہا تھا اس کے سامنے کاغذ قلم رکھا تھا یقیناً وہ کوئی نیا گانا تیار کر رہا تھا۔
"کہاں تھیں آپ اتنی دیر سے نظر نہیں آئیں؟" اسے دیکھتے ہی سوال کیا۔
"تمہارے ہر سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی میں......" مناب نے ایئر رنگز اتار کر دراز میں رکھتے ہوئے کہا۔
"حد ہے بداخلاقی کی...... میرے ہر سوال کا الٹا جواب دینے کی قسم کھا رکھی ہے آپ نے؟"
"یہی سمجھ لو۔" وہ اب اپنی کلائیوں سے چوڑیاں اتارنے لگی۔
"آپ بہت غلط کر رہی ہیں میرے ساتھ......" اقصم نے تاسف سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
"اور جو تم نے میرے ساتھ کیا...... وہ ٹھیک تھا؟" اس نے دکھ سے پوچھا۔
"یقیناً بہت غلط تھا...... مجھے آپ کی شادی نہیں تڑوانی چاہیے تھی۔ لیکن اب آپ کو وہ سب بھول جانا چاہیے، آپ کے وہ مسٹر ایکس اپنی نئی شادی شدہ لائف خوب انجوائے کر رہے ہیں، آج کل اپنا ہنی مون پیریڈ انجوائے کر رہے ہیں...... اور آپ ہیں کہ ابھی تک اپنی شادی ٹوٹنے کا سوگ منا رہی ہیں۔ اپنے ساتھ، ساتھ مجھے بھی سولی پر لٹکا رکھا ہے آپ نے۔" وہ خفگی سے بولا تو ولی کے ذکر پر وہ یک لخت خاموش ہوگئی۔
"کافی دیر سے مجھے کافی کی طلب ہو رہی تھی...... پلیز اپنے ہاتھ کی کافی ہی پلا دیں...... اتنا عرصہ ہو گیا ہے آپ کے ہاتھ کی کافی پیے ہوئے۔" اقصم نے فرمائش کی۔
"اسلم سے کہو وہ بنا دے گا، میں ملازمہ نہیں ہوں تمہاری......" اگلے ہی لمحے فرمائش رد کر دی گئی۔
"ویسے انتہا کی خودسر بیوی ہیں آپ...... مجھ جیسا شوہر نہیں ملے گا آپ کو جو آپ کی یہ بدتمیزیاں اتنی آسانی سے برداشت کر جاتا ہے۔" اس نے جتایا۔
"میں بھی تو تمہیں برداشت کر رہی ہوں، تم بھی کرو مجھے۔" مناب جیولری دراز میں رکھنے کے بعد بیڈ سے تکیہ اٹھاتے ہوئے بولی۔
"اب کہاں جا رہی ہیں آپ یہ تکیہ لے کر؟"
"ایشو کے کمرے میں۔"
"آپ وہاں نہیں جائیں گی، کیوں میرا تماشا بنانے پر تلی ہوئی ہیں......؟"

''تم مجھ پر حکم نہیں چلا سکتے۔''

''میں بہت کچھ کرسکتا ہوں اگر چاہوں تو...... حکم تو دور کی بات ہے۔'' اقصم غصے میں گٹار ایک سائڈ پر رکھ کر جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا اور تکیہ اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر بیڈ پر پھینکتے ہوئے بولا۔

''اقصم تم...... تم...... میرا دل چاہتا ہے تمہارا......'' وہ شدید غصے میں اسے گھورتی ہوئی بولی اور بے بسی سے جملہ ادھورا چھوڑ گئی۔

''کیا دل چاہتا ہے آپ کا بتائیں ناں......؟'' وہ اس کے مقابل کھڑا گہری نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''میرا دل چاہتا ہے گلا دبادوں تمہارا......'' مناب کے انکشاف پر وہ دھیرے سے مسکرایا اور اس کے نزدیک آتے ہوئے بولا۔

''آپ کو سوخون بھی معاف کیے...... لیجیے میں آپ کے سامنے ہوں...... دبائیں میرا گلا...... اور اپنی حسرت پوری کرلیجیے......'' اقصم نے اس کے ہاتھ پکڑ کر اپنی گردن پر رکھے، وہ بے بسی سے اپنے ہاتھ چھڑا کر بیڈ پر بیٹھ گئی...... اور ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی...... وہ اس کے رونے سے تڑپ کر اس کے پاس آیا۔

''مناب...... کیوں رو رہی ہیں آپ......؟ پلیز کچھ بتائیں ناں......'' اس نے مناب کے چہرے سے ہاتھ ہٹانے چاہے۔ ''آئی ایم سوری میں مذاق کررہا تھا۔''

''تمہاری وجہ سے...... صرف اور صرف تمہاری وجہ سے رو رہی ہوں۔'' اس نے روتے، روتے اطلاع دی تو اقصم گم صم سے انداز میں اسے دیکھے گیا۔

''دو چار دن مجھے اور برداشت کرلیں...... اگلے تین مہینے کے لیے میں ورلڈ ٹور پر جارہا ہوں۔ مختلف ممالک میں کنسرٹس ہیں میرے...... تین مہینے کے لیے جان چھوٹ جائے گی آپ کی مجھ سے...... پلیز اب تو رونا بند کردیں۔'' اقصم نے اس کی بھیگی آنکھیں دیکھتے ہوئے التجا کی۔ اس کے آنسو اقصم کے دل پر گررہے تھے۔ اسے روتا دیکھ کر اقصم کو سخت تکلیف ہورہی تھی۔ مناب نے اپنے آنسو صاف کرلیے اور وہ اسے دیکھتا رہ گیا...... اسے شدت سے احساس ہورہا تھا اپنی جذبات میں کی ہوئی غلطی کا...... وہ اس کے لیے بنی ہی نہیں تھی...... اقصم نے اسے زبردستی اپنی زندگی میں شامل تو کیا تھا مگر زبردستی اس کی محبت حاصل نہیں کرسکتا تھا...... وہ اسے پا نہیں سکتا تھا وہ اس کے دل سے ولی کا نام مٹا کر اپنا نام نہیں لکھ سکتا تھا۔

☆☆☆

صبح زارون کی آنکھ کھلی تو عنایہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے پریشان بیٹھی تھی، زارون نے کروٹ بدلی، اسے اس طرح بیٹھا ہوا دیکھا تو وہ بھی اٹھ بیٹھا۔

''کیا بات ہے ہنی......؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے...... ایسے کیوں بیٹھی ہو؟ سب ٹھیک تو ہے؟'' ایک منٹ میں اس نے اکٹھے سوال کرڈالے تھے۔

''تمہاری وجہ سے میں ساری رات سو نہیں سکی ہوں۔'' عنایہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''کیوں ہنی......؟''

''تم اچھی طرح سے جانتے ہو۔''

''میں واقعی نہیں جانتا۔'' اس نے تعجب سے دیکھ کر کہا۔

''تم رات پی کر آئے تھے؟''

''ہاں وہ......'' زارون نے نظریں چرائیں۔ ''تم جاگ رہی تھیں؟''

''ہاں جاگ رہی تھی...... تم ہوش میں نہیں تھے...... کیوں پی تم نے؟ تم نے آج تک ان حرام چیزوں کو ہاتھ

نہیں لگایا......اب کیوں زارون......؟" عنایہ کے لہجے میں بے یقینی، دکھ اور افسوس تھا۔
"بس وہ ایک دوست نے زبردستی پلادی۔" زارون نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔
"زبردستی......؟" اس نے زیرِلب دُہرایا۔
"آج سے پہلے تو کبھی تمہارے کسی دوست نے زبردستی تمہیں پلانے کی کوشش نہیں کی۔ یہ کون سا دوست ہے تمہارا جس کی بات تم ٹال نہیں سکے......؟" عنایہ کے سوالوں پہ وہ جھنجلا گیا۔
"فارگاڈ سیک عینی......اٹھتے ہی تم نے تفتیش شروع کردی......میری بات پر یقین نہیں ہے تمہیں......؟ جھوٹ بول رہا ہوں میں؟" الٹا وہ عنایہ پر برس پڑا تھا۔
"تمہیں اتنا غصہ کیوں آرہا ہے تم سے پوچھنا میرا حق بنتا ہے، بیوی ہوں تمہاری......" عنایہ حیرت سے اس کو دیکھنے لگی۔
"بیوی ہو تو پلیز بیوی بن کر ہی رہو......بال کی کھال اتار رہی ہو تم......اور جب میں نے کہہ دیا ہے کہ ایک دوست نے زبردستی پلادی......میں اسے انکار نہیں کرسکا تو تمہیں یقین کرلینا چاہیے۔" وہ غصے اور جھنجلاہٹ میں واش روم کی طرف بڑھا۔ "سارے موڈ کا ستیاناس کردیا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے۔ واش روم میں گھس گیا تھا۔
اور وہ حیرت و بے یقینی سے جہاں بیٹھی تھی وہیں بیٹھی رہ گئی۔
وہ زارون کے ایٹی ٹیوڈ پر سخت حیران ہوئی تھی......کہیں کچھ غلط ضرور تھا۔ اس کے دل و دماغ میں وسوسے سر اٹھانے لگے......زارون نے کبھی عنایہ کی کسی بات پر یوں رِی ایکٹ نہیں کیا تھا جیسے اس نے آج کیا تھا۔

☆☆☆

سب خوشگوار ماحول میں ناشتا کررہے تھے۔
"مناب بیٹا یہ اقصم کو سرو کرو......" سمیرا بیگم نے اپنے پاس بیٹھی بے دلی سے ناشتا کرتی مناب کو مخاطب کرتے ہوئے آملیٹ کی پلیٹ پکڑائی۔
مناب نے خاموشی سے پلیٹ پکڑ کر اقصم کے آگے رکھ دی۔
"تم دونوں اتنے خاموش کیوں رہتے ہو؟ میں نے کبھی تم دونوں کو ایک دوسرے سے خوشگوار انداز میں بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔" داؤد چوہدری نے ناشتا کرتے ہوئے ان دونوں کو دیکھا۔
مناب کھسیا کر سر جھکا گئی تھی۔
"نہیں ڈیڈ ایسا کچھ نہیں ہے، ہم دونوں خوش ہیں ایک دوسرے کے ساتھ۔" اقصم نے جھوٹ بولا۔
"خوشی بتائی نہیں جاتی مائے سن، خوشی نظر آتی ہے اور تم دونوں کے چہروں پر آج تک مجھے خوشی دکھائی نہیں دی۔ تم دونوں کے بیچ اگر ایسے ہی اجنبیت کی دیوار حائل رہی تو باقی کی زندگی کیسے گزارو گے۔" داؤد چوہدری نیپکن سے منہ صاف کرتے ہوئے دونوں سے مخاطب ہوئے۔
"ڈونٹ وری ڈیڈ سب ٹھیک ہوجائے گا......آپ بلاوجہ پریشان ہورہے ہیں۔" اقصم نے جوس اپنے گلاس میں ڈالتے ہوئے انہیں مطمئن کرنا چاہا۔
"جب تک چیزوں اور معاملات کو ٹھیک نہیں کیا جائے وہ ٹھیک نہیں ہوتیں......اور ماں، باپ کی پریشانی بلاوجہ نہیں ہوتی۔ ہم تم دونوں کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں، اسی میں ہماری خوشی ہے۔" داؤد چوہدری کی باتوں پر مناب سر جھکائے ناشتا کرنے کی ایکٹنگ کرتی رہی۔
"مجھے لگتا ہے تم دونوں کو ایک دو مہینے کے لیے یورپ کا ٹور کرلینا چاہیے۔ تم دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارنے کی ضرورت ہے۔"
"نہیں ڈیڈ......اس کی ضرورت نہیں ہے......ہفتے دس دن کے بعد میں دو تین مہینے کے لیے بہت بڑی ہونے والا

ہوں۔ مختلف ممالک میں کنسرنس ہیں میرے۔'' اقصم نے انکار کیا۔

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے اقصم ...... تم مناب کو ساتھ لے جانا......'' بڑی اماں نے اسے مشورہ دیا۔

''نہیں بڑی اماں، میں نہیں لے جا سکتا انہیں، وہاں میرا زیادہ وقت سفر میں گزرے گا اور میں مناب کو بالکل بھی ٹائم نہیں دے پاؤں گا۔ وہاں جا کر بور ہی ہوں گی یہ۔'' اقصم نے فوری انکار کیا۔

''اور ویسے بھی یہ آپ سب کے ساتھ زیادہ خوش رہتی ہیں۔'' آخری جملہ اس نے مناب کو سنانے کے لیے کہا تھا۔

''او کے ابھی دس دن تو ہیں ناں تمہارے پاس۔'' داؤد چوہدری نے استفسار کیا۔

''یس ڈیڈ......''

''پھر ایسا کرو تم دونوں ایک ہفتے کے لیے ملائشیا اور سنگاپور سے ہو آؤ...... ماحول چینج ہونے سے مناب بھی فریش ہو جائے گی۔''

''نن نہیں ماموں...... میں آپ سب کے ساتھ یہاں بہت خوش ہوں، مجھے اچھا لگتا ہے آپ سب کے ساتھ رہنا۔'' داؤد چوہدری نے کہا تو مناب فوراً بول اٹھی۔

''تھینکس اگین میری پیاری بیٹی...... مگر ہم سے بھی زیادہ تمہیں اقصم کی خوشی کا خیال رکھنا چاہیے۔ میں آج ہی تم دونوں کے وہاں جانے اور رہنے کا تمام بندوبست کروا دیتا ہوں۔''

''مگر ماموں...... وہ......'' مناب جھجک سی گئی۔

''کوئی اگر...... مگر نہیں......'' داؤد چوہدری نے جیسے بات ہی ختم کر دی تھی۔

وہ جزبزسی ہو کر چپ کر گئی تھی مگر کمرے میں آتے ہی وہ اقصم کے آگے پھٹ پڑی تھی۔

''کیا ضرورت ہے ملائشیا جانے کی؟''

''میں نے بھی یہی کہا تھا ڈیڈ سے کہ کیا ضرورت ہے وہاں جانے کی......؟ ان کی بہو مجھے میرے کمرے میں لفٹ نہیں کرواتی...... وہاں جا کر کیا ہوگا۔'' وہ آئینے کے سامنے کھڑا بال بناتے ہوئے بولا۔

''تم نے ایک بار بھی ماموں کو منع نہیں کیا۔'' وہ برہم ہوئی۔

''میں نے کئی بار انہیں منع کیا تھا۔'' اس نے خود پر پرفیوم اسپرے کیا۔

''تمہیں دوٹوک انداز میں انہیں منع کرنا چاہیے تھا۔''

''کیا تو تھا میں نے...... وہ ڈیڈ ہیں میرے...... جب انہوں نے حتمی انداز میں کہا، اپنا فیصلہ سنایا تو میں انکار نہیں کر سکا۔'' وہ تیار ہو کر اس کی جانب پلٹا۔

''تمہارا اپنا دل چاہ رہا ہوگا وہاں جانے کا...... اسی لیے منع نہیں کیا تم نے۔'' وہ غصے میں بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''میرے دل کی بات نہ کریں آپ...... میرا دل تو نہ جانے کیا، کیا چاہتا ہے۔'' وہ سینے پر بازو لپیٹے ذومعنی انداز میں اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''بس تمہیں تو موقع چاہیے ہوتا ہے، مجھ سے فلرٹ کرنے کا......'' وہ جھنجلائی۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا کہ اقصم قہقہہ لگا کر ہنسا۔

''جب بیوی لفٹ نہ کروائے تو شوہر بیچارہ...... اپنی بیوی سے فلرٹ کرنے کی کوشش ہی کرے گا ناں...... صرف کوشش......''

''بیچارہ ہونہہ......'' وہ تنفر سے بولی۔ ''بیچارے تم جیسے نہیں ہوتے...... وہ لوگوں کی زندگیاں برباد نہیں کرتے۔ وہ دوسروں کو دکھ نہیں دیتے۔''

''آپ میتھ کا ایک مشکل سوال بن گئی ہیں میرے لیے...... اس سوال کو حل نہیں کر پا رہا ہوں میں۔''

''اور حل کر بھی نہیں سکو گے۔'' اس نے لٹھ مار جواب دیا۔

''جانتی ہیں میں آپ کے یہ جلے کٹے انداز، نفرت آمیز باتیں اور بدتمیزیاں کیوں برداشت کر لیتا ہوں؟'' وہ چلتے، چلتے اس کے قریب آیا۔

مناب نے غصے سے گردن موڑ لی۔

''عشق کرتا ہوں آپ سے...... ایسا عشق جو آج کل لوگ نہیں کرتے۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

''تو کس نے کہا تھا تمہیں مجھ سے عشق کرنے کو؟ یہ احسان مجھ پر مت چڑھاؤ کہ تم مجھ سے عشق کرتے ہو۔''

وہ اس کی بات پر مسکرایا اور اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''ان خوب صورت آنکھوں نے کہا تھا مجھے آپ سے عشق کرنے کو...... ان بالوں نے کہا تھا اور ان ہونٹوں نے کہا تھا......'' اقصم نے اس کی آنکھوں، بالوں اور ہونٹوں کو دھیرے سے چھوا تو مناب نے تیزی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''تم لاعلاج مریض ہو...... کچھ نہیں ہو سکتا تمہارا......'' وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔

''تو کر دیجیے ناں، میرا علاج...... آپ کے سوا میرا علاج کسی کے پاس نہیں ہے۔'' اقصم نے التجا کی۔

''تم جہاں جا رہے تھے وہاں جاؤ...... اپنے ساتھ، ساتھ میرا بھی ٹائم ویسٹ کر رہے ہو۔''

''جا رہا ہوں ظالم خاتون...... ! نہ جانے وہ وقت کب آئے گا جب میں جانے لگوں گا اور آپ مجھے روکیں گی۔''

''انشاءاللہ وہ وقت کبھی نہیں آئے گا۔'' یقین دلایا گیا۔

''چل بھئی اقصم...... یہ دال گلتی نظر نہیں آتی۔'' وہ مایوس ہوا اور اس نے مسکراتے ہوئے سائڈ ٹیبل سے اپنی گاڑی کی چابی اور والٹ اٹھایا۔

''ویسے اس صدی کی سب سے ٹریجک لو اسٹوری ہے میری......'' وہ اس پر ایک نظر ڈال کر دروازے کی طرف بڑھا اور دروازے کے پاس آ کر ایک لمحے کے لیے رکا۔

''میری اور اپنی پیکنگ آج ہی شروع کر دیجیے گا...... ڈیڈ ہمارا ہنی مون ٹور کسی صورت بھی کینسل نہیں کرنے والے۔'' اقصم نے لفظ ہنی مون پر زور دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا...... مناب نے پلٹ کر غصے میں دیکھا...... مگر وہ جا چکا تھا۔

''کہاں جاؤں میں اس شخص سے بچ کر......'' وہ آبدیدہ ہوئی۔

☆☆☆

داؤد چوہدری نے کوالالمپور کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ان دونوں کے stay کے لیے ایک ہفتے کی بکنگ کروادی تھی۔ جہاں پہنچتے ہی اقصم تو سو گیا تھا مگر مناب نے بیگز میں سے اقصم کے اور اپنے کپڑے نکال کر الماری میں لٹکانے شروع کر دیے اس نے کروٹ بدلی تو اسے کام کرتے ہوئے دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا۔

''یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟''

''دیکھ نہیں رہے کیا کر رہی ہوں؟''

''دیکھ رہا ہوں اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں، آتے ہی آپ نے بیگز میں سے کپڑے نکالنے شروع کر دیے......؟ کل ہو جائے گا یہ کام......''

''آج کا کام کل پر نہیں چھوڑنا چاہیے...... سنا تو ہو گا تم نے......'' وہ اپنے کام میں مگن بولی تو اقصم بیڈ سے اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔

''آپ رکھیں ان کپڑوں کو اور تھوڑی دیر ریسٹ کر لیں...... ورنہ تھک جائیں گی آپ۔'' اقصم نے اس کے ہاتھ میں پکڑے کپڑے جھپٹ کر صوفے پر پھینکے اور اسے بازو سے پکڑ کر بیڈ پر بٹھانا چاہا۔

"چھوڑو میرا بازو......اور کرنے دو مجھے یہ کام......نہیں کرنا مجھے کوئی ریسٹ ویسٹ......" وہ جھنجلائی۔
"مناب کیا مسئلہ ہے آپ کا؟ یہاں آکر بھی آپ نے مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرنا تھی تو یہاں آنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟" اقصم کا موڈ آف ہوا۔
"اگر ماموں اس قدر اصرار نہ کرتے تو کبھی نہ آتی۔ اور یہ بات تم اچھی طرح سے جانتے ہو۔" مناب اپنا بازو چھڑا کر ایک بار پھر بیگ میں سے کپڑے نکالنے لگی۔
"کیا آپ اپنی اور میری اس لڑائی میں ایک ہفتے کے لیے سیز فائر کا اعلان نہیں کر سکتیں؟ پر اس واپس جا کر پھر سے اس لڑائی کو یہیں سے کنٹینیو کر لیں گے۔" اقصم چند لمحے مظلوم نظروں سے اسے دیکھتا رہا اور پھر التجا آمیز لہجے میں بولا۔
"فار گاڈ سیک اقصم......مجھ پر اپنا یہ گھٹیا قسم کا عشق مت جھاڑا کرو......تم سے سیز فائر کا اعلان کبھی نہیں ہو سکتا۔"
"عشق اگر اپنی مرضی اور رضا سے کیا جاتا تو شاید میں بھی آپ سے عشق کرنے جیسی غلطی ہرگز نہیں کرتا......اپنی زندگی برباد کرنے کا شوق نہیں تھا مجھے۔" وہ ٹھوکر مار کر غصے میں باہر نکل گیا تھا......اور پھر رات گئے واپس آیا تھا جب وہ سو چکی تھی۔ اقصم کو اب اپنی اس جذباتی حرکت اور غلطی کا شدت سے احساس ہوتا تھا......اس کی زندگی مشکل سے مشکل ترین ہو گئی تھی......اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ مناب کو کیسے موم کرے......اس کا دل پتھر بن چکا تھا اور وہ روز اس پتھر سے سر پھوڑتا اور خود ہی زخمی ہو جاتا......ایک بات تو زندگی نے اسے اچھی طرح سمجھا دی تھی......زبردستی کے رشتے سوائے ایک بوجھ کے اور کچھ نہیں ہوتے......کسی کو زبردستی اپنی زندگی میں شامل تو کیا جا سکتا ہے مگر زبردستی کسی سے محبت نہیں کروائی جا سکتی۔ اس محبت نے اسے بری طرح سے ذلیل کر دیا تھا۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، ہینڈسم اور مشہور و معروف راک اسٹار تھا۔ ہزاروں لڑکیاں اس پر مرتی تھیں۔ اس سے محبت کا اظہار کرتی تھیں......مگر اس کی تان مناب سے شروع ہو کر مناب پر ہی ٹوٹتی تھی۔ وہ اس کے سامنے بے بس ہو جاتا تھا، مجبور ہو جاتا تھا۔ اگلی صبح اس کی آنکھ موبائل کی بیپ پر کھلی تھی......اس نے نیم وا آنکھوں سے موبائل اٹھا کر دیکھا وہ جس آرگنائزر کے لیے کنسرٹ کرنے والا تھا وہ اسے کال کر رہا تھا اقصم نے فوراً کال پک کی۔
اقصم اس سے کنسرٹ کی ڈیٹس فائنل کرنے لگا......اس کی نظریں آئینے کے سامنے کھڑی مناب پر مرکوز تھیں۔ جینز کے اوپر لانگ جرسی پہنے اپنے کھلے بالوں میں برش کرتی وہ بہت کیوٹ لگ رہی تھی۔
"آپ اتنی خوب صورت لگا ہی مت کریں۔ خواہ مخواہ عشق جھاڑنے اور آپ سے فلرٹ کرنے کو دل چاہتا ہے میرا......" کال بند کرتے ہوئے وہ مناب سے بولا۔ اس کے اظہار پہ ایک لمحے کے لیے بالوں میں برش کرتا مناب کا ہاتھ رکا۔
"پلیز اب صبح ہی صبح اپنا محبت نامہ کھول کر مت بیٹھ جانا......" وہ ہیئر برش رکھ کر صوفے پر آ بیٹھی۔
"اور اگر آپ نے مجھ بیچارے کے ساتھ یہی ظالمانہ رویہ اپنائے رکھا تو مجھے یقین ہے عنقریب میں مینٹل اسپتال میں پایا جاؤں گا۔" بستر سے نکلتے ہوئے اس نے کچھ اس طرح بیچارگی سے کہا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی دھیمی سی مسکراہٹ مناب کے لبوں پر ٹھہر گئی۔
"مسکراتی ہوئی کتنی اچھی لگتی ہیں آپ۔" اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اقصم نے اس کے گال چھوئے۔
"کیا بدتمیزی ہے یہ۔" اسے برا لگا۔
"بدتمیزی نہیں محبت ہے۔" وہ واش روم کی طرف بڑھا۔
"تم کتنے ڈھیٹ ہو گئے ہو۔" اس نے جھنجلا کر ٹیبل پر رکھا میگزین اٹھایا۔
"اور آپ......؟ آپ کتنی ظالم اور بے حس ہو گئی ہیں۔ میری کسی بات کا اثر نہیں ہوتا آپ پہ......"
"اور کبھی ہوگا بھی نہیں۔"
"ڈیڈ کوئی فائدہ نہیں ہوا یہاں آنے کا......" وہ بڑبڑاتا ہوا واش روم کی طرف بڑھ گیا۔ ناشتے کے بعد وہ ریموٹ

اٹھا کر چینل سرچنگ میں مصروف ہوگئی تھی۔ اقصم نے چینج کیا اور اس سے مخاطب ہوا۔

"بغیر کسی بحث و تکرار کے اگر آپ میرے ساتھ باہر چلنا چاہیں تو چلیں...... اگر گھر والوں تک اس عجیب وغریب ہنی مون کی ایک بھی تصویر نہ پہنچی تو یاد رکھیے گا...... گھر پہنچتے ہی ڈیڈ، مام اور بڑی اماں کی عدالت میں پیش ہونا پڑے گا۔ اور مجبوراً وہاں مجھے آپ کے اس کٹھور پن کی تمام روداد سنانا پڑے گی۔" اقصم تیار ہو کر اب اس سے مخاطب تھا۔ اس کی دھمکی پہ مناب نے ٹی وی آف کر دیا۔

"زیادہ بلیک میل کرنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں، میں تیار ہو کر آتی ہوں۔"

"اب آیا ناں اونٹ پہاڑ تلے......" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

"کیا کہا تم نے؟"

"وہ میں کہہ رہا تھا آپ کو تیار ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اچھی خاصی حسین لگ رہی ہیں۔" اقصم سر کھجاتے ہوئے مسکرایا۔

"اوکے......!" وہ اثبات میں سر ہلا کر اپنا پرس اٹھائے چلنے کو تیار تھی۔ پہلی بار اس نے اقصم کی کوئی بات بغیر بحث و تکرار کے مانی تھی اقصم اندر ہی اندر مسرور ہو رہا تھا۔

کولالمپور کی تمام اہم جگہیں دیکھتے، دیکھتے انہیں شام ہوگئی تھی۔ اقصم اسے ٹوئن ٹاور دکھانے لے آیا تھا۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ روشنیوں میں نہائے ٹوئن ٹاورز کے سامنے اقصم نے مناب کے ساتھ اپنی سیلفی لی تھی۔ اور ایشال کو whats app کردی تھی۔

"اسے دیکھنے کے لیے تو دو چار دن چاہئیں۔ میں تھک گئی ہوں اور بھوک بھی لگ رہی ہے۔" چلتے، چلتے اس نے اقصم سے اظہار کیا۔

"بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے...... چلیں یہاں سے کچھ کھاتے ہیں اور پھر واپس چلتے ہیں۔" اقصم اسے قریب ہی ایک فوڈ پوائنٹ پر لے آیا تھا۔

"آج آپ اپنی پسند کا کھانا آرڈر کریں۔" اقصم نے اسے چیئر پیش کی۔

"اوکے......" مناب نے کرسی پر بیٹھ کر مینو کارڈ اٹھایا۔

شادی کے بعد یہ پہلا جملہ تھا جو مناب نے نارمل انداز میں اسے بولا تھا۔ اقصم دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد واپسی پر ایک آؤٹ لیٹ کے آگے سے گزرتے ہوئے اقصم کی نظر ایک خوب صورت سے ڈریس پر پڑی تھی اور وہ مناب کے لیے اس ڈریس کو خریدنے زبردستی اسے اس آؤٹ لیٹ کے اندر لے آیا تھا۔

مناب وہاں ایشال اور عینی کے لیے شرٹس دیکھنے لگی۔ دفعتاً ایک انگریز لڑکی ہاتھوں میں کچھ شاپنگ بیگز پکڑے نہایت خوش دلی سے اس کی طرف بڑھی، اس لڑکی کے ساتھ ایک کیوٹ سی بچی بھی تھی جس نے ٹیڈی بیئر اٹھا رکھا تھا۔ مناب نے بے ساختہ اس بچی کو پیار کیا۔

"آپ مناب ہیں؟" اس انگریز لڑکی نے بہت خوب صورت انگلش لہجے میں مناب سے پوچھا۔

"جی...... لیکن آپ کون ہیں اور مجھے کیسے جانتی ہیں؟" جواباً مناب نے حیرت سے اس لڑکی کو دیکھا۔

"میرا نام کیتھرین ہے۔" وہ لڑکی مسکرائی۔

"ولی کہاں ہے۔" اور اگلے ہی لمحے اس لڑکی نے دائیں، بائیں نگاہ دوڑائی۔

"آپ ولی اور مجھے کیسے جانتی ہیں؟" مناب مزید حیران ہوئی اور اس نے حیرت سے اسے پوچھا۔ اس کے سوال پر کیتھرین مسکرائی۔

"میں نے ولی کے ساتھ تمہاری تصویر فیس بک پر دیکھی ہے۔" مناب اس کے سوال پر زبردستی مسکرائی لیکن اس کی

سوئی وہیں اٹک گئی تھی۔

"آپ ولی کو کیسے جانتی ہیں؟" اس کے کریدنے پر کیتھرین نے جو انکشاف کیا تو وہ حیرت زدہ رہ گئی۔

"دراصل میں اس کی سابقہ بیوی ہوں۔" اس کی بات مناب کے چہرے کی مصنوعی مسکراہٹ بھی ایک دم غائب ہو گئی تھی۔ کیتھرین، ولی کی سابقہ بیوی تھی۔ کیتھرین، مناب کو مزید تفصیل بتانے لگی پھر اس نے اپنے ساتھ کھڑی اس بچی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ ہماری بیٹی ہے۔" مناب نے پھٹی، پھٹی نگاہوں سے اس بچی کو غور سے دیکھا۔ اس بچی کے نقوش، اس کی رنگت ہو بہو ولی جیسی ہی تھی۔

"میں اس کو یہاں گھمانے لائی ہوں، یہ اپنے ڈیڈ کو بہت مس کرتی ہے۔" کیتھرین نے بچی کو پیار کرتے ہوئے بتایا۔ مناب کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"آپ کیا کہہ رہی ہیں مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔" جواباً کیتھرین نے اس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

"میرا یقین کرو...... ہماری شادی پانچ سال قبل ہوئی تھی۔" مناب کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا...... ولی نے پانچ سال پہلے کیتھرین سے امریکا میں شادی کی تھی اور وہ ایک بیٹی کا باپ بھی تھا۔

اس سے محبتوں کے بے شمار دعوے کرنے والا، اسے اپنی پہلی اور آخری محبت کہنے والا شخص اس کو یوں بھی دھوکا دے سکتا تھا؟ اس کے نام کی انگوٹھی پہننے والی، اس کے نام کی مالا جپنے والی اسے اپنا سب کچھ سمجھنے والی کو ولی نے دھوکا دیا تھا۔ اسے اتنے بڑے دھوکے میں رکھا تھا؟ ولی سے اس کی شادی ہونے جارہی تھی پھر بھی اس نے اپنے ماضی کی اتنی بڑی حقیقت اس سے چھپائی۔

"ولی بہت دھوکے باز انسان ہے اس نے مجھے بھی دھوکا دیا۔" کیتھرین بدگمان لہجے میں ولی کو مزید برا بھلا کہہ رہی تھی۔ اس نے کیتھرین کو ہی دھوکا نہیں دیا تھا، اس نے مناب کو بھی دھوکے میں رکھا تھا اور اب وہ اپنی بہن کی نند سے شادی کر کے اپنا ہنی مون پیریڈ انجوائے کر رہا تھا، دو عورتوں کو دھوکا دینے کے باوجود وہ کس قدر خوش اور مگن ہو گیا تھا اپنی نئی زندگی میں اور مناب نے اس کی خاطر، اس کی یاد میں اس سے بچھڑنے کے دکھ میں، اس سے شادی ٹوٹنے کے غم میں خود پر خوشیوں کو حرام کر لیا تھا۔ کیتھرین اسے مزید تفصیل بتا رہی تھی کہ ڈاکٹر ولی نے امریکا کی قومیت حاصل کرنے کے لیے اس سے شادی کی اور بچی کی پیدائش اور گرین کارڈ حاصل کرنے کے بعد اسے چھوڑ دیا۔

مناب کو اپنے اردگرد ہر چیز گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی...... اسے اب سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیتھرین اس سے کیا، کیا کہہ رہی تھی۔ اس کے آس پاس اقصم کا جملہ گونج رہا تھا۔

"شکر کریں اس دو نمبر ولی سے آپ کی جان چھوٹ گئی۔ امریکا میں بھی اس نے شادی کر رکھی تھی۔" اسے شدید چکر آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ لڑکھڑا کر گرتی عقب سے اقصم شاپنگ بیگ ہاتھ میں لیے اس کے قریب آیا تھا اور اسے لڑکھڑاتا ہوا دیکھ کر عجلت میں اس نے اسے شانوں سے تھام لیا تھا۔ مناب کا چہرہ بھی دھواں، دھواں ہو رہا تھا۔

"مناب کیا ہوا ہے آپ کو......؟ اور یہ لڑکی کون ہے۔ کیا کہہ رہی تھی آپ سے؟" وہ از حد فکر مند ہوا۔

"کچھ نہیں بس جلدی یہاں سے چلو...... میرا سر چکرا رہا ہے۔ شاید میرا بی پی لو ہو رہا ہے۔" اس نے بہ مشکل جملہ ادا کیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے اور جسم بے جان...... اقصم نے اثبات میں سر ہلایا اور اسے تھامے جلدی سے لفٹ کی جانب بڑھا۔ وہاں سے اپنے ہوٹل کے روم میں پہنچتے ہوئے انہیں آدھا گھنٹا لگا تھا۔ اقصم نے روم میں آتے ہی اسے بیڈ پر لٹا دیا۔

"آپ چائے یا کافی کچھ لیں گی؟ منگواؤں آپ کے لیے......؟" اقصم اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

اس نے صرف نفی میں سر ہلا دیا۔

"مناب کیا بات ہے، اچانک آپ کی طبیعت کیسے خراب ہو گئی۔ صبح تو آپ بالکل فریش تھیں؟" وہ متفکر سا پوچھ

رہا تھا۔

"سر میں اچانک درد شروع ہو گیا اور تو ایسا کچھ بھی نہیں......" مناب کی نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں، لہجہ کھویا ہوا تھا جیسے کوئی اپنا سب کچھ گنوا دے۔

"ظاہر ہے ہر وقت مجھ پر اتنا غصہ کرتی ہیں، خود بھی پریشان رہتی ہیں اور مجھے بھی کرتی ہیں۔ مسلسل اسٹریس سے سر میں تو درد ہو گا ہی۔" اقصم نے فکرمندی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ "لائیں میں آپ کا سر دبا دوں۔" اس نے ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے، تم پلیز مجھے تھوڑی دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دو ...." مناب کے لہجے میں التجا تھی......اقصم خاموشی سے اس کے قریب سے اٹھ کر صوفے پر آ گیا تھا......اور وقت گزارنے کے لیے اقصم نے اپنا آئی پیڈ اٹھا لیا تھا۔

کیتھرین کے انکشاف نے مناب کو ہلا کر رکھ دیا تھا......ولی مرتضیٰ کی محبت میں اس نے اقصم کے ساتھ کیا، کیا نہیں کیا۔ اسے کیا، کیا نہیں کہا تھا......وہ روز اسے بے عزت کیا کرتی تھی۔" اس کو لعن طعن کرتی......اپنے غصے، نفرت کا غم کا بے پایاں اظہار کرتی اور وہ ہنستے مسکراتے ہوئے اس کی ہر تذلیل......اور نفرت کو سہہ جاتا، وہ اسے دکھ دے کر خوشی محسوس کرتی......اس کی ہر بات پر انکار کر کے اسے راحت ملتی تھی۔ حالانکہ وہ یہ بات اچھی طرح سے جانتی تھی جو عورت اپنے شوہر کو ناراض کرتی ہے اس کے حقوق پورے نہیں کرتی اللہ اور اس کے فرشتے کیسے اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔ ولی کی محبت میں وہ اللہ کے حکم کو بھی بھول گئی تھی، وہ سمجھتی تھی اقصم نے اس سے اس کی محبت چھین لی ہے......ولی کا ساتھ چھین لیا ہے مگر وہ آج سمجھی تھی اقصم نے اس سے ولی کا ساتھ نہیں چھینا تھا......اللہ نے اقصم کے ذریعے اس کو ایک دھوکے باز شخص سے بچا لیا تھا۔ اللہ نے اسے ایک چھوٹا دکھ دے کر بہت بڑے دکھ سے بچا لیا تھا......وہ ولی مرتضیٰ کو دنیا کا سب سے خوب صورت قابلِ اعتبار مرد سمجھا کرتی تھی، یہ تھی اس کی اصل حقیقت......؟ اتنا مکروہ تھا اس کی محبت کا چہرہ......؟ یہ وہ سوال تھے جس نے اس کے اندر ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ اقصم رات جانے کب بیڈ پر آ کر سویا تھا وہ کچھ نہیں جانتی تھی......اسے تو بس ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ساتویں آسمان سے زمین پر آ گری تھی۔ کمرے میں اچانک اسے آکسیجن کی کمی محسوس ہونے لگی تھی۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب اچانک کروٹ بدلتے ہوئے لاشعوری طور پر اقصم نے مناب کو دیکھنا چاہا تھا مگر اس کا بستر خالی تھا۔ اقصم نے تکیے سے سر اٹھا کر کمرے میں نگاہ دوڑائی وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ وہ تھوڑی دیر بستر پر چت لیٹا رہا......اور اس کا انتظار کرتا رہا کہ شاید وہ واش روم میں ہو......مگر واش روم سے بھی کسی قسم کے کھٹکے کی آواز نہیں آئی تھی۔

اقصم فوراً بستر سے اٹھا۔ اس نے واش روم میں جھانکا......واش روم خالی تھا۔ اقصم نے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر لابی میں جھانکا لابی بھی خالی تھی۔ اس نے عجلت میں دروازہ بند کیا......اور اپنا موبائل اٹھا کر اس کے نمبر پر کال ملائی تھوڑی دیر کے بعد تکیے کے قریب رکھا اس کا موبائل بج اٹھا۔

"مائی گاڈ......پاگل ہو چکی ہیں یہ......اور عنقریب مجھے بھی پاگل کر کے چھوڑیں گی۔" اس نے فکرمندی سے موبائل بیڈ پر پھینکا اور کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے لگا۔ اچانک اسے خیال آیا اور وہ عجلت میں روم کے ساتھ ملحق ٹیرس کی جانب بڑھا ٹیرس کا دروازہ کھول کر اس نے جھانکا تو وہ وہیں کھڑی تھی۔ شدید سردی میں جینز پر صرف جرسی پہنے......نہ سر کور تھا نہ گلے میں مفلر......سرد اور تیز ہوا کے جھونکوں سے اس کے کھلے بال لہرا رہے تھے۔ وہ روشنیوں جیسی نہائے شہر کو دیکھ رہی تھی۔

اقصم نے ٹیرس پر قدم رکھا تو سرد ہوا کے جھونکے نے اس کا استقبال کیا۔

"مناب یہ کیا پاگل پن ہے؟ کیوں خود کو بیمار کرنے پر تلی ہوئی ہیں؟"

"کیوں آئے ہو تم......؟ جاؤ اور مجھے اکیلا چھوڑ دو......" اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی تھی......وہ بے آواز رو رہی تھی۔ اقصم نے تڑپ کر اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔

"آپ رو رہی ہیں؟ مگر کیوں......؟" وہ اس کا بھیگا چہرہ دیکھ کر بے چین ہوا تھا۔

''اپنی قسمت پر رو رہی ہوں، پلیز چلے جاؤ یہاں سے۔'' وہ باقاعدہ رو پڑی۔ اقصم اس کے شانوں کے گرد بازو پھیلائے زبردستی اسے کمرے میں لے آیا۔ وہ برف کی طرح ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ اسے بیڈ پر بٹھانے کے بعد اقصم نے ہیٹر آن کیا...... اور اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ اب بھی رو رہی تھی...... اس کی آنکھوں سے گرنے والے آنسو اقصم کے دل پر گر رہے تھے۔

''مناب پلیز خود کو میری خاطر اذیت دینا چھوڑ دیں۔ میں نے کبھی آپ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھنے چاہے، آپ کو اپنی وجہ سے دکھ اور اذیت میں مبتلا دیکھ کر میرا دل، میرا ضمیر مجھے اور بھی ملامت کرنے لگتا ہے، میری جذبات میں کی ہوئی غلطی آپ کو اس طرح دکھ سے دوچار کرے گی، اس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔'' وہ خود سسک اٹھا۔

''میں...... میں ہوں آپ کا مجرم...... میں نے سکون غارت کیا ہے آپ کا...... آپ مجھے جو مرضی سزا دیں۔ لیکن خدارا اپنے آپ کو یوں اذیت نہ دیں۔ یہ ظلم نہ کریں خود کے ساتھ...... مناب میں آپ کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا، آپ کے آنسو مجھے بے چین کر دیتے ہیں، آپ نے مجھے اپنے شوہر کے روپ میں قبول نہیں کیا...... میں جانتا ہوں، میرا آپ کے آس پاس رہنا آپ کو اچھا نہیں لگتا میں یہ بھی جانتا ہوں۔'' اقصم اس کے ٹھنڈے برف ہاتھ تھامے اپنے ہاتھوں میں گرم کرتے ہوئے نہایت جذب اور پریشانی سے بولتا جا رہا تھا۔

''آج کے بعد آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی...... میں آپ کے قریب نہیں آؤں گا...... آپ سے زیادہ بات نہیں کروں گا...... آپ کے سامنے بھی نہیں آؤں گا...... خود کو مصروف کر لوں گا...... بہلا لوں گا اپنے دل کو...... کر لوں گا کچھ نہ کچھ مگر پلیز وعدہ کریں آج کے بعد آپ نہیں روئیں گی...... اور...... اور اگر وہ لی مرتضیٰ آپ کو اب بھی اپنانے پہ تیار ہے تو میں آپ کے حق سے دستبردار ہو جاؤں گا میں سمجھتا تھا آپ کو حاصل کر لوں گا تو دنیا کی ہر خوشی مل جائے گی مجھے...... مگر ایسا نہیں ہوا...... دکھ اور بھی بڑھ گیا ہے میرا...... اور ہاں آپ گھر والوں کی ٹینشن مت لیجیے گا...... ڈیڈ، مام، بڑی اماں اور سب گھر والوں کے سامنے بھی ڈٹ جاؤں گا...... اور رہی بات میری تو...... تو جس طرح اچانک میں آپ کی زندگی میں داخل ہوا تھا اسی طرح آپ کی زندگی سے نکل جاؤں گا......'' وہ بہت کرب اور دکھ سے بول رہا تھا اور اسے مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا تھا...... اور وہ...... وہ اس کی بے پایاں محبت پہ اور بھی شدت سے روئے جا رہی تھی۔ وہ جانتی تھی اس وقت اقصم دکھ کی کس انتہا پہ کہہ رہا تھا یہ۔

''پلیز مناب خاموش ہو جائیں...... مت روئیں۔'' اقصم کی التجا پہ بے ساختہ وہ اس سے کسی بچے کی طرح لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور نہ جانے کتنی ہی دیر وہ روتی رہی...... اور وہ اسے چپ کرواتا رہا...... یہاں تک کہ وہ روتے روتے نڈھال ہو کر نیند کی آغوش میں چلی گئی...... اور وہ کتنے ہی گھنٹے اسی اینگل سے بیٹھا رہا تاکہ اس کی نیند خراب نہ ہو...... صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کا ایک بازو اقصم کے کندھے پر تھا...... دوسرا اس کی کمر پر اور سر اقصم کے سینے پر...... اور وہ بیچارہ بیٹھے بیٹھے سو رہا تھا...... رات کا ایک، ایک منظر مناب کی نگاہوں میں گھوم گیا...... وہ عجلت میں شرمندگی کے ساتھ اس کی گرفت سے نکلی...... اقصم نے بہ مشکل آنکھیں کھولیں اس کی کمر اکڑ گئی تھی بیٹھے، بیٹھے۔

''آئی ایم سوری...... تم، تم سو جاؤ......'' وہ شرمندگی سے نظریں چراتے ہوئے بولی۔

''آپ کی طبیعت کیسی ہے اب......؟'' نیند میں ڈوبی آواز کے ساتھ اقصم نے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں، تم خواہ مخواہ ساری رات بیٹھے رہے۔'' وہ شرمندہ ہو رہی تھی۔

''آپ کے آرام کی خاطر...... میں ایک رات تو کیا ساری زندگی ایسے گزار سکتا ہوں اور پلیز اب یہ مت کہیے گا میں آپ سے فلرٹ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں......'' وہ اٹھ کر بیڈ کی دوسری سائیڈ پر آیا اور اپنی جگہ پہ نیم دراز ہو گیا۔

''اب سر میں درد تو نہیں ہو رہا۔'' اس نے دوبارہ سونے سے قبل ایک بار پھر مناب سے پوچھا تو وہ نفی میں سر ہلا گئی۔

''نہیں، میں اب ٹھیک ہوں۔ تم سو جاؤ......'' مناب کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔ کبھی کبھی بہت سارا رو لینے سے دل کا

بوجھ کم ہو جاتا ہے۔ اندر کی دھند چھٹ جاتی ہے جیسے بارش کے بعد آسمان، پھول، پودے سب نکھر جاتے ہیں......اور انسان پہلے سے بہتر دیکھنے لگتا ہے۔ اور پھر ملائشیا میں باقی کے جتنے دن بھی وہ رہے مناب اور اس کے بیچ ایک خاموشی حائل رہی......وہ کوئی بات کہتا تو مناب چپ چاپ اس کی بات مان لیتی اس کے ساتھ بحث و تکرار کرنا، غصہ دکھانا، اسے ڈانٹنا، اس کی باتوں پر لٹھ مارنا جواب دینا سب ختم کر دیا تھا مناب نے......اسے چپ لگ گئی تھی اور اس کی یہ چپ اقصم کو مزید پریشان کر رہی تھی۔

☆☆☆

زارون، عنایہ کو کہہ کر آفس گیا تھا کہ آج وہ دونوں ڈنر کہیں باہر کریں گے......اور وہ کب سے تیار ہو کر بیٹھی تھی۔ اس کا انتظار کرتے، کرتے اس نے زارون کو کال کی تو مسلسل بیل جاتی رہی مگر وہ کال پک نہیں کر رہا تھا......پھر اس نے موبائل ہی آف کر دیا۔ چار گھنٹے فارمل ڈریس پہن کر اس کا انتظار کرتے، کرتے بالآخر تھک ہار اس نے چینج کر لیا تھا......اور وہ رات ایک بجے گھر آیا تھا۔ کمرے میں آتے ہی اس کا موڈ آف دیکھ کر وہ انجان بنتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟ سوئی نہیں؟''

''مجھے ڈنر کا کہہ کر خود کہاں غائب تھے اب تک؟''

''اوہو......میں نے آج ڈنر کا کہا تھا تمہیں؟ آئی ایم سوری، میں بھول گیا۔'' وہ ہنوز انجان بنا واش روم کی طرف بڑھا۔

''آج کل تم بہت کچھ بھول رہے ہو مجھ سمیت......'' عنایہ نے غصے میں کہا۔

''کم آن ہنی......آفس میں آج کل بہت کام ہے، مصروف تھا میں......بھول گیا......'' اس نے بہانہ تراشا۔

''آفس میں ایسا کون سا کام ہوتا ہے جس کے لیے تمہیں رات گئے وہاں رکنا پڑتا ہے؟ بڑے پاپا تو بتا رہے تھے آفس میں آج کل تم کم ٹائم دے رہے ہو۔ پھر ایسی کون سی مصروفیت ہے تمہاری جو آدھی رات تک تمہیں آج کل گھر سے باہر رہنے پر مجبور کرتی ہے؟'' وہ غصے میں پوچھنے لگی، باقاعدہ تفتیش کرنے لگی۔

''فار گاڈ سیک ہنی......لو کلاس بیویوں کی طرح الٹے سیدھے سوال مت کرو......میں مصروف تھا، نہیں آسکا اور بھول گیا......سوال پر سوال کر کے میرا دماغ مت خراب کرو......'' وہ جھنجلاتے ہوئے الٹا اسی پر برس پڑا۔ ''شادی کیا کروالی میری تو سوشل لائف ہی ختم ہو گئی ہے۔''

''کیا؟ میں......میں تمہارا دماغ خراب کر رہی ہوں؟'' عنایہ نے حیرت و بے یقینی سے اسے دیکھا۔

''تو اور کیا......گھر آتے ہی تمہاری تفتیش شروع ہو جاتی ہے۔ بیوی ہو تم......بیوی بن کر رہو، تھانیدار مت بنو......'' وہ غصے سے بولا۔

''زارون یہ، یہ تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو مجھ سے؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ میں نے تو صرف ایک شکوہ کیا تھا تم سے اور تم اتنا اوور ری ایکٹ کر رہے ہو۔''

''ہاں، ہاں میں تو پاگل ہوں......اسٹوپڈ ہوں، اسی لیے اوور ری ایکٹ کر رہا ہوں۔''

''زارون میں نے یہ کب کہا کہ تم پاگل ہو......؟ بلاوجہ بات کو بڑھا رہے ہو تم۔''

''میں بڑھا رہا ہوں بات کو......؟'' وہ بلند آواز میں چلایا۔ ''بحث پہ بحث کیے جا رہی ہو تم......اور تم کہہ رہی ہو میں بات کو بڑھا رہا ہوں؟''

''اوکے! سارا قصور میرا ہے اس حالت میں چار گھنٹے تمہارا انتظار کرتی رہی ہوں......اور کھانا تک نہیں کھایا میں نے۔'' عنایہ نے غصے میں بات ختم کی اور خود پر کمبل تان کر لیٹ گئی اور زارون واش روم کی طرف بڑھ گیا۔

زارون ٹریک سے اتر رہا تھا اور زارون کے ہی حوالے سے بہت سے وسوسے عنایہ کے دل میں سر اٹھا رہے تھے۔

وہ منتظر ہی رہی کہ زارون اسے منائے گا مگر زارون نے ایسی کوئی پیش رفت نہیں کی تھی۔ وہ واش روم سے نکل کر سیدھا بیڈ پر آیا اور جلد ہی سو گیا۔ عنایہ کے لیے اس کا بدلہ ہوا رویہ سہنا بہت مشکل تھا وہ ایک منٹ کے لیے بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا وہ کبھی عنایہ کو ناراض ہوتا دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اور اب...... اب وہ اس کو اگنور کر رہا تھا...... وہ ساری رات ڈسٹرب رہی، اگلی صبح وہ زارون کے آفس جانے کے لیے سوٹ نکال رہی تھی جب زارون اس کے پاس کھڑا معافی مانگ رہا تھا۔

''آئی ایم سوری ہنی...... میں رات کچھ زیادہ ہی ہائپر ہو گیا تھا...... مجھے ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' زارون نے اس کے عقب سے آ کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے مگر عنایہ نے اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔

''تم میرے زارون نہیں ہو...... ایک بدلے ہوئے زارون ہو۔''

''میں تمہارا وہی زارون ہوں ڈیئر......'' اس نے عنایہ کا رخ اپنی جانب موڑا۔ ''محض وہم ہے تمہارا یہ سب۔''

''عورت کو وہم بلاوجہ نہیں ہوتا...... شوہر جب ٹریک سے اترتا ہے تو سب سے پہلے اس کی بیوی کو ہی پتا چلتا ہے۔'' وہ اس سے سخت ناراض تھی۔

''اوکے لیو دس ٹاپک...... یہ شک اور قیاس بعد میں کر لینا...... چلو ناشتا کرتے ہیں۔'' زارون اس کا ہاتھ تھامے کمرے سے باہر لے آیا تھا لیکن وہ خاموش تھی، اسے ہر حال میں اس بدلے ہوئے زارون کے پیچھے اصل حقائق کو جاننا تھا۔

زارون اپنے تئیں اسے منا کر آفس چلا گیا تھا...... لیکن اس کے اندر کہے زارون کے الفاظ اور لہجہ نہیں نکلا تھا...... وہ بہت پریشان تھی اور خاموش بھی...... اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی یہ پریشانی کس سے شیئر کرے...... وہ اپنی سوچوں میں گم تھی جب ایشال نے اس کے کمرے میں جھانکا تھا۔

''عینی میں پھپو کی طرف جا رہی ہوں۔ تم چلو گی؟'' وہ اس کے قریب آئی تو عنایہ نے غائب دماغی سے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں، میرا کہیں جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔'' اس کے لہجے کی ویرانی پہ ایشال اس کے پاس آ بیٹھی تھی۔

''عینی کیا بات ہے آج تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟'' جواباً اس نے زارون کے حوالے سے تمام باتیں ایشال کے گوش گزار دی تھیں۔

''ایشو! زارون بہت بدل گیا ہے، کیا شادی کے بعد محبت کا یہ انجام ہوتا ہے؟ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ زارون ایک دن بدل جائے گا...... مجھ سے جھوٹ بولنے لگے گا۔'' وہ رو دینے کو تھی۔

''کم آن عینی......'' ایشال نے اسے تسلی دی۔ ''تم بلاوجہ وہم کر رہی ہو۔ وہ کیوں بدلیں گے اور وہ بدل سکتے بھی نہیں، اتنی محبت کرتے ہیں تم سے۔''

''مرد کو بدلنے میں دیر نہیں لگتی ایشو...... ایک لمحہ لگتا ہے وہ عورت کو آسمان سے پاتال میں پہنچانے میں۔'' عنایہ کے لہجے میں کرب تھا۔

''عینی تم بلاوجہ ڈپریس ہو رہی ہو......'' ایشال نے اس کی تشویش دیکھتے ہوئے اسے تسلی دی۔ ''زارون بھائی واقعی بزنس میں مصروف ہوں گے۔ تم یوں ان پر شک کرو گی تو تمہارے اور ان کے رشتے پہ فرق پڑے گا۔''

''میں بلاوجہ شک نہیں کر رہی ہوں ایشو...... میں نے آج تک زارون پہ شک نہیں کیا...... اب مجھے خود فیل ہوا ہے تو میں کہہ رہی ہوں۔'' وہ ہنوز فکرمند تھی۔

''اچھا ایسا کرتے ہیں، کہیں باہر چلتے ہیں لانگ ڈرائیو پہ، کھانا باہر کھائیں گے تمہارا ڈپریشن تھوڑا کم ہو جائے گا۔'' ایشال نے اسے اٹھنے کو کہا۔

''نہیں ایشو...... مجھے کہیں نہیں جانا......''

"کم آن یار اٹھو...... تم چل رہی ہو میرے ساتھ......" ایشال نے فیصلہ سناتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر اٹھایا۔ وہ اسے باہر لے گئی تھی اور بہت حد تک اس کا دل بہل گیا تھا۔ ایشال اسے اس کے فیورٹ ریسٹورنٹ لے گئی تھی۔ ریسٹورنٹ کے اندر ایک خالی ٹیبل کی طرف جاتے ہوئے دائیں جانب عنایہ کی نظر پڑی تھی اور وہ پلکیں جھپکنا بھول گئی تھی۔

"ایشو...... وہ...... وہ دیکھو زارون" عینی کے لبوں سے بہ مشکل آواز نکلی...... ایشال نے اس کے اشارے کو فالو کیا...... تو وہ بھونچکارہ گئی۔ شکر ہے اس کی نظر ان پر نہیں پڑی تھی۔

"زارون بھائی کے ساتھ یہ لڑکی......؟ یہ تو سپر ماڈل دلنشیں ہے۔" ایشال زیر لب بڑبڑائی۔

"ایشو چلو یہاں سے......" عنایہ نے اسے بازو سے پکڑ کر ریسٹورنٹ سے باہر نکالا اور پھر باہر آکر اپنے موبائل سے عنایہ نے زارون کو کال کی...... بیل جاتی رہی...... پھر بالآخر اس نے کال پک کرلی۔

"ہیلو عینی کیسی ہو؟"

"زارون کہاں ہو تم......؟" عنایہ نے بہ مشکل اپنا لہجہ نارمل رکھا۔

"سویٹ ہارٹ میں نے تمہیں بتایا تو تھا آفس کا کچھ کام پینڈنگ تھا، وہ نمٹا رہا ہوں۔ اور کل ایک ڈیلیگیشن کو اٹینڈ کرنا ہے۔ اس کے لیے پریزنٹیشن کر رہا ہوں۔" عنایہ نے اگلے ہی لمحے فون بند کردیا تھا۔ آنسو نکل نکل کر اس کا چہرہ بھگو رہے تھے۔

"تو یہ مصروفیت ہے تمہاری زارون؟" وہ روتے ہوئے خود سے بولی۔

"عینی، عینی پلیز کول ڈاؤن...... تمہاری کنڈیشن ایسی نہیں ہے کہ تم اتنا اسٹریس لو۔"

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی ایشو...... زارون مجھ سے اندھی محبت کرنے والا، میرا شوہر ایک دو ٹکے کی ماڈل کے لیے مجھ سے جھوٹ بولے گا، مجھے چیٹ کرے گا، ہم...... مجھے یقین نہیں آرہا زارون ایسا کیسے کرسکتا ہے۔" عنایہ ایک شاکڈ کی کیفیت میں روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ایشال اسے بازو سے تھام کر گاڑی تک لائی...... اسے گاڑی میں بٹھانے کے بعد اس نے عجلت میں گاڑی آگے بڑھالی۔

"عینی جو تم سمجھ رہی ہو، یا جو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کیا پتا وہ صرف ایک غلط فہمی ہو؟" ایشال کی بات وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"نہیں ایشو، میرا دل کبھی غلط نہیں کہہ سکتا...... زارون کا افیئر چل رہا ہے، اس دلنشیں کے ساتھ...... اسی لیے اسے آج کل میری ہر بات بری لگتی ہے...... میں اچھی طرح سے جانتی ہوں اسے۔" عنایہ کے انداز میں مکمل یقین تھا۔

"اللہ کرے جیسا تم سوچ رہی ہو ویسا ہرگز نہ ہو۔" ایشال بھی بری طرح سے اپ سیٹ ہوگئی تھی۔ گھر آتے ہی وہ عینی کو اس کے روم میں لے آئی تھی۔

"عینی جب تک کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل جاتا، تم بڑے پاپا اور بڑی ماما کو کچھ مت بتانا۔" ایشال نے اسے بستر پر لٹاتے ہوئے تنبیہہ کی تو وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔

"میں اسلم سے اپنے اور تمہارے لیے چائے بنواتی ہوں۔" وہ اٹھ کر انٹر کام کی طرف بڑھی۔

خالد میں بات، بات پہ کہتا تھا جس کو جان
وہ شخص آخرش مجھے بے جان کر گیا

عنایہ بیڈ سے ٹیک لگائے گم صم سے انداز میں بیٹھی تھی ایشال اس کے پاس گھنٹا ڈیڑھ بیٹھ کر اپنے روم میں چلی گئی تھی، اسے لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کا دل نکال لیا تھا...... آدھی رات گزر گئی تھی جب پورچ میں زارون کی گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی تھی، وہ غصے اور بے چینی میں کمرے سے نکل کر نیچے لاؤنج میں آگئی تھی۔

زارون لڑکھڑاتے ہوئے اندر داخل ہوا...... پر اپنے سامنے عنایہ کو دیکھ کر اس کا نشہ ہرن ہوا تھا۔

"سل، سوری میری جان...... مجھے دیر ہوگئی......" وہ اس کے قریب آگیا۔

"ظاہر ہے تم دلنشیں کے ساتھ جو تھے...... ایسے میں گھر آنے کا دل تھوڑی کرتا تمہارا۔"

"کک...... کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب یہ کہ تم مجھے گزشتہ کتنے دنوں سے چیٹ کر رہے ہو، مجھ سے مسلسل جھوٹ بول رہے ہو، وہ جھوٹ آج سچ بن کر میرے سامنے آگیا ہے۔"

"میں نے تم سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ تمہیں کبھی چیٹ نہیں کیا۔" وہ اب بھی ڈھٹائی سے بولا۔

"زارون مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہوں مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ تم...... تم مجھے یوں دھوکا بھی دے سکتے ہو؟" عینی کے انداز میں بے یقینی ہی بے یقینی تھی۔

"میں نے تم کو کوئی دھوکا نہیں دیا۔" وہ اب بھی اپنی بات پر قائم تھا۔

"فار گاڈ سیک زارون...... بند کرو اپنی یہ جھوٹی بکواس...... تمہارا چکر چل رہا ہے ناں اس دو ٹکے کی گھٹیا ماڈل کے ساتھ۔" وہ بلند آواز میں بولی۔

"بکواس ہے یہ...... تت...... تم الزام لگا رہی ہو مجھ پر۔" وہ بوکھلائے انداز میں بولا۔

"بکواس تو یہ ہے جو تم کر رہے ہو...... تمہارا جھوٹ بے نقاب ہو چکا ہے۔ اب یہ جھوٹی تاویلیں مت دو۔"

"کیا اول فول بول رہی ہو......؟ میں اس ٹاپک پہ صبح بات کروں گا...... ابھی تم سے بحث کے موڈ میں نہیں ہوں......" وہ بیزاریت سے سیڑھیوں پر چڑھا۔

"مگر مجھے اس ٹاپک پہ ابھی اور اسی وقت بات کرنی چاہیے......" وہ اس کے پیچھے، پیچھے سیڑھیاں چڑھی...... اس کی بات پہ زارون آدھی سیڑھیوں میں رک گیا۔

''عنایہ مجھے غصہ مت دلاؤ...... میں نے کہا ناں صحیح بات ہو گی۔''

''غصہ؟'' وہ تلخی سے مسکرائی۔ ''تم نے مجھے آسمان سے اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا ہے، مجھ پہ اس دو ٹکے کی لڑکی کو فوقیت دے کر میری انسلٹ کی ہے...... میرا یقین، اعتبار سب خاک میں ملا دیا...... میرا مان، میری محبت کو بے یقین کر دیا اور تم...... تم کہہ رہے ہو میں تمہیں غصہ دلا رہی ہوں؟'' وہ شدید غصے میں اس کا بازو جھنجوڑتے ہوئے چلائی۔

''آہستہ بولو پاگل لڑکی...... سکون برباد کر دیا ہے تم نے میرا...... میرے پاس تمہارے ان فضول سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔ سونے جا رہا ہوں، نیند آ رہی ہے مجھے۔'' وہ ایک بار پھر جھنجلاتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

''میرا سکون، میرا چین برباد کر کے تم کیسے سو سکتے ہو؟ کیسے نیند آ سکتی ہے تمہیں؟ کیوں کیا تم نے میرے ساتھ ایسا؟ کیا کمی تھی میری محبت میں؟ بتاؤ مجھے میرے سوال تمہیں فضول لگ رہے ہیں اور دلنشیں کی بے حیائی تمہیں اتنی پسند آئی کہ اس دو نمبر عورت کی خاطر تم مجھ سے...... اپنی عنایہ سے جھوٹ بولنے پر مجبور ہو گئے؟ ایک لمحے میں میری محبت کو تم نے اپنے دل سے نکال پھینکا...... میں تمہیں کیا سمجھتی تھی زارون، ایک آسمانی مخلوق، اپنے دل کے سب سے اونچے سنگھاسن پہ بٹھا رکھا تھا میں نے تمہیں اور تم کتنے گھٹیا نکلے...... ایک عام اور معمولی مرد، عورت کو دھوکا دینے والے۔'' وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی اسی لیے دیوانوں کی طرح اس کا بازو تھامے اپنی محبت کا جواب اور اس کی بے وفائی کا حساب مانگ رہی تھی۔

''خدا کا واسطہ ہے جان چھوڑو میری...... اسٹوپڈ اور جاہل بیویوں کی طرح بات کا ایشو بنا رہی ہو...... ایسا کچھ نہیں ہے جیسا تم سمجھ رہی ہو۔'' وہ اس کی بحث و تکرار پہ جھنجلا گیا تھا۔ آہستہ آہستہ ان کے شور شرابے سے سب سوئے افراد اٹھنے لگے تھے۔

''ایک بدکردار عورت نے تمہیں چند لمحوں میں میری وفائیں، میری محبت، میرا احسن اور میرے رشتے سے بیگانہ کر دیا...... ایسا کون سا جادو کر دیا ہے اس نے تم پر جو اتنے سالوں میں، میں نہ کر سکی...... ایسی کون سی کمی تھی میرے اندر جس نے تمہیں دوسری عورت کی طرف جانے کا راستہ دکھایا۔ اوپر سے تم مجھ سے جھوٹ پہ جھوٹ بول رہے ہو...... اس بے حیا عورت نے تمہیں چند ملاقاتوں میں مجھ سے جھوٹ تک بولنا سکھا دیا؟ کیوں زارون...... کیوں؟ یہ ظلم کیوں کیا تم نے میرے ساتھ......؟'' وہ روتے ہوئے چلاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''کیوں تماشا کری ایٹ کر رہی ہو؟ کیوں جان نہیں چھوڑ رہی ہو میری؟'' جواباً وہ بھی چلایا۔

''جب تک تم میرے سوالوں کے جواب نہیں دو گے میں تمہیں ہرگز نہیں جانے دوں گی...... یہ تماشا تم نے شروع کیا ہے، اب اسے انجام تک میں پہنچاؤں گی۔'' وہ پاگلوں کی طرح اس کی جانب بڑھی۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے...... عذاب بنا دی ہے تم نے میری زندگی......'' جواباً زارون نے غصے اور جھنجلاہٹ سے اسے زور سے پیچھے دھکیلا اور عنایہ اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی نیچے جا گری تھی۔ اس کی چیخوں نے نور منزل کے مکینوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا...... خود زارون کے جسم سے بھی کسی نے جان نکال دی تھی اس کا سارا نشہ ہوا ہو گیا تھا...... اور وہ نہایت پریشانی میں سیڑھیاں اترتا ہوا نیچے آیا تھا تب تک عنایہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆☆☆

نگہت بیگم نے اپنی دوسری بیٹی کی شادی کے ساتھ، ساتھ زبردستی خضر کی شادی بھی اپنی سہیلی کی بیٹی زرناب سے کر دی تھی۔ زرناب ایک نہایت منہ پھٹ، بدلحاظ اور بدزبان لڑکی تھی۔ اس کے آنے سے نگہت بیگم کے گھر کا سکون تباہ و برباد ہو کر رہ گیا تھا۔ زرناب دن چڑھے سو کر اٹھتی۔ نخریلی اتنی تھی کہ اس نے کبھی کسی کام کو ہاتھ نہ لگایا۔ نگہت بیگم کسی معاملے میں بہو کو کچھ سمجھانے کی کوشش کرتیں تو وہ منٹوں میں انہیں بے عزت کر کے رکھ دیتی...... کنواری نندوں کو اس نے آگے لگا رکھا تھا کسی کو خاطر میں نہ لاتی، الٹا خضر کے آفس سے آتے ہی جھوٹی شکایتوں کے انبار لگا دیتی...... صحیح معنوں میں گھر کا سکون تباہ اور خضر کی زندگی برباد ہو گئی تھی۔

اب بھی وہ آفس سے تھکا ہوا آیا تھا اور زری کمرے میں اپنے ہاتھ پر مہندی لگانے میں مصروف تھی۔ ''میرے لیے کھانا لگاؤ...... میں فریش ہو کر آتا ہوں۔'' وہ اپنی شرٹ کے بازو فولڈ کرتے ہوئے واش روم کی طرف بڑھا۔

''بیا سے کہو وہ کھانا لگا دیتی ہے، میں ہاتھ میں مہندی لگا رہی ہوں۔'' کرارا سا جواب دیا گیا۔ خضر نے غصے میں پلٹ کر اسے گھورا...... مگر وہ ڈھٹائی سے ہاتھ پر مہندی لگانے میں مصروف رہی۔

''میرے سارے کام کرنے کی ذمے داری اب بیا کی نہیں ہے بلکہ تمہاری ہے اور ویسے بھی تمہیں پتا ہے کہ میں اس وقت آفس سے آتا ہوں تو کیا ضرورت تھی تمہیں ہاتھ میں یہ مہندی لگانے کی؟ ایسے کام میری غیر موجودگی میں کیا کرو......'' وہ غصے میں بولا۔

''تمہیں تو بہانہ چاہیے ہوتا ہے مجھ سے لڑنے کا...... تمہیں کھانا دینے سے بیا گھس نہیں جائے گی۔ سارا دن فارغ ہوتی ہے بھائی کے چھوٹے چھوٹے کام کر دینے سے تکلیف ہوتی ہے اسے۔'' زری نے تڑخ کر جواب دیا۔

''اور تم کیا کرتی ہو سارا دن......؟ میرے آفس جاتے ہی فون پیکج پہ اپنے رشتے داروں سے گپوں میں گزار دیتی ہو...... اب میرے سارے کام کرنا تم پر فرض ہے بیا پہ نہیں......'' خضر نے خفگی سے جواب دیا۔

''اچھا تو تمہاری ماں اور بہنیں میری شکایتیں لگاتی ہیں تم سے؟'' وہ مہندی چھوڑ کر لڑائی کے موڈ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ برابر والے کمرے میں لیٹی نگہت بیگم نے اس شور شرابے پہ سر تھام لیا تھا۔ اور اپنے پیپر کی تیاری کرتی بیا بھی جھنجلاہٹ میں اپنی کتابیں سمیٹنے لگی۔

''میری ماں اور بہنوں نے کبھی میرے کان نہیں بھرے...... اور میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں، جانتا ہوں تمہاری خصلت......''

''اچھا تو کیا ہے میری خصلت......؟'' وہ کمر پر ہاتھ رکھے لڑاکا عورتوں کی طرح پوچھنے لگی۔

''یہ سوال اگر تم خود اپنے آپ سے کرو تو بہت بہتر جواب ملے گا تمہیں......'' خضر واش روم کی طرف بڑھ گیا تھا اور کمرے میں کھڑی زری کو پتنگے لگ گئے تھے۔

''ہاں، ہاں میں تو ہوں ہی بری...... میری تو قسمت ہی خراب ہے جو اس گھر کی بہو بنی...... میری زندگی کا سب سے برا اور منحوس دن تھا وہ جب میری بات پکی ہوئی تم سے۔ اچھے بھلے رشتے آئے ہوئے تھے میرے۔''

''میرا بھی تمہارے بارے میں کچھ یہی خیال ہے۔'' ایک لمحے کے لیے خضر نے بھی دروازہ کھول کر حساب برابر کیا تو زری کے تو سر سے لگی اور پاؤں پہ بجھی۔

''تو کس نے کہا تھا تمہیں مجھ سے شادی کرنے کو؟ تمہاری ماں نے میرا رشتہ لینے کے لیے جوتیاں گھسا دی تھیں اس وقت......''

''دماغ خراب ہو گیا تھا امی کا...... عقل ماؤف ہو گئی تھی ان کی...... ورنہ تم جیسی عورت کبھی مسلط نہ کرتیں وہ مجھ پر......'' وہ ہاتھ دھو کر دوبارہ کمرے میں آیا۔ آج وہ بھی زری کا کسی صورت لحاظ کرنے کو تیار نہیں تھا کیونکہ وہ زری کی روز، روز کی بک، بک سے تنگ آ چکا تھا جب سے اس کی شادی ہوئی تھی ایک لمحہ بھی اس نے سکون کا زری کے ساتھ نہیں گزارا تھا۔

''تو کر لیتے ناں اپنی اس بچپن کی منگیتر...... اپنی معشوق زویا عرف دلنشیں سے شادی...... تم آج بھی اس بدکردار کی محبت میں مبتلا ہو جو جانے روز کتنے مردوں کے پاس جاتی ہو گی اور......'' زری کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا تھا اگلے ہی لمحے خضر نے ایک زوردار تھپڑ رسید کیا تھا۔

''بکواس بند کرو اپنی...... اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' وہ غصے میں بپھرا۔

''اوہو بڑی تکلیف ہوئی ہے تمہیں، اتنا ہی اندھا عشق ہے اس سے تو کر لو نکاح اس سے اور جان چھوڑ دو میری......

تم جیسے بے بزدلے ہوئے شخص کے ساتھ میں اب ایک لمحہ بھی نہیں رہوں گی......" وہ غصے میں چہرے پر ہاتھ رکھے الماری کی جانب بڑھی......اور عجلت میں اپنے کپڑے الماری سے نکالنے لگی اور وہ غصے میں بائیک لیے گھر سے نکل گیا تھا۔

زری نے ٹھیک کہا تھا وہ زویا سے اندھا عشق کرتا تھا......مگر بزدلوں والا عشق، وہ عشق جس میں دم نہیں ہوتا......وہ عشق جس میں کوئی بھی انتہائی قدم نہیں اٹھایا جاتا۔ وہ ایک بزدل انسان تھا۔ شاید اسی لیے اپنا سب کچھ ہار گیا تھا۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے اور وہ بائیک لیے نہ جانے کس سمت اور کس کے پاس جا رہا تھا۔ یہ اسے بھی خبر نہیں تھی......اس کا دماغ سن ہو رہا تھا کہ دفعتاً ایک جگہ ٹرن لیتے ہوئے وہ کسی قیمتی گاڑی سے ٹکرا گیا تھا......بائیک پہ اس کا توازن قائم نہ رہا تھا اور وہ پھسل کر بائیک سمیت کئی گز پیچھے جا گرا تھا۔

"ڈرائیور، گاڑی روکو......اور دیکھو اس شخص کو زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں تا کہ اسے فوری کسی اسپتال لے جایا جائے۔" گاڑی میں بیٹھی ہستی نے اپنے ڈرائیور کو حکم دیا تھا۔ حکم کے مطابق گاڑی روک دی گئی تھی۔ ڈرائیور گاڑی سے نکل کر اس شخص کی طرف بڑھا جو ٹکر سے ابھی نیچے گرا تھا۔

دلنشیں کی نظروں میں کچھ عرصے پہلے کا ایک منظر گھوم گیا تھا......جب وہ زویا ہوا کرتی تھی اور شاکر حسین کے ساتھ گلوکو ڈھونڈنے ڈیفنس آئی تھی اور شاکر حسین کی بائیک اس مل اونر زارون چوہدری سے ٹکرائی تھی۔ ایک، ایک منظر اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا۔ اور وہ اس وقت شوٹ سے واپس گھر جا رہی تھی......نہ جانے وہ کون تھا جو غلط ٹرن لے کر اچانک اس کی گاڑی سے ٹکرا گیا تھا۔ وہ بے چین ہو کر گاڑی سے نکل آئی تھی......اور بے ساختہ ڈرائیور کے پیچھے اس زخمی شخص کی جانب بڑھی تھی۔

آج سے کچھ عرصہ پہلے وہ کسی سڑک پر اپنے زخمی باپ کے ساتھ بے یار و مددگار کھڑی لوگوں سے مدد کی درخواست کر رہی تھی......اور اس کا باپ سڑک پر زندگی کی آخری سانس لیتے ہوئے موت سے ہار گیا تھا۔ وقت اسے پیچھے لے گیا تھا۔ وہ حال میں کھڑی تھی مگر ماضی میں سانس لے رہی تھی۔

"ڈرائیور جلدی سے اس شخص کو گاڑی میں ڈالو تا کہ اس کو بروقت اسپتال......" وہ بولتی ہوئی اس شخص کے قریب آئی تھی اور اس کے الفاظ اس کی شکل دیکھ کر گم ہو گئے تھے۔

اور خضر نام کا عنوان اس کے سامنے آ گیا تھا۔ وہ شخص جو کبھی اس کی ماضی کی کتاب کے صفحے پھڑپھڑائے تھے......اور خضر نام کا عنوان اس کے سامنے آ گیا تھا۔ وہ شخص جو کبھی اس کی زندگی ہوا کرتا تھا، وہ شخص جو کبھی ہر پریشانی میں اس کے لیے ایک تسلی بن جایا کرتا تھا، وہ شخص جو اس کے دل میں ایک دھڑکن بن کر دھڑکا کرتا تھا......وہ شخص جو اسے دنیا کا سب سے خاص مرد لگا کرتا تھا......وہ شخص جس کا نام وہ دن میں کئی بار اپنی ہتھیلی پہ لکھا کرتی تھی وہ شخص جس کے ساتھ کے وہ دن میں سپنے دیکھا کرتی تھی......وہ شخص جو اس کے لیے سب کچھ ہوا کرتا تھا، وہ شخص جو اب اس کے لیے کچھ نہیں تھا......وہ بزدل شخص جس نے اسے زمانے کی بھیڑ میں تنہا چھوڑ دیا تھا......زندگی کی ٹھوکروں کے حوالے کر دیا تھا۔ اس کا دل خضر کو دیکھ کر صرف ایک بار دھڑکا تھا اور پھر وہ پتھر کا ہو گیا تھا۔ خضر کی حالت بھی دلکش سے کم نہیں تھی......آج وہ سارے زمانے کی تھی لیکن اس کی نہیں تھی۔

"ڈرائیور اگر اس آدمی کو زیادہ چوٹیں نہیں آئیں تو جلدی چلو......دیر ہو رہی ہے مجھے۔" وہ اجنبی سے لہجے میں آخری بار خضر پہ نگاہ ڈال کر دوبارہ گاڑی کی طرف مڑی۔ خضر اسے جاتا ہوا دیکھ کر دیوانوں کی طرح اس کی طرف لپکا۔

"زویا، زویا، میری بات سنو......"

"اوئے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، میڈم کا نام زویا نہیں دلنشیں ہے۔" ڈرائیور نے اسے روکا......تب تک وہ گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔

"ڈرائیور جلدی نکالو گاڑی یہاں سے......" اس نے کرخت لہجے میں ڈرائیور کو حکم دیا۔

"زویا......صرف ایک بار......ایک بار میری بات سن لو زویا......" وہ گاڑی کی طرف لپکا تب تک ڈرائیور بھی

ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھ چکا تھا۔

خضر اب زویا کی طرف کی کھڑکی کا بند شیشہ بجا رہا تھا۔

”پتا نہیں میڈم کون پاگل شخص ہے یہ...... آپ کو زویا کہہ رہا ہے......“ ڈرائیور نے زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی۔

”زویا کو زویا...... تم...... تم ایسے نہیں جاسکتیں، زویا ایک بار صرف ایک بار میری بات سنو......“ وہ پاگلوں کی طرح اب چلتی گاڑی کے ساتھ، ساتھ بھاگ رہا تھا۔ دو آنسو چپکے سے اس کی آنکھوں سے ٹوٹ کر اس کے بے جان ہوتے ہاتھوں پر گر گئے تھے...... گاڑی نے بالآخر خضر کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا...... اس رات نیند کی گولی لینے کے باوجود وہ سو نہیں پائی تھی۔ اسے اپنا وہ چھوٹا سا گھر یاد آیا، اس گھر میں موجود بے پناہ مسائل یاد آئے۔ آہستہ، آہستہ ماضی کا ایک، ایک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ خضر کے ساتھ گزرا ہوا تمام وقت اور مناظر کٹ ٹوٹ اس کے ذہن اور آنکھوں کے پردوں پر نمودار ہونے لگے۔ اس کے پاس کچھ نہیں تھا مگر عزت تھی آج اس کے پاس سب کچھ تھا مگر...... عزت نہیں تھی۔

☆☆☆

اقصم اور مناب ملائشیا سے واپس آئے تو نور منزل میں ایک نئی پریشانی سے ان کا سامنا ہوا عنایہ کا مس کیرج ہوگیا تھا۔ آج دوسرا دن تھا اور وہ ابھی اسپتال میں ایڈمٹ تھی۔ اقصم اور مناب گھر میں اپنا سامان رکھتے ہی اسپتال پہنچ گئے تھے...... وہاں سب سے پہلے ان کا سامنا داؤد چوہدری اور سمیرا بیگم سے ہوا تھا۔

”پاپا کیسے ہوا یہ سب......؟“ اقصم نے پریشانی میں داؤد چوہدری سے دریافت کیا۔

”زارون کی وجہ سے ہوا ہے یہ سب...... وہ آج کل ایک ماڈل گرل میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اسی بات پر زارون اور عنایہ کا جھگڑا ہوا اور یہ سب ہوگیا۔“ داؤد چوہدری از حد پریشان تھے۔

”اوہ...... بہت برا ہوا یہ سب...... اب کہاں ہیں بھائی نظر نہیں آرہے......؟“ اقصم نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔

”میں نے بے عزت کر کے یہاں سے نکالا ہے اسے...... مگر مچھ کے آنسو بہا رہا تھا یہاں کھڑے ہو کر۔“ داؤد چوہدری نے غصے سے بتایا۔

”ممانی اتنا کچھ ہوگیا اور آپ نے ہمیں بتایا تک نہیں؟“

”تم دونوں کو وہاں بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے ہم......“ سمیرا بیگم آبدیدہ ہوئیں۔

”عنایہ...... وہ تو ٹھیک ہے ناں ممانی؟ اس کے دل پر نہ جانے کیا بیت رہی ہوگی؟“ مناب نے بے چین ہو کر سمیرا بیگم کے ہاتھ تھامے تو وہ فرطِ جذبات پر قابو نہ رکھ سکیں۔

”میرا گھر تو خوشیوں کا گہوارہ ہوا کرتا تھا...... ان آزمائشوں اور دکھوں نے نہ جانے کہاں سے میرے گھر کا راستہ دیکھ لیا...... کتنے خوش تھے ہم سب...... ایک مدت بعد گھر میں ننھے مہمان کی آمد کی خبر نے میرے گھر کو مہکا دیا تھا...... کیا معلوم تھا کہ یہ صرف وقتی خوشی ہے۔“

”ممانی پلیز حوصلہ رکھیں اگر ہم سب یوں مایوسی کی باتیں کریں گے تو عینی کو حوصلہ کون دے گا...... اس کی گود خالی ہوگئی ہے۔ اس نے اپنا بچہ کھو دیا ہے۔“ مناب کی آنکھیں چھلملا گئیں۔

”عنایہ تو بالکل خاموش ہوگئی ہے...... بولتی ہے نہ کچھ کھاتی ہے نہ پیتی ہے۔ بس روئے جارہی ہے، ایشال، ساجدہ آپا اور اماں اسے سمجھا، سمجھا کر تھک گئی ہیں مگر اسے صبر نہیں آرہا۔“ سمیرا بیگم نے مناب کو افسردہ لہجے میں بتایا۔

”مام ہم ابھی عینی بھابی سے مل کر آتے ہیں۔“ اقصم، عنایہ کے کمرے کی طرف بڑھا۔ مناب بھی اس کے پیچھے، پیچھے آئی۔

ایشال کمرے میں عنایہ کے پاس سوپ کا باؤل پکڑے بیٹھی تھی مگر عنایہ پی نہیں رہی تھی۔

''عینی مجھے یقین نہیں آرہا...... کیسے ہوگیا ہے یہ سب......؟'' مناب نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگایا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

''مناب...... میری گود اجڑ گئی...... خالی ہوگئی...... میرا بچہ...... کھو دیا میں نے اسے...... زارون نے سب ختم کردیا۔'' اس کے یوں تڑپنے اور رونے پر ایشال اور مناب کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔ مناب کے پاس اسے تسلی دینے کے لیے کوئی لفظ نہیں تھا۔

''مجھے تو یقین نہیں آرہا زارون بھائی کیسے کرسکتے ہیں یہ سب؟''

''زارون بھائی کی زندگی میں عینی بھابی کے علاوہ کبھی کوئی لڑکی نہیں آئی شادی سے پہلے کبھی ان کا کوئی افیئر سامنے نہیں آیا...... اور اب شادی کے بعد یہ سب...... میرا ذہن ان چیزوں کو قبول نہیں کر پارہا۔'' اقصم نے دکھ اور حیرت کا اظہار کیا۔

''ہم سب کے لیے اس حقیقت کو قبول کرنا انتہائی مشکل ہے اقصم! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ عینی کو زارون بھائی اتنا گہرا صدمہ دیں گے۔ کبھی کبھی وہ سب کیوں ہوجاتا ہے اقصم جس کا ہم نے کبھی تصور تک نہیں کیا ہوتا...... کیوں زندگی میں ایسے واقعات رونما ہوجاتے ہیں جو ہمارے بیچ محبتوں کو اس قدر کمزور کردیتے ہیں کہ پھر لاکھ کوشش کے باوجود وہ محبتیں، یقین و اعتبار کی منازل طے نہیں کرپاتیں۔'' ایشال نے دکھ اور افسردگی سے کہا۔

''شاید اسی کا نام زندگی ہے۔ یہاں سب کچھ ہماری مرضی کے مطابق نہیں ہوسکتا ایشال...... کہیں نہ کہیں، کچھ نہ کچھ ادھورا ضرور رہ جاتا ہے اور وہ ادھورا پن ہمیں خدا کی یاد دلاتا رہتا ہے، ہم اس سے غافل نہیں ہوتے، یہ زندگی دھوپ چھاؤں جیسی ہی ہے ایشال...... یہاں ہر کہانی کا ہیپی اینڈ نہیں ہوتا۔'' اقصم دھیرے سے بولتے ہوئے گویا ایشال کو تسلی دے رہا تھا۔

مناب نے نکاح کے بعد پہلی بار اسے غور سے دیکھا غور سے سنا...... وہ اتنا سمجھدار نہ جانے کب سے ہوگیا تھا۔ مناب نے اسے دیکھتے ہوئے دل میں سوچا۔ عین اسی لمحے اقصم کی نظریں بھی مناب کی جانب اٹھی تھیں اور اگلے ہی لمحے مناب نے سر جھکالیا تھا۔

☆☆☆

خضر بستر پر چت لیٹا کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا...... نگہت بیگم اس کے پاس آبیٹھیں اور فکرمندی سے پوچھنے لگیں۔

''تم نے ناشتا کیوں نہیں کیا؟ رات بھی تم اتنی دیر سے گھر آئے۔ نہ کچھ کھایا، نہ پیا......'' نگہت بیگم نے فکرمندی سے پوچھا۔ ''اور دکھاؤ یہ تمہاری کہنی پر کیا ہوا؟'' اچانک ان کی نظر اس کی زخمی کہنی پر پڑی۔

''کچھ نہیں ہوا اور بھوک نہیں تھی امی۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''کیوں بھوک نہیں تھی؟''

''بس ایسے ہی...... ہر کیوں کا جواب نہیں ہوتا؟''

''کیا ضرورت تھی تمہیں زری سے لڑنے جھگڑنے کی......؟'' انہوں نے پیار سے سمجھایا۔

''لڑائی میں نے شروع نہیں کی تھی۔''

''چلو جس نے بھی کی تھی...... چھوڑو اس قصے کو...... آج شام جاکر اسے منالینا اور گھر لے آنا۔''

''نہیں امی...... اس بار میں اسے منانے نہیں جاؤں گا اور نہ اسے لینے جاؤں گا۔ اس نے آنا ہوگا تو خود ہی آجائے گی۔ ورنہ رہنے دیں اسے اس کی ماں کے گھر...... ہمارے گھر کا سکون برباد کردیا اس نے۔ میری زندگی سے سکون نام کی

چیز رخصت ہوگئی ہے جب سے یہ بیوی بن کر مسلط ہوئی ہے مجھ پر۔'' خضر کے لہجے میں اکتاہٹ، بیزاری، نفرت سب کچھ تھا۔

''بس میرے بچے، یہ قسمت کے کھیل ہوتے ہیں' اپنی طرف سے تو میں نے اچھا سوچ کر ہی یہاں تمہاری شادی کی تھی، مجھے کیا معلوم تھا بلی بن کر ملنے والی لڑکی اس گھر میں آتے ہی شیر بن جائے گی۔'' نگہت بیگم نے شرمندگی سے کہا۔
''ویسے امی آپ نے میرے اور زویا کے ساتھ بڑی زیادتی کی...... زویا بھتیجی تھی آپ کی...... اگر ہم اس وقت ان کی مدد کردیتے انہیں اکیلا نہ چھوڑتے اور آپ مجھے اپنی قسم دے کر بچپن کا طے شدہ رشتہ نہ توڑتیں تو ہماری زندگی اس طرح بے سکون نہ ہوتی۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے قدرت زویا کے ساتھ کی ہوئی زیادتی کا ہم سے بدلہ لے رہی ہے۔'' اس کی بات پر نگہت بیگم نے سر جھکا لیا۔

''ہاں ٹھیک کہتے ہو تم...... زویا کتنی محبت کرتی تھی مجھ سے...... میری بیٹیوں سے اور تم سے...... اس گھر میں ملنے آتی تو ڈھیروں کام کر جاتی...... ٹی وی پہ اب غیر مردوں کے ساتھ اسے عجیب وغریب لباس پہنے دیکھتی ہوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے، میرے مرحوم بھائی کی روح اسے اس حلیے میں دیکھ کر تڑپ جاتی ہوگی۔'' نگہت بیگم آبدیدہ ہوگئیں۔
''میں زویا کا مجرم ہوں امی...... زویا کو طوفان کے بیچ تنہا چھوڑ دیا میں نے...... اسے بہت مان تھا مجھ پہ اور میں نے ایک لمحے میں اسے پرایا کر دیا، یہ دکھ یہ پچھتاوا مجھے سونے نہیں دیتا امی...... میرا سکون اڑا دیا ہے۔ ساری، ساری رات میری آنکھوں میں کٹ جاتی ہے...... اور پھر زری جیسی بیوی کو سنبھالنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ اس کے ساتھ رہنا، اس کے ساتھ گزارہ کرنا، کڑھ، کڑھ کر مرنے کے مترادف ہے۔''
''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو خضر...... مگر پھر بھی اپنے رویّے میں لچک رکھو...... زری جیسی بھی ہے بیوی ہے تمہاری...... گھر تو بسانا ہی ہے، اس لیے مت الجھا کرو اس سے۔''
''بیوی زری جیسی نہیں ہوتی امی...... اور میرا گھر بسا ہی کب ہے؟ وہ تو پہلے دن سے ہی اجڑ گیا تھا۔'' خضر نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے جواب دیا اور نگہت بیگم بیٹے کو ملول وافسردہ سی دیکھے گئیں۔ بلاشبہ زویا ہیرا تھی جسے انہوں نے گنوا دیا تھا...... اب مکافاتِ عمل کے مطابق قدرت نے انہیں ان کی غلطی کا احساس تو دلانا ہی تھا۔

☆☆☆

آگ کے شعلے آسمان کو چھو رہے تھے، ہر طرف آگ لگی ہوئی تھی، وہ خود کو بچانے کے لیے اِدھر اُدھر سرپٹ بھاگ رہی تھی...... لیکن اسے وہاں سے نکلنے کا راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے کہیں جائے پناہ نہیں مل رہی تھی...... دفعتاً ان آگ کے شعلوں اور خاکستر ہوتی چیزوں سے ایک سفید دودھیا روشنی نمودار ہوئی اور وہ اس روشنی کی طرف بھاگی تھی۔ وہ روشنی ایک راستہ تھی جس پر بھاگتے، بھاگتے وہ خوفناک آگ سے جل کر راکھ ہوتے شہر سے نکل آئی تھی۔ وہ سفید روشنی اب ختم ہوگئی تھی، اس روشنی کے آخری سرے پر ایک شخص کھڑا تھا۔ وہ بھاگتے، بھاگتے ہانپ گئی تھی۔ اب اس کے قدم آہستہ ہوگئے تھے اور وہ اب اس شخص کو غور سے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی...... چند قدم اور آگے بڑھی تھی...... اچانک اس نے وہاں کھڑے شخص کو پہچان لیا تھا...... اور وہ خوشی سے بلند آواز میں چلائی تھی۔
''ابا، ابا......'' وہ دیوانہ وار شاکر حسین کی جانب بھاگی تھی مگر قریب جانے پر وہ غائب ہوچکے تھے...... وہ بدحواسی سے انہیں ڈھونڈنے لگی۔ وہ دودھیا سی روشنی بھی ان کے ساتھ ہی غائب ہوگئی تھی۔
''ابا، ابا...... کہاں ہیں آپ......؟ مجھے اکیلا مت چھوڑیں ابا۔'' وہ بدحواسی میں انہیں آوازیں دے رہی تھی کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ دلنشیں خواب میں پھر ڈر گئی تھی، یہ وہ خواب تھا جو اس نے تیسری بار دیکھا تھا۔ اس نے عجلت میں سائڈ ٹیبل پر رکھے جگ سے پانی گلاس میں انڈیل کر پیا...... اس کی سانس پھول رہی تھی۔ جیسے سچ مچ وہ بھاگتے، بھاگتے ہانپ گئی ہو۔ اس کا وجود سخت سردی میں بھی پسینے سے شرابور تھا۔

وہ اس وقت شہرت کی بلندیوں کو چھورہی تھی...... ہر طرف اس کے حسن، اس کے گلیمر کے چرچے تھے۔ایک سروے کے مطابق وہ پاکستان کی واحد ٹاپ ماڈل تھی جسے گوگل پر سب سے زیادہ سرچ کیا گیا تھا۔اپنے ملک کے ساتھ ساتھ اسے پڑوسی ملک سے بھی فلموں کی آفرز ہورہی تھیں...... وہ اس وقت بہت بڑی کمپنیوں کی برانڈ ایمبیسڈر تھی اور کروڑوں کے پروجیکٹس کرنے والی تھی...... ایسے میں آج کل اسے اس طرح کے خواب آرہے تھے۔جن کی وجہ سے وہ ڈپریشن کا شکار ہورہی تھی۔کئی اچھے سائیکاٹرسٹ کے پاس جانے کے باوجود اس کے ذہن کی الجھن کم نہیں ہورہی تھی، اسے یہ خواب مسلسل کیوں آرہے تھے جن کی نوعیت ایک جیسی تھی...... وہ اپنے ہر خواب میں شاکر حسین کو دیکھ رہی تھی...... وہ اسے کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا دیکھ کر بچا ضرور لیتے تھے مگر جونہی وہ ان کے پاس جانے لگتی، وہ غائب ہوجاتے...... جیسے وہ اس سے خفا ہوں، ناراض ہوں اور اس کے پاس نہ جانا چاہتے ہوں۔

☆☆☆

نور منزل پر غم کے بادل چھائے ہوئے تھے۔گھر کے افراد کے ساتھ ملازمین تک اس افسوس ناک حادثے پہ افسردہ تھے۔داؤد چوہدری کو زارون پہ انتہائی غصہ تھا یہی وجہ تھی کہ زارون ایک ہفتے سے گھر نہیں آیا تھا، وہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں رہ رہا تھا۔اسے بھی اپنے ہونے والے بچے کو کھودینے کا بہت دکھ ہوا تھا مگر وہ شرمندگی سے گھر نہیں آیا تھا۔وہ آج کل آفس بھی نہیں جارہا تھا۔داؤد چوہدری بھی اس کی وجہ سے ڈپریس تھے اسی لیے کافی دنوں کے بعد آفس آئے تھے اور آفس آتے ہی ان کے وکیل نے فون پر جو انہیں اطلاع دی تھی وہ سن کر داؤد چوہدری بھونچکا کر رہ گئے تھے۔انہوں نے فوری زارون کو کال ملائی۔وہ فون نہیں اٹھا رہا تھا۔جب انہوں نے تیسری بار اسے کال کی تو فون اٹھالیا گیا مگر وہ بولا کچھ نہیں تھا۔

”زارون تم جہاں کہیں بھی ہو فوراً گھر آؤ، مجھے تم سے کچھ ایشوز پر بات کرنی ہے۔اور اگر تم آدھے گھنٹے کے اندر، اندر گھر نہ پہنچے تو نتائج کے ذمے دار تم خود ہوگے۔“ داؤد چوہدری نے اپنی بات ختم کرکے فون بند کردیا تھا...... وہ اپنا موبائل اور گاڑی کی چابی اٹھائے اپنی چیئر سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔جب داؤد چوہدری نور منزل پہنچے تو پورچ میں زارون کی گاڑی کھڑی دیکھی اور جب وہ گھر کے اندر داخل ہوئے تو زارون لونگ روم میں سمیرا اور بڑی اماں کے پاس سر جھکائے بیٹھا تھا۔

”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم جیسا ذہین، فطین اور ایک کامیاب ترین بزنس مین ایک دو ٹکے کی بد کردار لڑکی کے آگے یوں گھٹنے ٹیک کر اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مار بیٹھے گا۔“ وہ شدید غصے میں تھے۔

”اپنا بڑا بیٹا ہونے پر ہمیشہ میں نے فخر محسوس کیا، تمہاری ہر کامیابی پر میرا سینہ فخر سے چوڑا ہوجایا کرتا تھا لیکن آج تم نے اپنی اس گھٹیا حرکت سے میرا سر جھکادیا ہے۔اپنی وفادار اور محبت کرنے والی بیوی کا ہمیشہ کے لیے اعتماد توڑ دیا...... اپنے بچے کو کھودیا ہے تم نے...... اپنے والدین کا دل دکھایا ہے تم نے...... اور میں نے تمہاری شادی پر جو کروڑوں کا لگژری اپارٹمنٹ گفٹ کیا تھا وہ تک تم نے اس دو نمبر لڑکی کے نام کردیا......؟ اور وہی لڑکی آج کل نواز لغاری کی منظور نظر ہے اور تمہارے، ساتھ، ساتھ اسے بھی دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی ہے۔“ داؤد چوہدری غصے میں بلند آواز سے زارون کو ڈانٹ رہے تھے سمیرا بیگم اور بڑی اماں نے از حد حیرت سے زارون کو دیکھا تھا۔

”زارون یہ...... یہ کیا کہہ رہے ہیں تمہارے پاپا؟ تم نے وہ اپارٹمنٹ اس ماڈل گرل کو دے دیا؟“ سمیرا بیگم کے انداز میں بے یقینی تھی...... زارون سر جھکا گیا۔

”سمیرا ابھی تو صرف اپارٹمنٹ اس کے نام کرنے کی خبر سامنے آئی ہے، پوچھو اپنے بیٹے سے یہ خفیہ طور پر اور کیا، کیا نچھاور کرچکا ہے اس (گالی) لڑکی پر۔“ داؤد چوہدری ہنوز غصے میں تھے۔

”پاپا آپ دلنشیں کے بارے میں مسلسل غلط الفاظ استعمال کررہے ہیں، وہ ویسی ہرگز نہیں ہے جیسا آپ اسے سمجھ رہے ہیں، بہت محبت کرتی ہے وہ مجھ سے۔“ زارون نے دلنشیں کی وکالت کی۔

"دیکھا سمیرا بیگم تم نے اپنے اس احمق بیٹے کو...... یہ سمجھتا ہے کہ وہ دو نمبر واہیات لڑکی اس سے محبت کرتی ہے...... اسٹوپڈ آدمی ایسی بد کردار لڑکیاں تم جیسوں سے نہیں...... تم جیسوں کی دولت سے پیار کرتی ہیں، دیکھنا جونہی اسے تم سے بہتر آپشن نظر آیا وہ تمہارا کیا حشر کرے گی۔" داؤد چوہدری کا غصہ کسی صورت کم نہیں ہو رہا تھا۔

"پاپا پلیز آپ دلنشیں کے بارے میں مسلسل غلط الفاظ استعمال مت کریں۔" زارون کو برا لگ رہا تھا ان کا اس کے بارے میں یوں کہنا۔

"تو اور کن القابات سے نوازوں اس بے شرم اور کرپٹ لڑکی کو؟"

"پاپا پلیز...... آپ اب مزید دلنشیں کی انسلٹ نہیں کریں گے۔"

"کیوں، کیا لگتی ہے وہ تمہاری......؟ ایسا کون سا رشتہ بنا لیا ہے اس نے چار دن میں تمہارے ساتھ کہ تمہیں میری باتیں بری لگ رہی ہیں؟" داؤد چوہدری بری طرح سے برہم ہو رہے تھے۔

"وہ میری ہونے والی بیوی ہے...... نکاح کرنے والا ہوں میں اس سے۔" زارون کے الفاظ کسی دھماکے سے کم نہیں تھے۔ بڑی اماں نے تو اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا تھا...... اور وہ صوفے پر ڈھے گئی تھیں۔ خود سمیرا بیگم کی حالت بھی ان سے کم نہیں تھی۔

"یہ...... یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم......؟" داؤد چوہدری کو تو جیسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔

"بکواس نہیں ہے یہ...... اطلاع دے رہا ہوں آپ سب کو...... میں دلنشیں سے نکاح کرنے والا ہوں۔" زارون نے گویا فیصلہ سنایا...... اس کے فیصلے نے نور منزل کی بنیادوں کو ہی ہلا کر رکھ دیا تھا۔

"میں اپنی زندگی میں تمہیں اپنی بھتیجی کے ساتھ یہ ظلم ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔ دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے اور آئندہ اس گھر میں قدم مت رکھنا اگر تم نے اس لڑکی کے ساتھ نکاح کیا تو یاد رکھنا، میں تمہیں اپنی تمام جائداد سے عاق کر دوں گا۔ ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی تمہیں۔ پھر میں دیکھوں گا کیسے کنگلے کے ساتھ رہے گی وہ۔" جواباً داؤد چوہدری نے بھی اسے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا اور وہ تن فن کرتا گاڑی کی چابی ٹیبل سے اٹھا کر لونگ روم سے باہر نکل گیا تھا۔ نور بیگم اور سمیرا بیگم دونوں غم سے نڈھال ہو رہی تھیں...... مشکلات نے نور منزل کا راستہ دیکھ لیا تھا۔

☆☆☆

مناب، اقصم کے کپڑے سوٹ کیس میں رکھ رہی تھی، وہ پانچ دن کے لیے کراچی جا رہا تھا وہاں اسے کچھ ڈراما سیریلز کے ٹائٹل سونگز ریکارڈ کروانے تھے۔ کراچی سے اسے ممبئی روانہ ہونا تھا...... وہاں بھی اسے کچھ موویز کے سونگ ریکارڈ کروانے تھے اور کچھ ٹی وی چینلز پہ بطور گیسٹ شرکت کرنا تھی...... اور پھر دو دن کی بریک کے بعد اسے آگے ورلڈ ٹور پر روانہ ہو جانا تھا۔

"مناب آپ مت زحمت کریں بلاوجہ خود کو تھکا رہی ہیں...... میں پروین سے کہتا ہوں وہ رکھ دیتی ہے میرے کپڑے۔" اقصم ہاتھ میں کافی کا مگ لیے کمرے میں آیا تو اسے وارڈ روب سے اپنے کپڑے نکال کر ہینڈ کیری میں رکھتے ہوئے پایا۔ ایک لمحے کے لیے مناب کے ہاتھ رکے۔

"اب تو میں رکھ چکی ہوں......" اس نے ہینڈ کیری بند کرتے ہوئے اطلاع دی۔

اس وقت وہ گہرے نیلے اور وائٹ رنگ کی پرنٹڈ شارٹ شرٹ کے ساتھ کیپل پاجامے میں بالوں کی اونچی سی پونی بنائے بہت کیوٹ اور کم عمر سی لگ رہی تھی۔ وہ بے اختیار اسے دیکھے گیا۔

"گھر میں اتنی ٹینشن چل رہی ہے اور تم اتنے لمبے عرصے کے لیے جا رہے ہو؟ ماموں اور ممانی کو تمہاری ضرورت ہے اس وقت۔"

وہ کافی لیے صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔ بیگ ایک سائڈ پر رکھنے کے بعد وہ اقصم کی جانب پلٹی۔

''کیا آپ کو ضرورت نہیں ہے میری؟'' آنچ دیتے لہجے میں پوچھا گیا۔

''میں نے جو پوچھا ہے صرف اس کا جواب چاہیے مجھے۔'' مناب نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بیڈ پر پڑا کمبل تہ کیا۔

''اس کا مطلب ہے آپ کو میری ضرورت نہیں ہے۔'' اقصم کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''تم بہت فضول سوال کرتے ہو۔'' وہ جھنجلائی۔

''بقول آپ کے...... میں خود بھی تو فضول ہوں۔'' اس نے کافی کا مگ ایک سائڈ پر رکھا۔

''میں تم سے کوئی بحث نہیں کرنا چاہتی۔ میں نے تو بس تم سے ایک سوال کیا تھا۔'' وہ خفا ہوئی۔

''ایکچوئیلی میں نے یہ پروجیکٹس بہت پہلے کے سائن کر رکھے تھے۔ اب جانا میری مجبوری ہے۔ خود میرا بھی دل نہیں چاہ رہا ماما اور پاپا کو ایسی سچویشن میں چھوڑ کر جانے کو...... لیکن آئی ہوپ، میری جگہ آپ ان کا خیال رکھیں گی، ہے ناں......'' اس نے پُر امید لہجے میں کہتے ہوئے مناب کو دیکھا...... جواباً وہ صرف سر ہلا گئی اور وہ اس بے حس لڑکی کو دیکھے گیا۔ وہ تین مہینے کے لیے گھر سے، اس سے دور جا رہا تھا۔ اقصم کا دل ہول رہا تھا وہ اتنے دن اس کے بغیر کیسے رہے گا؟ وہ اس کی لڑائی کا اس قدر عادی ہو گیا تھا جس دن وہ خاموش ہوتی اسے تشویش ہونے لگتی۔ اور وہ اس وقت خاموش ہی تھی۔

''کیا بات ہے...... آپ کچھ پریشان لگ رہی ہیں؟'' اقصم نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تو وہ اپنی پونی کھول کر بیڈ پر بیٹھ گئی...... اب سیاہ سلکی بال اس کے شانوں پر بکھر گئے تھے۔

''تمہی کے لیے بہت پریشان ہوں میں۔'' اس نے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگایا۔

''اور میرے لیے کب پریشان ہونا شروع ہوں گی آپ؟'' وہ صوفے سے اٹھ کر بیڈ کے قریب آیا۔

''تم نے وعدہ کیا تھا مجھ سے، تم مجھے پریشان نہیں کرو گے۔'' اپنے اوپر کمبل لیتے ہوئے مناب نے اسے یاد دلایا۔

''جا ہی تو رہا ہوں، میرے جانے کے بعد خوب انجوائے کیجیے گا اپنا ٹائم...... اور ویسے بھی سب کے ساتھ آپ کی خوب بنتی ہے سوائے میرے......'' اس نے منہ بنا کر کہا۔ ''کتنی اچھی دوستی ہوا کرتی تھی ہماری...... اگر مجھے پتا ہوتا کہ شادی کے بعد آپ کا یہ سڑا ہوا روپ دیکھنے کو ملے گا تو میں آپ کی شادی رکوانے کی کبھی حماقت نہیں کرتا۔ آپ نے تو مجھ سے میری دوست ہی چھین لی۔'' بیڈ کی دوسری سائڈ پر بیٹھتے ہوئے اقصم نے کہا...... مگر تب تک مناب منہ تک کمبل تانے کروٹ بدل چکی تھی اس نے اقصم کی باتوں کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

بعض اوقات خاموشی اختیاری نہیں، مجبوری ہوتی ہے۔ شاید وہ بھی اسی لیے خاموش ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر اقصم کمبل میں لپٹے اسے دیکھتا رہا اور پھر اس نے اٹھ کر لائٹ بند کر دی۔ اگلی صبح وہ کراچی کے لیے گھر سے روانہ ہو گیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آئی تو لاشعوری طور پر اسے اپنا کمرا خالی، خالی سا لگا۔ ایک اداسی اور خالی پن نے اسے گھیر لیا تھا، گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ اس کے دل کی حالت بھی بدل رہی تھی، اسے کمرے کے ساتھ، ساتھ اپنا دل بھی خالی لگ رہا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر ولی مرتضیٰ اور اقصم چوہدری کا موازنہ کرنے لگی...... اقصم، ولی مرتضیٰ سے بہت بہتر انسان تھا...... اس کا ماضی ایک کھلی کتاب کی طرح مناب کے سامنے تھا، اس نے کبھی مناب سے جھوٹ نہیں بولا تھا، وہ جھوٹا نہیں تھا لیکن ولی مرتضیٰ اس سے محبتوں کے بے شمار دعوے کرنے والا نہ صرف اس سے جھوٹ بولتا رہا بلکہ اس نے اپنا ماضی بھی مناب سے چھپا رکھا تھا اور پھر شادی ٹوٹتے ہی ایک ہفتے کے اندر، اندر ولی نے شادی کر کے اس کے جذبات کی جو توہین کی تھی وہ اپنی ہی نظروں میں گر گئی تھی۔ جس شخص سے اس نے محبت کی اس کی اصلیت یہ تھی؟ وہ جب یہ سوچتی تو اسے اقصم کے سامنے بڑی سبکی محسوس ہوئی۔ انہی سوچوں میں الجھے اس نے بے دلی سے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا۔ کسی چینل پر ایک میوزک پروگرام میں اقصم کو بطور گیسٹ بلایا گیا تھا وہی پروگرام دوبارہ دکھایا جا رہا تھا۔

اقصم کو اس پروگرام میں دیکھ کر بے ساختہ وہ چینل چینج کرتے، کرتے رک گئی تھی۔ بلیک ڈیزائنر شلوار قمیص میں وہ اتنا ڈیشنگ لگ رہا تھا کہ پروگرام میں بیٹھی آڈینس میں موجود لڑکیاں بار، بار اس کے لیے ہوٹنگ کر رہی تھیں۔ وہ شلوار قمیص بہت کم پہنتا تھا مگر جب بھی پہنتا اسے خوب جچتا تھا۔ بے ساختہ اس کے آس پاس اقصم کا جملہ گونجا۔

''اچھا خاصا ہینڈسم شخص ہوں، ہزاروں لڑکیاں مرتی ہیں مجھ پر...... اگر ان لڑکیوں کو پتا چل جائے کہ اس مشہور راک اسٹار کی بیوی گھر میں اس کا کیا حشر کرتی ہے تو خودکشی کرلیں وہ سب۔'' وہ سچ کہتا تھا وہ ہزاروں لڑکیوں کا کرش تھا...... آئیڈیل تھا...... ہزاروں لڑکیوں کو چھوڑ کر اس نے سچی اور والہانہ محبت کی تھی تو مناب سے کی تھی...... اور اس کی محبت کی سچائی یہی تھی کہ مناب سے محبت کے بعد کوئی لڑکی اس کی زندگی میں نہیں آئی تھی۔ کسی لڑکی سے اس کا تعلق نہیں تھا۔

آج وہ اپنے ضمیر کی عدالت میں کھڑی تھی جہاں اسے جھوٹ اور سچ بتایا جا رہا تھا۔ جہاں اسے احساس دلایا جا رہا تھا کہ وہ کب، کہاں کیا غلطی کرتی رہی ہے۔ کب، کہاں وہ کیا، کیا کھوتی اور کیا، کیا پاتی رہی...... آج ضمیر کے کٹہرے میں کھڑی سود و زیاں کے حساب کا دن تھا۔

''جی اقصم صاحب...... ہزاروں لوگ آپ کی گائیکی کے مداح ہیں، یہ بتائیں آپ جب تنہا ہوتے ہیں تو کسے سنتے ہیں؟'' ہوسٹ نے اقصم سے سوال کیا تھا۔

''میں ہر قسم کا میوزک سنتا ہوں...... چاہے وہ ہالی وڈ کا ہو...... انڈین، پاکستانی، اسپینش سب......'' اقصم نے جواب دیا۔

''کوئی خاص سنگر جسے آج کل بہت سنتے ہوں؟''

''آج کل راحت فتح علی اور جگجیت سنگھ کو بہت سنتا ہوں۔ کیا خوب صورت آواز پائی ہے ان سنگرز نے۔'' اقصم نے اپنے فیورٹ سنگرز کو سراہا تھا۔

''بے شک گائیکی کی دنیا میں یہ دو آوازیں ایسی ہیں جنہیں پوری دنیا میں سراہا گیا ہے، لاکھوں لوگ ان کی گائیکی کے مداح ہیں، انہی سنگرز کا کوئی ایسا سونگ جو آپ کے دل کے بہت قریب ہو تو ہماری آڈینز اور گھر بیٹھے ناظرین کے لیے گنگنائیں۔'' ہوسٹ نے فرمائش کی تو آڈینس نے بھی بھرپور شور مچایا۔ اقصم مسکرایا...... اس کی لیڈی کلر اسمائل پر وہاں موجود لڑکیوں نے ہوٹنگ کی۔

''اقصم دیکھیے ہماری باذوق آڈینس کس قدر بے چین ہے آپ کی خوب صورت آواز سننے کے لیے۔'' ہوسٹ نے اقصم کے ساتھ، ساتھ اپنی آڈینس کو بھی سراہا تو اقصم مائیک لیے مسکراتا ہوا اپنی نشست سے اٹھ کر اسٹیج کے درمیان آ کھڑا ہوا۔

''جگجیت کا ایک خوب صورت سلو ٹریک سونگ جو آج کل میں اکثر گنگناتا ہوں۔ آپ کے سب کے لیے......'' اقصم نے آڈینس کی جانب اشارہ کیا اور میوزشنز کو ہدایت دینے کے بعد گانا شروع کیا......

پاس آئے...... دوریاں پھر بھی کم نہ ہوئیں
اک ادھوری سی ہماری کہانی رہی
آسماں کو زمیں یہ ضروری نہیں جان لے
عشق سچا وہی جس کو ملتی نہیں منزلیں
رنگ تھے، نور تھا جب قریب تو تھا
اک جنت سا تھا یہ جہاں......
وقت کی ریت پہ کچھ میرے نام سا
لکھ کے چھوڑ گیا تو کہاں؟

ہماری ادھوری کہانی!

ہماری ادھوری کہانی......

اس کی خوب صورت، دل سوز آواز اور دل کو چھو جانے والے واکن کے سُروں نے مناب کے دل کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

"ہماری ادھوری کہانی......" اس ایک مصرعے نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی نظریں ٹی وی اسکرین پر مرکوز تھیں......اس کے آس پاس پھر سے اقصم کی آواز گونجی۔

"جانتی ہیں آپ......میں آپ کے یہ جلے کٹے انداز......نفرت آمیز باتیں اور بدتمیزیاں کیوں برداشت کرلیتا ہوں؟عشق کرتا ہوں آپ سے، ایسا عشق جو آج کل لوگ نہیں کرتے۔"

مناب کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ کر گرنے لگے۔

خوشبوؤں سے تیری یونہی ٹکرا گئے

چلتے چلتے دیکھو ناں ہم کہاں آ گئے

انتظار تیرا صدیوں سے کررہا

پیاسا بیٹھا ہوں، کب سے یہاں

ہماری ادھوری کہانی

اس مصرعے نے مناب کے رونے میں شدت پیدا کردی تھی۔ اسے اقصم کے ساتھ بچپن سے لے کر اب تک گزارا ہوا وقت یاد آنے لگا۔ وہ اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلا کرتا تھا اور وہ اقصم کو سائیکل پر بٹھا کر پورے ٹاؤن کا چکر لگایا کرتی تھی۔ پھر اسے لڑکپن کا وہ وقت بھی یاد آیا۔ جب وہ گھر والوں سے چھوٹی، چھوٹی باتوں پر لڑ جھگڑ کر اپنا سامان اٹھائے ان کے گھر آجایا کرتا تھا......اور زبردستی اس کے سامنے بیٹھ کر سرسوں کے تیل سے اپنے سر کی مالش کروایا کرتا تھا۔ اور اس کے پاس بیٹھ کر لڑکیوں کے لیے لو لیٹر لکھوایا کرتا تھا۔ پھر اسے جوانی کا وہ وقت بھی یاد آیا جب وہ ان کے گھر مناب کے ہاتھ کی کافی پینے آتا تھا۔ اور اپنی ہر گرل فرینڈ سے بریک اپ ہونے پہ مصنوعی غم زدہ ہوکر اس کے پاس آتا اور وہ اس کا غم بانٹنے کے لیے اس کا دل بہلانے کے لیے اسے کسی اور لڑکی کو پٹانے اور دوستی کرنے کا مشورہ مذاق کے طور پر دیتی اور وہ ہر بار سیریس ہوکر پھر سے کسی نئے افیئر چلانے میں مصروف ہو جاتا۔

اسے وہ وقت بھی یاد آیا جب اس کی ولی سے منگنی ہوئی تھی اور اقصم کو تیز بخار نے آلیا تھا، سب اس کے بخار کو بدلتے موسمی اثرات کا نام دے رہے تھے جبکہ وہ مناب کی منگنی کے بعد کس قدر خاموش رہنے لگا تھا اور پھر وہ ملک چھوڑ کر ہی چلا گیا......اور جب دو سال کے بعد انگلینڈ میں اس کی ملاقات اقصم سے ہوئی تھی تو وہ اسے کس قدر بدلا ہوا لگا تھا......سنجیدہ اور خاموش اقصم......بات کرتے، کرتے کہیں کھو جانے والا اقصم، اسے اقصم کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ میں گزارا ہوا وہ وقت بھی یاد آیا۔

اسے آکسفورڈ اسٹریٹ کی وہ مارکیٹ بھی یاد آئی جہاں اقصم نے اس پر چھتری تان رکھی تھی اور وہ خود بارش میں بھیگ گیا تھا......اسے اقصم کے ساتھ حویلی میں گزارے ہوئے وہ لمحات بھی یاد آئے۔ اسے عنایہ کی شادی کے وہ ہنگامے بھی یاد آئے جب وہ اس کی قربت حاصل کرنے کے لیے کیا، کیا ناٹک کرتا رہا تھا۔ اسے اپنا مایوں والا وہ دن بھی یاد آیا جب وہ جارحانہ انداز میں اسے بازو سے پکڑے کمرے میں لے گیا تھا۔ اسے ملائشیا کے ہوٹل میں گزری وہ رات بھی یاد آئی جب وہ ولی کی بے وفائی، اس کے دیے دھوکے کا غم اقصم کے سینے سے سر لگا کر روتے ہوئے ہلکا کرتی رہی تھی یہاں تک کہ اس کی آنکھ لگ گئی تھی اور وہ صبح تک یونہی اکڑ کر بیٹھا رہا تھا کہ اس کی نیند خراب نہ ہو۔ اسے اقصم کے وہ الفاظ بھی یاد آئے جو مناب کے رونے پر اس نے تڑپ کر کہے تھے......وہ اس کی خوشی کی خاطر دل پر پتھر رکھ کر اب بھی اسے ولی کے ساتھ خوش دیکھنے کی باتیں کررہا تھا......اسے اقصم سے وابستہ ایک، ایک چیز یاد آئی تھی۔

اقصم نے پروگرام میں گانا ختم کر دیا تھا...... مگر...... مناب کا رونا ختم نہیں ہو رہا تھا پہلے وہ ولی کی جدائی پہ روتی تھی...... آج وہ اقصم کی بے پایاں محبت پہ رو رہی تھی، وہ اس سے اتنی محبت کرتا تھا کہ اس نے مناب کی اجازت کے بغیر اسے چھونا تک گوارا نہیں کیا تھا۔ اس نے مناب کی تمام پسندیدہ چیزوں کو پسندیدہ بنا رکھا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور مرد ہوتا تو نہ اس کے جذبات کی پروا کرتا نہ اس کی پسند کی...... اور ہر حال میں اس پر اپنا شرعی حق جتاتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔

وہ محبت کے موضوع پر کہانیاں لکھا کرتی تھی لیکن وہ خود محبت کو نہیں سمجھ پائی تھی۔ اس نے زندگی کو ہمیشہ ایک شفیق باپ کی طرح پایا تھا۔ جب زندگی اس کے لیے سوتیلی ماں بنی تو وہ ورطۂ حیرت میں مبتلا ہو گئی تھی۔ کہتے ہیں برا وقت ایک ایسا آئینہ جو اپنے پرائے کی پہچان کروا دیتا ہے۔ وقت نے اسے بھی بتا دیا تھا کہ اس کے لیے بدترین کون تھا اور بہترین کون؟ وقت خوشیوں بھرا ہو یا غموں بھرا...... گزر ہی جاتا ہے بس اللہ نے انسان کو آزمانا ہوتا ہے۔ اسے ٹھوکر لگا کر سنبھلنا سکھانا ہوتا ہے۔ انسان چاہتا ہے اسے اس کی تمام من چاہی چیزیں حاصل ہو جائیں اور اللہ اسے وہی دیتا ہے جو اس نے اپنے بندے کے لیے منتخب کیا ہوتا ہے...... بس وہ انسان کا ظرف آزماتا ہے کہ انسان اللہ کی رضا میں راضی ہوتا ہے یا اپنی خوشی میں خوش ہوتا ہے۔ اپنی خوشی میں انسان صرف وقتی خوشی ہی حاصل کر پاتا ہے لیکن اللہ کی رضا میں اس کی خوشی دائمی ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو جاننے کا یہی اصل وقت مناب کے پاس تھا۔

کراچی میں گانے ریکارڈ کروا کر وہ ممبئی روانہ ہو گیا تھا جہاں اسے کچھ موویز کے لیے گانے ریکارڈ کروانے تھے چند مشہور ٹی وی شوز میں شرکت کرنا تھی...... اقصم کی تمام مصروفیت، اس کے انٹرویوز تمام اخبارات میں شائع ہو رہے تھے، اپنی ڈیشنگ اور چارمنگ پرسنالٹی کے ساتھ، ساتھ اس کی گائیکی نے پڑوسی ملک کی اداکاراؤں کو بھی اس کا دیوانہ بنا دیا تھا۔ اخبارات میں وہاں کی ایک مشہور اداکارہ کا نام اقصم کے ساتھ لیا جا رہا تھا۔ وہ اداکارہ اقصم کی کریزی فین تھی، اس نے اقصم کو اپنے گھر ڈنر پر انوائٹ کیا تھا اس دعوت کے چرچے اخبارات میں مع تصاویر شائع ہو رہے تھے۔ اس وقت بھی وہ لان میں بیٹھی چائے پی رہی تھی اس کے سامنے ٹیبل پر اخبارات کا ڈھیر لگا ہوا تھا، وہ جو اخبار اٹھاتی اس اخبار کے شوبز پیج پر اقصم کی اس اداکارہ کے ساتھ تصاویر دیکھ کر جھنجلاہٹ اور غصے میں اخبار واپس رکھ دیتی۔

''بی بی جی آپ اپنا خیال رکھا کریں جی...... جب خاوند سوہنا (سوہنا) اور اتنا مشہور ہو تو کڑیاں آپے ہی پیچھے لگ جاتی ہیں، آج کل تو ویسے وی شرم حیا مک گئی ہے۔'' پینو کی بات اس کے آس پاس گونجی۔

وہ جب سے گیا تھا اس نے ایک بار بھی مناب کو فون نہیں کیا تھا...... وہ لاشعوری طور پر روز اس کے فون کا انتظار کرتی...... اقصم سے شرعی رشتے اور عورت کے اندر موجود فطری رقابت کے احساسات نے اسے بھی شک اور تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ بے دلی سے اٹھ کر کاشانۂ عمر جانے کے لیے تیار ہونے وہاں سے اندر جانے لگی تھی جب ٹیبل پر پڑا اس کا موبائل بج اٹھا تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔

''مناب کیسی ہیں آپ؟'' آج دس دن کے بعد اقصم کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

''یقیناً آپ نے میری کال کا بالکل بھی انتظار نہیں کیا ہوگا...... اسی لیے میں نے آپ کو ڈسٹرب نہیں کیا۔'' اقصم نے طنز کیا۔ (مناب کا جی چاہا کہ وہ اسے بتائے کہ تم نے ڈسٹرب نہ کر کے بھی مجھے بہت ڈسٹرب رکھا)

''تمہیں کیا جیسی بھی ہوں، تم تو بہت خوش ہو ہزاروں لڑکیاں تم پر فدا ہیں۔ وہ جو تمہاری کریزی فین ہے تم اس کے ساتھ ڈنر کرو یا لنچ...... تمہارا وقت تو یقیناً اس کے ساتھ اچھا ہی گزر رہا ہوگا ناں......'' مناب نے جلے کٹے انداز میں جواب دیا تو روایتی بیویوں والے اس کے انداز نے اقصم کو اندر تک سرشار کر دیا۔

''کم آن مناب، یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟'' وہ مسکراتے ہوئے انجان بن کر پوچھنے لگا۔

''وہی باتیں جو ساری دنیا کر رہی ہے۔'' وہ ہنوز بدگمانی سے بولی۔

دنیا کو چھوڑیں...... اپنے دل کی باتیں کریں ناں مجھ سے...... میرے جانے کے بعد کتنا ستایا اس نے آپ کو؟'' وہ

مسکرایا۔

''جب آؤ گے تب بتاؤں گی۔'' دھیرے سے کہا گیا۔

''آپ کہیں تو ابھی آجاؤں؟'' اقصم نے خوشی سے بھرپور لہجے میں پوچھا۔

''جی نہیں، میں جانتی ہوں تم نہیں آسکتے......'' مناب کے لہجے میں یقین تھا، پہلی بار وہ اقصم سے اس طرح بات کررہی تھی دوسری طرف اقصم نہال ہوا جارہا تھا۔ گلیشیر پگھل رہا تھا۔ پتھر میں سوراخ ہو رہا تھا۔

''کاش آپ میرے سامنے ہوتیں۔'' دل کی حسرت سرگوشی کے انداز میں بتائی گئی۔

''تو کیا کرتے تم......؟'' دھیرے سے کریدا گیا۔

''اب فون پہ کیا بتاؤں میں آپ کو......؟'' اقصم کی بے بسی پہ ایک دھیمی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر ٹھہر گئی۔

''کیا کررہے تھے اس وقت......؟''

''آپ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔''

''کیا......؟'' وہ مسکرائی۔

''واپس آکر بتاؤں گا......'' گمبھیر لہجے میں کہا گیا۔

''اپنا بہت خیال رکھنا وہاں۔'' پہلی بار خیال رکھنے کی فرمائش پہ وہ اندر ہی اندر دیوانہ ہونے لگا۔ تاہم اپنی خوشی چھپا کر بولا۔

''وہ بھی رات یہی کہہ رہی تھی مجھ سے...... کہ اپنا خیال رکھا کرو......'' اس کے انکشاف پہ مناب کا سارا موڈ خراب ہوگیا۔

''او کے پھر اسی کے پاس رہو اور اسے کہو وہی تمہارا خیال رکھ لے...... تم تو دودھ پیتے بچے ہو اپنا خیال نہیں رکھ سکو گے......'' اس کی جلسی اقصم کے بے قرار دل پہ خوشی و مسرت کی پھوار بن کر برس رہی تھی۔

''ٹھیک ہے، میں آپ کا پیغام اسے آج ہی text کردیتا ہوں۔'' مسکراہٹ چھپائے اس نے شرارت سے کہا۔

''او کے، میں فون رکھ رہی ہوں۔'' بگڑے موڈ کے ساتھ اطلاع دی گئی۔

''اتنی جلدی......؟'' وہ عجلت میں بولا۔

''میں امی کی طرف جارہی ہوں۔'' اس نے خفگی سے کہا۔

''کوئی تو ایسی بات کریں جو مجھے یاد رہے...... جسے سوچ کر میرا ٹائم یہاں اچھا گزرے۔'' اقصم نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے فرمائش کی...... مگر اس نے جواباً فیصلہ سنایا۔

''واپس مت آنا۔''

''مگر کیوں؟ مجھے دو دن کی بریک ملی تھی اور میں سوچ رہا تھا گھر آجاؤں، اگلے تین مہینے میں ویسے بھی یورپ میں گزرنے والا ہوں۔'' اس نے بے چینی سے کہا۔

''یہاں آکر کیا کرو گے؟ اپنی اس کریزی فین سے ملتے رہنا تمہارا ٹائم اچھا گزرے گا وہاں۔'' مناب نے مشورہ دے کر کھٹک سے فون بند کردیا تھا اور دوسری طرف وہ موبائل ہاتھ میں پکڑے کتنی ہی دیر مسکراتا رہا تھا اور مناب...... اس کا دل بے چین ہوگیا تھا فون بند کرنے کے بعد......

☆☆☆

اس دن داؤد چوہدری کے ساتھ ہونے والی جھڑپ کے بعد زارون غصے ... میں گھر سے باہر نکل گیا تھا، وہ دلنشیں کے پاس اسے بتائے بغیر گیا تھا۔ وہ اس سے ابھی اور اسی وقت نکاح کرنا چاہتا تھا، اپنی گاڑی گیٹ سے باہر لگا کر وہ حتمی انداز میں اس کے گھر داخل ہوا تو گیراج میں نواز لغاری کی سرکاری گاڑی دیکھ کر ٹھٹک گیا، ماتھے پر بل لیے جب وہ گھر کے

اندر داخل ہوا تو ڈرائنگ روم میں بیٹھے نواز لغاری اور دلنشیں کی گفتگو اس کے کانوں سے ٹکرائی اور اس کے قدم وہیں کاریڈور میں ہی رک گئے۔

”تم آج کل مجھے بالکل وقت نہیں دے رہی ہو۔“ نواز لغاری کے لہجے میں محبت بھرا شکوہ تھا۔

”لغاری صاحب! کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ میں اور میرا سارا وقت آپ کے لیے ہی تو ہے۔“ محبت سے لبریز لہجے میں وہ نواز کو یقین دلا رہی تھی۔

”تو پھر زارون چوہدری نے تمہاری چوکھٹ کیوں پکڑ رکھی ہے؟ کیا مجھ سے زیادہ محبت کرتا ہے وہ تم سے۔“ نواز لغاری اب بھی خفگی سے کہہ رہا تھا۔ اس کے شکوے پہ دلنشیں اِک ادا سے ہنسی تھی۔

”لغاری صاحب کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ زارون جیسے پچاس عاشق آپ کی محبت پر وار دوں میں۔“ اس کی بات پر وہاں کھڑے زارون کا پارہ ہائی ہو رہا تھا۔

”تو پھر کیوں تم نے اسے اس خوش فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے کہ تم اس سے محبت کرتی ہو؟“ نواز کے سوال پر وہ زخمی سانپ کی طرح پھنکاری۔

”برباد کرنا ہے اسے...... سڑک پر لے کر آنا ہے، ذلیل و خوار کرنا ہے اسے۔“

”مگر کیوں؟ اس بیچارے نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“

”بس ایک پرانا حساب کتاب چکانا ہے۔“

”پھر بھی کچھ تو بتاؤ......؟“ نواز لغاری نے اصرار کیا۔

”یہ شخص میرے باپ کو اپنی گاڑی تلے روند کر اسے مرتا ہوا چھوڑ گیا تھا اور میری التجاؤں کو بھی اس نے اپنی قیمتی گاڑی تلے کچل دیا تھا اور میرا باپ...... وہ اس سڑک پر بے بسی کی تصویر بنا اپنی زندگی کی سانسیں ہار گیا تھا...... بس اپنے باپ کی انہی سانسوں کا حساب چکانا ہے مجھے زارون چوہدری سے۔“ دلنشیں کے لہجے میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی...... اس کے لہجے میں زارون کے لیے نفرت تھی...... باہر کھڑے زارون کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔

”تین مرد تمہارے انتقام کی نذر ہو چکے ہیں، یہ بتاؤ مجھ سے کس بات کا بدلہ لے رہی ہو تم؟ کتنے دن ہو گئے ہیں تمہارے ساتھ وقت گزارے ہوئے...... میں دس دن تک ناروے جا رہا ہوں...... بس تم میرے ساتھ جاؤ گی۔“ نواز نے اپنا حتمی فیصلہ سنایا۔

”لغاری صاحب! مہینہ ڈیڑھ انتظار نہیں کر سکتے آپ میرا؟“

”میری جان اتنے دنوں سے انتظار ہی تو کر رہا ہوں۔“

”بس مہینہ ڈیڑھ اور انتظار کر لیں، زارون کو اس کے گھر سے نکلوا نے دیں، اس کے ماں، باپ اور بیوی کی نظروں میں ذلیل و خوار کرنے دیں پھر اس خوشی میں آپ جہاں کہیں گے آپ کے ساتھ جاؤں گی میں۔“

دلنشیں کے لفظوں نے، اس کے انکشاف نے زارون کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کا دماغ سائیں، سائیں کر رہا تھا۔ وہ ایک بہت بڑے طوفان میں گھر گیا تھا۔ وہ غائب دماغی سے نہ جانے کیسے وہاں سے نکلا اور ریش ڈرائیونگ کرتے ہوئے اس نے جانے کتنے سگنل توڑے تھے۔ دلنشیں کے الفاظ مسلسل اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ اور وہ اس کے انتقام سے بچنے کے لیے گاڑی کی اسپیڈ تیز سے تیز کر رہا تھا۔ اتنی تیز کہ سامنے سے آتے کیری ڈبے سے اس کی گاڑی بری طرح سے ٹکرا گئی تھی اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد اس کے ایکسیڈنٹ کی خبر نور منزل پہ بجلی بن کر گری تھی۔

سب گھر والے اللہ کے آگے گڑگڑاتے ہوئے زارون کی زندگی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ سمیرا بیگم اور داؤد چوہدری پے در پے غموں سے نڈھال ہو چلے تھے۔ آقصم ان دنوں ممبئی میں ہی تھا، ایسے میں ڈاکٹر عمر نے ہی اس صورتِ حال کو سنبھالا تھا۔ کئی گھنٹے ایمرجنسی میں رہنے کے بعد اسے پرائیویٹ روم میں شفٹ کیا گیا تو سب نے سکھ کی سانس لی۔

اللہ نے اسے نئی زندگی بخشی تھی تاہم اس کا بازو اور ٹانگوں کی ہڈیاں فریکچر ہوئی تھیں اس کے ماتھے پہ بھی گہرا زخم آیا تھا۔ دوسرے دن اسے ذرا ہوش آیا تو اس نے سب سے پہلے عنایہ کا نام لیا...... وہ اس کے پاس آ گئی تھی اور بے آواز رو رہی تھی۔ اس نے کبھی خواب میں بھی زارون کو اس حالت میں دیکھنے کا تصور نہیں کیا تھا...... اور اب وہ زخموں سے چور اس کے سامنے پڑا تھا، اس کو اس حالت میں دیکھنا عنایہ کی زندگی کی سب سے بڑی آزمائش تھی۔ اس شخص کو عنایہ نے ٹوٹ کر چاہا تھا، بے لوث اور بے پناہ چاہا تھا وہ اسے کیسے دیکھ سکتی تھی اس حالت میں۔ زارون بھی اسے دیکھتے ہوئے رو رہا تھا۔ اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ اس نے دلنشیں کی دلفریب دلکشی میں پھنس کر اپنی خوب صورت، وفادار بیوی سے بے وفائی کا گناہ کر لیا تھا اور اب زارون کو اس گناہ پہ رونا ہی تو تھا۔ انسان اپنی غلطیوں اور گناہوں کا نتیجہ اکثر اس دنیا میں ہی بھگت لیتا ہے اس کے باوجود وہ نہیں سمجھتا...... نہ جانے کیوں؟

اگلے روز ہی اقصم ارجنٹ فلائٹ سے واپس آیا تو ائرپورٹ سے سیدھا اسپتال چلا آیا۔ زارون کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ ابھی اسے ہفتہ دس دن اسپتال میں رہنا تھا۔ اقصم نے مناب کو اپنی آمد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا، وہ صبح اسپتال سے ہو کر گھر جا چکی تھی...... دو گھنٹے اسپتال میں گزارنے کے بعد داؤد چوہدری نے اقصم کو بھی آرام کے لیے گھر بھجوا دیا تھا۔

☆☆☆

اس کے دل کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ اقصم کے جاتے ہی جیسے خالی ہو گیا تھا۔ اس کا اب اس کمرے میں دل نہیں لگتا تھا۔ اقصم کی اس کے ساتھ چھوٹی موٹی شرارتیں، نوک جھوک اسے سونے نہیں دیتی تھی، اس کا دل نہیں لگ رہا تھا اقصم کے بغیر...... وہ اسے مس کر رہی تھی۔ وہ کبھی دراز سے اس کی چیزیں نکال کر دیکھتی اور کبھی وارڈروب کھول کر اس کے کپڑوں کو دیکھنے لگتی...... اب بھی وہ الماری کھولے اس کے کپڑے دیکھتے ہوئے بے آواز رو پڑی تھی۔

اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اقصم کو کیسے بتائے کہ وہ بھی اس کے بغیر ادھوری ہے۔ وہ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا تھا...... اور بے آواز چلتا ہوا اس کے عقب میں آ کھڑا ہوا۔ اگلے ہی لمحے وہ بے چینی سے پلٹی تھی۔

”اقصم تم...... تم آ گئے؟“ وہ اسے اپنے مقابل کھڑا دیکھ کر مسکرائی۔

”آپ کو کیسے پتا چلا میرے آنے کا......؟“ اسے اپنی نگاہوں میں مقید کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”تمہاری خوشبو سے......“ وہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔

”شاعری کر رہی ہیں مجھ پہ؟“ اقصم نے آہستگی سے اس کے بال سنوارے۔

”کچھ کھاؤ گے کیا؟“

”نہیں، پلین میں کھا لیا تھا ابھی بھوک نہیں ہے۔“ وہ اسے محبت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”اپنے آنے کا بتایا ہی نہیں تم نے؟“

”آپ نے پھول بچھانے تھے کیا؟“ اقصم نے اسے خود سے قریب کیا۔ وہ حیرت زدہ تھا مناب نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔

”تم پہ پھول بچھانے والیوں کی کمی تو نہیں۔“ وہ اس کے طنز پہ دھیرے سے مسکرایا اور اسے اپنے بازو کے گھیرے میں لیے بیڈ کی طرف آیا۔

”آپ تو لاکھوں لڑکیوں کے دل میں دھڑکتا ہوں میں...... مگر میرے دل کی دھڑکن تو صرف آپ ہیں۔ میرا پہلا اور آخری عشق......“ اقصم اسے لیے بیڈ پر بیٹھ گیا...... وہ اب بھی اقصم کے حصار میں تھی آج اسے محبت بھری پناہ بری نہیں لگ رہی تھی سو اس نے اقصم کا حصار توڑنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

”اور وہ آشا فرینڈس اس سے کیا دل لگی کر رہے ہو؟“ مناب کی بات پر اقصم نے قہقہہ لگایا تھا۔

''آپ جیلس ہو رہی ہیں کیا اس سے؟''

''مجھے کیا ضرورت ہے کسی سے جیلس ہونے کی۔'' مناب نے جھوٹ بولا۔

''ہاں، میں تو بھول ہی گیا تھا آپ کو کیا ضرورت ہے آشا سے جیلس ہونے کی...... آپ کا دل میرا بیڈ روم تھوڑی ہے جس میں وندناتا ہوا میں بلا اجازت اندر گھس جاؤں گا...... دل کا دروازہ تو بہت خاص لوگوں کے لیے کھلتا ہے ناں......'' اقصم نے اسے چھیڑتے ہوئے یاد دلایا۔

''میری ہر بات کسی سبق کی طرح یاد کر رکھی ہے تم نے؟'' مناب نے پہلی بار اسے اتنے قریب سے اور غور سے دیکھا۔

''آپ کی ہر بات کے میرے دل نے رٹے لگا رکھے ہیں۔ ویسے ایک بات ہے مناب! آشا ہے بہت خوب صورت...... اتنی hot دکھتی ہے کیا بتاؤں...... کچھ مت پوچھو'' اس نے مسکراتے ہوئے اسے جان بوجھ کر چھیڑا...... تو وہ اس کی گرفت سے نکلتے ہوئے بولی۔

''اگر اتنی ہی خوب صورت اور ہاٹ دکھتی ہے تو رہتے اسی کے پاس...... یہاں آنے کیا ضرورت تھی؟'' وہ خفگی سے اس کا حصار توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

''ارے میری پوری بات تو سن لیں ناں...... آپ سے خوب صورت تو کوئی لڑکی نہیں ہو سکتی۔'' اس نے جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔

''مت لگاؤ مجھے مکھن۔''

''آئی سوئیر میں مکھن نہیں لگا رہا آپ کو......''

''اور وہ جو اخبارات میں تمہارے اور اس کے افیئر کے بارے میں......'' مناب نے بات ادھوری چھوڑی۔

''کم آن یار...... اس نے مجھے انوائٹ ضرور کیا تھا مگر ایک اچھے دوست کی طرح...... میری آواز، میری گائیکی کو سراہنے کے لیے...... اس کے علاوہ میرا اس سے کوئی ریلیشن نہیں اور رہی بات اس سے افیئر کی تو آپ کے اندر کی سوئی ہوئی اس بیوی کو بیدار کرنے کے لیے میں نے جنید سے کہا تھا اخبارات میں یہ خبر لگوانے کو...... تاکہ میں آپ کا یہ خوب صورت روپ دیکھ سکوں۔'' اقصم نے مناب کی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اونچا کیا۔

''بہت برے اور ڈرامے باز ہو تم......'' مناب نے مصنوعی خفگی سے اسے گھورا۔

''جانتا ہوں میں...... ابھی پچھلے دنوں ہی آپ نے بتایا تھا مجھے......'' وہ اس کے شریر انداز پہ بے ساختہ ہنسی۔

''آپ ہنستی ہوئی کتنی اچھی لگتی ہیں؟ کتنے عرصے بعد آپ کو یوں ہنستے ہوئے دیکھا ہے میں نے...... آپ وعدہ کریں مجھ سے ہمیشہ ایسے ہی ہنستی رہا کریں گی۔'' اس نے بچوں کی طرح فرمائش کی تو وہ مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا گئی۔

''میں نے تمہیں کتنا تنگ کیا ناں اقصم......؟'' مناب نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں تنگ تو آپ نے واقعی مجھے بہت کیا...... اور اب میں سوچ رہا ہوں کہ آپ کو سزا کے طور پر اپنے ساتھ ورلڈ ٹور پر لے جاؤں......'' اقصم کے لہجے میں اس کے لیے محبت ہی محبت تھی۔

''اقصم تم سے زیادہ مجھے اس دنیا میں کوئی اور نہیں چاہ سکتا۔'' مناب نے اعتراف کیا اور وہ مناب کے اعتراف پہ سر تا پاؤں سرشار ہو گیا تھا۔

''تھینک گاڈ...... آپ کو میری ''محبت'' پہ یقین تو آ گیا۔'' توقف کے بعد وہ دوبارہ بولا۔

''مناب ایک بات کہوں آپ سے؟''

''ہاں کہو......''

''میں آپ کو تم کہنا چاہتا ہوں...... اور چاہتا ہوں کہ تم مجھے آپ کہو......''

''کوشش کروں گی آپ کی اس فرمائش کو پورا کرنے کی۔'' اقصم اس کے انداز پر مسکرا دیا۔

''مناب میں صرف تمہاری ہمراہی کے خواب دیکھا کرتا تھا، میں کبھی سوچ بھی نہیں...... سکتا تھا ایک دن میرے خواب یوں سچ ہو جائیں گے۔''

''لگن سچی ہو تو خواب بھی سچ ہو جایا کرتے ہیں اقصم......'' آج اسے اقصم کا اپنے لیے محبت کا اظہار اچھا لگ رہا تھا۔ اقصم نے اٹھ کر اپنی دراز سے ایک ڈبیا نکالی اور وہ پھر سے اس کے پاس آیا۔ اس نے ڈبیا سے انگوٹھی نکالی۔

''یہ کب خریدی؟'' مناب نے خوشی سے انگوٹھی کو دیکھا۔

''جن دنوں آپ مجھ پر زہر اگل رہی تھیں۔'' اس کی صاف گوئی پہ مناب مسکرائی۔

''یہ بہت خوب صورت اور انمول ہے، تمہاری محبت کی طرح......'' مناب نے ڈائمنڈ رنگ دیکھتے ہوئے کہا۔

''اونہہ آپ سے زیادہ خوب صورت اور قیمتی نہیں......'' اقصم نے اس کی انگلی میں محبت سے انگوٹھی پہناتے ہوئے کہا تو مناب کی آنکھوں میں اس کی بے پایاں محبت پہ آنسو تیر گئے تھے۔ اس کے دل ودماغ سے سارا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ وہ خود کو بہت فریش محسوس کر رہی تھی۔ اب زندگی کا راستہ بہت واضح اور خوب صورت دکھائی دے رہا تھا۔

''اور ہاں میں ایک اور بات کلیئر کرنا چاہتا ہوں۔'' اقصم نے اس کے خوب صورت چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کون سی بات......؟'' اس نے حیرت سے اقصم کو دیکھا۔

''میری اور تمہاری ایج میں صرف دو سال کا ڈفرینس ہے...... تم اس ایج ڈفرینس کو لے کر کبھی ایشو نہیں بناؤ گی...... ہمارے پیارے نبی حضرت محمدؐ بھی تو اپنی زوجہ حضرت خدیجہؓ سے کتنے برس چھوٹے تھے۔ اتنی بڑی مثال موجود ہے ہمارے سامنے...... اور ویسے بھی تم مجھ سے چار پانچ برس چھوٹی لگتی ہو...... عمر چور جو ہوئیں۔'' وہ مسکرایا تو مناب بھی مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا گئی۔

''تمہارے پاکیزہ، انمول اور لازوال سچے عشق پہ کیا کہوں...... لفظ پرونے والی لڑکی کے پاس لفظ ختم ہو گئے ہیں تمہارے لیے۔'' وہ دھیمے سے نم لہجے میں بولی۔ وہ سچ کہتا تھا آج کل کے دور میں ایسا سچا عشق کوئی نہیں کرتا جیسا وہ مناب سے کرتا تھا۔

''کچھ مت کہو...... اور کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں ہے...... اس بار تمہارے دل کا دروازہ خود کھلا ہے میرے لیے اور میرے لیے یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے مناب...... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا اللہ مجھ پر اتنی جلدی مہربان ہو جائے گا......'' وہ اسے اپنے بازو کے حصار میں لیے محبتوں سے لبریز لہجے میں بول رہا تھا اور وہ دل میں سوچ رہی تھی کہ مہربان تو اللہ تعالیٰ کی ذات اس پر ہوئی تھی کہ ایک دھوکے باز شخص کو ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے نکال باہر کیا تھا اور وہ یہ بات realize کر چکی تھی، دوسرا موقع کہانیاں دیتی ہیں زندگی نہیں دیتی...... اسے اقصم جیسے شخص کی بے قدری کر کے اللہ کو ناراض نہیں کرنا تھا...... جس نے خاص مناب کے لیے اقصم کو چنا تھا۔

☆☆☆

زویا عرف دلنشیں آج کل دبئی میں ہونے والے ایک انٹرنیشنل فیشن ویک میں شرکت کے لیے دبئی گئی ہوئی تھی...... جوں جوں وہ شہرت کی بلندیوں کو چھو رہی تھی وہ اپنی ہی ذات میں اکیلی ہو رہی تھی۔ روز بروز اس کا سکون غارت ہو رہا تھا...... سیما بیگم تو ویسے ہی پاگل ہو چکی تھیں اور سارہ کے مرنے کے بعد زارا بجو نے بھی اس سے کوئی رابطہ نہیں رکھا تھا۔ گو بھی اپنی زندگی میں مگن ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی وہ خود سے سوال کرتی کہ اب وہ یہ سب کس کے لیے کر رہی تھی؟ ایک گہری خاموشی کے علاوہ وہ کوئی جواب نہیں دے پاتی خود کو...... خاموشیاں کبھی کبھی بہت تفصیل سے جواب دیتی ہیں سو دلنشیں کو بھی خاموشی نے ایک تفصیلی جواب دے دیا تھا۔

اس کی بے چینی میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ سکون آور ادویات کی عادی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے باوجود اسے

سکون نہیں مل رہا تھا۔ وہ جن، جن لوگوں سے انتقام لینا چاہتی تھی وہ ان سے لے چکی تھی پھر بھی اس کے اندر بے سکونی کی ایک آگ بھڑک رہی تھی...... کبھی، کبھی وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوتی تو پہروں خود کو دیکھتی رہتی...... وہ کیا تھی اور کیا ہوگئی تھی؟ وہ زندگی کی تلخیاں پیتے، پیتے بہت کڑوی ہوگئی تھی۔

اس وقت وہ ہوٹل میں اپنے کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بے دلی سے اپنے چہرے سے میک اپ اتار رہی تھی۔ اسی وقت کمرے کا انٹرکام بجا تھا...... دلنشیں نے قریب رکھا انٹرکام کا ریسیور اٹھایا۔

''ہیلو...... جی فرمائیں......؟''

''میم وہ آپ کو ایک میسج دینا تھا۔'' روم سروس سے کوئی تھا۔

''کیسا میسج......؟''

''وہ ایک مولانا صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' اس نے ایک معروف عالم دین کا نام لیا۔ وہ حیران تھی کہ یہ کیسے ممکن تھا۔ ایک شام ٹی وی پر ان کا لیکچر سنتے ہوئے اس نے ان سے ملنے کی تمنا کی تھی وہ بہت الجھ گئی تھی کہ وہ عالم اس سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔ بہرحال ان سے پوچھ کر ٹائم سیٹ کیا گیا اور وہ اگلی صبح ایک مدت کے بعد سمپل سی شلوار قمیص کے ساتھ سر پر دوپٹا لیے مولانا صاحب کے سامنے حاضر تھی۔ ستر سالہ باریش سے بزرگ کے چہرے پر بلا کا نور اور اطمینان تھا...... سکون تھا، ایک کشش سی تھی۔

اس نے مولانا کو سلام کیا تھا اور جواباً انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔ ایک مدت کے بعد اس کے سر پر کسی بزرگ نے ہاتھ پھیرا تھا۔

''مولانا صاحب آپ مجھ ناچیز سے ملنا چاہتے تھے؟'' وہ ادب سے ان کے مقابل بیٹھ گئی تھی۔

''ہاں بیٹا......'' وہ دھیرے سے بولے۔

''مگر کیوں......؟'' وہ اب بھی حیران تھی۔

''بس یوں سمجھو اللہ کے حکم سے۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں......'' وہ ہنوز حیرت سے بولی تو مولانا دھیرے سے مسکرائے۔

''بیٹا تم ابھی سمجھ اور ناسمجھی کے درمیان بھٹک رہی ہو...... تمہیں سمجھ کی طرف لوٹنے میں تھوڑا وقت لگے گا۔''

ان کی بات پہ اب کے وہ خاموش رہی تھی۔ اسے ان کی ادھوری سی بات سمجھ نہیں آئی تھی۔ لیکن ان کے پاس بیٹھ کر اسے اک مدت کے بعد ذہنی و قلبی سکون نصیب ہوا تھا۔ اس کے بعد مولانا بہت شفیق سے لہجے میں اس کی شوبز آمد کے بارے میں پوچھنے لگے اور حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ من و عن انہیں بتا رہی تھی...... وہ شاید جھوٹ بول، بول کر تھک چکی تھی بہت عرصے کے بعد اس نے کسی سے سچ بولا تھا۔

اس نے مولانا کو اپنے اس خواب کے بارے میں بھی بتایا تھا جو کچھ عرصے سے اب اسے بار، بار آرہا تھا۔ اور مولانا کا جواب سن کر وہ کتنے ہی لمحے خاموشی کی لپیٹ میں رہی تھی۔ وہ کچھ بول نہیں پارہی تھی۔

''ابا مجھ سے ناراض ہیں؟'' اس نے مولانا صاحب کی بات زیرِلب دُہرائی۔

''ہاں بیٹا تمہارے والد تم سے ناراض ہیں سخت ناراض۔'' وہ دھیمے سے لہجے میں بولے۔

''میں انہیں کیسے مناؤں......؟ وہ کیسے راضی ہوں گے مجھ سے؟'' اسے اپنی آواز کسی گہری کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔

''اس شعبے کو چھوڑ دو۔ گناہوں میں لپٹی اس زندگی سے نکل آؤ اور سچے دل سے توبہ کرلو...... اللہ کو راضی کرلو، تمہارے مرحوم والد تمہیں معاف کردیں گے، تم سے راضی ہوجائیں گے وہ۔'' وہ آہستگی سے بول رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر خاموشی کی زد میں آگئی تھی۔

"مگر میرے لیے اس فیلڈ کو چھوڑنا اب بہت مشکل ہے مولانا...... میں اتنی دور نکل آئی ہوں کہ اب تو مجھے واپسی کا کوئی راستہ بھی نہیں ملے گا نہ یہ معاشرہ مجھے قبول کر سکتا ہے......" اس نے گھبرا کر مولانا صاحب کو دیکھا۔ وہ اس کی بات پہ دھیرے سے مسکرائے۔

"انسان کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے صرف ارادے کی مضبوطی اس سے وہ سب کچھ کروا لیتی ہے جس کے بارے میں اس نے خود بھی کبھی سوچا نہیں ہوتا...... اور جب انسان اللہ پر توکل رکھتا ہے۔ اپنا ایمان مضبوط رکھتا ہے تو راستے خود بخود آسان ہوتے چلے جاتے ہیں۔ انسان سب کچھ دیکھنے لگتا ہے۔" مولانا صاحب کے لہجے میں کامل یقین تھا۔

"چاہے انسان کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو؟ چاہے انسان برائیوں کی دلدل میں کتنا ہی دھنسا ہوا کیوں نہ ہو......؟"

ایک بار پھر اس کی آواز خود کلامی لیے ہوئے تھی۔ ایک طویل سانس لیتے ہوئے وہ پھر سے مسکرائے تھے۔

"بیٹا اللہ کہتا ہے، جنھوں نے زندگی میں بھول کر بھی مجھے راضی کرنے کا ایک کام نہیں کیا، وہ بھی میرا ہے۔ میری رحمت سے کبھی نا امید نہ ہونا...... میں سارے گناہ معاف کردوں گا۔ سوائے شرک کے اور کیوں نہ کروں......؟ کوئی ہے میرے سوا معاف کرنے والا......؟ کوئی ہے میرے سوا بخشش کرنے والا؟ میں ہی غفور و رحیم ہوں' وہ ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے اپنے بندوں سے...... اس کی رحمت کی بانہیں ہمیشہ کھلی رہتی ہیں۔ اس کی رحمانیت کی چادر ہمیشہ تنی رہتی ہے' اس کی عطا کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں...... وہ دینے کے لیے، وہ نوازنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے میری طرف ایک قدم بڑھاؤ، میں تمہاری طرف دس قدم بڑھاؤں گا، وہ کہتا ہے اتنے گناہ لے کر آؤ گے جتنے بارش کے قطرے ہیں، میں تب بھی اپنے بندے کو معاف کردوں گا اگر وہ سچے دل سے مجھ سے توبہ کرے گا اور واپس اس راہ پر نہیں لوٹے گا۔ اور بیٹی تمہارے گناہ بارش کے قطروں سے زیادہ تو نہیں ہو سکتے......؟ ریت کے ذروں سے زیادہ تو نہیں ہو سکتے...... درختوں کے پتوں سے زیادہ تو نہیں ہو سکتے ناں؟ کہ وہ معاف نہ کرے......؟ بس وہ کہتا ہے کہ میری مانو...... جو میں کہتا ہوں وہ کر گزرو......" وہ بہت دھیمے پُر اثر انداز میں بول رہے تھے اور وہ ان کی باتوں پہ باآواز رو رہی تھی...... اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔

"اللہ کو ندامت کے آنسو بہت پسند ہیں بیٹا...... یہ گناہوں کی آگ بجھا دیتے ہیں...... اس نے تو اپنے بندوں سے رحمت کے وعدے فرما رکھے ہیں...... پھر انسان کیسے اس کی رحمت سے مایوس ہو سکتا ہے......؟ کیسے یہ کہہ سکتا ہے کہ اللہ پاک اسے معاف نہیں کرے گا؟" مولانا اپنے سحر انگیز دھیمے لہجے میں بول رہے تھے اور وہ روتے ہوئے ان کی باتیں سن رہی تھی اور پھر وہ وہاں...... جتنے بھی دن رہی ان سے ملتی رہی...... ان کی محفل میں بیٹھتی رہی...... اِک مدت کے بعد اسے ذہنی اور قلبی سکون عطا ہوا تھا...... اِک عرصے کے بعد اس کے اندر وہ پتھر کی لڑکی ریزہ، ریزہ ہوئی تھی۔ اِک مدت کے بعد اس کا کھورا اور سخت دل تڑپا تھا...... اِک عرصے کے بعد وہ موم ہوئی تھی۔

☆☆☆

عنایہ بڑی اماں کے بیڈ پہ ان کی گود میں سر رکھے لیٹی ہوئی تھی اس کی نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں، لبوں پر گہری خاموشی تھی۔ بڑی اماں دھیرے، دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں۔

"زارون کو اسپتال سے گھر آئے دو مہینے ہو چکے ہیں' تم نے اس کی تیمارداری میں ایک اچھی بیوی کی طرح کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اتنی خدمت کی اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھا...... اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں کی یقیناً اس خدمت کا تمہیں اللہ خاص اجر دیں گے...... لیکن......" وہ ایک لمحے کے لیے رکیں۔

"لیکن کیا بڑی اماں......؟" وہ دھیرے سے پوچھنے لگی۔

"لیکن تم نے اپنی خاموشی نہیں توڑی میری بچی...... تمہارے اور زارون کے درمیان جو یہ خاموشی کی دیوار کھڑی ہو گئی ہے...... اسے گرا دو بیٹا...... زارون اپنے کیے پہ بہت شرمندہ ہے اسے معاف کردو......" بڑی اماں نے اسے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



سمجھاتے ہوئے گویا زارون کی سفارش کی۔

"کب تک بڑی اماں؟ کب تک عورت، مرد کو معاف کرتی رہے؟ اور معاف کرے بھی کیوں؟ مرد کو معاف کرنے کے سارے فرائض عورت کے ہی ہیں؟ عورت اپنے دل کی سنے اپنی مرضی کرے تو مرد وہ تو ایک لمحہ لگاتا ہے اسے کاری اور ستی کرنے میں...... اور عورت وہ ایسے مرد کا کیا کرے جسے اس نے رنگے ہاتھوں پکڑا ہو؟ وہ مرد کو ونی یا کاری کیوں نہیں کر سکتی؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ عنایہ کی آنکھوں میں وحشت اور لہجے میں سب کچھ ٹوٹ جانے کی تڑپ بھی، دکھ تھا۔ بڑی اماں بھی اندر سے دکھی ہو گئی تھیں ان دونوں کو خاندان بھر میں چاند سورج کی جوڑی کہا جاتا تھا، ان کی محبت ایک مثال تھی۔ رشک کرتے تھے ان کے خاندان کے لڑکے، لڑکیاں زارون اور عنایہ کی محبت پہ...... اور اب دونوں کے بیچ دوری کی یہ دیوار کھڑی دیکھ کر بڑی اماں اور سمیرا بیگم کا دل خون کے آنسو روتا۔

"عینی میری بچی ایک مشہور افسانہ نگار نے کسی زمانے میں کہیں لکھا تھا...... مرد کا گناہ وقت کے تالاب میں کنکر کی طرح ڈوب جاتا ہے جبکہ عورت کا گناہ ساری عمر کنول کے پھول کی طرح سطحِ آب پر رہتا ہے۔" بڑی اماں کی بات پہ اس کے اندر جلتی ہوئی بے اعتباری اور دھوکے کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی تھی۔

"بڑی اماں! عورت کا عورت ہونا جرم کیوں ہے ہمارے معاشرے میں؟ آخر کب تک عورت ابن آدم کے دیے ہوئے دکھوں، فریبوں، دھوکوں پہ اسے معاف کرتی رہے گی؟ کیا عورت انسان نہیں ہوتی، کیا اس کے وجود میں دھڑکتا ہوا دل مرد کے لیے ایک کھلونے کی حیثیت رکھتا ہے؟ جس سے وہ جب چاہے کھیلے گا اور جب چاہے اٹھا کر کہیں پھینک دے گا؟"

"میری بچی تمہاری ساری باتیں ٹھیک ہیں...... لیکن گھر بسانے کے لیے عورت کو ہی اپنا آپ مارنا پڑتا ہے عورت کا جہاد، شوہر کے ساتھ اچھی زندگی بسر کرنا ہے جو عورت اپنے شوہر کی ایک کڑوی بات برداشت کرتی ہے اللہ تعالیٰ اس عورت کو روزہ دار اور راہِ خدا کے مجاہد جتنا ثواب عطا کرتا ہے۔" بڑی اماں نے پیار سے اسے سمجھانا چاہا۔

"بڑی اماں کچھ غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جن کے لیے ہم کسی کو معاف تو کر دیتے ہیں مگر پھر پہلے جیسا تعلق قائم نہیں رکھ پاتے۔ زارون کا اور میرا ابھی یہی معاملہ ہے۔" عنایہ حتمی فیصلہ سناتے ہوئے بستر سے اٹھ گئی۔

"ہزاروں بار معافی مانگ چکا ہے زارون تم سے۔ اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہے اور ویسے بھی انسان ہزاروں غلطیاں کرتا ہے پھر بھی وہ خود سے پیار کرتا ہے تو پھر وہ دوسروں کی ایک غلطی پہ اس کو معاف کیوں نہیں کر سکتا؟"

"بڑی اماں آپ نہیں سمجھیں گی...... کوئی بھی انسان پوری دنیا کے لیے نہیں جیتا...... وہ کچھ خاص لوگوں کے لیے جیتا ہے۔ وہ خاص لوگ جو اس کی زندگی ہوتے ہیں اور وہی خاص لوگ اس کی زندگی کے اندر جیتی ہوئی زندگی کو ختم کر دیں تو انسان جی نہیں پاتا۔ جھوٹ کے درخت پہ اعتبار کی چڑیا بھی لوٹ کر نہیں آتی بڑی اماں...... ! فرض کیا میں آپ کے، بڑی ماما اور بڑے پاپا کے کہنے پر زارون کو معاف کر دیتی ہوں اور شاید کر بھی دوں...... مگر میں اپنے ٹوٹے ہوئے دل کا کیا کروں...... ؟ کیا ٹوٹے ہوئے دل جڑ بھی سکتے ہیں؟" وہ آنکھوں میں آنسو لیے بڑی اماں سے پوچھ رہی تھی۔

"وقت سب سے بڑا مرہم ہے میری بچی...... وہ خود ہی ان زخموں کو بھرے گا۔" بڑی اماں نے بھی آبدیدہ ہو کر عنایہ کو بھینچ لیا تھا۔

"تو پھر بڑی اماں...... ابھی کچھ مت کہیں، کچھ مت بولیں، اور اس وقت کا انتظار کریں، میرا اعتبار ٹوٹا ہے، میرا یقین ٹوٹا ہے، میرا دل ٹوٹا ہے، میری محبت بے یقین ہوئی ہے، میں نے اپنا بچہ کھویا ہے اتنا آسان نہیں ہے میرے ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنا...... زارون میرے اندر بکھر گیا ہے اسے اپنے دل میں ترتیب دیتے ہوئے وقت لگے گا، پتھر ہو چکا ہے میرا دل...... اسے موم ہونے میں وقت لگے گا۔" وہ ان کے ساتھ لپٹی سسک رہی تھی۔

☆☆☆

زویا پاکستان آ گئی تھی...... مگر یہاں آ کر بھی وہ انہی عالم دین سے فون پر رابطے میں تھی، ان سے بات کر کے اسے

روحانی خوشی محسوس ہوتی تھی۔ ان کے لیکچرز وہ اٹینڈ کرتی...... وہ واپس آ کر اب اپنے ادھورے پراجیکٹ مکمل کر رہی تھی مگر بے دلی سے...... اس نے پارٹیز میں جانا کم کر دیا تھا...... اپنے اردگرد کی رنگین دنیا سے اس کا دل اچاٹ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جب بھی کوئی شوٹ کرواتی، ریمپ پہ جاتی تو مولانا صاحب کے جملے اس کے آس پاس گونجتے۔

''تمہارے والد تم سے ناراض ہیں، سخت ناراض...... اس فیلڈ کو چھوڑ دو...... گناہوں میں لپٹی ہوئی اس زندگی سے نکل آؤ۔ سچے دل سے توبہ کرلو...... اللہ کو راضی کرلو...... تمہارے مرحوم والد تمہیں معاف کر دیں گے، تم سے راضی ہو جائیں گے۔'' اس کی دلچسپی اب اس چکا چوند دنیا سے ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی اس فیلڈ سے عدم دلچسپی کو دیکھ کر فرقان از حد فکر مند تھا...... اس کا دل بدل رہا تھا۔ اس کے ارادے بدل رہے تھے۔

☆☆☆

عورت نہ توڑنے کی چیز ہے نہ کہیں رکھ کر بھول جانے کی چیز ہے، یہ تو پیار سے رکھنے کی چیز ہے۔ اس کا دل محبت کے گیتوں پہ دھڑکتا ہے، یہ بے وفائی کرنے والوں کو آسانی سے معاف نہیں کرتی۔ عنایہ کے لیے بھی زارون کو معاف کرنا آسان نہیں تھا۔

سردی کا زور آہستہ، آہستہ ٹوٹ رہا تھا۔ زرد موسم آہستہ، آہستہ ہرا چولا پہن رہے تھے۔ فضا میں پھولوں کی خوشبو رچی بسی محسوس ہو رہی تھی لیکن ان کی زندگی میں تو جیسے خزاں آ کر ٹھہر گئی تھی۔ وہ کمرے میں آئی تو زارون بیڈ پر بیٹھا تھا شاید وہ ابھی سو کر اٹھا تھا۔

''ناشتے میں کیا لو گے......؟ میں اسلم سے کہہ کر بنوا دیتی ہوں۔'' وہ ایک فرمانبردار بیوی کا فرض نبھاتے ہوئے اس کے سامنے کھڑی پوچھ رہی تھی تاہم اس کا چہرہ سپاٹ تھا کسی بھی تاثر سے عاری...... وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا اور پھر اس کا ہاتھ تھام کر زارون نے اسے اپنے برابر بٹھا لیا۔

''عینی تم ایک بہت اچھی بیوی ہو، ایک نیک اور وفادار بیوی......! ایمان کے بعد ایک مرد کے لیے نیک بیوی سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہوتی...... اور میں...... میں ایک بدنصیب شوہر ہوں۔ چند لمحوں میں تمہاری ساری وفائیں، تمہاری محبتیں بھول کر ایک تاریک راستے میں جا نکلا جہاں میرے لیے سوائے تباہی کے اور کچھ نہیں رکھا تھا...... تم ایک اچھی بیوی کے تمام فرائض ادا کر رہی ہو مگر تم نے اپنے دل کا دروازہ بند کر لیا ہے...... پلیز عنایہ میرے لیے پھر سے یہ دروازہ کھول دو...... مجھے معاف کر دو، میں کئی بار تم سے معافی مانگ چکا ہوں میں اپنے کیے پر بہت پشیمان ہوں...... میں بھٹک گیا تھا، گمراہ ہو گیا تھا، خدا کے لیے مجھے معاف کر دو، مجھے ساری رات نیند نہیں آتی، مجھے یہ گلٹ سونے نہیں دیتا کہ میں نے تمہارا دل دکھایا ہے۔'' زارون اس کے آگے ہاتھ جوڑے بچوں کی طرح پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑا تھا۔ اور عنایہ اسے یوں روتا دیکھ کر خود بھی رو پڑی تھی۔

''غلطی تو اِک فانی شے ہے زارون، کسی سے بھی ہو سکتی ہے مگر یہ محبت بڑی عجیب چیز ہوتی ہے پتھر ہو جائے تو اسے موم ہونے میں وقت لگتا ہے، بے یقین راستوں کو سچائی کی منزل تک پہنچنے میں کچھ عرصہ لگتا ہے۔ کچھ چیزیں جب گم ہو جاتی ہیں تو وہ آسانی سے نہیں ملا کرتیں...... انہیں ڈھونڈنے میں وقت لگتا ہے...... زارون میں تمہیں اسی طرح معاف کر چکی ہوں جس طرح میں اپنے اللہ سے اپنے لیے معافی کی امید رکھتی ہوں...... مگر میں اس دل کا کیا کروں زارون...... جو گم ہو گیا ہے کہیں...... جو کھو گیا ہے کہیں...... جو ٹوٹ گیا ہے، میں روز اس ٹوٹے ہوئے دل کی کرچیاں سمیٹتی ہوں...... آہستہ، آہستہ جڑ ہی جائے گا۔'' عنایہ کے لفظ اس کے درد کی شدت کو کم کر رہے تھے...... زارون کو اس کے زخموں پہ پھر سے اپنی محبت کے پھاہے رکھنے تھے...... وہ پُرامید تھا ایک دن اسے پھر سے عنایہ کے دل کے بجھے چراغ جلانے تھے۔ عنایہ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی لیکن اس کا دل قدرے مطمئن ہو گیا تھا۔

☆☆☆

خضر نے زری کو اسی کے مطالبے پر طلاق دے دی تھی.....وہ واپس نہیں آنا چاہتی تھی.....خضر کے ذہن سے بھی ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ زندگی میں سکون آ گیا تھا.....تاہم نگہت بیگم بیٹے کا گھر ٹوٹنے سے ڈسٹرب تھیں.....مگر خضر کو زری کو اپنی زندگی سے نکال دینے کا کوئی غم نہیں تھا۔ اب بھی وہ آفس سے گھر آیا تھا اور اس نے آتے ہی بہن سے کھانا مانگا تھا۔ نیا اس کے لیے کچن میں کھانا گرم کر رہی تھی.....نگہت بیگم پڑوس میں کہیں گئی ہوئی تھیں ہاتھ، منہ دھونے کے بعد اس نے ریموٹ اٹھایا تھا اور ٹی وی آن کر لیا تھا۔ ٹی وی پر چلنے والی بریکنگ نیوز نے اسے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ اس کے اردگرد اندر باہر خاموشی چھا گئی تھی.....اس کی نظریں ٹی وی پر مرکوز تھیں۔

"ناظرین ہمارے ملک کی مشہور معروف سپر ماڈل دلنشیں نے شوبز سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے، ان کا کہنا ہے کہ وہ اب ٹی وی پہ کام نہیں کریں گی۔ انہوں نے ماڈلنگ چھوڑ دی ہے۔ ناظرین یہ انکشاف انٹرنیشنل ماڈل دلنشیں نے تھوڑی دیر پہلے ایک پریس کانفرنس میں کیا.....آئیں اس پریس کانفرنس کی کچھ جھلکیاں آپ کو دکھاتے ہیں۔" نیوز کاسٹر بول رہا تھا اب ٹی وی اسکرین پر زویا عرف دلنشیں کو دکھایا جا رہا تھا.....سفید شلوار قمیص پہ سفید ہی دوپٹا سر پر اچھی طرح لیے زویا شوبز چھوڑنے کا انکشاف کر رہی تھی۔ صحافی اس سے شوبز چھوڑنے کی وجوہات پوچھ رہے تھے اس سے مختلف سوال جواب کر رہے تھے.....وہ ان صحافیوں کے ایک، ایک سوال کا جواب دے رہی تھی.....وہ اب کیا کہہ رہی تھی۔ خضر نہیں جانتا تھا اس کے آس پاس بس ایک ہی جملہ گونج رہا تھا۔

"دلنشیں نے شوبز سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔"

زندگی ایک معما ہے اسے کوئی نہیں سمجھ سکتا.....اس کا آنے والا ہر دن نیا ہوتا ہے اور ہر دن میں کچھ نیا اور مختلف ہو جانا ہی زندگی ہے.....اور زندگی موت سے زیادہ مشکل ہے۔ یہاں ہر روز کئی بار مرا جاتا ہے اور کئی بار مر کر جیا جاتا ہے۔ یہاں کچھ بھی ہماری مرضی سے نہیں ہوتا.....خضر نے بھی یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن زویا اس سے دور کر دی جائے گی۔ اس سے بچھڑ جائے گی.....وہ ایک پاکیزہ زندگی گزارنے والی لڑکی گناہوں کی دلدل میں دھنس جائے گی.....وہ بھی شاید اسی کی وجہ سے یہاں تک پہنچی تھی.....جب سے زویا اس کی زندگی سے گئی تھی اس کی زندگی، زندگی نہ رہی تھی۔ اس کی بزدلی نے زویا کو اس سے دور کیا تھا.....اس کا سکون غارت ہو گیا تھا۔ وہ خود کو زویا کا مجرم سمجھتا تھا اور یہ احساسِ جرم اسے بے چین رکھتا تھا.....اپنے بے چین دل کو قرار دینے کے لیے اپنی اجڑی ہوئی ویران زندگی میں پھر سے بہار لانے کے لیے اور اپنے مرحوم ماموں کی روح کو قرار دینے کے لیے اور سب سے بڑھ کر اپنے دل کی خوشی کے لیے خضر نے ایک بڑا فیصلہ کیا تھا.....زویا کو پھر سے اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ۔

اور اس فیصلے کو نہ تو اس کی ماں بدل سکتی تھی اور نہ اب اس کی بہنیں.....اسے اب نہ دنیا والوں کی پروا رہی تھی اور نہ گھر والوں کی.....بہت پہلے اس کی بزدلی نے ایک غلط فیصلہ کروایا تھا۔ اور اس فیصلے کا نتیجہ وہ بھگت چکا تھا زری کی صورت.....لہٰذا اس بار اس نے صرف اپنے دل کی سنی تھی.....وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جو وہ سوچ رہا ہے وہ اتنا آسان نہیں ہوگا۔ زویا ہرگز، ہرگز آسانی سے اس کا پھر سے ہاتھ نہیں تھامے گی.....وہ کئی بار اس پر غصہ ہوگی، وہ کئی بار اسے ٹھکرائے گی۔ وہ کئی بار اسے کہے گی "تم جس زویا سے محبت کرتے تھے میں وہ زویا نہیں ہوں....." وہ کئی بار یہ کہتے ہوئے روئے گی کہ "اب میں تمہارے قابل نہیں ہوں....." وہ کئی بار یہ کہتے ہوئے تڑپے گی..... "مجھ پر بدنامی کا لیبل لگا ہوا ہے تم یہ لیبل کیسے ہٹاؤ گے۔" وہ کئی بار یہ کہے گی کہ "مجھے نگہت پھپو اور تمہاری تینوں بہنیں کیسے قبول کریں گی؟" مگر خضر نے ان سارے سوالوں کے جواب سوچ لیے تھے.....اسے مطمئن کرتے، کرتے چاہے خضر کو عرصہ بھی لگ جائے اس نے زویا کی رضامندی حاصل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا دل میں.....اسے کسی کی پروا نہیں کرنی تھی۔ اسے صرف اب زویا کو اپنی زندگی میں واپس لانا تھا۔ اسے زویا کو اپنے گھر لانے کے لیے منانا تھا اور اسے کامل یقین تھا نیت صاف ہو، ارادہ مضبوط ہو.....اللہ کا خاص کرم اپنے بندے کے ساتھ ہو تو کچھ بھی پانا، حاصل کرنا مشکل نہیں ہوتا اسے یقین تھا آنے والا وقت

اس کا اور دنیا کا ساتھ لگنے والا تھا۔

☆☆☆

آج نور منزل میں خلافِ توقع صبح بہت جلدی ہوگئی تھی سب افراد اپنے کمروں سے نکل کر لاؤنج میں پلازمہ ٹی وی کے سامنے براجمان ہو رہے تھے...... پینو سب کے لیے چائے بنا رہی تھی۔ زارون جب اپنے کمرے سے نیچے لاؤنج میں آیا تو عنایہ لکڑی کے جھولے میں بیٹھی تھی، وہ دھیرے سے چلتا ہوا اس کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔

ایک ٹی وی چینل کے مشہور مارننگ شو میں اقسم اور مناب کو مدعو کیا گیا تھا اور ایک ہفتے سے ان دونوں کی اس مارننگ شو میں آمد کے میڈیا میں چرچے ہو رہے تھے۔ وہ دونوں شادی کے بعد پہلی بار کسی مارننگ شو میں شرکت کر رہے تھے۔

شو کی میزبان پُرجوش انداز میں اقسم کی آواز...... اس کی گائیکی اور اس کے ٹیلنٹ پہ زمین آسمان کے قلابے ملا رہی تھیں۔

”ناظرین دلوں کو تھام لیجیے...... آپ کی بھرپور تالیوں میں...... پاکستان کی وہ خوب صورت آواز جس نے نہ صرف اپنے ملک بلکہ پڑوسی ملک میں جا کر اپنی آواز کا ایسا جادو جگایا کہ ساری دنیا ان کے گائے گیتوں پہ جھوم اٹھی...... وہ خوب صورت آواز...... وہ خوب صورت پرسنالٹی لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکن پہلی بار اپنی بیوٹی فل اور ٹیلنٹڈ وائف جو ایک بہترین ڈراما رائٹر بھی ہیں کے ساتھ تشریف لا رہے ہیں، آپ کی بھرپور تالیوں میں اقسم چوہدری اینڈ مناب چوہدری......“ اسٹوڈیو میں بیٹھی آڈینس (جن میں زیادہ تعداد لڑکیوں کی تھی) نے اٹھ کر بھرپور اور پُرجوش انداز میں تالیاں بجاتے ہوئے ان دونوں کا استقبال کیا تھا۔ اقسم جینز اور وائٹ شرٹ میں ملبوس تھا جبکہ مناب نے بھی وائٹ کلر کا نہایت دیدہ زیب، خوب صورت سوٹ پہن رکھا تھا۔ دونوں بہت خوب صورت لگ رہے تھے اور مسکراتے ہوئے بیٹھے ہوئے مہمانوں کو ہاتھ ہلا رہے تھے۔

”دونوں کتنے خوب صورت لگ رہے ہیں ناں......؟“ ایشال نے پینو کے ہاتھ سے چائے کا مگ پکڑتے ہوئے کہا۔

”ہاں ماشاء اللہ...... اللہ میرے سب بچوں کو اپنی امان میں رکھے۔“ سمیرا بیگم نے ٹی وی اسکرین پہ دونوں کو دیکھ کر خوشی سے کہا۔

”آمین...... اللہ آنے والا وقت ہمیشہ میرے سب بچوں کے لیے خوشیوں کا پیام لے کر آئے۔ اللہ میرے سب بچوں کو سلوک، اتفاق، پیار، محبت کے ساتھ نظرِ بد سے بچانا......“ بڑی اماں نے بھی خوشگوار موڈ میں ہاتھ بلند کرتے ہوئے دعا دی۔

”اماں آپ کی ان دعاؤں نے ہی ہمیں الحمدللہ تمام آزمائشوں اور پریشانیوں سے نکالا ہے۔“ داؤد چوہدری نے بھی چائے پیتے ہوئے بڑی اماں کی تائید کی تھی۔

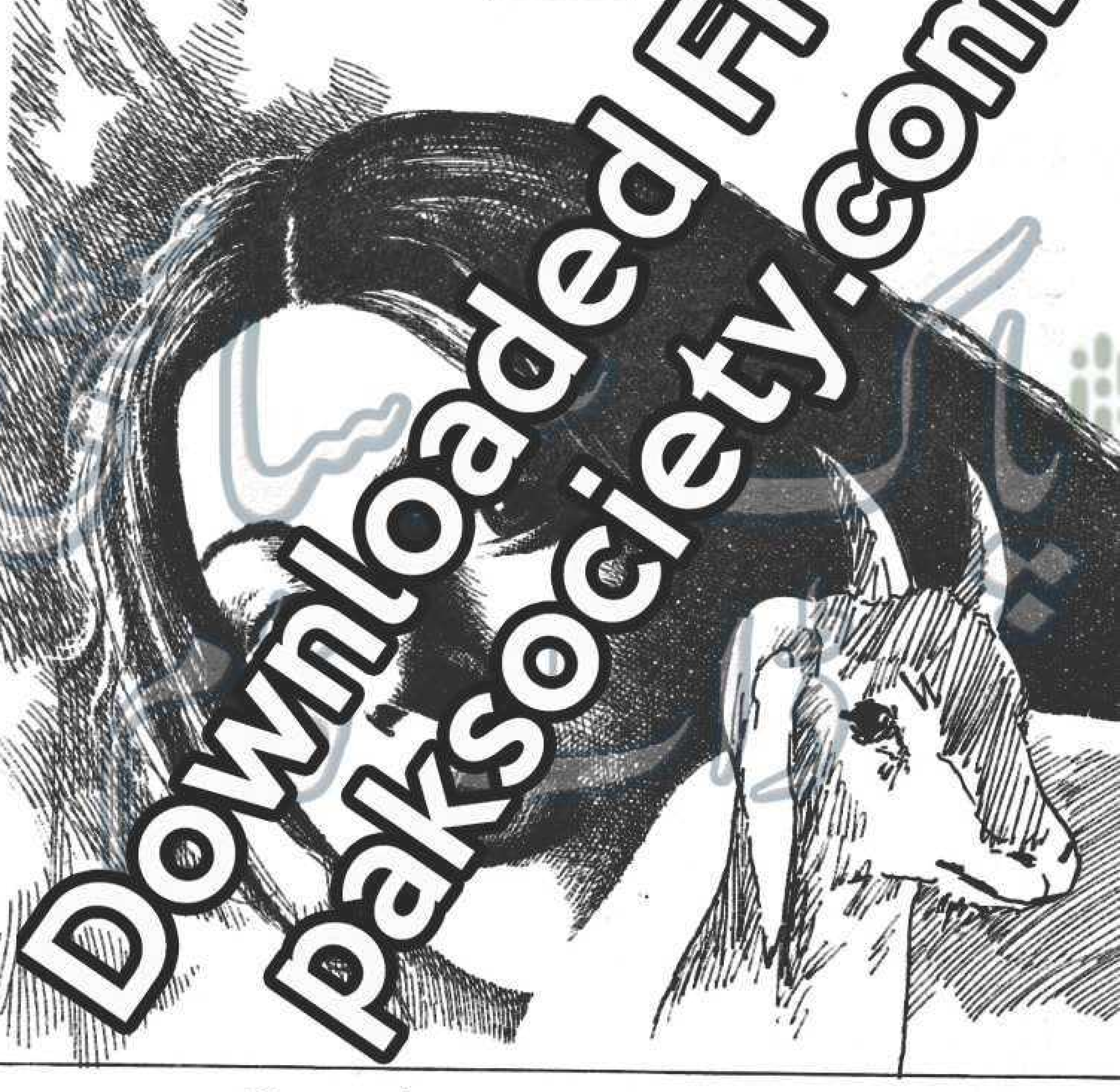
”وڈی اماں......! اب دیکھیے گا اقسم صاحب کے ساتھ ہماری مناب بی بی کو دیکھ کر کڑیاں جل کے سواہ (راکھ) ہو جائیں گی۔“ پینو نے بڑی اماں کو چائے سرو کرتے ہوئے کچھ اس انداز سے کہا تھا کہ لاؤنج میں بیٹھے تمام نفوس مسکرا دیے تھے۔ زارون نے غیر ارادی طور پر اپنا بازو عنایہ کے کندھے پر پھیلایا تھا اور عنایہ نے آج اس کا بازو جھٹکا نہیں تھا...... زارون کو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ پھر سے اس کے دل میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو ہی جائے گا۔

خوشیاں ایک بار پھر نور منزل کی طرف لوٹ رہی تھیں...... بہار ایک بار پھر خوشیوں کا پیام لے کر ان سب کی زندگیوں میں رونق لانے والی تھی...... عشق کے کھیل میں کون جیتا کس کو مات ہوئی، اس نرالے کھیل کا انجام ہو چکا تھا۔ عشق نے اپنی داستان مکمل کر لی تھی۔

ختم شد

قربانی تو دینی ہی پڑے گی

عقیلہ حق



"لو بھئی کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ خاندان ہے، برادری ہے، محلے والے ہیں، نیا، نیا سمدھیانہ ہے، آخر میں کس، کس کو جواب دوں گی۔" رفیعہ بیگم نے سروتہ پاندان پر پٹخا اور کتھا لگی دونوں انگلیوں کو بالوں سے پونچھتے ہوئے تڑخ کر کہا۔

"کوئی آپ سے سوال کرے گا ہی کیوں، جواب دہی کی کیا بات ہے؟" عبدالوہاب اپنی بیوی کے شدید ردِعمل پر حد درجہ حیران ہوتے ہوئے بولے۔

"ارے واہ، خوب کہی آپ نے یہاں تو کوئی چھینک بھی مار دے تو دس لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں پوچھنے، کیا ہوا، چھینک کیوں ماری۔ کوئی مشورہ دیتا ہے، بھپارہ لے لو تو کوئی کہتا ہے دماغ کے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ اتنی چھینکیں کیوں آرہی ہیں اور آپ آرام سے فرمارہے ہیں کہ قربانی نہیں کریں گے تو کیا کوئی پوچھے گا نہیں؟ حد کرتے ہیں، ویسے آپ اتنے ہی معصوم ہیں یا اپنی بہنوں کی طرح معصومیت کی اداکاری کررہے ہیں...... ویسے ایک بات ہے آپ کا پورا خاندان بہت بڑا فنکار ہے، کل ہی مارکیٹ میں جب میں سودا لے رہی تھی تو آپ کی خالہ بھی اسی سبزی والے سے کھڑی پالک خرید رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھا نہیں، میں بھی بس چپکی کھڑی رہی، وہ قینچی کی طرح زبان چلا رہی تھیں اور پالک کا ایک ایک پتا اس طرح چیک کررہی تھیں جیسے ڈاکٹر پھیپھڑوں کے ایکسرے دیکھتے ہیں اور ہم سے معصوم بن کر یہ کہتی ہیں کہ بھیا ہم نے تو نکاح سے پہلے بہوؤں کو نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ کندھا تھپتھپا کر پوچھوں کیوں خالہ جان پالک کے پتے اس طرح چنتی ہو اور بہویں آنکھوں پر کالا چشمہ لگا کر لاتی ہو، ایسا چشمہ جس کے پیچھے سے صرف دولت کے ڈھیر نظر آتے ہیں اور......"

"حد ہوگئی، بات ہو کیا رہی تھی اور آپ کہاں سے کہاں لے گئیں۔" عبدالوہاب نے بیزار ہو کر بیوی کو ٹوکا۔ "میں کب کہہ رہا ہوں کہ قربانی نہیں ہوگی، میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ اس وقت ہاتھ ذرا تنگ ہے، ہم قربانی میں حصہ ڈال لیتے ہیں۔ اللہ پاک تو نیت دیکھتا ہے۔"

"اللہ تو نیت دیکھتا ہے اور یہ دنیا والے؟" رفیعہ بیگم کی سوئی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔

"بیٹی کی سسرال ہے وہاں کیا گائے کا گوشت بھیجیں گے۔ ارے سمدھیانے میں کم از کم بکرے کی دو رانیں تو جائیں، ورنہ وہ لوگ کیا سوچیں گے۔ بیٹی کو دس باتیں سننے کو ملیں گی۔ اور ویسے بھی چھوٹی والی نرگس کے لیے میرا دل احمد بھائی کے بیٹے پر ہے اب اگر بھابی جان کو گائے کے بڑے بھیجوں گی تو وہ کبھی ہمارے گھر آئیں گی پیغام لے کر وہ تو یہی کہیں گی ارے جو لوگ قربانی نہیں کرسکے وہ اپنی بیٹی کو جہیز کیا دیں گے۔" عبدالوہاب بیوی کی بے سروپا باتوں پر حیرت سے انہیں تکے جارہے تھے۔

"میں جانتی ہوں آپ پر قرضہ بھی چڑھا ہوا ہے اور اس مہینے خرچہ زیادہ ہونے کی وجہ سے آپ کا ہاتھ بھی تنگ ہے لیکن...... کیا کروں، قربانی تو کرنی ہی پڑے گی۔" رفیعہ بیگم نے میاں کے چہرے پر تفکر کے سائے پھیلتے دیکھ کر ذرا رسان سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"بیٹی کی سسرال گوشت جانا ہے، رشتے داروں میں بھرم رکھنا ہے، محلے والوں میں ناک اونچی رکھنے کے لیے، قربانی تو کرنی پڑے گی۔" عبدالوہاب نے اپنے آپ سے کہا اور خاموشی سے آنکھیں بند کرکے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

☆☆☆

"الحمدللہ ذی الحج کا مہینہ ہے، یہ اللہ کے نزدیک مقدس مہینوں میں شامل ہے...... اس میں اللہ پاک کی رحمتیں اور مغفرتیں عروج پر ہوتی ہیں۔ تم یہ سوچو بیٹا، اس ماہ میں فریضۂ حج ادا ہوتا ہے۔ لاکھوں مسلمانوں کو اللہ کے گھر کی زیارت نصیب ہوتی ہے، بے شمار لوگ مغفرت کی پرچی ہاتھ میں لے کر واپس آتے ہیں بلکہ تم میری اس بات کو اس طرح سمجھو جب ہم بہت خوش ہوتے ہیں تو ہم ان لوگوں کو جو ہم سے ملنا چاہتے ہیں یا جن سے ہم ملنا چاہتے ہیں، دعوت پر بلاتے ہیں، خاطر تواضع کرتے ہیں، حسبِ حیثیت تحفے تحائف اور مٹھائیاں بھی تقسیم کرتے ہیں، بالکل اس ماہ ویسے تو تاقیامت اللہ کی رحمت عام ہے لیکن اس ماہ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے گھر بلاتا ہے اور ہم گناہ گاروں کی میزبانی کرتا ہے اور پھر ہمارا بھی تو فرض ہے ناں ہم اس کا حکم

مانتے ہوئے حسبِ حیثیت سنت ابراہیمؑ ادا کریں۔''

مولوی عبدالقدوس نے مسجد کی طرف جاتے ہوئے اپنی انگلی تھامے اپنے چھوٹے بیٹے عبداللہ کو نرم اور میٹھے لہجے میں سمجھایا۔

''تو ابا کیا ہم بھی قربانی کریں گے؟'' عبداللہ نے جلدی سے پوچھا کہ بکرے کی رسی پکڑ کر گلی میں گھومنے کا تو اس کو بھی بے حد شوق تھا۔

''ہاں بیٹا قربانی واجب ہے، ہر صاحبِ نصاب مسلمان پر۔ اللہ کو ہماری پُرخلوص قربانی چاہیے، اس کے پاس ہمارے قربان شدہ جانور کا خون اور گوشت نہیں جاتا...... جاتا ہے تو ہماری نیت اور خلوص انشاء اللہ یوں تو میری نیت ہے لیکن اگر ہاتھ نہیں پڑا تو پھر تمہاری امی اور اپنی طرف سے قربانی میں حصہ ڈال دوں گا......'' مولوی عبدالقدوس نے بیٹے کو محبت سے دیکھتے ہوئے سمجھایا۔

''امی کی طرف سے کیوں؟ امی تو عورت ہیں۔'' عبداللہ نے پوچھا۔

''بیٹا جو صاحبِ نصاب ہے، اس پر قربانی واجب ہے۔'' مولوی عبدالقدوس نے عبداللہ کے چہرے پر الجھن دیکھ کر کہا۔

''ارے مولوی صاحب، اس دس بارہ سالہ بچے کو کیوں سمجھا رہے ہیں، اس معصوم کو کہاں سمجھ آئیں گی یہ باتیں۔'' مولوی عبدالقدوس کے قریب سے گزرتے ڈاکٹر صاحب نے رک کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیوں ڈاکٹر صاحب جب ہم ڈھائی، تین سالہ معصوم بچے کو کندھے پر ڈال کر اسکول لے جاتے ہیں جب ہم اس معصوم کو فرنگی زبان سکھانے کے لیے دن رات ایک کر دیتے ہیں، اس کے کھلونے چھین کر اس کے ہاتھ میں کتابیں تھما دیتے ہیں اس وقت تو ہم یہ نہیں کہتے کہ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟ ہم ہر روز صبح سردی، گرمی، ہنگامے، افراتفری ہر حالت میں بچوں کو اٹھاتے ہیں اور اسکول بھیجتے ہیں لیکن فجر کی نماز کے لیے اٹھاتے وقت ہمارے دلوں میں شدید درد اٹھتا ہے، اس لیے ہمیں گہری نیند سوتے بچوں پر رحم آتا ہے، ترس آتا ہے اور میرے خیال سے وہ رحم نہیں ظلم ہوتا ہے۔ اپنے ساتھ بھی اور اس معصوم کے ساتھ بھی۔''

مولوی صاحب کی بات پر ڈاکٹر صاحب گہری سوچ میں پڑ گئے۔ نماز کے بعد مسجد میں مولوی عبدالقدوس لوگوں کے مسائل سنا کرتے اور قرآن و سنت کی روشنی میں ان کے تسلی بخش جواب دیتے اس وقت بھی چند نمازی انہیں گھیرے بیٹھے تھے۔

''ویسے مولوی صاحب جن کے پاس باون تولہ چاندی اور ساڑھے سات تولہ سونا ہو، وہی صاحبِ نصاب ہوتا ہے؟'' ایک صاحب نے اپنی علمیت کا رعب جھاڑا۔

''نہیں، برادرِ محترم، یہ وہ چور دروازے ہیں جو ہم نے ڈھونڈ رکھے ہیں ورحقیقت ہر دور میں صاحبِ نصاب ہونے کا معیار بدلتا رہتا ہے۔ اس سال جس کے پاس 63000 روپے ہیں وہ صاحبِ نصاب ہے اسے زکوٰۃ بھی دینی ہے اور قربانی بھی کرنی ہے اور قربانی کرنے کے لیے صرف کیش کو کیوں دیکھتے ہو، میرے بھائیوں گھر میں موجود سامان، سامانِ تجارت حتیٰ کہ کام کرنے کے اوزاروں کی قیمت کا تعین بھی کرنا چاہیے۔'' مولوی عبدالقدوس بول رہے تھے...... اور آس پاس بیٹھے اشخاص جس میں سے اکثر قربانی یہ کہہ کر نہیں کرتے تھے کہ ہم صاحبِ حیثیت یا صاحبِ نصاب نہیں ہیں۔ سوچ رہے تھے یا اللہ قربانی تو کرنی پڑے گی۔

☆☆☆

''او مائی ڈیئر سن......! ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ یہ بہت ضروری ہے۔ قربانی تو کرنی ہے۔'' مسز جمال نے اپنے لمبے، لمبے ناخنوں کو کیوٹیکس سے سجاتے ہوئے گٹار بجاتے جمی سے کہا۔

''کیوں ممی! مجھے خون پسند نہیں ہے۔ I hate its smell۔''

''ہاں میں جانتی ہوں میرے بچے لیکن میں کیا کر سکتی ہوں۔ اللہ نے کہا ہے کہ قربانی کرو۔''

''اوکے ممی لیکن میں آپ سے کہہ رہا ہوں یہ غریبوں کی طرح گائے، بکرے گھر کے باہر بندھے مجھے بالکل پسند نہیں اور پلیز آپ لان میں بھی جانور مت کھڑے کر دیجیے گا۔ آپ جانتی ہیں کہ میں نے کتنے مہنگے پلانٹس پوری دنیا سے اکٹھے کیے ہیں۔'' جمی نے بیزار لہجے میں کہا۔

''اوکے...... ڈارلنگ، میں کون سا یہ سب گندگی اور بکھیڑا پسند کرتی ہوں، اب تو شہر میں بہت سارے ایسے ادارے کھل گئے ہیں کہ وہ آپ سے مکمل پے منٹ لے لیتے ہیں اور پھر قربانی کا گوشت آپ کے بتائے ہوئے وزن میں پیکٹ بنا کر بھیج دیتے ہیں۔ آپ وہ گوشت کے پیکٹ باہر کے باہر ہی تقسیم کر دیں۔'' مسز جمال نے جمی کے چہرے کے بگڑے زاویوں کو دیکھتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''بٹ ممی......''

''اب کچھ نہیں ڈارلنگ، بس یوں سمجھ لو مجبوری ہے، جہاں بہت سارے ایونٹ ہوتے ہیں، وہاں ایک یہ بھی سہی...... لیکن میری جان قربانی تو کرنی ہی پڑے گی کیونکہ......''

''بیگم صاحبہ جی ایک بات بولوں برا نہ منائیے گا۔'' ابھی ان کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ برسوں پرانی ملازمہ اماں صغریٰ نے جو قریب کسی کام میں مصروف تھیں اپنا فرض سمجھ کر کچھ کہنا چاہا۔

''ہاں بولو کیا کہہ رہی ہو؟'' مسز جمال نے یہ کہتے ہوئے اپنے ناخنوں پر ایک دفعہ پھر پھونک ماری۔

''بیگم صاحبہ، بابا کو بتائیں کہ قربانی مجبوری نہیں بلکہ یہ دینی فریضہ ہے جو ہر صاحب استطاعت پر فرض کیا گیا۔'' اماں صغریٰ کسی عالم کی طرح بول رہی تھیں اور مسز جمال سن کھڑی تھیں۔

☆☆☆

''ابا دیکھیں یہ میں نے بہت سارے پیسے جمع کیے ہیں، ابا بکرا لینے چلیں گے ناں۔'' پپو نے ٹوٹے گلک کے ٹکڑوں میں سے سکے چنتے ہوئے توقیر احمد سے کہا۔

''ان پیسوں سے تم بکرا خریدو گے؟'' باوجود تھکن اور پریشانی کے توقیر احمد کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''ہاں ابا...... پچھلے سال اماں نے کہا تھا کہ پیسے جمع کر کے اگلے سال ہم بھی بکرا ضرور خریدیں گے تو بس ابا میں نے اسی دن یہ گلک خرید لیا تھا۔ میں جب سے باہر کی چیزیں نہیں کھاتا بس سارے پیسے گلک میں ڈالتا ہوں، اب تو ہم ضرور بکرا خریدیں گے، پتا ہے ابا برابر والا احمد اور سامنے والا گڈو اپنے بکروں کو روز گلی میں ٹہلاتے ہیں، ایک دفعہ بھی مجھے اسی پکڑنے نہیں دیتے لیکن جب ہمارا بکرا آئے گا ناں تو میں ان کے بکروں سے ریس لگاؤں گا اور پھر سب بچوں کو بکرا گھمانے کے لیے رسی بھی پکڑا دیا کروں گا۔ ابا سب کا دل چاہتا ہے ناں۔''

مکان کا کرایہ، ٹپکتی ہوئی چھت، رضیہ کی دوائیاں اور راشن والے کا قرضہ، یا اللہ میں کیا کروں؟ اور پھر اس معصوم کی خواہش میرے مالک، میں غریب، میں نادار، میں قرضدار، میں پریشان، میں کیسے اس بچے کو سمجھاؤں جو ہاتھ میں چند سکے لیے کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے کہ قربانی تو کرنی ہی پڑے گی۔''

پپو مسلسل بول رہا تھا، سکے الٹ پلٹ کر گن رہا تھا اور توقیر احمد آنکھیں بند کیے اپنے رب سے محوِ کلام تھے۔

☆☆☆

''تو پھر تم مان گئیں......'' روزی نے حیرت سے ایشل سے پوچھا۔

''ہاں......'' ایشل کی آواز نم لیکن لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔

''کیوں ایشل کیوں؟ تم جانتی ہو، علی بھائی تمہیں پاگلوں کی طرح چاہتے ہیں۔'' روزی چیخ پڑی۔

''صرف علی ہی نہیں روزی، میں بھی علی کو بے حد

.... چاہتی ہوں لیکن میرے ماں، باپ، میرے ماں باپ کا بھی تو مجھ پر بہت حق ہے مجھے نہیں پتا تھا کہ میرے ابا نے بچپن ہی سے میرا رشتہ میرے تایا زاد سے طے کر رکھا ہے۔ اور میں خاندان کی پہلی لڑکی ہوں جو میڈیکل کالج تک پہنچی ہے۔ اگر آج...... آج میں بغاوت کروں گی میں انکار کروں گی۔۔تو میرے خاندان کی آنے والی کتنی لڑکیاں کھلی فضا میں سانس لینے اور اعلیٰ تعلیم لینے سے محروم کردی جائیں گی تو میری بہن قربانی تو دینی ہی پڑے گی۔'' ایشل نے مضبوط لیکن بھیگے لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا...... کس کو کیا معلوم کہ گائے، بکرے اور دیگر جانور سال میں صرف ایک بار قربان ہوتے ہیں لیکن اونچی، اونچی دیواروں میں رہنے والیاں عزتوں اور خاندانوں کے لیے روز قربان ہوتی ہیں کیونکہ ان سے کہا جاتا ہے۔

''قربانی تو دینی ہی پڑے گی۔''

☆☆☆

''دیکھو ماشاء اللہ کئی گھروں میں قربانی ہوئی ہے جیسے ہی کہیں سے گوشت آتا ہے تو سالن چڑھاتی ہوں۔'' نفیسہ نے دروازے کی جھری میں سے گلی میں جھانک کر دیکھتے ہوئے پیچھے بیٹھے بچوں سے کہا۔

''اماں میں تھوڑا سا گوشت بھون کر کھاؤں گا۔ پچھلے سال بھی آپ نے کھانے نہیں دیا تھا......'' دس سالہ رضوان نے رال ٹپکاتے لہجے میں ماں سے شکوہ کیا۔

''بیٹا ہمارے مال میں دوسروں کا بھی حصہ ہوتا ہے، پچھلے سال میں نے تھوڑا سا گوشت تمہاری استانی جی کو بھیج دیا تھا۔ ان بیچاریوں کے ہاں تو کہیں سے دو بوٹیاں تک نہیں آئی تھیں۔ لیکن انشاء اللہ اس دفعہ میں پہلے دو چار بوٹیاں تم کو دے دوں گی تم تکے بنا کر کھالینا۔'' نفیسہ نے پورے سال میں بار، بار کیا ہوا وعدہ پھر دوہرایا۔

''اماں، گلی کے نکڑ والے احمد صاحب کی گائے ہی کٹ گئی۔'' بارہ سالہ احمد نے گھر میں داخل ہو کر پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ سب کو اطلاع دی۔

''اماں ہمارے ہاں کب گوشت آئے گا۔ اللہ کی قسم بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' آمنہ نے منہ بنایا۔

''بس بیٹا آہی جائے گا ذرا صبر کرو......'' نفیسہ نے تسلی دی۔

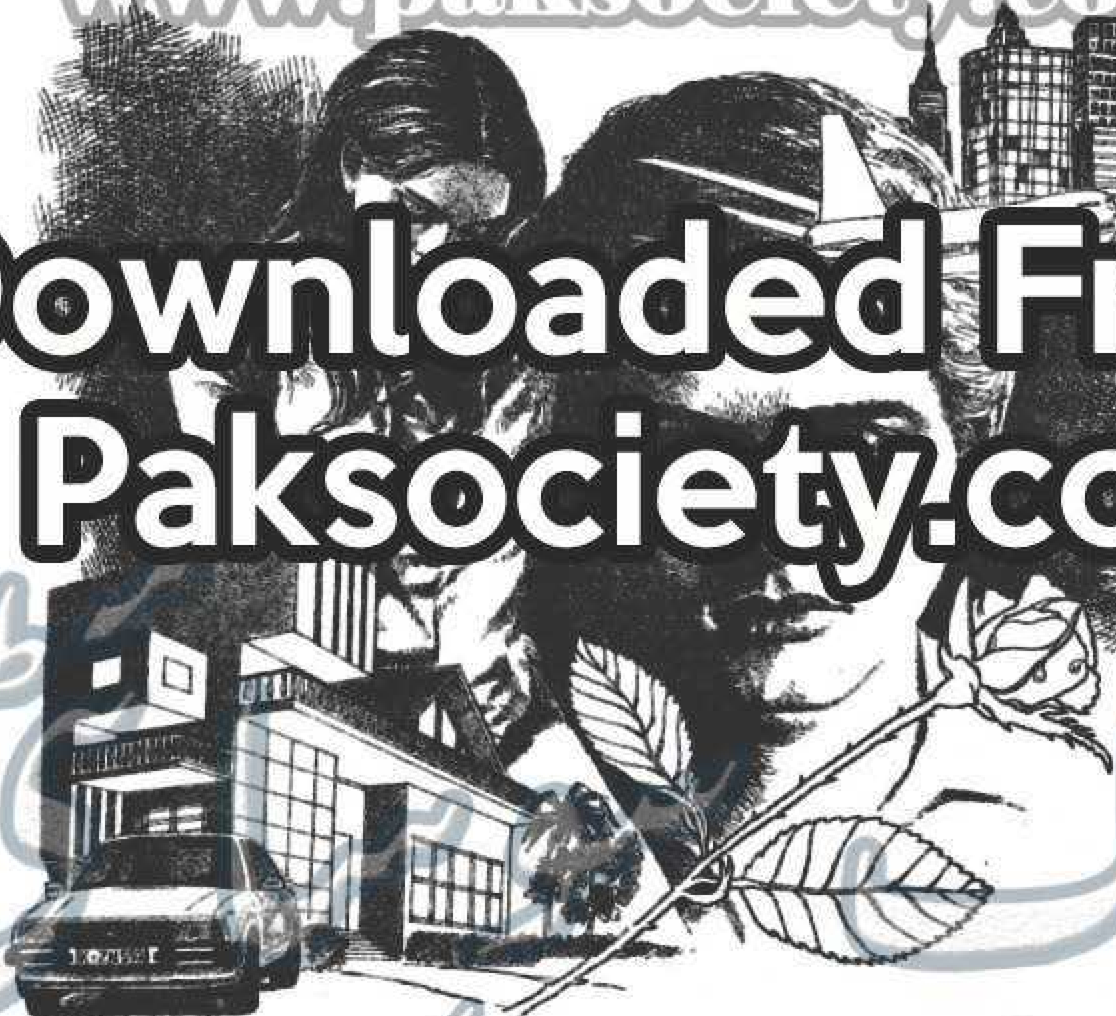
''پتا نہیں کیا ہوا، لگتا ہے سب بھول گئے۔'' دوپہر ڈھلتے دیکھ کر شرمندہ، شرمندہ سی نفیسہ نے آلو کی قتلیاں ڈش میں نکالتے ہوئے بچوں سے کہا۔

''بھول گئے؟'' رضوان کے حلق میں باسی روٹی کا نوالہ پھنسا۔

''سب ہی نے اپنے، اپنے فریج اور ڈیپ فریزر بھر لیے ہوں گے، کیا تھا جو دو چار بوٹیاں میرے یتیم بچوں کے لیے بھیج دیتے، یہ لاکھوں روپوں کی قربانیاں کرنے والے سارے سال ہی گوشت اور مرغن کھانا کھاتے ہیں، کیا انہیں یہ نہیں معلوم کہ ان کے مال میں، ان کی قربانی میں ہم جیسے سفید پوش غریبوں کا بھی حصہ ہے۔ جو اپنی عزت کا بھرم رکھے گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں۔'' نفیسہ نے نم آنکھوں اور بھاری دل کے ساتھ ایک بے ضرر سا شکوہ کیا۔

''ارے رضوان دکھی کیوں ہوتے ہو، آج قربانی کا دن ہے، سب اللہ کی راہ میں قربانیاں کر رہے ہیں اور ہم نے بھی قربانی دی ہے اپنی خواہشات کی اور تمہارے تکوں کی...... تو بس خوش ہو جاؤ، ہم بھی آج سے صاحب نصاب ہو گئے...... ہم نے بھی قربانی دی ہے۔'' آمنہ نے آنکھوں میں آئے آنسو پیتے ہوئے چھوٹے بھائی رضوان کے منہ میں باسی روٹی میں آلو کا ٹکڑا رکھتے ہوئے کہا تو اس کی بات پر سب کے چہروں پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی...... اور رضوان نے نوالہ چباتے ہوئے اپنی عمر سے زیادہ بڑا جملہ کہا۔

''واقعی قربانی تو دینی ہی پڑے گی۔''



منی ناول

ہم کو محبت نے بدنام کیا

سیما رضا ردا

"اس جہانِ فانی میں انسان اپنی تنہائی کو کم کرنے کے لیے سہارا بلکہ سہارے تلاش کرتا ہے اور اسی تلاش کے دوران اسے جو سہارے ملتے ہیں انہی میں وہ کبھی مخلص دوست تو کبھی اپنا محبوب ڈھونڈتا ہے......ایسا کیوں ہوتا ہے۔"

تشمیرہ بانو کا قلم اس "کیوں" کے آگے رک گیا تھا اور اس کی ساری فلاسفی اس کے کمرے کی ہر چیز کی طرح خاموش تھی یا وہ تھک گئی تھی۔ اس لیے جھنجلا کر قلم



ایک طرف پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئی..... پہلے اپنے اطراف بکھرے کاغذات سمیٹ کر میز پر رکھے پھر گھڑی پر نظر پڑی تو رات کا آدھا پہر گزرنے کا احساس ہوا لیکن تشمیرہ کے لیے یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ چار سال پہلے جب اس نے یونیورسٹی جوائن کی تھی تو یہ اس کا معمول بن گیا تھا اور عموماً تو اکثر .... ویک اینڈ پر وہ سوتی ہی نہیں تھی۔ اپنی اس ذہنی الجھن کو سلجھاتے ہوئے وہ یہ بھی بھول جاتی کہ سورج کی کرنیں بہت خاموشی سے اس کے کمرے میں چلی آئی ہیں اور اسے احساس تب ہوتا جب تایا جی خدائے واحد کے تمام فرائض سے فارغ ہو کر روز کی طرح اس کے کمرے پر دستک دیتے تو اگر وہ جاگ رہی ہوتی تو پہلی دستک پر دروازہ کھول دیتی اور اگر سو رہی ہوتی تو پھر تایا جی دو تین دستک کے بعد ذرا سا دروازہ کھول کر اسے دیکھ کر مسکرا کر دعائیں دیتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ جاتے۔

اس وقت بھی وہ اسے سوتا دیکھ کر واپس پلٹ گئے تھے کیونکہ تایا جی اس کی روٹین سے واقف تھے کہ کس طرح اس نے ضد کر کے صحافت میں ایڈمیشن لیا تھا اور اس کی خواہش کی خاطر ہی وہ لاہور سے کراچی والے گھر میں آئے تھے جس پر تائی جی نے کتنا واویلا مچایا تھا اور اب بھی تایا جی راہ داری سے گزر کر لاؤنج میں آئے تو تائی جی جو ملازمہ پر برس رہی تھیں...... تایا جی کو آتا دیکھ کر انہوں نے پہلے ملازمہ کو جانے کا اشارہ کیا پھر تایا جی کو دیکھنے لگیں۔

''آج آپ آفس نہیں جائیں گے؟'' انہوں نے ملائمت سے پوچھا۔

''جاؤں گا کیوں نہیں......''

''پھر ابھی تک آپ ایسے ہی ٹہل رہے ہیں، میرا مطلب ہے تیار......''

''ہو جاؤں گا......'' تایا جی کا انداز ٹالنے والا تھا۔ تائی جی ٹھٹک کر انہیں دیکھنے لگیں۔

''ایک کپ چائے تو پلا دو نیک بخت......'' وہ ان کے انداز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔

''جی پلا دیتی ہوں لیکن اپنی لاڈلی تشمیرہ کو بھی سمجھائیں، میں تو اس کے بھلے کے لیے ہی کہتی ہوں کل کو پرائے گھر جائے گی تو لوگ کیا کہیں گے کہ اپنی اولاد نہیں تھی اس لیے توجہ نہیں دی۔'' وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولیں۔ تائی جی اپنی عادت سے مجبور ہو کر ایک بار پھر تایا جی کے سامنے شروع ہو گئی تھیں اور یہ اُن کا معمول بن چکا تھا کہ اپنے لہجے میں تشمیرہ کے لیے فکر کا احساس لا کر وہ تایا جی کو اس کی غیر ذمے داری کا احساس دلاتی رہتیں۔ صرف تایا جی کو ہی نہیں اگر موقع ملتا تو تشمیرہ کو بھی نہ جانے کیا کچھ سنا دیا کرتیں اور تشمیرہ اتنے برس ان کے ساتھ رہنے کے باوجود اب تک ان کے مزاج کی عادی نہیں ہو پائی تھی۔

''دیکھیں ابھی تک سو رہی ہے! یونیورسٹی سے آئے گی تو پھر سو جائے گی آخر گھر داری کب کرے گی؟''

''ضرور کرے گی، فکر کیوں کرتی ہو؟'' تایا جی نے بے فکری سے کہا۔

''آپ تو بس پتا نہیں کیا سوچ کر بیٹھے ہیں، ماں نہیں لیکن ماں بن کر پالا ہے فکر تو رہے گی ناں مجھے۔'' تایا جی نے انہیں حیرت سے دیکھا تو تائی جی نظریں چرا گئیں۔

''اچھا بابا سمجھاؤں گا اسے...... ویسے بھی اس کا آخری سال ہے اس کے بعد تو اس نے گھر کے کام ہی کرنے ہیں۔''

''کس نے کام کرنے ہیں؟'' تشمیرہ نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے تایا جی کی آخری بات سنی تھی اس لیے پوچھنے لگی تو تایا جی نے پہلے تو تائی جی کو جانے کا اشارہ کیا پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''آج اتنی جلدی کیسے اٹھ گئی ہماری گڑیا۔''

''آج یونیورسٹی میں اسائنمنٹ جمع کروانے ہیں اس لیے آپ مجھے یونیورسٹی چھوڑ دیں گے تایا جی......؟'' وہ تایا جی کے سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے

بولی تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ جس طرح بیٹھی تھی اسی طرح تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بس میں دس منٹ میں تیار ہو کر آئی......''

تشمیرہ یہ کہہ کر تیزی سے لاؤنج سے نکل کر اپنے کمرے میں آئی اور اپنی فائل وغیرہ ٹھیک کرنے کے بعد الماری سے عجلت میں ایک سوٹ نکال کر واش روم میں بند ہوگئی۔ اسے تقریباً دس منٹ ہی لگے تھے تیاری کرنے میں لیکن اس کے باوجود اسے یوں لگ رہا تھا جیسے نہ جانے کتنا وقت گزر گیا ہو اور جب وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو پہلے تایا جی نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا پھر اسے لیے ہوئے ڈائننگ ہال میں آگئے جہاں تائی جی ملازمہ کے ساتھ مل کر ناشتا لگا رہی تھیں۔ تشمیرہ کو یوں لگا جیسے دنیا کا سب سے فضول کام ناشتا کرنا ہو اور وہ بھی باقاعدہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر وقت ضائع کرنا......اس کے لیے دنیا میں سب سے اہم اپنی پڑھائی تھی اس کے علاوہ وہ تمام کام ضرورت کے مطابق کرتی تھی لیکن گھر کے کام وہ تائی کے کہنے سے پہلے ہی کر دیتی تھی لیکن اس پر بھی اسے تائی کی ڈھیروں صلواتیں سننے کو ملتیں اور وہ حیران ہونے کے ساتھ افسردہ ہو کر اپنے ماں، باپ کو سوچتی جو اسے چھ سال کی عمر میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

اس وقت اس نے بڑی عجلت میں ناشتا کیا اور چائے کا آخری سپ لیتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی تو تایا جی بھی اس کے ساتھ، ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''یہ کیا طریقہ ہے؟'' تائی جی نے بری طرح ٹوکا لیکن پھر فوراً ہی اپنی بات سنبھالتے ہوئے بولیں۔ ''میرا مطلب ہے ناشتا تو ٹھیک سے کر لو......اور دیکھو تمہارے تایا جی نے تو کچھ کھایا بھی نہیں۔''

''نہیں، میں کھا چکا ہوں۔'' تایا جی نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولے۔

''کہاں کھایا ہے آپ نے کچھ! دیکھیں انڈا ویسے ہی رکھا ہے اور چائے بھی......'' تائی جی نے کہا تو تایا جی اُن کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک گھونٹ میں ساری چائے پی کر اسے یوں دیکھنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں ''چلو'' اور تشمیر ان کا اشارہ سمجھ کر ان کے ساتھ چلتی ہوئی گاڑی میں آبیٹھی۔

''سوری تایا جی......میری وجہ سے۔''

''میری گڑیا......میں ناشتا کر چکا تھا اور اب اگر بھوک لگی تو آفس میں کھا لوں گا......'' انہوں نے گاڑی ریورس کرتے ہوئے گھر کے مین گیٹ سے گاڑی باہر نکالی اور آہستہ، آہستہ مین روڈ پر لے آئے۔

وہ ایک حساس طبیعت کی مالک تھی اس لیے اسے تایا جی کا ناشتے پر سے یوں اٹھ جانا اب ٹھیک نہیں لگ رہا تھا اگر اسے یونیورسٹی جلدی نہیں پہنچنا ہوتا تو وہ کبھی تایا جی کو زحمت نہیں دیتی۔ گاڑی سڑک پر رواں تھی اور وہ خاموش بیٹھی جانے کن سوچوں میں غلطاں تھی۔ تایا جی نے ایک نظر اسے دیکھا جو اب شیشے سے باہر کی دنیا دیکھنے میں مصروف تھی۔ وہ بالکل اپنے باپ سرمد علی کی کاپی تھی اور مزاج میں بے صبری بھی شاید باپ سے ہی ورثے میں ملی تھی۔ اس وقت تشمیرہ جس انداز میں بیٹھی تھی تایا جی کو ایسا لگا جیسے اس کی جگہ سرمد علی آکر بیٹھ گیا ہو۔ ایک آنسو ان کی آنکھوں سے نکل کر قمیص میں جذب ہو گیا۔ تایا جی سگنل پر گاڑی روک کر اسے دیکھنے لگے تھے اور ذہن ماضی میں بھٹک گیا تھا۔

''آپ کو پتا ہے بھائی جان! اگر انسان خود سے مخلص ہو تو اسے دوست کی ضرورت نہیں رہتی اور یہ میرا اپنا تجزیہ ہے۔''

''اچھا......'' سرمد علی کی بات پر وہ یوں ہی ہنسے تھے۔ سرمد علی کی یاد ان پر بری طرح حملہ آور ہوئی۔ لال بتی، زرد بتی میں تبدیل ہو کر سبز ہو گئی تھی۔

''تایا جی سگنل کھل چکا ہے۔'' تشمیرہ کی آواز نے ان کی سوچ کو منتشر کر دیا......ساتھ ہی گاڑیوں کے ہارن بھی انہیں سنائی دینے لگے۔ تایا جی نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ سارا رستہ خاموشی سے کٹا اور پھر یونیورسٹی کے مین گیٹ پر ہی گاڑی کو بریک لگایا تھا۔

''تھینک یو تایا جی......'' اس نے گاڑی سے

اترتے ہوئے کہا اور پھر دروازہ بند کرتی ہوئی ذرا جھجک کرتایا جی سے بولی۔

''آپ پلیز تایا جی، کچھ کھا لیجیے گا، مجھے آپ کی فکر رہے گی۔'' اس کے آخری جملے پر وہ محظوظ ہو کر مسکرائے اور اثبات میں سر ہلا کر اس کی طرف پیار سے دیکھا اور دل میں اسے ڈھیروں دعائیں دیتے ہوئے گاڑی آگے بڑھالی۔ ثمیرہ کچھ دیر تایا جی کی گاڑی کو پیچھے سے دیکھتی رہی پھر گیٹ سے اندر داخل ہوگئی۔ اچانک اسے یوں لگا جیسے اس کی صبح اب ہوئی ہو......فضا میں ایک عجیب سی خوشبو پھیلی تھی۔ خاموشی کو توڑتے ہوئے لڑکیوں کے قہقہے، لڑکیوں کی مستقبل کے عزائم لیے بہ آواز بلند گفتگو...... ثمیرہ بانو اپنے ڈپارٹمنٹ میں داخل ہوگئی تھی۔

☆☆☆

اعزاز شاہ کی نیند میں مسلسل موبائل پر ہونے والی بیل خلل ڈال رہی تھی اور موبائل فون کی شاید خوش قسمتی تھی جو کمرے میں ہونے کے باوجود بھی قریب نہیں تھا۔ ورنہ اعزاز شاہ اس کے ساتھ بہت برا سلوک کرتے......رات دیر سے سونے کی وجہ سے جسم تھکاوٹ سے چور تھا اور آنکھیں نیند سے اتنی بوجھل کہ آدھا دن گزرنے کے باوجود ان کی آنکھ نہیں کھل رہی تھی۔ جبکہ دل فون کرنے والے کو ہزاروں گالیاں دے رہا تھا اور جب موبائل فون نے خاموشی تان لی تو اعزاز شاہ ایک بار پھر نیند کی وادیوں میں اتر گئے تھے کہ اچانک وانیہ اعزاز نے بہت جارحیت سے واش روم کا دروازہ بند کیا تھا جس پر اعزاز شاہ کی دوبارہ ذرا سی آنکھ کھلی تھی لیکن بولنے کی ہمت اب بھی نہیں ہوئی تھی وانیہ اعزاز نے گیلا تولیا ایسے ہی اچھال کر ایک طرف پھینک دیا اور خود اپنا موبائل تلاش کرنے لگی۔ کبھی تکیے کے نیچے دیکھتی تو کبھی الماری اور دراز کے اندر ایک موبائل کے لیے وہ پاگل ہو رہی تھی۔

''اعزاز......اعزاز اٹھو، مجھے دیکھنا ہے کہ کہیں تمہارے کمبل میں میرا موبائل تو نہیں ہے۔'' وانیہ نے بالآخر سوئے ہوئے اعزاز شاہ کو بری طرح جھنجوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی نیند سے بوجھل آنکھوں کو بہ مشکل کھولے وانیہ کو دیکھنے لگے۔

''کیا ہوگیا ہے امیرے کمبل میں کہاں سے آ گیا تمہارا موبائل؟''

''دیکھو اعزاز، مجھے بہت ضروری جانا ہے، میرا موبائل نہیں مل رہا اور مجھے لگتا ہے تمہارے قریب ہی ہوگا باقی سب جگہ میں دیکھ چکی ہوں۔ مجھے کہیں نہیں ملا......''

''اچھا دیکھ لو بابا نہیں ہے یہاں۔'' اعزاز شاہ بڑی مشکل سے ہمت کر کے اٹھ بیٹھے تھے لیکن نیند اس قدر طاری تھی کہ وہ ایک طرف ڈھے گئے اور دوسرے ہی لمحے موبائل ایک بار پھر شور مچانے لگا تھا۔ کمرے سے باہر بجتا فون اور وانیہ کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔

''ہاں میرا فون......'' وانیہ زور سے چیخی تھی اور کمرے سے باہر کی طرف بھاگی۔ اعزاز شاہ کی قسمت میں اس وقت سونا نہیں لکھا تھا لیکن پھر بھی وہ بیڈ پر آڑے ترچھے لیٹ گئے۔ اسی طرح انہیں سکون مل رہا تھا اور یہ سکون بھی وقتی ہی تھا۔

وانیہ کسی سے موبائل پر بات کرتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس کی اونچی ہوتی آواز، قہقہے اعزاز شاہ کے اعصاب پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔ بالآخر وہ تکیہ دیوار پر مار کر اٹھ بیٹھے اور اسے دیکھنے لگے لیکن ان کے دیکھنے کا بھی وانیہ پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ جھنجلاتے ہوئے وہ واش روم چلے گئے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ باہر نکلے تو وانیہ کو ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بیٹھا پایا۔ وانیہ کو اتنے سکون سے بیٹھے دیکھ کر اعزاز شاہ کو اس پر بے تحاشا غصہ آیا تھا ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان کی نیند خراب کرنے والی کو قتل کر دے اور وہ ایسا کر بھی گزرتا جو اگر اسے وانیہ اپنے باپ زوار شاہ کی طرف سے تحفے میں نہ ملی ہوتی۔

''اعزاز شاہ! وانیہ میری بھتیجی ہی نہیں بلکہ

تمہارے لیے میری طرف سے ایک انمول تحفہ ہے جسے تم ساری زندگی ہتھیلی کے چھالے کی طرح سنبھال کر رکھو گے۔ کیونکہ یہ تمہارے باپ کی طرف سے دیا گیا ایک شاہکار ہے۔'' یہ اس کے باپ زوار شاہ کے جملے تھے جو اعزاز شاہ کے نکاح کے وقت اس کی سماعتوں میں گونجے تھے۔ اعزاز شاہ نے ویسے بھی اپنے باپ کو بہت کم بولتے دیکھا اور سنا تھا۔ ایک گھر میں ہی رہتے تھے۔ آفس میں بھی ساتھ کام کرتے تھے مگر ان دونوں کا سامنا قسمت سے ہی ہوتا تھا۔

زوار شاہ بارعب شخصیت ہونے کے ساتھ اپنے اصولوں کے بھی پکے تھے۔ وہ کئی ملز کے مالک ہونے کے ساتھ، ساتھ ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی بھی چلا رہے تھے...... وہ جدی پشتی رئیس تھے، اس بات کا گھمنڈ تو انہیں پہلے ہی تھا مزید ایڈورٹائزنگ کمپنی نے نام دے کر ان کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا دیا تھا۔

زوار شاہ نے اپنی شادی تو پسند سے کی لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو کر اپنے چار بیٹوں اور تین بیٹیوں میں سے کسی کو بھی یہ حق نہیں دیا کہ وہ اپنی پسند کی کوئی معمولی لڑکی یا لڑکا اس گھر میں لا سکیں۔ لڑکے تو چاروں ان کے بزنس مزید آگے بڑھا رہے تھے اور لڑکیاں بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بیاہی جا چکی تھیں۔

اعزاز شاہ زیادہ دیر تک ایڈورٹائزنگ بزنس کو ٹائم دیتے مگر ان کی اپنی تفریح میں کوئی مخل نہیں ہو سکتا تھا۔ واش روم سے نکل کر جھنجلاہٹ کے عالم میں انہوں نے وارڈ روب کھول کر اپنے آج کے ڈریس کا انتخاب کیا اور ایک بار پھر واش روم میں بند ہو گئے۔ وانیہ نے ایک نظر واش روم کے بند دروازے کو دیکھا پھر بڑی عجلت میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی ضروری چیزیں ہینڈ بیگ میں رکھنے لگی۔ اے ٹی ایم کارڈ دراز میں سے کیش رقم اور آخر میں گاڑی کی چابی اٹھا کر وہ جب سیدھی ہوئی تو اس وقت اس کی نظریں اعزاز شاہ کے موبائل فون پر پڑیں اور جانتے بوجھتے اس نے اعزاز شاہ کا موبائل فون اٹھا کر اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لیا جبھی واش روم سے اعزاز شاہ نکل کر اس کے سامنے آیا تو وہ ایک سرسری سے نظر...... اسے دیکھتے ہوئے کمرے سے نکلنے لگی تھی کہ وہ پکار اٹھے۔

''وانیہ کہاں جا رہی ہو؟''

''کہیں بھی! تم سے مطلب......'' یہ کہہ کر وہ رکی نہیں بلکہ تیزی سے آگے نکل گئی اور وہ اس کے پیچھے حیران ہونے کے بجائے اپنی تیاری میں مصروف ہو گئے کیونکہ یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا۔ شادی کی اولین رات ہی وانیہ نے اعزاز شاہ کو یہ بتا دیا تھا کہ شادی نہ اس کی مجبوری تھی نہ ضرورت اس کے باوجود اس نے اعزاز شاہ کا نکاح قبول کیا...... اور اعزاز شاہ پر اس کی طرف سے یہ احسان ہی تھا۔ اس رات اعزاز شاہ پر دو دھماکے ایک ساتھ ہوئے تھے، ایک باپ نے نکاح کے وقت کیا تھا اور دوسرا بیوی نے ان کے کمرے میں داخل ہونے پر ہی کر دیا تھا۔

اس وقت سے لے کر اب تک اعزاز شاہ اپنی زندگی میں کسی چیز کی کمی بہت شدت سے محسوس کر رہا تھا اور وہ کیا چیز تھی وہ خود نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆

''تم باہر جا رہے ہو؟'' ثمیرہ نے ریبال کے ساتھ کینٹین کی طرف بڑھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، جرمنی جا رہا ہوں۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''کب......؟''

''ایک ہفتے بعد......'' ریبال کے جواب پر وہ رک کر اسے دیکھنے لگی۔ ریبال کی دوستی اس کے لیے بہت اہم تھی اور یہ اس کی ذہنی ہم آہنگی تھی جب ہی ریبال اسے تپتی دھوپ میں سائے کی طرح لگتا تھا اور اس کے باہر جانے کا سن کر وہ بہت اداس سی ہو گئی تھی۔

''ارے...... ہمیشہ کے لیے تھوڑی جا رہا ہوں۔'' ریبال اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا، وہ انقلابی سوچ کا بہت پیارا شخص تھا۔ ثمیرہ کو کبھی وہ دوست لگتا تو کبھی افلاطون اور جب وہ ادب کی سیڑھیاں پھیلانے لگتا تو اسے گمان ہوتا کہ منٹو تو عرصہ

ہو اور دنیا سے پردہ کر چکے ہیں پھر یہ......؟ وہ سر جھٹک کر ریبال کے ساتھ چلنے لگی۔

''آخری سال ہے، اس کے بعد تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''پتا نہیں۔'' اس نے حقیقتاً اس حوالے سے ابھی کچھ نہیں سوچا تھا اس لیے صاف گوئی سے بولی تھی اور ویسے بھی وہ ریبال سے کوئی بات نہیں چھپاتی تھی۔

''میرا مطلب ہے ابھی کچھ سوچا نہیں۔''

''گھر تو تم بیٹھو گی نہیں۔'' ریبال کینٹین میں تشمیرہ کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔

''ہاں اور مجھے بیٹھنا بھی نہیں ہے۔ زندگی میں کچھ کرنا تو ہے۔'' اس نے پُراعتماد ہو کر کہا۔

''بالکل......لیکن ایک بات کا خیال رکھنا تشمیرہ بانو! انسان کو اپنی حدوں پر اختیار سے زیادہ قابو ہونا چاہیے۔ دوسروں کی حدیں کراس کرنے سے بہتر ہے کہ انسان اپنی لائن کو گہرا رکھے۔

یارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو''

تشمیرہ مسکرائی۔

''ٹھیک ہے یار مہربان زندگی بہت انمول ہے مگر ہمیشہ انسان کو اپنے کردار کے بارے میں محتاط رہنا چاہیے۔ ایسا بے داغ کردار کہ مقابل آپ کی زور آوری پر رشک کرے۔ لڑکیوں کو ایسی ذہنی پختگی رکھنی چاہیے کہ کسی کمزور لمحے میں بھی ان کے ارادے کی پختگی میں دراڑ نہ پڑے۔'' وہ ایک بار پھر اپنی عادت سے مجبور ہو کر لیکچر دینا شروع ہو گیا تھا اور تشمیرہ اس کے جانے کا سن کر اداس تھی اس لیے ٹوکا نہیں بلکہ خاموشی سے سنتی رہی۔

''لوگ بہت ظالم ہوتے ہیں، ان کی مہربانیوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ آپ کی شخصیت سلامت ہے تو سامنے والے ٹھیک ہیں اور شخصیت میں ذرا ٹوٹ پھوٹ ہوئی، سب سے پہلے ان کے ہاتھ میں ہی پتھر نظر آئے گا......سو ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو۔''

ریبال اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر تشمیرہ کی آنکھوں میں چھائی اداسی نے اسے مزید کچھ کہنے نہیں دیا۔

ریبال سے اس کی دوستی یونیورسٹی کے پہلے دن سے تھی اور یہ دوستی اتنی گہری ہو گئی تھی کہ کبھی اس نے دوری کا تو سوچا ہی نہیں۔ اسے کہیں بھی کوئی مسئلہ ہوتا ریبال اس کے حل لیے پہلے سے موجود ہوتا۔ اور جب پریکٹیکل لائف میں قدم رکھنے میں چند ماہ ہی رہ گئے تھے تو وہ اس کا ساتھ چھوڑ کر جرمنی جا رہا تھا۔

ریبال نے اپنے بارے میں اسے بہت پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ اکلوتا ہے، والد کا بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا، سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے ان کی پنشن سے گھر کا خرچ چل رہا تھا اور اب وہ ٹیوشن پڑھانے کے ساتھ، ساتھ پارٹ ٹائم جاب کر کے پیسے جمع کر رہا تھا تاکہ باہر جا سکے اور یہ اس کی زندگی کا اہم مقصد تھا۔

''میرا خیال ہے تم ابھی سے جاب کی تلاش شروع کر دو......'' ریبال کافی کا بل پے کرنے کے بعد جب کینٹین سے باہر نکلا تو تشمیرہ سے کہنے لگا۔ ''جتنی افراتفری اس دور میں ہے تو یہاں ہر آدمی کو جاب ملنا بہت مشکل ہے لیکن اگر پھر بھی کہیں کوئی مشکل آجائے تو میں حاضر ہوں۔''

''کہاں، تم تو بہت دور جا رہے ہو۔'' وہ دلبرداشتہ ہو کر بولی۔

''لیکن پھر بھی ہم رابطے میں تو رہیں گے۔'' تشمیرہ اس کی بات پر کھل سی گئی۔ اس کے اندر کی اداسی کو ریبال نے اپنی آخری بات سے اڑانے کی کوشش کی۔

☆☆☆

ریبال نے جیسے ہی بائیک زینب خالہ کے گھر کے آگے روکی ان کی بیٹی عروج بھاگتی ہوئی دروازہ کھولنے آ گئی تھی۔

''خالہ جی کہاں ہیں۔'' اس نے صحن میں بائیک کھڑی کر کے برآمدے کے دونوں کمروں میں جھانک کر پوچھا تو اس سے پہلے کہ عروج کچھ کہتی خالہ جی اوپر کی سیڑھیاں اترتی ہوئی نظر آئیں۔ اس نے بڑھ کر

انہیں سلام کیا۔

''ہاں بیٹا جیتے رہو سب ٹھیک ہے، کب جا رہے ہو جرمنی......؟'' خالہ زینب قریب آکر ریبال کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے چمکار کر پوچھنے لگیں۔

''انشاء اللہ اگلے ہفتے......'' ریبال وہیں برآمدے میں خالہ زینب کے تخت کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔''امی جی کی طبیعت کی فکر نہیں ہوتی تو میں بھی آپ کو تکلیف نہیں دیتا۔''

''ارے تکلیف کیسی......بہن ہے وہ میری رہ لوں گی میں اس کے پاس بس بھانجے کی حیثیت سے تم میرا ایک کام کر دینا۔ میرے بیٹے احمر کو جرمنی دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ بس وہاں جاتے ہی اسے بھی بلا لینا۔'' خالہ زینب کی بات پر وہ چونکنے کے ساتھ حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔

''ہمارے بھی دن پھر جائیں گے بیٹا......'' وہ اس کی حیرانی پر وضاحت دیتے ہوئے بولیں۔

''خالہ جی میں وہاں پڑھنے کے لیے جا رہا ہوں۔'' ریبال نے انہیں اپنا جرمنی جانے کا مقصد بتایا تو ایک لمحے کو ان کا اشتیاق ماند پڑ گیا۔

''تو کیا ہوا۔ وہاں جا کر کسی کو بلانا مشکل تھوڑی ہے اور پھر تو یہ کیوں بھول جاتا ہے کہ وہ صرف تیرا خالہ زاد نہیں بلکہ ہونے والا سالا بھی ہے۔''

ریبال کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح زینب خالہ کو سمجھائے ان کی لالچی طبیعت اور خود غرضی پر اسے غصہ آ رہا تھا ایک تو امی جی کی وہ سگی بہن تھیں اور کوئی قریب کا رشتے دار تھا نہیں۔ وہ بولتی چلی گئیں اور ریبال انہیں کل ساتھ لے کر جانے کا وعدہ کر کے وہاں سے اٹھ آیا۔

☆☆☆

وانیہ اعزاز ریسٹورنٹ کے ایک کونے میں بیٹھی کولڈ ڈرنک پینے میں مصروف تھی جبکہ اس کے سامنے ایک نوجوان لڑکا اپنے سیدھے ہاتھ کی دو انگلیوں میں معمولی سا سگریٹ پکڑے بیٹھا تھا۔ وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن وانیہ نے اس سے کہا تھا کہ میرے ساتھ جب بھی بیٹھا کرو سگریٹ ہاتھ میں ضرور رکھا کرو۔

''تمہارے پاس کوئی اور موضوع نہیں ہے۔''

''مثلاً......؟'' وہ نروس ہوتے ہوئے بولا تو وانیہ اعزاز جھنجلا کر بولی۔

''اب یہ بھی میں بتاؤں۔ جب سے آئے ہو صرف اپنی دکان اور بیگم صاحبہ کی باتیں کیے جا رہے ہو۔'' وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی پھر نظروں کا زاویہ بدل کر پوچھنے لگی۔ ''میرا ذکر کس، کس سے کرتے ہو؟''

''کسی سے بھی نہیں......'' وہ نوجوان فوری بولا تھا۔

کولاچی کا ماحول جدید طرز سے آراستہ تھا۔ مغربی موسیقی کی تیز دُھن اندر بکھری ہوئی تھی۔ دن سہ پہر میں تبدیل ہو رہا تھا۔ ریسٹورنٹ میں رش ابھی نہیں ہوا تھا۔ باتیں کرنے کی آواز۔ ان ماحول میں پُراسراریت بیدا کر رہی تھیں۔

''جھوٹ مت بولو۔'' وہ سختی سے بولی۔

''آپ مجھ سے قسم لے لیں۔'' اس نے کہا تو وانیہ اعزاز خاموش ہو گئی چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر پہلے ویٹر کو بلا کر بل لے کیا اس کے بعد اسے اٹھنے کا اشارہ کیا اس کے ساتھ چلتی ہوئی وہ ریسٹورنٹ سے باہر نکل کر اپنی گاڑی کی طرف آ گئی تھی۔

''مجھ سے صرف اپنی ہی بات کیا کرو......'' پھر پرس میں سے پیسے نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''یہ لو پیسے......تم رکشا کر لو......مجھے اب کہیں اور جانا ہے۔'' وہ نوجوان حیرت سے ہزار، ہزار کے دس نوٹوں کو دیکھنے لگا تھا۔ وانیہ اعزاز اسے حیرت زدہ چھوڑ کر گاڑی بھگا لے گئی تھی۔

اب تک وانیہ اعزاز جتنے بھی لوگوں سے ملی تھی ان میں یہ پہلا مرد تھا جو اس کے معیار پر پورا اتر رہا تھا، اس لیے اس کے ساتھ وقت گزارنا اسے اچھا لگتا لیکن وہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو حیثیت میں وانیہ اعزاز کے

برابر تو کیا اس سے بے حد کم ترین درجے کا تھا۔ لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والا وہ نوجوان جس کے نام سے بھی وہ واقف نہیں ہوئی تھی ایک اپر کلاس ایریا میں ٹیلر کی حیثیت سے چند ہزار ماہانہ پر کام کر رہا تھا۔

ایک سگنل پر وانیہ اعزاز نے گاڑی روکی تھی اور یونہی اِدھر اُدھر دیکھنے لگی تھی کہ اچانک اس کی نظر بائیک پر بیٹھے ہوئے ریبال پر جا ٹھہری اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے دیکھنے لگی تھی۔ غیر ارادی طور پر وہ ریبال کا ہر انداز نوٹ کر رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کا دل چاہا کہ وہ اس کے ساتھ رہے۔ اس کے ساتھ والی سیٹ جو فی الحال خالی تھی وہاں بیٹھ کر اس کے ساتھ لمبے سفر پر چلے۔ وانیہ اس کے شانے پر سر رکھ کر اپنی ہر بات کہے اور اس کی سنے مگر یہ سب ناممکن تھا کیونکہ ٹریفک سگنل کھلنے پر ریبال ہجوم کا حصہ بن گیا تھا اور مسلسل تلاش پر بھی وانیہ اعزاز کو نظر نہیں آیا آخر مایوس ہو کر اس نے روزی کے گھر کا رخ کیا تھا۔

''ہیلو، مسز وانیہ اعزاز......'' روزی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو وانیہ اعزاز کو دیکھ کر خوش دلی سے بولی اور آگے بڑھ کر اس کے گلے لگ گئی۔ وانیہ کی طرف سے کوئی اچھا رسپانس نہیں آیا تھا۔ جس پر روزی پہلے تو ٹھٹکی پھر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''آج کوئی واقعہ خوشگوار ہوتے ہوتے نامکمل رہا۔'' وانیہ اعزاز اس کی دور اندیشی پر لمحے بھر کو چونکی۔

''ہاں، ابھی تمہاری طرف آتے ہوئے ہی۔'' اس نے اعتراف کیا۔

''اوہ گریٹ......'' روزی دلفریب انداز میں مسکرائی۔ وہ ایک کامیاب پامسٹ تھی، ایک کلب پارٹی میں وانیہ اعزاز کی اس سے ملاقات ہوئی تھی اور وہیں سے دوستی بھی اس قدر بڑھ گئی کہ اب دونوں ایک دوسرے کی راز داں تھیں۔ روزی کی ماں ایک عیسائی عورت تھی جو بہت خوب صورت بھی تھی اس نے ایک بوڑھے آدمی سے شادی کی، وہ بوڑھا آدمی تو روزی کی پیدائش کے بعد کچھ سال ہی جیا لیکن روزی کی ماں ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی مری تھی۔

''لیکن تمہارے ہاتھ کی لکیریں کچھ اور کہتی ہیں۔'' روزی نے اس کا ہاتھ دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا کہتی ہیں؟'' وہ سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔

''یہی کہ تمہاری قسمت میں وہ نہیں جسے تم دیکھ کر آئی ہو۔ وہ تمہارے نزدیک آئے گا تو لیکن اپنے مطلب سے۔''

''وہ میرے قریب آئے گا اور وہ بھی اپنے مطلب سے۔ یہ ممکن نہیں روزی۔'' وانیہ نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑایا۔

''وانیہ یہ میں نہیں بلکہ تمہارے ہاتھ کی لکیریں کہہ رہی ہیں۔''

''میں مانتی ہوں روزی اور یہ بھی مانتی ہوں کہ یہ لکیریں کبھی کبھی جھوٹ بھی بولتی ہیں۔'' وانیہ یہ کہہ کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اس کے ذہن میں ریبال کا وجیہہ سراپا آ کر ٹھہر گیا تھا۔ وانیہ اعزاز کوئی کم عمر لڑکی نہیں تھی۔ اور نہ ہی اس کا شوہر واجبی سا تھا، چالیس سال سے زیادہ عمر ہونے کے باوجود بھی اس کی پرسنالٹی نوجوانوں سے زیادہ پُرکشش تھی لیکن پھر بھی وانیہ کو اس کی قدر نہیں تھی۔ عمر میں اگر اعزاز شاہ، وانیہ سے پانچ سال چھوٹا تھا تو یہ بھی کوئی مسئلے کی بات نہیں تھی۔

''ایسا بھی تو ہو سکتا ہے ناں روزی کہ وہ میرے پاس آئے اور کہیں نہ جاسکے؟'' وہ بہت پریکٹیکل انداز میں بولی۔

''اگر ایسا ہوا تو پھر بہت کچھ ہو سکتا ہے۔'' روزی کے انداز میں خوف ظاہر تھا اور وانیہ سمجھ کر بھی انجان بن گئی تھی۔ کیونکہ وہ ریبال کے علاوہ کچھ اور نہیں سوچ رہی تھی۔ ابھی تک وہ صرف اس کا حلیہ جانتی تھی، وہ کون ہے، کیا کرتا ہے، کیا نام ہے، ان سب باتوں سے وہ بے خبر تھی۔ اس تک رسائی حاصل کرنا بھی وانیہ کے لیے کوئی مشکل بات نہیں تھی لیکن اس کے لیے وقت درکار تھا۔

☆☆☆

تشمیرہ دوپہر کے کھانے کے بعد فریج میں سالن رکھ کر اپنے کمرے میں آئی تھی لیکن تائی جی کو تشمیرہ کو باتیں سنانے کا موقع چاہیے تھا اس لیے انہوں نے سالن واپس پتیلی میں ڈال کر پھر اس کی کلاس لے ڈالی تھی۔

”میں آخر ایسا کیا کروں کہ تائی جی مجھ سے خوش رہیں۔“ تشمیرہ اپنے بیڈ پر اداس بیٹھی سوچ رہی تھی۔ گو کہ غلطی اس کی نہیں تھی لیکن یہ بھی غلط نہیں تھا کہ وہ اتنے برسوں میں تائی جی کے مزاج کو سمجھ نہیں پائی تھی اگر وہ تائی جی کو بتا کر سالن فریج میں رکھ دیتی یا کچن کا ہر کام وہ تائی جی کو بتا کر ان کے مشورے سے کر دیتی تو کیا غلط تھا مگر وہ کام تو الٹ کرتی۔ یعنی جو کام بتانے کے ہوتے وہ نہیں بتاتی اور جس، جس کام میں تائی جی کو دلچسپی نہیں ہوتی وہ انہیں بتانا اپنا فرض سمجھتی۔ جیسے یونیورسٹی میں ایڈمیشن کا اس نے بڑی خوشی سے تائی جی کو بتایا تھا اور تائی جی کیونکہ خود کم پڑھی لکھی خاتون تھیں اس لیے انہیں برا تو لگا لیکن تایا جی کی موجودگی کا خیال کرتے ہوئے وہ دبے لہجے میں کہہ کر رہ گئیں۔

”لڑکیوں کی پڑھائی لکھائی کون دیکھتا ہے، گھر گرہستی آنی چاہیے، یہی کچھ سسرال میں کام آتا ہے۔“

تائی جی نے یہیں بس نہیں کر دیا تھا بلکہ کتنے ہی دن تک وہ تشمیرہ کو سناتی رہی تھیں اور وہ چور سی بن جاتی جیسے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے کر اس نے کوئی بہت بڑی غلطی کر دی ہو۔

اس وقت وہ اپنے کمرے میں بیٹھی تائی جی کے غصے کو کم کرنے کی ترکیب سوچ رہی تھی کہ اچانک تائی جی کمرے میں دروازے پر دستک دینے کے بعد اندر ہی آ گئی تھیں۔

”تم ایسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہو، کتنے سارے کام ہیں کرنے کو...... اور پھر کل میرا بھتیجا آ رہا ہے ملتان سے۔ اس کے لیے کمرا صاف کرنا ہے کچن میں برتن ویسے ہی رکھے ہیں۔ رات کا کھانا بنانا ہے یہ سب کون کرے گا۔“ تائی جی نے جس تیزی سے کام بتائے تھے تشمیرہ اتنی ہی تیزی سے اٹھی تھی لیکن تائی جی کو بتائے بغیر ہی وہ کچن میں آ کر رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگی تھی۔ یعنی اس نے اپنی شامت کو خود ہی آواز دی تھی اور تائی جی کو بھی موقع مل گیا تھا۔ فوراً ہی اس کے پیچھے کچن میں چلی آئیں اور ایک بار پھر شروع ہو گئیں۔

☆☆☆

شام کے سائے آہستہ، آہستہ بڑھ رہے تھے۔ سورج آہستہ، آہستہ سمندر میں ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ شام کے دھندلکے ابھی گہرے نہیں ہوئے تھے لیکن اس ایڈورٹائزنگ کمپنی میں محسوس کی جانے والی خاموشی نے وقت کو پُراسرار بنا دیا تھا۔ آفس کا آدھا اسٹاف اپنے گھر جانے کے لیے نکل چکا تھا اب صرف گنتی کے چند لوگ ہی رہ گئے تھے، اعزاز شاہ کے پاس بھی اس وقت نورین کو سنانے کے لیے کچھ نہیں تھا اور ویسے بھی پچھلے ایک گھنٹے سے اعزاز شاہ، نورین کو اپنی ذاتی زندگی کے تمام تر واقعات ایک بار پھر سنا چکے تھے اور اس کی ہمدردی بھی سمیٹ چکے تھے اس لیے اسے گھر جانے کا کہہ کر میگزین دیکھنے لگے تھے کہ اچانک ٹیلی فون کی بیل پر اعزاز شاہ نے ریسیور اٹھا کر بے دلی سے ہیلو کہا تھا۔

”جی، کیا میں اعزاز شاہ سے بات کر سکتی ہوں۔“ دل کو چھو لینے والی نفیس سی آواز پر وہ ہمہ تن گوش ہوئے۔

”جی کیوں نہیں، ہم اس لیے تو یہاں موجود ہیں کہ آپ کی بات سن سکیں کہیے کیا کہنا چاہتی ہیں آپ۔“ اعزاز شاہ کے اندر کی اداسی، خوش مزاجی میں بدل گئی تھی۔ وہ اس وقت پچھلی زندگی کو یکسر نظر انداز کر کے اس انجان آواز پر اس طرح فدا تھے جیسے برسوں کی شناسائی ہو اور اس لڑکی نے بھی شاید فراغت سے فون کیا تھا۔

”کہنے کو تو بہت کچھ ہے! آپ بتائیں کیا سننا چاہتے ہیں؟“ وہ بڑے اطمینان سے بولی۔

”آئی لو یو......“

”کیا......؟“ لڑکی بری طرح چونکی اور اعزاز

شاہ کے بلند قہقہے نے اسے مزید نروس کر دیا۔

"آپ تو بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔" اعزاز شاہ کی یہ عادت تھی کہ کسی بھی لڑکی سے وہ فون پر گھنٹوں باتیں کیا کرتے اگر غلطی سے فون کسی مرد کا آجاتا تو لہجہ بہت سخت گیر ہو جاتا کہ فون کرنے والے کی دوبارہ ہمت نہیں پڑتی اور اب بھی وہ اس لڑکی کو اپنی گفتگو کے سحر میں جکڑ کر اس کے نام کے ساتھ اس کے گھر کا پتا اور کل ملنے کا وقت اور جگہ بھی طے کر چکے تھے۔

ایسا ہرگز نہیں تھا کہ اعزاز شاہ نے اپنی ازدواجی زندگی کو نارمل بنانے کی کوشش نہیں کی تھی یا وہ وانیہ اعزاز کا بدلہ ان معصوم لڑکیوں سے لے رہے تھے جن سے وہ فون پر گفتگو کرنے کے بعد ملا کرتے تھے انہیں تو تلاش تھی کسی چاند کی چاندنی...... صبح کے اجالے کی...... وہ لوگوں کے ساتھ بیٹھتے تو خوش نظر آتے لیکن جب تنہا ہوتے تو پھر ان کی حالت سے پتا چلتا کہ وہ کتنے اکیلے ہیں۔ بے ترتیب حلیے کے ساتھ منہ میں پان کا طوفان لیے وقفے، وقفے سے سگریٹ پینا، اس کے ساتھ ڈرنک کرنا تو جیسے ان کے شایانِ شان ہو...... اس وقت وہ زندگی سے بیزار آدمی نظر آتے لیکن یہ کیفیت کچھ دن ہی رہتی...... اس کے بعد جب وہ زندگی کی طرف لوٹتے تو جیسے دنیا کی ہر چیز اُن کے لیے بنی ہو...... اعزاز شاہ جہاں اپنے اوپر ظلم کرتے نظر آتے وہیں شاید ان کے اندر کہیں سراہے جانے کی خواہش بھی پوشیدہ ہوتی۔ اس لیے تیار ہوتے وقت وہ ایک، ایک چیز کا خیال رکھتے...... اعزاز شان کے مزاج میں عجیب حساب کتاب تھا، کبھی اچھا موڈ ہے تو کبھی برا، کبھی خوش تو کبھی ناخوش...... اور آج نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے ان کا موڈ ٹھیک نہیں تھا لیکن پھر بھی ہر ایک سے ٹھیک سے بات کر رہے تھے۔ اس وقت اعزاز شاہ کا گھر بھی آنے کا موڈ نہیں تھا لیکن ڈرائیور نے گاڑی جب گھر کے پورچ میں داخل کی تو وہ پہلے حیران ہوئے پھر کچھ سوچ کر اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر گئے تھے۔

"اعزاز بیٹا......" وہ لاؤنج سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے کہ پیچھے سے ممی نے آواز دے کر قدم روک لیے.... لیکن مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

"جی......"

"کبھی ماں سے بھی مل لیا کرو......"

"میرا تو اس گھر میں آنے کو دل ہی نہیں چاہتا پھر بھی پتا نہیں کیوں آجاتا ہوں۔" اعزاز شاہ نے ماں کے لہجے کی اداسی کو محسوس کرتے ہوئے دل میں سوچا تھا۔

"ایک گھر میں رہتے ہوئے مہینوں ہو جاتے ہیں تمہاری شکل دیکھے...... تم کب آفس سے آتے ہو کب جاتے ہو کس کو خبر......! کس جرم کی سزا دے رہے ہو مجھے......" اعزاز شاہ کو نہ جانے اس وقت کیا ہوا تھا جو چور بنے ممی کی طرف پیٹھ کیے سر جھکائے کھڑے تھے۔ اور ممی آزردگی سے اعزاز شاہ کی پیٹھ دیکھ رہی تھیں۔

زوار شاہ کا اتنا رعب و دبدبہ تھا کہ کبھی ان کے آگے کسی کو بولنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی اور ان کی بیوی کسی ملازمہ کی طرح خاموش کھڑی ان کی ہر بات سر جھکا کر سنتی تھیں۔ انہوں نے اپنے تمام بچوں کے فیصلے خود اپنی مرضی سے کیے تھے اور بیگم زوار شاہ کو بولنے کی اجازت نہیں تھی اور روا زوار شاہ تو اس گھر میں ایک بے جا شے کی طرح تھیں۔ بچے ان کے ہوتے ہوئے بھی ان سے دور تھے اور شوہر جو صرف اپنی بات کہتا اور بولنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

اعزاز شاہ کو اپنی ماں کی یہی سب سے بڑی غلطی لگتی تھی کہ بچوں کے معاملے پر تو کہیں وہ اپنے شوہر کی مخالفت کرتی نظر آتیں مگر ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ روا زوار شاہ کے لیے جو اُن کے شوہر نے کہا وہ ٹھیک تھا۔ وہ مجبور نہیں تھیں کیونکہ اعزاز شاہ کی نظر میں ایک عورت ماں کے درجے پر آتے ہی تمام مجبوریوں کو کہیں پھینک دیتی ہے مگر انہوں نے اب تک تمام مجبوریوں کو اپنا زیور بنا رکھا تھا۔

''ایسا کیوں؟'' اس سوال کا جواب شاید کسی کے پاس نہیں تھا خود زوار شاہ کے پاس بھی نہیں۔

☆☆☆

روزی ذہین و شاطر ہونے کے ساتھ خوب صورتی کا شاہکار بھی تھی اس لیے ہر نوجوان لڑکا اس سے دوستی کرنے کے ساتھ کچھ وقت اس کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا لیکن وہ بڑی خوب صورتی سے اپنی طرف بڑھا دوستی کا ہاتھ وانیہ کی طرف بڑھا دیا کرتی کیونکہ یہاں اس کی غرض چھپی تھی اور وہ غرض زوار شاہ تھا۔ ویسے تو عموماً روزی جیسی لڑکیاں اپنی دوست کے شوہر پر نظر رکھتی ہیں لیکن وہ جانتی تھی کہ اعزاز شاہ کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں ہے اس لیے روزی کی کوشش تھی کہ وہ زوار شاہ تک کسی طرح رسائی حاصل کرے۔ گو کہ یہ ناممکن نہیں تھا اور اسے وانیہ کو اس معاملے میں سیڑھی بنانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن وہ اپنے شاطر ذہن میں ایک جال بنا چکی تھی جس میں وہ آہستہ آہستہ سب کو لپیٹ رہی تھی بالکل اپنی ماں کی طرح ہر چال کو کامیاب بنا کر چل رہی تھی۔ گو کہ اسے کسی چیز کی کمی نہیں تھی لیکن مزید کی ہوس نے اسے لالچی بنا دیا تھا۔

''تم ہر وقت گاڑی میں اِدھر اُدھر گھومتی رہتی ہو، اپنا کاروبار کیوں نہیں کر لیتیں؟'' سوئمنگ کرتے ہوئے روزی نے مشورے کے طور پر وانیہ سے کہا۔

''کاروبار......؟''

''ہاں، بوتیک کر لو...... آج کل تو فیشن بھی ہے۔''

''آئی ہیٹ فیشن......'' وانیہ غصے سے بولی اور سوئمنگ پول سے باہر نکل کر پہلے تاول سے جسم خشک کیا پھر دوسرا تاول اپنے جسم پر لپیٹ کر بینچ پر بیٹھ کر جوس سے بھرا گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

''ارے میں تو یونہی ٹائم پاس کے لیے کہہ رہی تھی، تم تو غصہ ہو گئیں۔'' روزی سوئمنگ پول کی دیوار پر اپنے دونوں بازو رکھ کر وانیہ اعزاز کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''فیشن کے علاوہ اور بھی بہت سے کام ہیں دنیا میں کرنے کے لیے۔''

''ہاں...... ہیں تو مگر......'' روزی کے ذہن میں پتا نہیں کیا چل رہا تھا۔ وانیہ اسے دیکھنے لگی اور ساتھ قیاس کرنے کی بھی کوشش کر رہی تھی کہ روزی آخر کیا کہنا چاہتی ہے روزی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

''مگر کیا......؟'' وانیہ اعزاز نے خاموشی کو توڑا تھا۔

''مگر یہ کہ تمہیں شاید یہ کام پسند نہیں آئے یا تم میرا ساتھ دینے سے انکار کر دو۔'' وہ تاول گاؤن پہنتی اس کے پاس آ بیٹھی تھی۔

''میں انکار نہیں کروں گی، تم کام بتاؤ۔'' روزی نے بغیر کسی تاخیر کے اپنے بیگ سے ایک لفافہ نکال کر وانیہ اعزاز کی طرف بڑھا دیا تو وہ سوالیہ نظروں سے روزی کو دیکھنے لگی۔

''اسے کھول کر پڑھ لو۔'' روزی نے کہا تو وہ لفافے سے ایک کاغذ نکال کر پڑھنے لگی۔ ایک بار دو تین بار وانیہ نے اس کاغذ کو پڑھا تھا دوسری جانب روزی کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا کوئی سوچ، کوئی فکر نہیں تھی اسے بلکہ اسے یقین تھا کہ وانیہ اعزاز نہ صرف کاغذ کے اس ٹکڑے کو پڑھے گی بلکہ اس پر دستخط بھی کر دے گی کیونکہ اس کچھ عرصے میں روزی، وانیہ اعزاز کو بہت اچھی طرح جان چکی تھی۔ وانیہ اعزاز نے روزی کی سوچ کے مطابق اس کاغذ پر دستخط کر دیے تھے۔

''اب کیا کرنا ہے؟'' وہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''سوچتے ہیں کہ کام کی شروعات کہاں سے کریں۔'' روزی کاغذ اپنے بیگ میں رکھتے ہوئے بولی۔

''لیکن اس میں میرا کتنا پرافٹ ہوگا؟''

''میری جان میری طرف سے تم سب رکھ لینا۔'' روزی کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولی۔ ''مجھے تو صرف کام سے غرض ہے اور کسی چیز سے نہیں۔''

''اور تمہاری خواہشات میں جانتی ہوں۔'' روزی، وانیہ اعزاز کا ہاتھ تھام کر بولی۔

''لیکن سب کچھ ویسا ہی ہو جیسا میں چاہتی ہوں تو تمہیں کبھی مایوسی نہیں ہوگی بلکہ اب تم یہ سمجھو کہ تم ایک نئی دنیا میں قدم رکھ رہی ہو۔ جہاں ہر چیز تمہیں میسر ہے۔'' روزی کی شاطر مسکراہٹ گہری ہوگئی تھی اور اس کا دماغ آگے کی پلاننگ کرنے کے ساتھ، ساتھ اسے آگے درپیش آنے والے حالات سے بھی آگاہ کر رہا تھا اس کاغذ پر تمام شرائط کے بعد یہ بھی درج تھا کہ میں سب کچھ اپنی مرضی سے کر رہی ہوں اور اس کھیل میں میرے ساتھ کوئی شامل نہیں ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں اس پیپر کے نیچے ایک کاربن پیپر اور ایک سادہ پیپر بھی تھا جس پر وانیہ کے صرف دستخط آئے تھے اس پر روزی کو سوچنے کے بعد ایک تحریر لکھنی تھی تاکہ وہ خود کو ہر طرح سے محفوظ کر سکے۔

''مجھے بس تمہارا ساتھ چاہیے۔''

''بےفکر رہو...... میں تمہارے ساتھ ہوں اور یہ کام ہمیں جلدی شروع کر دینا چاہیے۔''

وانیہ اعزاز کے لیے روزی ایک مخلص دوست اور اس کی رازدار بھی تھی اس لیے اس کی ہر چال سے بےخبر وانیہ اعزاز ایک مہرے کی طرح اس کے اشارے پر آنکھیں بند کر کے چل رہی تھی یا جان بوجھ کر انجان بن رہی تھی کیونکہ ٹین ایجر تو وانیہ اعزاز بھی نہیں تھی جو صحیح وغلط کا فیصلہ کرنا نہ جانتی ہو لیکن ایک بری عادت نے بھی اسے اپنے شکنجے میں لے رکھا تھا جس سے وہ نکلنا نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆

ریبال کے لیے یہ پریشانی کی بات تھی کہ زینب خالہ اس کے جرمنی جانے پر اس امید پر یہاں امی جی کے پاس رہ رہی تھیں کہ وہ ان کے نالائق آوارہ بیٹے کو اپنے پاس بلالے گا اور اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو آگے وہ خالہ کی حرکتوں سے بھی بخوبی واقف تھا وہ امی جی کی سگی بہن ہوتے ہوئے سوتیلوں کو بھی پیچھے چھوڑ جاتی تھیں۔ ریبال کے جرمنی جانے کا سن کر وہ خود ہی اپنی بیٹی عروج کا رشتہ بھی لے کر آئیں اور اپنی طرف سے زبردستی طے بھی کر گئی تھیں جبکہ ابھی دور، دور تک اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن پھر بھی امی جی نے واسطے اور قسمیں دے کر اسے منا ہی لیا تھا۔ اس کے بعد امی جی کے پاس رکنے پر بھی وہ خود تیار ہوئی تھیں اور اب یہ شرط کہ ریبال ان کے بیٹے کو جرمنی بلالے ابھی تک یہ بات امی جی تک نہیں پہنچی تھی ورنہ وہ ایموشنل بلیک میل کرتیں اور یہاں وہ مجبور تھا کیونکہ اس کے اپنے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔

''کیا ہوا، کیا سوچ رہے ہو؟'' امی جی نے ریبال کو سوچ میں گم دیکھا تو پوچھنے لگیں۔

''کچھ نہیں، ویسے ہی بس......'' ریبال کے ہونٹوں سے پہلے گہری سانس خارج ہوئی اس کے بعد نفی میں سر ہلا کر بولا۔

''کیا ایسے ہی بس...... کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھا رہے ہو، کوئی پریشانی ہے تو بتاؤ مجھے۔''

''نہیں، کوئی پریشانی نہیں۔'' ریبال یہ کہہ کر کھانا کھانے لگا تو امی کچھ دیر اسے یونہی دیکھتی رہیں۔

''بچپن میں تو تم اپنی ساری باتیں مجھ سے کیا کرتے تھے لیکن اب چھپا جاتے ہو، میں تمہاری ماں ہوں ریبال...... اتنا جانتی ہوں کہ تم میری وجہ سے پریشان ہو۔'' وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

ریبال نے پہلے کھانے سے ہاتھ کھینچا پھر واش بیسن پر جا کر ہاتھ دھونے لگا۔

''ہاں، میں آپ کے لیے پریشان ہوں۔'' وہ تولیے سے ہاتھ صاف کرتا ہوا بولا۔ ''میں جب جرمنی چلا جاؤں گا تو آپ یہاں اکیلے کیسے رہیں گی۔''

''میری فکر مت کرو...... یہاں سب اپنے ہیں، میرا خیال رکھنے والے اور پھر زینب بھی تو آجائے گی۔'' خالہ زینب کا نام سن کر ریبال امی جی کو دیکھنے لگا۔ اب انہیں کیا بتاتا کہ اصل پریشانی کی وجہ ہی وہ تھیں، مزید وہ انہیں یہاں لا کر اپنی پریشانی میں اضافہ کر رہا تھا لیکن خالہ زینب کے علاوہ کوئی اور رشتے دار بھی نہیں تھا جو امی جی کے پاس رک کر ان کی دیکھ بھال

کر سکتا کو کہ امی جی کوئی محتاج نہیں تھیں لیکن پھر بھی وہ امی جی کو اکیلے چھوڑ کر جرمنی جاتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ وہ عجیب سی کشمکش میں گھرا ہوا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ خالہ زینب کے نکھے بیٹے کو جرمنی بلا لیتا لیکن وہ تو خود وہاں پڑھنے جارہا تھا اور ایسے حالات میں وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

''امی جی...... ہم خالہ زینب کو نہیں بلاتے، کیوں ان کا احسان لیں۔'' ریبال نے کچھ دیر بہت سوچ سمجھ کر کہا۔

''وہ اپنا گھر چھوڑ کر یہاں کیسے رک سکتی ہیں اور پھر میں کوئی دو چار دن کے لیے...... تو نہیں جارہا۔''

''یہ بات جب میں نے سمجھائی تھی تو اس وقت تو تمہاری سمجھ میں نہیں آئی تھی اب کیا ہوا؟'' وہ اچنبھے سے اسے دیکھنے لگیں۔

''کچھ نہیں، بس مجھے ویسے ہی خیال آیا تھا۔'' ریبال یہ کہہ کر لیٹ گیا لیکن بے چین طبیعت کے باعث نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کبھی وہ سوچتا کہ باہر جانا کینسل کر دے لیکن اب تو سب کام ہو چکے تھے اس لیے سب کچھ اتنا آسان نہیں تھا پھر امی کا کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا جتنا اس نے خود پر سوار کیا ہوا تھا آخر کو جب وہ یونیورسٹی جاتا تھا تب بھی تو پیچھے امی جی اکیلے ہی گھر میں رہتی تھیں اس کے بعد ٹیوشن پڑھانے جانا اور ابھی سے اس نے امی جی کی تنہائی کو خود پر سوار کر لیا تھا جس کی وجہ سے اسے نیند نہیں آرہی تھی۔

☆☆☆

ریبال نے اپنی زندگی میں بہت مشکل وقت کا سامنا کیا تھا جب ہوش سنبھالا تو والد کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے امی جی کی تنہائی کو بھی شدت سے محسوس کیا اس لیے اپنی تمام تر شرارتوں کو کہیں پس پشت ڈال کر وہ پڑھائی میں مصروف ہو گیا۔ فارغ وقت اس کا زیادہ تر لائبریری میں یا کمپیوٹر پر سرچ کرتے گزرتا تھا۔ اس لگن ومحنت سے وہ جرمنی جارہا تھا مگر کئی پریشانیاں اس کے پیر کی بیڑیاں بنی ہوئی تھیں اور سب سے زیادہ فکر اسے امی جی کی تھی ویسے تو وہ رات تک گھر آ ہی جاتا تھا اور دن میں بھی انہیں کال کر لیا کرتا تھا لیکن اب کوئی چند دنوں کی تو بات نہیں تھی پھر اپنوں کا رویہ اس کے سامنے ایک سوال بن کر کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اس کے جانے میں بس ایک ہفتہ ہی رہ گیا تھا جتنی کوشش وخواہش اسے جرمنی جانے کی تھی اب اداسی وفکر نے اس کی جگہ لے لی تھی جبکہ امی جی اسے مطمئن کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ رات اپنے اختتامی مراحل طے کر رہی تھی اور ریبال کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی اور وہ امی جی کی فکر میں نہ جانے کیا، کیا سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

تحمیرہ رات بہت تھک کر سوئی تھی اس لیے صبح آنکھ کافی تاخیر سے کھلی اور عموماً تو تائی جی، تایا جی کے آفس جاتے ہی اسے جھنجوڑ کر اٹھا دیا کرتی تھیں لیکن آج انہوں نے اسے کیسے اتنی دیر تک سوتا چھوڑ دیا تھا وہ خود بھی حیران تھی۔ اگر یونیورسٹی اور کلاس کا خیال نہیں ہوتا تو وہ پھر ایک بار سو جاتی کیونکہ ابھی کل کے کاموں کی تھکن نہیں اتری تھی۔ تائی جی نے بھی تو حد کر دی تھی سارے گھر کا کام اس اکیلی سے کروایا تھا۔ رات کے کھانے سے لے کر گیسٹ روم کی صفائی تک اگرچہ اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن تائی جی نے ہر کام کو بڑھا دیا تھا صرف گیسٹ روم کی صفائی اور جھاڑ پونچھ نہیں لگے ہاتھوں انہوں نے ڈرائنگ روم کی بھی صفائی کروالی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر تائی جی اتنا اہتمام اس کے آنے پر کیوں کروا رہی تھیں اور وہ بھی کوئی پہلی دفعہ تو نہیں آرہا تھا ہمیشہ ہی یہاں آتا جاتا رہا تھا۔ اسے یونیورسٹی کے لیے دیر ہو رہی تھی۔ اس لیے وہ سر جھٹک کر اپنی تمام تر سوچوں سے چھٹکارا حاصل کرتے ہوئے جلدی، جلدی بیگ میں چیزیں

رکھنے لگی تھی پھر کمرے سے نکل کر سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے آئی تو تائی جی اپنے بھتیجے فاطر کے ساتھ باتوں میں مصروف تھیں۔

''تم کہاں جارہی ہو؟'' تشمیرہ کو دیکھ کر ماتھے پر بل ڈال کر تیز انداز میں پوچھنے لگیں۔

''یونیورسٹی۔'' وہ سر جھکا گئی جبکہ فاطر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''پھپو! یہ ابھی تک یہیں ہے...... میرا مطلب ہے اس کی شادی......؟'' وہ اسے اپنی نظروں کے حصار میں لیتا ہوا تائی جی سے بولا۔

''شادی کہاں...... ابھی تو نخرے ہی ختم نہیں ہورہے ہیں۔'' تائی جی بھتیجے کی بات کاٹ کر فوراً بولیں۔

''تمہارے پھوپا صاحب نے سر چڑھایا ہوا ہے ورنہ میں تو کب کا اسے اس گھر سے رخصت کرچکی ہوتی۔''

''اچھا ہی ہے پھپو جو یہ یہاں ہے، ورنہ میں تو......'' فاطر اس کے قریب آکر بولا تو وہ خوف سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر تائی جی کو دیکھنے لگی تو تائی جی، فاطر کی بات پر چونکیں۔

''کیا مطلب......؟''

''مطلب یہ کہ میں تو آپ کے ہاتھ کے کھانے کھا، کھا کر اکتا جاتا......'' وہ بات کو مذاق کا رنگ دے کر بولا۔

''تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو...... جاؤ اپنے کمرے میں......'' تائی نے بھتیجے کی بات پر تشمیرہ کو غصے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تائی جی آج بہت ضروری ہے میرا یونیورسٹی جانا۔'' وہ منمنائی تھی لیکن ساتھ ہی یہ بھی جانتی تھی کہ تائی جی اب اس کی نہیں سنیں گی۔

تایاجی کے آفس جاتے ہی وہ روایتی تائی جی بن جاتی تھیں اور اس پر روک ٹوک کے ساتھ ظلم وستم کرنے میں نہ جانے کیوں انہیں انجانی سی خوشی محسوس ہوتی تھی۔ اس وقت بھی وہ ایک ظالم عورت کے روپ میں تشمیرہ کے سامنے کھڑی تھیں۔

''پھپو! میں لے جاؤں اسے اپنے ساتھ۔''

''کہاں......؟''

''یونیورسٹی، مجھے بھی اسی طرف جانا ہے۔''

فاطر نے کہہ کر شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ تشمیرہ کی طرف دیکھا تو اس کی مسکراہٹ کا مفہوم سمجھ کر وہ بری طرح کانپ گئی اس کا دل چاہا کہ اب کے تائی جی منع کردیں جبکہ تائی جی کچھ دیر خاموش رہیں پھر شاید انہیں تشمیرہ پر رحم آگیا تھا اس لیے فاطر کی طرف دیکھے بغیر اس سے بولیں۔

''تم اپنے کمرے میں جاؤ اور وہیں نہیں بیٹھی رہنا بلکہ کچھ کچن کے کام میں لگ جاؤ۔ شام میں تمہارے تایاجی کے دوست وقار مرزا کے یہاں ہماری دعوت ہے، تم رات کے کھانے میں اپنے اور فاطر کے لیے کچھ بنالو۔'' فاطر کے چہرے پر ابھی جو باہر ساتھ نہ جانے پر مسکراہٹ پھیکی پڑگئی تھی وہ شام میں گھر میں اکیلے ہونے پر گہری ہوگئی تھی اور تشمیرہ خوف سے چکرا کر صوفے پر گری تھی۔

''سب جانتی ہوں کام نہ کرنے کے بہانے ہیں۔'' وہ یہ کہہ کر ڈرائنگ روم سے چلی گئیں تو فاطر جیسے اسی انتظار میں تھا فوراً تشمیرہ کے قریب آکر اس کا ہاتھ تھام کر پوچھنے لگا۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟''

''ہاں......'' اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی اپنے کمرے میں جا کر بند ہوگئی۔ دل بے ترتیب حالت میں دھڑک رہا تھا اور سانسیں بھی غیر ہموار تھیں۔

''نہ جانے فاطر بھائی کو کیا ہوگیا ہے، وہ پہلے تو ایسے نہیں تھے؟'' تشمیرہ بیڈ پر بیٹھی فاطر کی مسکراہٹ اور اس کی حرکت کو سوچ رہی تھی اس سے پہلے فاطر کمال نے اسے کبھی اہمیت نہیں دی تھی بلکہ وہ تو جب بھی کراچی آیا ہمیشہ اپنے ہی بزنس کے کاموں میں الجھا رہا تھا اور دو چار روز میں واپس چلا جایا کرتا لیکن اس بار اس کے ارادے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے تھے اور اب

وہ شام میں فاطر کے ساتھ خود کو تنہا سوچ کر خوف محسوس کر رہی تھی۔

جبکہ دوسری جانب فاطر کا شیطانی دماغ تشمیرہ کو اکیلے گھر میں تصور کر کے کیا، کیا سوچنے لگا تھا۔ آج سے پہلے وہ خاطر جب بھی یہاں آیا اس کی نظر تشمیرہ پر سرسری سی ہی پڑی تھی کیونکہ وہ کام میں ہی اتنا زیادہ مصروف رہتا تھا کہ لیکن اب وہ خود کو کوس رہا تھا کہ اس نے تشمیرہ کو اب تک کیوں نہیں دیکھا تھا اور اگر نظر پڑی بھی تو وہ سرسری کیوں تھی۔

فاطر کمال تائی جی کے بھائی کمال احمد کی اکلوتی اولاد ہونے کے ساتھ ان کے تمام کاروبار کا اکلوتا وارث بھی تھا باپ نے بچپن سے ہی تربیت ایسی کی کہ لوگوں سے میل جول زیادہ ہونے کی بنا پر وہ ہر موضوع پر بات کر سکتا تھا اس لیے کم تعلیم کو اس نے اپنی کمزوری بننے نہیں دیا تھا اسے رنگین مزاجی اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی وہ اپنے دل کے سرور کے لیے کئی جتن کرتا اور کامیاب ہو کر دوستوں کے ساتھ جشن مناتا لیکن تشمیرہ کے لیے اسے بہت سوچ کر قدم اٹھانا تھا کیونکہ وہ اس کے پھوپا صاحب کی سگی بھتیجی تھی۔ تشمیرہ کو دیکھتے ہی اس کے رنگین مزاج دل نے ایک نئے سرور کے ساتھ دھڑکنا شروع کر دیا تھا اس لیے وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی کیفیت تشمیرہ سے نہیں چھپا سکا تھا لیکن اس تک رسائی حاصل کرنے کے لیے فاطر کو کوئی جتن کرنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ وہ تو خوش ہونے کے ساتھ، ساتھ بے صبری سے شام کا انتظار کر رہا تھا۔ دل میں بے صبری کے ساتھ واہیات خیالات بھی انگڑائیاں لے رہے تھے۔ فاطر کمرے میں بیٹھا انگریزی فلم دیکھنے کے ساتھ سگریٹ پہ سگریٹ پھونک رہا تھا اس کی نظریں ٹی وی پر جبکہ سوچ تشمیرہ بانو کے وجود میں اٹک گئی تھی۔ اس کے پاس رکھا موبائل فون اچانک بجنے لگا تو اس نے ذرا سا نظروں کا زاویہ بدل کر موبائل فون کی اسکرین کو دیکھا لیکن کال اٹینڈ نہیں کی اس وقت وہ اپنی سوچ کو نہیں اور خلل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ موبائل فون مسلسل بجنے کے بعد جیسے ہی خاموش ہوا تو فاطر کمال نے اسے آف کر دیا۔ تاکہ وہ دوبارہ اسے ڈسٹرب نہ کرے اور خود بیڈ پر لیٹ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک سفر کی تھکن دوسرے سوچوں کی تھکن نے اسے نیند کی وادیوں میں پہنچا دیا تھا۔

لیکن تشمیرہ کے لیے تو زندگی نایاب اور نئی مصیبت لیے منتظر کھڑی تھی اور مصیبت نے بھی اس کے گھر میں ہی پناہ لی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، کہاں جائے تایا جی اور تائی جی کے علاوہ اس کی ایک خالہ تھیں جو دوسرے شہر میں رہتی تھیں اور وہاں جانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا کیونکہ امی، ابو کے انتقال کے بعد وہ اس سے دوبار ملنے تو آتے تھے مگر تشمیرہ کو اپنے گھر آنے کا بالکل نہیں کہا تھا۔ یہ بات اس نے بہت شدت سے محسوس کی تھی اور تائی جی نے بھی کتنی بار اسے اس بات کا طعنہ دیا تھا۔

”اکلوتی بھانجی اور سب سے بڑی بات مرحومہ کی آخری نشانی پھر بھی خالہ نے اپنے ساتھ چلنے کو نہیں کہا اور نہ ہی گھر آنے کی دعوت دی۔“ تائی جی نے کھانے کی میز پر تایا جی کو سناتے ہوئے کہا اور یہ پہلا موقع تھا جس پر تایا جی بھی خاموش بیٹھے جانے کیا سوچ رہے تھے۔

”ہم پر کوئی بوجھ نہیں ہے پھر بھی اخلاقاً تو خالہ کو اپنے گھر بلانا چاہیے تھا۔“

وہ اپنی جگہ پر مجرم بنی بیٹھی رہی تھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے سارا قصور اس کا ہو۔ اس وقت اسے ساری باتیں یاد آنے کے ساتھ امی، ابو بھی شدت سے یاد آ رہے تھے مگر اچانک ہی کسی نے کان میں سرگوشی کی تھی۔

”تمہیں کمزور پڑنے کی ضرورت نہیں۔“ تشمیرہ نے ریبال کی آواز پر چونک کر ادھر اُدھر دیکھا تھا لیکن کمرے میں اس کے سوا کوئی اور نہیں تھا اور وہ سر جھٹک

کرا ٹھ کھڑی ہوئی کیونکہ اس ایک جملے نے اسے آنے والے حالات سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار کر دیا تھا۔

☆☆☆

روزی کے لیے سب کچھ بہت آسان تھا کیونکہ اس نے ابھی تک جو بھی حاصل کیا اس میں اس کی خوب صورتی کے ساتھ ذہانت کا بھی ہاتھ تھا، اسی لیے وہ اب تک کامیاب تھی، اس کی زندگی میں ناممکن کوئی بھی چیز نہیں تھی، وہ کئی ممالک کی سیر کرنے کے ساتھ وہاں کے لوگوں کی سوچ کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس کی نظر میں پاکستان کا ہر شہری خود کو ہوشیار سمجھنے کے ساتھ ساتھ اندر سے انتہا درجے کا بے وقوف بھی تھا۔

روزی اپنی ذہانت سے انتہائی ہوشیاری کے ساتھ کھیل رہی تھی خود کو بہت معصوم وسادہ ظاہر کرتی جیسے اسے کسی بات کا علم نہ ہو اور اس سارے معاملے میں وہ خود سے کبھی بے نیاز نہ رہی ہو۔ وہ اپنی ہر چیز کا خیال رکھتی، کپڑوں سے لے کر اٹھنے بیٹھنے کے ساتھ محفل میں کی جانے والی گفتگو وغیرہ، وغیرہ۔ ادبی محفل ہو یا کسی سوشل پارٹی میں جانا ہو۔ روزی ہر جگہ خود کو نمایاں رکھتی اب آہستہ، آہستہ وہ سیاسی حلقوں میں بھی جگہ بنا رہی تھی۔ اسے ہر چیز پر عبور حاصل تھا، اس نے کتابیں بھی بے انتہا پڑھ رکھی تھیں اس کے گھر کا ایک کمرا تو دنیا جہاں کی کتابوں اور رسائل سے بھرا ہوا تھا وہ اپنی گفتگو میں محفل کے حساب سے الفاظ استعمال کرتی اور جہاں ضرورت ہوتی وہاں بات کرتی ورنہ ایک کونے میں کھڑی بہت سرسری سے انداز میں ہر ایک شخص کو نوٹ کرتی رہتی۔ اس کے مزاج میں حاکمیت نہیں تھی مگر وہ اپنی خوب صورتی، اپنی قابلیت، اپنی گفتگو سے مقابل شخص کے ذہن پر حکمرانی کرنا جانتی تھی۔ اسے عشق و محبت پر بھی یقین نہیں تھا اور نہ ہی شادی کے بندھن میں بندھ کر وہ زندگی گزارنے کی قائل تھی اس لیے اس نے اپنی زندگی کا یہ چیپٹر کبھی اوپن ہونے نہیں دیا تھا۔ وہ تو بس شطرنج کی بازی کھیلنا اور جیتنا جانتی تھی اور ابھی تک اسے اس بازی میں کسی نے مات نہیں دی تھی اور اب جو بازی وہ کھیل رہی تھی اس میں ہر چال پر اسے بہت سنبھل کر چلنا تھا کیونکہ آگے کوئی معمولی اور عام سے لوگ نہیں تھے بلکہ وہ بھی روزی کی طرح شاطر و ہوشیار تھے اور ان کی جان پہچان بھی بڑے، بڑے لوگوں سے تھی ذرا سا شک ہو جانے پر روزی کہاں غائب ہو جاتی کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی اس بات کا اسے اچھی طرح اندازہ تھا۔ اس لیے اس نے مہرے کے طور پر وانیہ اعزاز کو تیار کیا تھا گو کہ اس عورت سے روزی کو کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی وانیہ اعزاز اس کی کوئی خاص دوست تھی۔ روزی کی دوستی میں مقصد ہونے کے ساتھ غرض چھپی تھی اگر یہ دونوں باتیں نکال کر وہ وانیہ اعزاز کو دیکھتی تو وہ ایک فضول سی عورت تھی جس کے پاس سب کچھ ہونے کے باوجود مایوسی تھی اور یہ مایوسی اس نے خود اپنے لیے پیدا کی تھی۔ اس لیے روزی نے وانیہ اعزاز کو ایک حد تک ہی رکھا تھا اس سے آگے بھی بڑھنے نہیں دیا تھا۔

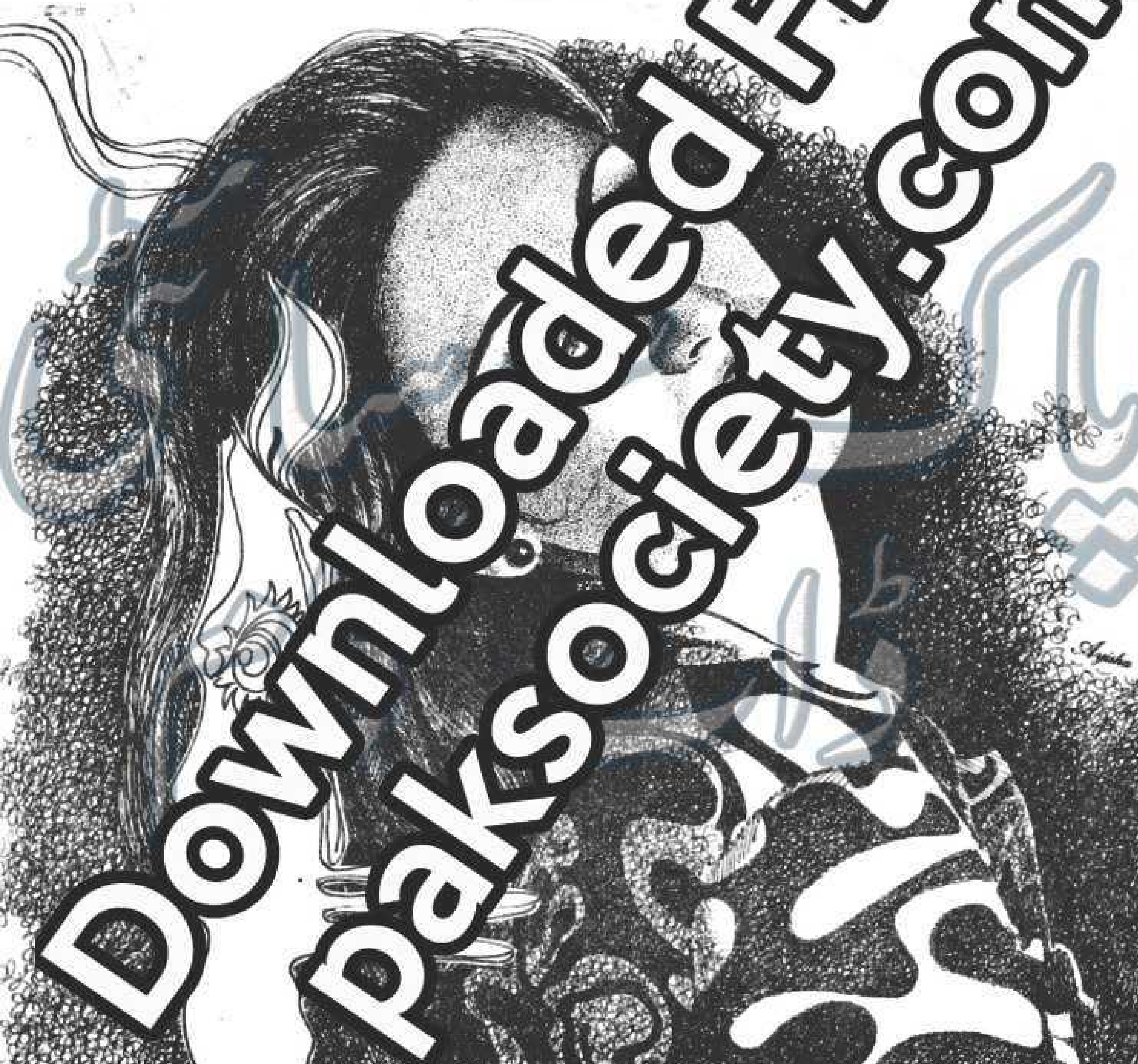
روزی اس وقت کسی ادبی محفل میں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ اچانک ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا موبائل فون بجنے لگا اس نے ایک نظر موبائل فون کی طرف دیکھا اور وانیہ اعزاز کا نام دیکھ کر اس نے کال اٹینڈ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنے شوز کے اسٹریپ باندھنے لگی تھی۔ اس کے بعد ڈریسنگ ٹیبل سے تمام میک اپ کا سامان بیگ میں رکھ کر کمرے کو لاک کر کے گاڑی میں آ بیٹھی۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے گاڑی کا ہارن بجا کر چوکیدار کو اپنے پاس بلایا۔

”میرا کوئی بھی پوچھنے آئے تو میں یہاں موجود نہیں ہوں۔“ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر چوکیدار سے کہا۔ ”ایک دو روز کے لیے لاہور جا رہی ہوں یہ ہی بتانا سب کو۔“ اس کے بعد چوکیدار کو جانے کا اشارہ کیا اور گاڑی اسٹارٹ کرنے کے ساتھ ہی پہلے موبائل فون آف کیا پھر گاڑی ریورس کر کے گھر سے باہر لے آئی تھی۔

(باقی آئندہ)

ہم سا سمجھدار

صبا عتیق عاطف



"تم نے مجھ سے کچھ کہنا تھا؟" اسے اچانک یاد نکلتے، نکلتے خیال آگیا تھا۔ گو کہ اس سوال کے لیے یہ قطعی طور پر غیر مناسب وقت تھا...... وہ کہنے سننے میں اگر دو سے تین گھنٹے کی کوئی سی بھی داستان امیر حمزہ سنا دیتی تو احمد کا کیا بنتا؟ اس کی تیاری کا کیا بنتا؟ پچھلے دو گھنٹوں کی ساری محنت اکارت چلی جاتی۔ وہ جو آفس سے آنے کے بعد کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا بلکہ سارے ضروری کام بھاڑ میں جھونک کر اپنی تیاریوں

بلکہ سنگار میں مصروف ہو گیا تھا جو ماشاء اللہ سے عورتوں کو بھی مات دے رہے تھے۔

اس کی چمک دمک نے شاید آمنہ کو چونکا دیا تھا جو اچانک اسے احمد سے کچھ کہنے کا خیال آ گیا۔ یا پھر آمنہ کو واقعی ہی احمد سے کچھ کہنا تھا۔

ویسے وہ رات سے ہی احمد کو کچھ بتانا چاہ رہی تھی۔ لیکن اسے موقع نہیں مل رہا تھا...... بلکہ احمد اسے موقع نہیں دے رہا تھا۔ رات کو بھی جب آمنہ کچن سمیٹ کر اس کے لیے دودھ کا گلاس لے کر آئی تو وہ جو فون کان سے لگائے کسی اور ہی دنیا میں گم تھا اچانک آمنہ کو آتا دیکھ کر سوتا بن گیا۔ پھر جب آمنہ کچھ کہنے سننے کی خواہش دل میں دبا کر بالآخر اسے سوتا دیکھ کر دودھ وہیں سائڈ ٹیبل پر رکھ کر خود بھی نیند میں گم ہوئی تو احمد محتاط انداز میں برابر سے اٹھ کر باہر ٹیرس پر آ گیا تھا۔

کافی ہفتوں سے اس کی یہی روٹین چل رہی تھی...... اور اپنے تئیں احمد سمجھ رہا تھا کہ آمنہ اس کے بدلتے معمول سے بے خبر ہے کیونکہ احمد پوری کوشش کر رہا تھا۔ اس کی بدلتی روٹین کی ہوا تک نہ لگے۔

آج وہ جلدی گھر آ گیا تھا...... اس نے لنچ کے نام پہ تھوڑا سا کھانا کھایا تھا پھر کمرے میں آ گیا...... کچھ دیر فون پر مصروف رہنے کے بعد اس نے خوب دل لگا کر اپنی تیاری کی اور باہر نکل آیا۔

معاً کچن میں مصروف آمنہ کو دیکھ کر اسے چانک خیال آیا تھا...... وہ پچھلے دو دن سے چپ، چپ تھی۔ اور احمد سے کچھ کہنا بھی چاہتی تھی...... پھر یہ احمد کی... بدقسمتی کے سوا کیا تھا جو اس نے ابھی کے ابھی آمنہ کو مخاطب کرنے کی غلطی کر لی تھی۔

''کیا ضرورت تھی آمنہ کو اس وقت بلانے کی۔'' خود کو خود ہی سرزنش کی اور جو اس نے احمد کو خبر سنائی تھی۔ احمد کے سر پر جیسے بم بلاسٹ ہوا تھا...... وہ لحہ بھر کے لیے بھونچکا رہ گیا...... اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں...... اور حواس جیسے معطل ہو گئے۔ ہاتھ میں پکڑے کوٹ پہ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی اور اس کے قدم سست پڑ گئے۔

آمنہ نے ایک کھوجتی مگر مطمئن سی نگاہ احمد پر ڈالی اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اس کے انگ، انگ سے اطمینان چھلک رہا تھا...... اور اس کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

احمد کی آمنہ کے ساتھ ارینج پلس لو میرج تھی۔ پہلے آمنہ اس کے گھر والوں کی پسند تھی پھر اس کی پسند بن گئی۔ آمنہ ایک کم گو اور سنجیدہ ٹائپ لڑکی تھی۔ احمد کو وہ خاصی خاموش طبع لگتی تھی۔ تاہم احمد کی والدہ اور اس کے پورے خاندان کے آمنہ صاحبہ کی شان، مزاج، عادتوں اور طبیعت کے بارے میں بہت الگ اور اچھوتے خیالات تھے۔

پورے خاندان والوں کی زبان پر آمنہ کی ''سمجھداری'' کے چرچے تھے...... ہر کوئی اس کے ''سیانے پن'' کا شیدائی تھا۔ ہر کوئی اس کی سمجھ بوجھ کی تعریف کرتا تھا۔ وہ واقعی سمجھدار تھی یا شو کرتی تھی، احمد نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی سمجھداری کو تسلیم کر لیتا مگر آمنہ کے منہ پہ نہیں...... کیونکہ اس نے اپنی سوجھ بوجھ کی بہت سی عظیم مثالیں قائم کی تھیں۔ آمنہ کے میکے والے بھی اس کی عقل مندی پر واری صدقے جاتے۔ مشکل سے مشکل مسائل کا حل بھی آمنہ صاحبہ کی سمجھداری کے باعث کہیں نہ کہیں سے نکل آتا تھا۔ میکا تھا یا سسرال، آمنہ کی ''عقل اور ذہانت'' ڈنکے کی چوٹ پر مشہور تھی۔

آمنہ کی کزنز، رشتے دار حتیٰ کہ کسی دوست تک کو کوئی پریشانی لاحق ہوتی فوراً اسے فون کھڑکا کر مشورہ طلب کر لیا جاتا اور اس کا مشورہ تابوت میں آخری کیل ثابت ہوتا، اسے ہی حرف آخر سمجھا جاتا۔ یہی حال احمد کی فیملی کا تھا...... اس کی تنک چڑھی بھابی سے لے کر نازک اندازم بہن تک آمنہ کا دم بھرتے نہیں تھکتی تھیں۔ کومل بھابی کو ذرا سی فراز بھائی کی ''کھنچائی'' کرنا ہوتی فوراً آمنہ سے نادر و نایاب قسم کا مشورہ لینے پہنچ

جاتیں۔ اور وہ ان کو ایسا اعلیٰ پائے کا مشورہ دیتی جس سے سانپ بھی مرجاتا اور لاٹھی بھی بچ جاتی۔ حتیٰ کہ کومل بھابی چیخ، پکار کے بغیر اپنی بات منوا لینے، فراز بھائی کی کھنچائی کرلینے پر خود ہی دم بخود رہ جاتی تھیں۔ آخر آمنہ کے پاس یہ ہنر کہاں سے آیا تھا؟ اتنی سمجھداری، اتنا فہم، جہاں دوسرے کی سوچ اور گمان پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔ احمد کو اپنی ازدواجی زندگی کے ان تین سالوں میں آمنہ سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ نہ عام عورتوں کی طرح جھگڑا کرتی تھی، نہ لڑتی تھی، نہ تیز آواز میں چلا کر محلہ اکٹھا کرتی تھی، نہ آنسو بہا، بہا کر خود کو مظلوم ثابت کرتی تھی بلکہ ہر طرح کے حالات کو فیس کرتی، ان کا حل سوچتی......

احمد کو یاد تھا جب اس کی اکلوتی، لاڈلی نازک اندام بہن عزہ پر آمنہ کے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بھائی سے محبت کا بھوت سوار ہوا تھا اور آمنہ کی فیملی کر اس میرج پر تحفظات کا شکار تھی۔ اوپر سے اس کا بھائی نبیل بلا کا نخریلا، کچھ اکھڑ اور موڈی سا بھی ثابت ہوا۔ اسے عزہ انتہائی امیچور نظر آتی اور وہ عزہ سے شادی پر خاصا متردد تھا۔ چونکہ اکلوتا، کماؤ بیٹا تھا سو آمنہ کی فیملی نبیل کی خواہش پر پس و پیش سے کام لے رہی تھی۔ پھر یہ آمنہ ہی تھی جس نے عزہ کی خاطر اپنے بھائی نبیل کو منایا تھا۔ کیسے منایا تھا، اس بات پر آج تک احمد بھی حیران تھا۔ کیونکہ نبیل کو اس کے فیصلوں سے ہٹانا اتنا آسان ہرگز نہیں تھا۔ اس کی نظر میں وہ بھی اپنی بہن کی طرح بہت عقل مند، معاملہ فہم اور سمجھدار تھا۔ اور نبیل نے مزید اکڑ دکھانے کے بجائے شادی کے لیے ہاں کردی تھی۔ عقل مند تھا نا...... ورنہ احمد تو اپنی بہن کی خاطر نبیل کو ہر جذباتی حربے سے زیر کرنے کا پکا پروگرام بنا چکا تھا۔ آمنہ کو بس ذرا سی دھمکی ہی تو دینی تھی۔ چونکہ یہ دونوں بہن، بھائی خاندانی سمجھدار مشہور تھے سو، اس کو تردد کرنا نہیں پڑا تھا۔ اور یوں عزہ شادی ہو کر نبیل کے ہمراہ دبئی چلی گئی۔ وہ دونوں بہت خوش و خرم اور خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ عزہ کی سسرال دبئی میں تھی یعنی آمنہ کا میکا......

☆☆☆

آمنہ کا آبائی گھر احمد کی کالونی کی پچھلی اسٹریٹ پر ہی تھا تاہم وہ لوگ یہاں کم، کم آتے تھے۔ شاید کبھی عید وغیرہ پر آتے ہوں...... مگر اب یہ بھی آنا جانا کم ہوگیا تھا۔ کیونکہ نبیل تو ویسے بھی بڑا مصروف تھا اور عزہ، نبیل میں مصروف تھی۔ بس فون پر رابطہ بحال تھا...... آمنہ ہی چھ ماہ بعد دبئی کا چکر لگا لیتی تھی اور یہ قصہ تب ہی پروان چڑھا تھا۔ تب ہی یعنی جب آمنہ

دبی گئی۔ عزہ اور نبیل کا بیاہ دیکھنے احمد کو آفس سے چھٹی نہیں مل سکی تھی۔ یوں احمد نہیں جا سکا۔

آمنہ کے بغیر اسے رہنے کی عادت نہیں تھی لیکن مجبوری تھی کیا کرتا...... گھر میں دل نہیں لگا تو باہر نکل آیا...... اپنی ہی کالونی کی سڑکوں پر گھومتے ہوئے وہ اچھا بھلا آمنہ کو مس کر کے اداس ہو رہا تھا جب پارک کے قریب ہی ایک سنگل اسٹوری مکان سے نکلتی مس مرینہ سے ٹکراؤ ہو گیا...... آہ وہ بھی کیا قیامت دن تھا۔ مس مرینہ اس کی اچھی بھلی چلتی زندگی کی ٹرین سے ایسا ٹکرائی کہ احمد کی سدھ بدھ ہی بھلا دی۔

وہ اس سنگل اسٹوری مکان میں بطور کرائے دار آئی تھی۔ مقامی بینک میں ملازمت کرتی تھی۔ اپنی ماں کے ساتھ تنہا رہتی تھی...... ان کا گھر پارک کے سامنے تھا۔ اگر گول چکر لے کر دوسری طرف آیا جاتا تو سامنے ہی سہ منزلہ آمنہ کے میکے والوں کا آبائی گھر تھا جو سالوں سے سنسان پڑا تھا۔

خیر آمنہ کی غیر موجودگی میں مس مرینہ کے ساتھ احمد کی لو اسٹوری ایسی پروان چڑھی کہ مرینہ صاحبہ نے اسے دوسری شادی کی افادیت پر لیکچر دے دے کر پوری طرح گھائل اور قائل کر لیا تھا...... قریب تھا کہ احمد مارے جذباتیت اور دھواں دھار عشق کے آمنہ کی آمد سے پہلے ہی بیاہ رچا لیتا کہ اچانک آمنہ کی واپسی کا بگل بج اٹھا۔ احمد کو اپنے شوریدہ جذبات پر بند باندھنا پڑا۔ مگر دوسری طرف سے اصرار جان گسل تھا۔ مس مرینہ اس کی کوئی مجبوری سمجھے بغیر وارننگ پر وارننگ دے رہی تھی۔ اور احمد کو حالات سازگار نظر نہیں آ رہے تھے۔ اوپر سے آمنہ کی ایکسرے مشین جیسی نظروں کا سامنا کرنا سخت محال تھا۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولتی تھی تاہم اس کی تلوار جیسی نگاہیں...... احمد کو ان نگاہوں سے چھپنا بھی محال تھا...... تاہم پھر اس کی فطری دیدہ دلیری عود آئی تھی۔ ایسا بھی کیا ڈر اور خوف اسے آمنہ سے دبنا نہیں چاہیے۔ دوسری شادی کوئی جرم ہے کیا؟ جب وہ افورڈ بھی کر سکتا ہے۔ دوسری بیوی کو ایک گھر میں رکھا جا سکتا ہے ایسے ہی بہت سے دلائل دے کر احمد نے آمنہ کی غیر موجودگی والی روٹین کچھ پس و پیش کے بعد برقرار رکھی اور آفس سے آنے کے بعد مرینہ سے گپ شپ جاری و ساری تھی۔ مغرب کے بعد پارک میں واک کرنا اس کا معمول بن چکا تھا۔ اس واک کے دوران مرینہ سے لمبی ملاقات ہو جاتی تھی...... اور احمد، مرینہ کی والدہ کے کئی کام بھی کر آتا۔ ان کا چیک اپ وغیرہ سودا سلف اور دوائیاں لاتا...... بلز وغیرہ جمع کروانا آتا...... ایسے ہی چھوٹے موٹے کئی کام...... یعنی خدمتِ خلق بھی اپنی جگہ چل رہی تھی اور محبت بھی......

"واک، کھانا کھانے کے بعد کرنا مناسب ہوتی ہے، کھانے سے پہلے نہیں۔" آمنہ نے صرف ایک مرتبہ دبے لفظوں میں کہا تھا۔

احمد نے اس کی بات کو سنا اور اڑا دیا۔ آخر واک کون کافر کرنے جاتا تھا؟ واک کے پس پردہ حقائق سے اس کی عقل کل کی مالک انتہائی سمجھدار بیوی قطعی طور پر لاعلم تھی۔ بیچاری کی ساری "سمجھداری" بھاڑ میں جاتی نظر آ رہی تھی۔ احمد دونوں قسم کی سچویشنز کو انجوائے کر رہا تھا۔ محبت، محبت کے کھیل کو بھی اور آمنہ کو بے وقوف بنانے پہ بھی۔

بیچاری کو کانوں کان خبر نہیں تھی...... احمد اس کی ناک کے نیچے کون سا کھیل رچا رہا ہے۔ محبت کی یہ اسٹوری کلائمکس پہ تب پہنچی جب مرینہ کی طرف سے شادی کا دباؤ بڑھنے لگا۔ احمد اسے ٹال، ٹال کر تنگ آ چکا تھا...... اور اب سوچ رہا تھا کہ کوئی ٹھوس فیصلہ کر ہی لے۔ اس پر عمل درآمد کرنا مشکل نہیں تھا مگر بیچ میں آمنہ صاحبہ موجود تھیں۔ جو بھی تھا آمنہ کی حیثیت کو چیلنج کرنا کچھ مشکل نہیں۔ بہت مشکل اور کٹھن مرحلہ تھا۔ چونکہ احمد شوہروں کی اس قسم میں سے تھا جو ہرجائی پن میں اپنی مثال آپ ہوتے ہیں سو اس نے دل کڑا کر کے آج کی فائنل ملاقات میں مرینہ کو خوشخبری سنانے کا فیصلہ کر لیا تھا...... جو ہونا تھا ہوتا رہتا، وہ کب

تک مرینہ کی نظروں میں اترے سوالوں سے نگاہ چراتا...... اس کی محبت سے کب تک کتراتا......؟ کب تک مرینہ کو آس دلائے رکھتا؟ آج اس نے بالآخر فیصلہ کر ہی لیا تھا...... سو بن سنور کر باہر آ گیا۔

''میں مرینہ کو صاف بتا دوں گا...... اسے کچھ عرصہ اپنی ماں کے ساتھ رہنا ہوگا۔ تب تک میں اس کے لیے فلیٹ کا بندوبست کرلوں گا...... اتنا اماؤنٹ تو ہے میرے پاس...... پھر اسے حق مہر میں تحفظ کے طور پر فلیٹ ہی چاہیے۔ یعنی اپنا فلیٹ اور جہاں تک آمنہ کا سوال ہے مجھے امید ہے کہ وہ کمپرومائز کرلے گی۔ ویسے بھی ابھی فی الحال تو آمنہ کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ پہلے مرینہ سے نکاح کرلوں...... بعد میں آمنہ بھلا کیا کرے گی۔ شور شرابے کی تو اسے عادت ہے نہیں۔ لڑائی جھگڑا کرے گی نہیں...... روئے دھوئے گی اور خاموش ہو جائے گی۔ میں ایک ننھا سا ایکسکیوز دوں گا...اور پھر راوی چین ہی چین لکھے گا۔ آخر مرینہ کو بھلانا بھی تو آسان نہیں...... بیچاری کی ساری امیدیں مجھ سے جڑی ہیں، عمر بھر کرائے کے مکانوں میں دھکے کھاتی رہی ہے...... کب تک مزید دھکے کھائے گی۔ مجھے مرینہ کی خاطر اسٹینڈ لینا ہی ہوگا۔ مجھ سے کتنی محبت کرتی ہے بیچاری......'' پوری تیاری کے دوران احمد، مرینہ کے بارے میں سوچتا رہا تھا اور اپنے فیصلے پر مہر لگاتا رہا...... اس دوران اسے آمنہ کا خیال تک نہیں آیا۔

جب وہ بن سنور کر باہر نکلا تو آمنہ کو دیکھ کر اچانک اسے خیال آیا تھا۔ آمنہ اسے کچھ بتانا چاہ رہی تھی۔ کیا بتانا چاہ رہی تھی؟ احمد نے سرسری انداز میں پوچھنے کی غلطی کر ہی لی تھی...... وہ اپنی ٹائی کی ناٹ ٹھیک کر رہا تھا۔ اپنے آس پاس مخصوص سی خوشبو محسوس کر کے آمنہ نے گردن موڑ کر دیکھا اور لمحہ بھر کے لیے چپ کر گئی...... اس کے دل میں ایک گرم بھاپ کی لہر اٹھی تھی جسے اس نے کمال ضبط سے دبا لیا تھا۔ بظاہر وہ پُرسکون کھڑی تھی تاہم اس کے اندر بھونچال اتر رہا تھا۔ احمد کے معمولات اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں تھے...... اس کا فون پر گھنٹوں مصروف رہنا، میسج کرنا، واک کے بہانے گھر سے غائب رہنا...... آمنہ کو نظر انداز کرنا۔ اس کا بدلتا رویہ آمنہ کو کھٹک رہا تھا لیکن اپنی ازلی سمجھداری اور فہم کے تناظر میں اس نے احمد سے ڈائریکٹ باز پرس کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ چاہتی تو عام عورتوں کی طرح چلا، چلا کر سارا محلہ اکٹھا کرلیتی۔ رو، رو کر احمد کا جینا محال کرتی، لڑتی جھگڑتی، گھر کا ماحول خراب کرتی۔ احمد کو طعنے مارتی پھر بھلا کیا ہوتا؟ کیا احمد رک جاتا؟ اس کے قدموں کی خودسری زنجیر پا ہو جاتی؟ شاید ہرگز نہیں...... وہ چڑ جاتا، غصے میں آجاتا، شہہ پا کر اور بھی دیدہ دلیر ہو جاتا جو ایک ہلکی سی جھجک اور پردہ سا درمیان میں حائل تھا وہ بھی پھٹ جاتا۔ احمد جو کچھ چھپ چھپا کر کرتا رہا تھا پھر کھل کر کرتا۔ بغیر ڈر اور خوف کے کرتا۔ اس کی جھجک ختم ہو جاتی اور آمنہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی دور اندیشی، فہم اور سمجھداری کے تقاضے یہ نہیں تھے۔ اسے اپنے ہی انداز میں اس معاملے کو ہینڈل کرتا تھا۔ اور وہ اپنے ہی انداز میں اس معاملے کو ہینڈل کر بھی رہی تھی۔ کیونکہ اسے اپنی صلاحیتوں پر پورا بھروسا تھا۔

اس وقت خوشبو میں مہکتے احمد کو دیکھ کر آمنہ نے زبردستی اپنے لبوں پر مسکراہٹ سجالی تھی۔ پھر ازلی ملائم سے لہجے میں کہا۔

''کہاں جا رہے ہیں؟'' اس کا لہجہ رواں اور نرم تھا۔ اسے اپنے تاثرات چھپانے میں مہارت حاصل تھی۔ چونکہ احمد عجلت میں تھا اس لیے آگے بڑھتا ہوا بولا۔

''ایک دوست سے ملنے......'' احمد نے ذرا نگاہ چرا کر جواب دیا تھا۔ آمنہ اس کے برابر چل رہی تھی۔ وہ اسے گیٹ تک چھوڑنے جا رہی تھی، اپنے معمول کے مطابق......

''آج واک نہیں کرنی......'' آمنہ نے لہجے کو بلا کا سرسری بنا کر پوچھا تھا۔ احمد چلتے، چلتے لحظہ بھر کے لیے رک گیا۔ اس کے چہرے کی رنگت پل بھر کے لیے

متغیر ہوئی تھی۔ کیا آمنہ نے اس پر طنز کیا تھا؟ اس کا دل سکڑ کر سمٹ گیا۔

''نہیں......'' احمد بہ مشکل بول پایا تھا۔ پھر اپنی کیفیت سے چھٹکارا پانے کی غرض سے بولا۔

''تم نے کچھ بتانا تھا؟'' اسے بات بدلنا ہی تھی...... مگر اسے یہ نہیں پتا تھا۔ بات بدل کر وہ اور مصیبت میں پھنس جائے گا۔

''ہاں، بتانا تو تھا...... لیکن پھر سہی......'' اس کے ہونٹوں پر نرم مسکراہٹ چمکی۔

''ابھی کیوں نہیں؟'' احمد پھر سے رک گیا۔ گو کہ مرینہ کے پاس جانے کی جلدی تو تھی تاہم آمنہ کی بات سننا بھی ضروری تھا۔

''ابھی آپ کا دوست انتظار کر رہا ہوگا۔ آپ کو دیر ہو جائے گی۔'' اس کی مسکراہٹ اب بھی برقرار تھی۔ احمد تھوڑا کھسیانہ سا ہو گیا۔

''نہیں، تم کہو۔'' اس کے اصرار پر آمنہ کو سرسری انداز میں بتانا پڑا۔

''نبیل اور عزہ آچکے ہیں...... چار دن ہوئے ہیں نبیل کی پوسٹنگ ہو گئی ہے۔ وہ دو سال کے لیے یہاں آیا ہے۔ آپ کو کال کی مگر آپ کا فون بزی تھا۔ مجھے آپ کو یہی بتانا تھا۔ پارک کے سامنے والے گھر میں...... یعنی ہمارے اپنے گھر میں...... نبیل اور عزہ وہیں رہیں گے...... تو میں چاہ رہی تھی...... آپ کو بتادوں، کسی دن فرصت ملے تو اُن سے ایک ملاقات کرآئیں۔ نبیل نہ سہی...... عزہ آپ کو اکثر نہیں کثرت سے دیکھ چکی ہے۔ پارک کے گول چکر کے بعد آنے والے سنگل اسٹوری گھر میں آتے اور جاتے ہوتے آپ کے دوست کی والدہ بیمار تھیں ناں تو آپ جو خدمت خلق میں مصروف تھے۔ سوشل ورک اپنی جگہ...... لیکن محتاط رہیے گا...... نبیل سے...... وہ آپ کی سوشل ورکنگ کا پس منظر نہ جان سکے۔ کیونکہ آپ جانتے تو ہیں ناں...... نبیل میرے معاملے میں کتنا ٹچی ہے۔ اور عزہ آپ کی بہن ہے، آپ کو عزہ کے لیے ٹچی ہونا چاہیے۔ نبیل مجھے پریشان نہیں دیکھ سکتا...... اور آپ عزہ کو...... یوں زندگی کی ٹرین کو دھکا لگا کر اسٹارٹ کریں۔ آپ کا انجن ٹھیک جگہ نہیں رکا...... کیونکہ ہر دوست مخلص نہیں ہوتا۔ کچھ دوست دلوں کو بھی کرائے کا مکان سمجھتے ہیں، آئے رہے اور یوں چل دیے جیسے ہوا کا جھونکا...... تو میں چاہتی ہوں......'' وہ دھیمی، پُراثر، نرم اور مسکراتی آواز میں احمد کے سر پر بم گرا رہی تھی اور وہ پھٹی، پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے حواس اڑ رہے تھے۔ اس کے الفاظ گم ہو رہے تھے۔ اس سے کھڑا رہنا محال ہو رہا تھا۔ اس سے چلنا محال ہو رہا تھا۔

''تو......'' احمد کے حلق سے بہ مشکل پھنسی، پھنسی آواز نکلی تھی۔ اس کی رنگت اڑ چکی تھی۔ دماغ چکرا رہا تھا۔

''تو میں چاہتی ہوں، آپ 'محتاط' رہیں۔''

آمنہ نے اپنا ادھورا جملہ مکمل کر دیا تھا۔ پھر ہمیشہ کی طرح مطمئن اور ملائم انداز میں مسکراتی رہی...... احمد کو یوں لگا، اس کے دماغ کے سارے ڈھیلے پُرزے ایک دم کس گئے ہیں جبکہ اس کا بند ہوتا دماغ کھلنے لگا۔ عشق کا چڑھتا بخار ٹھنڈا پڑ گیا...... وہ ایک ہی وار میں اس کے سارے ''بل'' بڑی عقل مندی سے نکال گئی تھی۔ وہ اس کی آنکھیں پوری کھول گئی تھی اور اسے سمجھا گئی تھی کہ اس کا کوئی بھی احمقانہ انتہائی قدم اس کی بہن عزہ کی زندگی کا پانسہ بھی الٹ سکتا ہے اور احمد کی اپنی ناؤ بھی ڈبو سکتا ہے۔ وہ واقعی بڑی زیرک نگاہ، معاملہ فہم اور سمجھدار واقع ہوئی تھی۔ بغیر ہتھیار اٹھائے پوری جنگ جیت کر بڑی مطمئن اور سرشاری اپنے معمولات زندگی میں مصروف ہو گئی تھی جبکہ احمد ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا، اپنا کوٹ اتار کر سست قدموں سے چلتا ہوا اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کسی دوست کو دوبارہ کبھی نہ ملنے کے لیے...... کیونکہ اس کی سمجھدار بیوی ڈھکے چھپے لفظوں میں اس کے سارے کرتوت کھول گئی تھی۔ اور احمد پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L.5/78 تحصیل وضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com



ناولٹ

تم جو مل گئے ہو

نادیہ احمد

قرینے سے سجے ڈائننگ ہال میں اس وقت مکمل خاموشی تھی۔ اس کمرے کے فرنیچر سے لے کر برتنوں کی سلیکشن تک ہر شے قیمتی اور قابلِ ستائش تھی۔ اسٹیٹس پہ عبدالمنان احمد نے کبھی کمپرومائز نہیں کیا تھا۔ قیمتی ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے وہ تینوں لوگ جو اس وقت محض ڈنر کے لیے اکٹھے ہوئے تھے ایک دوسرے سے بالکل لاتعلق تھے۔ ان کی لاتعلقی محض وجود تک نہیں تھی بلکہ وہ ایک دوسرے کے دلوں اور ذہنوں سے بھی کوسوں دور

تھے۔ کمرے میں دو ملازم قدرے چوکس کھڑے تھے، ان کی نظریں اپنے مالک کے اشارے کی منتظر تھیں۔ اس گھر میں کوتاہیاں قابلِ قبول نہ تھیں۔ عبدالمنان احمد غلطیوں کو معاف کرنے کے عادی نہیں تھے۔ یہ گھر اور یہاں کے مکینوں کی زندگی کا ہر فیصلہ کرنے کا اختیار صرف عبدالمنان کو تھا۔ چاہے وہ ان کی اکلوتی بیٹی ایشال ہو یا ان کی دوسری بیوی سبینہ جو چند سال پہلے ان کی پرسنل سیکرٹری ہوا کرتی تھی اور جس سے عبدالمنان نے اپنی پہلی بیوی فاطمہ کے انتقال کے بعد شادی کی تھی۔ محبت نہ انہیں فاطمہ سے تھی اور نہ سبینہ سے۔ جذبات کی ان کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ ان کی ترجیحات میں رشتے شاید آخری نمبر پر تھے۔ اس گھر کا ہر فرد شاندار زندگی گزارتا تھا۔ یہاں سب کی ضروریات پوری ہوتی تھیں لیکن خواہشات، احساسات اور جذبات سے متعلق کبھی نہیں سوچا جاتا تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے عبدالمنان نے ایشال کی طرف دیکھا جو بے دلی سے پلیٹ میں چمچ مار رہی تھی۔

’’کچھ کہنا چاہتی ہو؟‘‘ ایشال کی طرف دیکھتے ہوئے انہوں نے سوال کیا۔

’’جی بابا!‘‘ اس نے سر جھکائے ہوئے کہا۔

’’پیسے چاہییں؟‘‘ وہ دوبارہ اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

’’پیسے نہیں چاہییں مجھے۔ آج ماموں کا فون آیا تھا۔‘‘ ایشال نے جھجکتے ہوئے کہا۔

’’کیا کہہ رہا تھا یاسر؟‘‘ عبدالمنان نے پوچھا۔

’’بابا میں چھٹیوں میں ماموں کے پاس جانا چاہتی ہوں۔‘‘ عبدالمنان کے سامنے کچھ کہنے کے لیے ایشال کو ہمیشہ بہت ہمت جمع کرنی پڑتی تھی۔

یاسر علی اپنی فیملی کے ساتھ ٹورنٹو میں رہتے تھے۔ فاطمہ کی وفات کے بعد ایشال کا یہ واحد ننھیالی رشتہ ٹیلیفون کی حد تک محدود ہو گیا تھا۔ یاسر علی اپنی بھانجی ایشال سے ہمیشہ رابطے میں رہتے تھے اور جب بھی پاکستان آنا ہوتا ایشال سے ضرور ملتے۔ ان کی ہمیشہ سے خواہش تھی کہ ایشال ان کے پاس آ کر رہے لیکن عبدالمنان سے کہنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اس بار خود ایشال نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ یہ اس کی تعلیم کا آخری سال تھا اور یونیورسٹی کی چھٹیوں میں وہ یاسر کے پاس جانے کی خواہش مند تھی۔

’’یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ ہر سال ایشال ساری چھٹیاں گھر میں گزار دیتی ہے۔ میرے خیال میں اسے ضرور کینیڈا جانا چاہیے۔‘‘ سبینہ نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

ایشال کے ساتھ سبینہ کا رشتہ سوتیلی ماں والا نہیں تھا۔ شاید اس کی وجہ عبدالمنان کی سرد مہری تھی۔ اس گھر میں اگر سبینہ کی حیثیت پہ سوالیہ نشان تھا تو ایشال بھی بے اختیار تھی جب عبدالمنان کی شادی سبینہ سے ہوئی تو اس وقت ایشال صرف دس سال کی تھی۔ ایک سہمی ہوئی بن ماں کی بچی سے سبینہ کو دلی ہمدردی تھی۔ دس سال کے ازدواجی رشتے میں عبدالمنان نے جہاں سبینہ کو کسی گنتی میں نہیں رکھا تھا وہاں ایشال بھی باپ کی نظرِ التفات سے محروم تھی۔

سبینہ کی بات پہ عبدالمنان نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ یہ اس کے لیے وارننگ تھی۔

’’میری کافی اسٹڈی میں بھجوا دینا۔‘‘ عبدالمنان کھانے کی ٹیبل سے اٹھ چکے تھے۔

ایشال نے بے دلی سے چمچ پلیٹ میں رکھ دیا۔ باپ کا رویہ اسے ان کا جواب سمجھا چکا تھا۔

☆☆☆

یونیورسٹی گراؤنڈ میں الگ تھلگ بیٹھی تنکے سے وہ آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ ہلکے گلابی رنگ کی ایمبرائیڈری کی قمیص اور ملک وائٹ ٹراؤزر میں اس کی رنگت اور بھی کھل رہی تھی۔ بغیر کسی میک اپ کے بھی وہ اس وقت بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔ بہار کی نرم دھوپ اس کے چہرے پہ سات رنگ بکھیر رہی تھی۔

’’تم یہاں بیٹھی ہو اور میں تمہیں پورے ڈیپارٹمنٹ میں ڈھونڈ رہی تھی۔‘‘ مائرہ ہانپتی ہوئی آ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

''کن سوچوں میں گم ہو محترمہ؟'' ایشال اب بھی زمین پہ بے مقصد لکیریں کھینچ رہی تھی۔

''سوچا تو اس وقت جاتا ہے جہاں کچھ اختیار ہو۔ آپ کچھ کر نہیں سکتے، کچھ کہہ نہیں سکتے، زندگی اپنی مرضی سے نہیں گزار سکتے تو پھر سوچنے کا فائدہ۔'' ایشال کے لہجے کی تلخی نے مائرہ کو پریشان کر دیا تھا۔

''کیا ہوا ایشال سب خیریت تو ہے؟ انکل نے کچھ کہا ہے کیا؟ تم بہت ڈپریس لگ رہی ہو۔'' مائرہ نے فکرمندی سے پوچھا۔

''سب کچھ بابا ہی تو کہتے ہیں۔ ہمارے گھر میں ان کے سوا کسی کو کچھ کہنے یا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔'' بڑی مشکل سے اس نے اپنے آنسوؤں کو دبایا تھا۔

''کیوں تم اپنے بابا سے اتنی نالاں ہو۔ آخر وہ تمہارے باپ ہیں اور پیرنٹس تو اولاد کی بہتری ہی چاہتے ہیں۔'' مائرہ کا انداز سمجھانے والا تھا۔

''مائرہ اگر وہ باپ بن کر کوئی فیصلہ کریں تو میں اُف بھی نہ کروں لیکن جس گھر کا سربراہ باپ نہیں ایک ڈکٹیٹر ہو وہاں سانس لینا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ میرا دم گھٹنے لگا ہے وہاں۔ گھر ایسے تو نہیں ہوتے۔ جہاں نہ محبت ہو اور نہ رشتوں کا مان۔'' ایشال کا ضبط ختم ہو رہا تھا۔

''کیوں اتنا منفی سوچتی ہو۔ سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوئی ہو تم، محل جیسا گھر اور آسائشوں بھری زندگی گزار رہی ہو۔'' مائرہ نے محبت سے کہا۔ ایشال اس کی واحد سہیلی تھی جو اسے بہت عزیز تھی۔

''قید خانہ کتنا ہی عالیشان ہو گھر نہیں کہلاتا اور سونے کے چمچے محض دکھاوا ہوتے ہیں، ان سے نہ تو کڑوی دوائیں میٹھی ہو جاتی ہیں، نہ ہی کھانے کا مزہ بدل جاتا ہے۔ میں ایک نارمل زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ بابا کی دولت نہیں ان کی توجہ چاہتی ہوں۔'' ایشال کے لہجے کی چبھن مائرہ نے صاف محسوس کی۔

''کیا تمہاری سوتیلی ماما کا سلوک بھی تمہارے ساتھ برا ہے؟''

''اگر بابا سبینہ آنٹی کے کہنے پہ مجھے اگنور کرتے تو شاید میں انہیں الزام نہ دیتی لیکن وہ تو انہیں بھی کوئی اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ بابا ایک جذبات سے عاری انسان ہیں۔ جنہیں اس بات کی کوئی پروا نہیں کہ ان کی فیملی کیا چاہتی ہے ان کے لیے صرف وہ اہم ہے جو وہ خود چاہتے ہیں۔'' اس کے لہجے کی تلخی بدستور قائم تھی۔

''بس کرو ایشال کیا تم رونی صورت بنائے بیٹھی ہو۔ یہاں تو تمہارے بابا نہیں ہیں ناں، سوچ، سوچ کر خود کو ہلکان کرنے کے بجائے لائف کو انجوائے کرنا سیکھو۔ چلو کینٹین چلتے ہیں۔'' مائرہ کے پاس ایشال کا موڈ تبدیل کرنے کا یہی حل تھا۔

☆☆☆

عبدالمنان احمد کی انگلیاں تیزی سے لیپ ٹاپ پہ چل رہی تھیں۔

''ستر جولائی کو اوٹاوا کی میٹنگ فائنل ہو گئی ہے۔ اس کے بعد ہمیں ٹورنٹو میں کروگر انٹرنیشنل کے ساتھ جوائنٹ وینچر کی ڈیٹ سائن کرنی ہے، تم اپنے پروگرام اس کے مطابق رکھنا۔'' عبدالمنان ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی سبینہ سے مخاطب تھے جو اس وقت کلینزر سے میک اپ صاف کر رہی تھی۔ عبدالمنان کی خواہش کے مطابق سبینہ ان کی کاروباری سرگرمیوں میں شرکت کیا کرتی تھی۔

''اگر ہم ایشال کو بھی ساتھ لے جاتے تو اچھا ہوتا۔ وہ مجھے بہت اپ سیٹ لگ رہی ہے۔'' سبینہ نے ہاتھوں پہ لوشن لگاتے ہوئے کہا۔

''سبینہ میں نے تم سے رائے نہیں مانگی۔ تم اچھی طرح جانتی ہو ایشال کے بارے میں مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔'' عبدالمنان نے سنجیدگی سے کہا۔

''میرا مشورہ مت مانیں، اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کر بتائیں کیا آپ کو ایشال خوش نظر آتی ہے؟ وہ آپ کی بیٹی ہے اور آپ کو اس کی خوشی کا خیال رکھنا چاہیے۔ ویسے بھی یہاں نہ آپ ہوں گے اور نہ میں، ایسے میں چند دنوں کے لیے اگر وہ اپنے ماموں سے مل لے گی تو کیا ہو جائے

گا۔ باقی آپ اس کے باپ ہیں اور اس کا اچھا برا بخوبی جانتے ہیں۔" سیمنہ یہ سب کہتے لوشن کی بوتل بند کرتے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

گلبرگ تھری میں بنے اپنے شاندار آفس کے ساؤنڈ پروف کیبن میں بیٹھے عبدالمنان احمد کسی گہری سوچ میں تھے۔ سگار کا کش لیتے ہوئے انہوں نے اپنے موبائل پہ ایک نمبر ملایا۔

"السلام علیکم منان بھائی!" دوسری طرف سے یاسر علی کی آواز آئی۔

"ایشال پانچ جولائی کو ٹورنٹو پہنچ جائے گی تم اسے ائرپورٹ سے پک کر لینا۔" عبدالمنان نے مختصراً کہا۔

"ایشال کینیڈا آ رہی ہے؟ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ ہماری تو کب سے خواہش تھی کہ وہ کچھ عرصہ میرے پاس رہے۔ عالیہ اور بچے یہ سنیں گے تو نہال ہو جائیں گے۔" یاسر علی یہ خبر سن کر بہت ایکسائٹڈ تھے۔

"سترہ کو میں اور سیمنہ اوٹاوا آ رہے ہیں۔ ایک اہم بزنس ڈیل کے سلسلے میں مجھے ٹورنٹو بھی آنا ہوگا۔ میں اور سیمنہ اکیس کو ٹورنٹو پہنچ جائیں گے۔ ایشال ہمارے ساتھ ہی پاکستان واپس آئے گی۔" عبدالمنان نے مزید کہا۔

"بس تو پھر آپ اور سیمنہ میرے پاس ہی رکیں گے۔" یاسر نے کہا۔

"تم جانتے ہو یاسر میں کسی کے گھر سے زیادہ ہوٹل میں کمفرٹیبل محسوس کرتا ہوں۔ ویسے بھی میں وہاں بزنس کے سلسلے میں آ رہا ہوں کوئی سوشل گیٹ ٹوگیدر کرنے نہیں۔" عبدالمنان کا لہجہ سپاٹ تھا۔

☆☆☆

یاسر اور عالیہ، ایشال کو لینے ائرپورٹ آئے تھے۔ ایشال ان دونوں سے مل کر بے حد خوش ہوئی۔ عالیہ کی دوستانہ طبیعت کی وجہ سے ایشال جلد ہی ان کے ساتھ مانوس ہو گئی تھی۔ ان کے دونوں بچے لبیبہ اور فرقان عمر میں ایشال سے چھوٹے تھے لیکن ایشال سے ان کی خوب دوستی ہو گئی تھی۔ لبیبہ کالج میں تھی اور فرقان ساتویں گریڈ میں پڑھتا تھا۔ ایشال کے برعکس وہ دونوں بہت کانفیڈینٹ بچے تھے۔ جس کی وجہ یاسر اور عالیہ کی بہترین تربیت تھی۔ یاسر نے اپنی اولاد کی محبت کو دولت کے ڈھیر تلے دبایا نہیں تھا نہ ہی عالیہ اپنی سوشل لائف کے چکر میں اپنے گھر کو اگنور کرتی تھی۔ عبدالمنان کے پاس ایشال کے لیے پیسہ تھا، آسائشیں تھیں لیکن وقت نہیں تھا۔ یاسر کی زندگی متوازن تھی جبکہ عبدالمنان ایک ابنارمل زندگی گزار رہے تھے اور یہاں آ کر ایشال کو یہ احساس شدت سے ہونے لگا تھا۔

یاسر اور ان کی فیملی ایشال کا ہر طرح خیال رکھ رہے تھے۔ دن میں اسے گھمانے پھرانے کی ذمے داری عالیہ ممانی نے سنبھال رکھی تھی اور شام میں یاسر اور بچے بھی ان کے ساتھ ہوتے تھے۔

"ایشال آپی آپ واک کے لیے کیوں نہیں چلی جاتیں؟ آخر آپ کو صبح اتنی جلدی اٹھنے کا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ یہ تو آئیڈیل دن ہیں مارننگ واک کے۔" لبیبہ اور ایشال لاؤنج میں بیٹھی مووی دیکھ رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ اسنیکس پر بھی ہاتھ صاف ہو رہا تھا۔

"میں اکیلی کیسے جا سکتی ہوں لبیبہ۔ مجھے تو یہاں کے راستے بھی معلوم نہیں ہیں۔" ایشال کو لبیبہ کا مشورہ سن کر حیرت ہوئی۔

"تو میں کون سا آپ سے ڈاؤن ٹاؤن جانے کا کہہ رہی ہوں۔ ریور سائڈ پہ جو پارک بنا ہے، وہاں چلی جایا کریں۔ کیوں پاپا میں نے ٹھیک کہا ناں؟" لبیبہ نے لاؤنج میں داخل ہوتے یاسر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"بالکل ہمارے گھر سے دو منٹ کی واک ہے بس۔ سمر میں وہاں کافی گہما گہمی ہوتی ہے۔ تمہیں اچھا لگے گا وہاں جا کر۔" یاسر نے محبت سے کہا۔

یاسر علی، ایشال کی شخصیت میں اعتماد لانا چاہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا عبدالمنان کی سخت طبیعت نے کس طرح ایشال کے اعتماد کا گلا گھونٹ رکھا ہے۔ اس کی شخصیت کو دبا دیا ہے۔ اسی لیے انہوں نے ایشال کے واک پہ جانے کی حوصلہ افزائی کی تھی۔

کریڈٹ ریور کے کنارے۔ ناویلی پارک ان کے گھر سے محض دو منٹ کی واک پر تھا۔ سورج ان دنوں جلد طلوع ہو جاتا تھا۔ پارک میں واقعی بہت گھما گہمی تھی۔ ایشال کے لیے نہ صرف یہ لوگ اجنبی تھے بلکہ شہر بھی انجان تھا۔ دریا کے کنارے خوب صورت بینچ پر لگے ایک بینچ پہ بیٹھی وہ آتے جاتے لوگوں کو خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ کنارے پہ بنے جاگنگ ٹریک پہ اس وقت کافی رش تھا۔ دریا کے اجلے پانی کی خنکی اور سبزہ، صبح کی مدھم دھوپ کے ساتھ ایک حسین تاثر پیدا کر رہا تھا۔ پرپل ٹاپ اور بلیک ٹراؤزر میں بالوں کو کیچر میں جکڑے وہ بہت سادہ سے حلیے میں تھی۔ اردگرد شور بھی تھا اور ہجوم بھی۔ لیکن اس کے اندر تنہائی تھی۔ ظاہری طور پہ کینیڈا آکر وہ بہت خوش تھی لیکن یاسر اور ان کی فیملی سے مل کر اس کا تاسف اور بھی بڑھ گیا تھا۔

"کیوں میرے کی بابا مجھے پیار سے نہیں بلاتے ہیں؟ ان کی توجہ ان کی دلچسپی صرف پیسے تک محدود ہے۔ زندگی کا مرکز اور محور فقط کاروبار بن چکا ہے لیکن اپنی اکلوتی اولاد کے لیے ان کے دل میں کوئی جذبہ نہیں ہے۔ دو کے چار اور دس کے لاکھ بنانے کی جستجو میں وہ مجھے تو بھول ہی گئے ہیں۔ کتنا اچھا لگتا ہے جب یاسر ماموں لبنیٰ اور فرقان کے ساتھ نرمی اور محبت سے پیش آتے ہیں اور ان سے باتیں کرتے ہیں، ان کے مسئلے سنتے ہیں ایسے میرے بابا کیوں نہیں کرتے۔" اپنے اردگرد سے لاتعلق وہ اپنی اور اپنے ماموں کے بچوں کی زندگی کا موازنہ کرتی رہتی۔

پارک میں پندرہ بیس منٹ بیٹھ کر وہ گھر واپس آگئی۔ حالانکہ اس کا دوبارہ پارک جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اگلی صبح وہ پھر وہاں موجود تھی۔ شاید اسے تنہائی کی ضرورت تھی۔ سب لوگوں کے درمیان مسکراتے رہنا اس کی مجبوری تھی لیکن یہاں کوئی اسے جانتا نہیں تھا۔ یہاں اسے اپنی اداسی کسی سے چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ آج پھر وہ اپنے ہی خیالوں میں گم بیٹھی تھی جب اپنے قریب کسی کی موجودگی کو محسوس کر کے اس نے سر اٹھایا۔

"میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" پرکشش لہجے میں اس نے نرمی سے پوچھا۔ گرے جاگنگ سوٹ میں ملبوس وہ اس کی بینچ کے پاس کھڑا تھا۔

"اگر آپ برا نہ منائیں تو کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" اس شخص نے انگریزی میں آکر اس سے پوچھا تھا۔

ایشال نے حیرت سے پہلے اس چھبیس، ستائیس سالہ شخص کو اور پھر اپنے اردگرد گھومتے لوگوں کو دیکھا۔ وہاں کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ یہاں لوگوں کے پاس دوسروں کو دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔

ایشال کی حیران صورت دیکھ کر وہ اس سے ذرا فاصلے پہ اسی بینچ پہ بیٹھ گیا تھا۔

"آپ پاکستانی ہیں؟" ہاتھ میں پکڑی پانی کی بوتل اس نے لبوں سے لگائی۔

ایشال نے سر اثبات میں ہلایا۔ اس کے چہرے پہ الجھن واضح تھی۔

"میں صارم ہوں، صارم وحید۔ یہیں پارک لین میں رہتا ہوں۔ میرا تعلق بھی پاکستان سے ہے۔ میں روزانہ صبح یہاں جاگنگ کے لیے آتا ہوں۔ میں نے کل بھی آپ کو اسی بینچ پہ اکیلے بیٹھے دیکھا تھا۔ آپ شاید یہاں نئی شفٹ ہوئی ہیں، کل سے پہلے میں نے آپ کو اس پارک میں کبھی نہیں دیکھا۔" لہجہ دوستانہ لیکن مؤدب تھا۔

"میرا نام ایشال ہے۔ میں کینیڈا اپنے رشتے داروں سے ملنے آئی ہوں۔" ایشال نے مختصراً جواب دیا۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ایشال۔ پردیس میں کوئی ہم وطن مل جائے تو بہت اچھا محسوس ہوتا ہے۔" اس نے خوش دلی سے کہا۔

اس بات پر ایشال بہ مشکل مسکرائی۔

"امید کرتا ہوں ہم پھر ملیں گے ابھی تو میرے آفس کا وقت ہو رہا ہے۔" خوش اخلاقی سے کہتا وہ پارک کے خارجی دروازے کی طرف چل پڑا تھا۔ ایشال خاموشی سے اسے پارک سے نکلتا دیکھتی رہی۔ اس شخص

کے رویے نے اسے الجھن اور حیرت میں ڈال دیا۔ سارا دن وہ اجنبی اس کے ذہن سے نہیں اترا تھا۔ اگلے دن وہ پارک میں اپنی مخصوص جگہ پہ بیٹھی تھی جب صارم کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''اس عمر میں اتنی گہری سوچ میں ڈوبی لڑکی میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔'' وہ اس کے پاس کھڑا مسکرا رہا تھا۔

ایشال نے سنجیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ بلیک ٹریک ٹراوزر اور وائٹ شرٹ میں وہ مبالغے کی حد تک اسمارٹ لگ رہا تھا۔ اس کا قد چھ فٹ کے قریب تھا۔

''گڈ مارننگ!'' ایشال نے کہا۔

''گڈ مارننگ مادام۔'' اس نے بھی خوش دلی سے کہا۔

''ویسے سوچنے کا کام تو چلتے پھرتے بھی ہو سکتا ہے اس کے لیے کوئی مخصوص نشست درکار نہیں ہوتی۔'' وہ بھی ایشال کے ساتھ بینچ پہ ہی بیٹھ گیا تھا۔

''آپ جاگنگ کرتے ہوئے یہاں وہاں کیوں دیکھتے ہیں۔'' ایشال اکتاہٹ سے بولی۔ اس کی بات سے محظوظ ہوتے صارم نے قہقہہ لگایا۔

''ایک تو جاگنگ آنکھیں کھلی رکھ کر کی جاتی ہے دوسرے اتنی خوب صورت صبح میں ایک حسین لڑکی دریا کے کنارے اکیلی بیٹھی ہے۔ اسے نظرانداز کرنے کا جرم کم سے کم میں تو نہیں کر سکتا۔'' اس کا مذاق ایشال کو گراں گزر رہا تھا۔

''میں جا رہی ہوں۔'' ایشال یک دم بینچ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''شاید میں بے تکلفی میں کچھ زیادہ بول گیا اس کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ آپ پلیز بیٹھی رہیں، میں جا رہا ہوں۔'' ایشال سے معذرت کرتا وہ سنجیدگی سے جاگنگ ٹریک کی طرف چلا گیا تھا۔ ایشال دوبارہ بینچ پہ بیٹھ گئی تھی لیکن اس جگہ سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ اس کے جانے کے چند منٹ بعد ہی وہ گھر لوٹ آئی تھی۔

وہ پورا دن اس نے بے چینی اور الجھن میں گزارا۔ اسے اپنے روڈ ہونے پہ بہت غصہ آ رہا تھا۔ ہم وطن جان کر اس بیچارے نے اگر ایشال سے دو منٹ بات کر لی تو اس میں اتنا برا منانے کی کیا ضرورت تھی۔ اسے اپنی فرسٹریشن کا غصہ ایک اجنبی پہ نہیں نکالنا چاہیے تھا۔ یہی بات سوچ کر وہ شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

اگلی صبح پھر وہ اسی بینچ پہ بیٹھی تھی لیکن آج اس کا مقصد صارم سے معافی مانگنا تھا۔ اس کی نظریں جاگنگ ٹریک پہ تھیں۔ کبھی کبھی گردن گھما کر وہ پارک کے داخلی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہاتھ میں پانی کی بوتل پکڑے وہ دور سے آتا دکھائی دیا۔ ایشال کو اس نے مکمل نظرانداز کرتے ہوئے اپنی دوڑ جاری رکھی۔ ایشال نے اسے جاتا دیکھ کر بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ ایشال کو دیکھ کر رکا نہیں تھا۔ اس بات نے ایشال کو اور بھی بے چین کر دیا تھا۔

وہ دوسری بار بھی اسے دیکھے بغیر اس کے سامنے سے گزر رہا تھا مگر اس بار ایشال سے رہا نہ گیا۔

''صارم......'' اس کے قدم ایشال کی آواز پہ رک گئے تھے۔ اسے رکتا دیکھ کر ایشال تیز قدموں سے چلتی اس کے قریب آئی۔

''گڈ مارننگ صارم۔'' جھجکتے ہوئے ایشال نے اس سے کہا۔

''گڈ مارننگ ایشال۔ کیسی ہیں آپ؟'' اس کا لہجہ اور مسکراہٹ ایسے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کی مسکراہٹ نے ایشال کی ہمت بڑھائی۔

''مجھے آپ سے سوری کہنا تھا۔ کل میں نے آپ کے ساتھ بہت بدتمیزی کی تھی۔ مجھے اپنے رویے پہ بے حد شرمندگی ہے۔''

''آپ کو مجھ سے معذرت کرنے کی ضرورت نہیں ہے ایشال۔ میں نے آپ کی کسی بات کا برا نہیں منایا۔'' صارم نے خلوص سے کہا۔

''میں جانتی ہوں کہ غلطی میری ہی ہے۔ مجھے اتنا اوور ری ایکٹ نہیں کرنا چاہیے تھا در اصل میری نیچر بہت ریزروڈ ہے۔ میں ہر کسی سے بے تکلف نہیں ہو پاتی۔'' ایشال نے وضاحت دینا چاہی۔

''آپ نے سوری کہہ دیا، میرے نزدیک اس کی

بھی کوئی ضرورت نہیں تھی اور آپ مجھے وضاحتیں دینے کی پابند نہیں ہیں۔ آپ کو اکیلے گم صم بیٹھا دیکھ کر مجھے لگا آپ کی زندگی میں دوستوں کی کمی ہے اور میں سمجھتا ہوں میں ایک بہت اچھا دوست ہوں۔ بس یہی سوچ کر آپ کے پاس آیا تھا۔" صارم کے لہجے کی نرمی اب بھی برقرار تھی۔

"دوستوں کی کمی تھی لیکن شاید اب نہیں ہے۔" ایشال، صارم کے سامنے پہلی بار مسکرائی تھی۔

"فرینڈز؟" ایشال نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"میں وعدہ کرتا ہو ایشال میری دوستی آپ کو کبھی لیٹ ڈاؤن نہیں ہونے دے گی۔" صارم نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا۔

☆☆☆

اگلے دن ایشال پارک پہنچی تو صارم اس کا گیٹ پہ ہی انتظار کر رہا تھا۔

"ویسے کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گی تمہیں کون سا نیا پاکستان بنانے کی فکر لاحق ہے۔ اتنے خوب صورت موسم اور ماحول میں ایک کیوٹ سی لڑکی گہری سوچ میں ڈوبی ہو تو ہر کسی کی توجہ اس کی طرف جائے گی۔ خاص طور پہ جب وہ آپ کی ہم وطن بھی ہو۔" جاگنگ کے بجائے آج وہ ایشال کے ساتھ واکنگ ٹریک پہ تھا۔ چلتے، چلتے صارم نے رک کر اس سے پوچھا۔

ایشال نے ریور سائیڈ پہ بنے جنگلے سے ٹیک لگاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ صارم نے نوٹ کیا اس کے سوال پہ ایشال کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔

"پلیز اب تم ناراض مت ہو جانا، تم اگر بتانا نہیں چاہتی ہو تو میں زور نہیں دوں گا لیکن دوست ہونے کے ناتے میں جاننا چاہوں گا کہ تمہیں ایسی کیا پریشانی لاحق ہے شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔" صارم نے نرمی سے کہا۔

"کچھ مسئلوں کا کوئی حل نہیں ہوتا صارم، اس لیے انہیں شیئر کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" ایشال نے بے دلی سے کہا۔

"میری سوچ تمہاری فلاسفی کے برعکس ہے، میرے نزدیک ایسا کوئی مسئلہ نہیں جس کا حل نہ ہو۔ بس ہمیں اپنے سوچنے کا۔۔۔ انداز بدلنے کی ضرورت ہے۔ آج جو پریشانی تمہیں مایوس کر رہی ہے، جسے سوچ کر تم اتنی اذیت محسوس کرتی ہو، یہ بھی تو ہو سکتا ہے وہ درحقیقت کوئی بہت بڑا مسئلہ ہو ہی نہیں۔" صارم کی بات پہ ایشال استہزائیہ لہجے میں ہنسی۔

"آپ ایسا اس لیے کہہ رہے ہیں کیونکہ آپ میری پرابلم سے واقف ہی نہیں ہیں، آپ کی زندگی نارمل ہے۔ آپ کی زندگی میں باپ کی صورت میں کوئی ڈکٹیٹر نہیں ہے جس کی محبت اور توجہ کے لیے آپ دن رات ترستے ہیں، لوگ مکان کو گھر بناتے ہیں لیکن میرے بابا نے اسے جیل بنا دیا ہے۔ ان سے بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ جب میں اپنے کزنز کو دیکھتی ہوں تو میرا یہ کمپلیکس اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ وہ دونوں کتنے اعتماد کے ساتھ ماموں سے بات کرتے ہیں۔ جب میری ماما کی ڈیتھ ہوئی تو میں دس سال کی تھی۔ میں آج بھی وہ لمحے بھول نہیں سکی صارم جب ماما آخری بار بابا سے ملنا چاہتی تھیں، ان سے کچھ کہنا چاہتی تھیں اور بابا ایک بزنس ٹور پہ گئے ہوئے تھے۔ اپنی بیوی کے آخری وقت میں اس کے پاس ہونے کے بجائے بابا کے لیے ان کا کاروبار اہم تھا۔ ان کی ترجیحات ان کی فیملی نہیں ان کا کاروبار رہا ہے۔ انہیں بیوی بچے نہیں غلام چاہئیں۔۔۔" صارم کو اپنے بارے میں بتاتے ہوئے ایشال کے چہرے کی اداسی بڑھ گئی تھی۔

"ایشال نارمل لائف کیا ہوتی ہے؟ نارمل لائف ایک بہت ٹیپیکل، بہت عام سی زندگی ہے جہاں سب کچھ ویسے ہو جیسا آپ سوچتے ہیں۔ لیکن اگر تم لوگوں کی زندگی کا تجزیہ کرو تو ہم سب کہیں نہ کہیں ایک ابنارمل لائف کو لیڈ کر رہے ہیں۔ یہ ہم پہ ڈپینڈ کرتا ہے کہ ہم نے اس سچویشن کو کیسے خود پہ طاری کیا ہوا ہے۔ میں مانتا ہوں تمہارے والد تمہیں اگنور کرتے ہیں یا ان کا رویہ تمہارے ساتھ ایک آئیڈیل باپ والا نہیں ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہیں نہ کہیں تم خود بھی اس سب کی ذمے دار

ہو۔ یہ بتاؤ تم نے اپنے اور ان کے ریلیشن میں آئی خلیج کو کم کرنے کے لیے کیا، کیا؟ تم نے ان کی حاکمیت کو بغیر کسی چون و چرا کے قبول کر لیا ہے۔ تم نے خود کو بے بس (عقل سے عاری دو پاؤں کا جانور) تسلیم کر لیا اور اپنے آپ کو مظلومیت کے خول میں بند کر چکی ہو۔"

صارم کی باتوں پہ ایشال بے پناہ چڑ گئی۔

"آپ یہ سب اس لیے کہہ رہے کیونکہ آپ کا واسطہ کبھی ایسی صورتِ حال سے نہیں پڑا۔ مشورہ دینا بہت آسان ہے۔ دوسروں کا تجزیہ کرنا تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے لیکن اس سے ملتی جلتی کوئی پرابلم جب ہمیں خود فیس کرنی پڑے تو پتا چلتا ہے کہ کہنے اور کرنے میں کتنا فرق ہے۔"

"تمہیں لگتا ہے میں جو تمہیں سمجھا رہا ہوں تو صرف اس لیے کہ میری زندگی پرابلم فری ہے۔ میں جنت میں رہتا ہوں۔ ایشال میں نے آج تک اپنے پرابلمز کی تشہیر نہیں کی ہے، آج جو بات میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں، میرے قریبی دوستوں کو بھی اس کا علم نہیں ہے۔ لیکن تمہیں خودترسی سے نکالنے کی لیے میں سمجھتا ہوں تمہیں اپنی زندگی کا سچ بتانا بہت ضروری ہے۔ تم نارمل لائف اور گھر کی بات کرتی ہو۔ تمہیں لگتا ہے تمہارے سوا سب پرابلم فری زندگی گزار رہے ہیں۔ تمہیں لگتا ہے سب کے پاس گھر ہے۔ سب کے پاس رشتے ہیں، مجھ سے ملو ایشال میں صارم وحید۔ جو گھر اور رشتوں کے ہوتے ہوئے بھی تنہا ہے۔ میرے پیرنٹس میں اس وقت علیحدگی ہوئی جب میں صرف پانچ سال کا تھا، میرے پیرنٹس نے اپنے اپنے گھر دوبارہ بسا لیے۔ ان دونوں نے میرے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ ڈائیورس کے بعد جہاں ان دونوں نے ہر چیز کا بٹوارا کیا وہیں مجھے بھی بانٹ لیا۔ لیکن میری اہمیت ان تمام چیزوں میں سب سے کم تھی جن کی تقسیم میرے ماں، باپ کے درمیان ہوئی۔ ممی کے دوسرے شوہر کو میرا اپنے گھر میں رہنا پسند نہیں تھا اور یہی مسئلہ ڈیڈ کے ساتھ بھی تھا۔ اس لیے مجھے نانا کے پاس بھیج دیا گیا۔ ممی اور ڈیڈی نے مجھے فنانشلی تو سپورٹ کیا لیکن اب ان کی زندگیوں میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ ان کے اپنے بچے ہیں اور وہ ایک مکمل زندگی گزار رہے ہیں۔ اب اس بات پہ میں کب تک آنسو بہاتا رہتا۔ میں اس سچ کو قبول کر چکا ہوں کہ میں ایک بروکن فیملی سے ہوں۔ میرے پیرنٹس کی وجہ سے جتنا سفر میں نے کیا ہے ایسی سچویشن میں اکثر بچے بگڑ جاتے ہیں۔ گمراہ ہو جاتے ہیں لیکن میں نے خود کو سنبھال لیا۔ اور یہی میرا کمال ہے۔ ایشال میں اپنے پیرنٹس کے فیصلے کو بدل نہیں سکا لیکن اپنی زندگی بدلنا تو میرے اختیار میں ہے۔" صارم نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔

"آئی ایم سوری صارم۔ انجانے میں میں نے آپ کو بہت ہرٹ کیا ہے۔ آپ کو دیکھ کر لگتا ہی نہیں آپ کا بھی کوئی فیملی ایشو ہو سکتا ہے۔" ایشال نے شرمندگی سے کہا۔

"اب اس بات کو اتنا بھی دل پہ لینے کی ضرورت نہیں ہے محترمہ، یہ زندگی ہے یہاں کب کیا ہو جائے کچھ پتا نہیں چلتا۔ لیکن میری تمہیں ایک ایڈوائس ہے۔ خود کو اذیت دینا بند کرو ایشال۔ اپنی سوچ کو مثبت کرو۔ تم اپنے اور اپنے فادر کے درمیان آئے فاصلے کو کم کرنے کی کوشش کرو۔"

"لیکن مجھے بابا سے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں ان کے سامنے کچھ بھی بول نہیں پاتی۔"

"وہ تمہارے والد ہیں ایشال، اگر انہیں تمہاری کسی بات سے اختلاف ہوگا تو زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا؟ وہ تمہیں ڈانٹ دیں گے بس۔"

"مجھے ان کی ڈانٹ سے ہی خوف آتا ہے۔"

"کیا وہ تمہیں اکثر ڈانٹتے ہیں؟"

"نہیں لیکن وہ مجھ سے بہت کم بات کرتے ہیں۔ جب انہیں کوئی ضروری بات کہنی ہو۔"

"تو تم خود اُن سے بات کیا کرو۔ دو لوگوں میں سے کسی ایک کو تو اس برف کو پگھلانا ہوگا ناں۔"

"یہ سب کہنا جتنا آسان ہے پر ایسا کرنا اتنا ہی مشکل ہے۔"

"کیا تمہارے والد کا تمہاری سوتیلی والدہ کے ساتھ بھی یہی رویہ ہے؟"

"ہاں، وہ ان سے بھی بہت کم بات کرتے ہیں۔ اکثر ڈانٹ بھی دیتے ہیں لیکن سینہ آنٹی پھر بھی بابا سے بحث کرتی ہیں اور اکثر اپنی باتیں منوا بھی لیتی ہیں۔"

"تو تم بھی ضد کر کے ان سے اپنی بات منوا سکتی ہو۔"

"وہ بہت دلیر ہیں، میں اتنی ہمت نہیں رکھتی۔"

"ایشال میرا خیال ہے تم اپنے بابا کو بدلنے کی کوشش کرنے کے بجائے خود کو بدلو۔ ان کے ساتھ اپنے تعلقات کو بہتر کرو۔ میرے خیال میں جس رویے کو تم ان کی سردمہری کہہ رہی ہو وہ ان کی طبیعت کا حصہ ہے، انہوں نے تمہیں چھوڑا نہیں ہے بس خود سے دور کر لیا ہے اب یہ تم پہ منحصر ہے تم کیسے انہیں اپنے قریب لاتی ہو۔ تم بھلے اس سب میں کامیاب نہ ہو پاؤ لیکن ایک بار کوشش ضرور کرنا۔" صارم کے سمجھانے پہ ایشال نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

"اب چلیں؟ تمہارے چکر میں، میں ضرور آج آفس سے لیٹ ہو جاؤں گا۔" صارم کی بات پہ ایشال کو بھی وقت کا خیال آیا۔

"آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں آپ کرتے کیا ہیں؟" ایشال نے چلتے چلتے سوال کیا۔

"غم ہائے روزگار میں الجھا ہوا ہوں میں۔ آپ کے بابا جیسا........ انڈسٹریلسٹ تو نہیں ہوں۔ نو سے پانچ کی واجبی سی ملازمت کرتا ہوں۔" اس نے مصنوعی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

صارم سے بات کرنے کے بعد اور اپنا دکھ اس سے شیئر کرنے کے بعد سے وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ جس طرح صارم نے اپنی مثال دے کر اسے سمجھایا مائرہ دراصل اس طرح اسے مطمئن نہیں کر پاتی تھی۔ صارم کی باتوں سے اسے حوصلہ ملا تھا۔ آج سارا دن وہ انہی باتوں کو سوچتی رہی تھی۔

"کل میری چھٹی ہے۔ میں سوچ رہی ہوں میں بھی آپ کے ساتھ واک کی لیے جاؤں گی۔" لاؤنج میں اکیلی بیٹھی وہ صارم کے متعلق سوچ رہی تھی جب لبیبہ نے اس کے پاس آ کر اعلان کیا۔

"کیوں؟" ایشال نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"کیوں کا کیا مطلب ایشال آپی، کیا میں آپ کے ساتھ واک کے لیے نہیں جا سکتی۔" لبیبہ نے خفگی سے کہا۔

"میرا وہ مطلب نہیں تھا لبیبہ۔ وہ تو بس ایسے ہی منہ سے نکل گیا۔" ایشال کو سمجھ نہیں آ رہا تھا اب وہ کہے تو کیا کہے۔

"دراصل میں دیکھنا چاہتی تھی پارک میں آج کل ہوا کا رخ کیا ہے، جو آپ اتنی فریش لگنے لگی ہیں۔" لبیبہ نے شوخی سے کہا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں، تمہیں شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔" ایشال نے نظریں چرائیں۔

"اچھا تو جلدی سے بتائیں، کیا سوچ کر آپ اکیلے میں مسکرا رہی تھیں؟" لبیبہ کو اسے چڑانے میں مزہ آ رہا تھا۔

"لبیبہ پلیز، ایسا کچھ نہیں ہے۔" ایشال نے.... بے بسی سے کہا۔

"چلیں مان لیتے ہیں۔" لبیبہ نے مسکراتے ہوئے کہا

اگلی صبح وہ بھی ایشال کے ساتھ پارک میں آئی تھی۔ صارم اس کا دروازے پہ انتظار کر رہا تھا جب وہ پارک میں داخل ہوئی۔ وہ نہیں جانتی تھی صارم سے مل کر لبیبہ کیا سوچے گی۔

"لبیبہ یہ صارم ہیں۔ چند دن پہلے پارک میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔" ایشال نے تعارف کروایا۔ صارم بھی خوش دلی سے ملا۔

واک کے دوران تینوں میں باتیں ہوتی رہیں صارم اور لبیبہ کو ایک دوسرے سے مل کر اچھا لگا تھا۔

"ایشال آپی کیا شاندار بندہ ہے۔ جتنی امپریسو پرسنیلٹی ہے اتنا ہی اٹریکٹو بات کرنے کا انداز۔ میں تو پہلی ملاقات میں ہی فین ہو گئی ہوں صارم کی۔ اب پتا چلا آج کل آپ بات بے بات مسکراتی کیوں رہتی ہیں۔" لبیبہ

نے راستے میں ایشال سے کہا۔
"لیبہ وہ صرف میرا دوست ہے۔ اس سے آگے تم کوئی اندازہ نہ لگاؤ تو اچھا ہے ورنہ میں تمہاری پٹائی کر دوں گی۔" ایشال اس کے شرارتی انداز پہ روہانسی ہو رہی تھی۔ ایشال کے جواب پہ لیبہ نے مسکراتے ہوئے اسے پیار سے دیکھا۔
"ویسے اگر یہ دوستی سے آگے والا معاملہ ہے تو میں آپ کے ساتھ ہوں۔ آپ چاہیں تو میں پاپا سے بھی بات کر سکتی ہوں۔" اس کی شوخی پہ ایشال نے سر پیٹ لیا۔
"توبہ ہے لیبہ بات کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہو۔" ایشال کو لیبہ سے جان چھڑانا مشکل ہو رہا تھا۔

☆☆☆

دن تیزی سے گزر رہے تھے اور صارم سے اس کی دوستی مزید گہری ہوتی جا رہی تھی۔ پارک میں دونوں کا ملنا روز کا معمول تھا۔ دل کی کیفیت بدلنے لگی تھی۔ زندگی سے شکایتیں کم ہونے لگی تھیں۔ صارم اس کی ذات کا ایک اہم حصہ بنتا جا رہا تھا۔ اس دن لیبہ کالج سے آئی تو ایشال کو اپنا منتظر پایا۔
"صارم مجھے نیاگرا فال لے جانا چاہتا ہے۔" ایشال بہت گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔
"ہاؤ ایکسائٹنگ پھر کب جا رہی ہیں آپ؟" لیبہ نے جوش سے کہا
"تم پاگل تو نہیں ہو لیبہ.... کیسے جا سکتی ہوں میں اس کے ساتھ فال دیکھنے۔ ماموں اور ممانی سے کیا کہوں گی؟ میں کہاں جا رہی ہوں۔" اسے لیبہ کی بات پہ حیرت ہوئی۔ "میں نے تو صاف منع کر دیا کہ میں فال دیکھ چکی ہوں۔"
"آپی، آپ کتنی بورنگ ہیں۔ ایک ہینڈسم بندہ جو آپ کا اتنا اچھا دوست بھی ہے۔ آپ اسے پسند کرتی ہیں لیکن اس کے ساتھ چار گھنٹے کے لیے گھومنے جاتے ہوئے آپ کی جان نکل رہی ہے۔" لیبہ خفگی سے بولی۔
"لیبہ وہ صرف میرا دوست ہے اس سے آگے میں کچھ سوچ بھی نہیں سکتی۔ چند دن بعد جب میں پاکستان چلی جاؤں گی تو شاید ہم کبھی ایک دوسرے سے بات بھی نہ کر سکیں۔ تم بابا کو اچھی طرح جانتی ہو۔ مجھے سانس بھی بابا کی مرضی سے لینی پڑتی ہے۔ شاید مجھے صارم سے دوستی کرنی ہی نہیں چاہیے تھی۔" ایشال کو پچھتاوا ہو رہا تھا۔
"آپی پلیز خود سے تو سچ بولیں۔ میں نے آپ کی آنکھوں میں، آپ کی باتوں میں صارم کے لیے دوستی سے بڑھ کر جذبہ دیکھا ہے اور منان انکل بھلے بہت ایکسپریسو نہیں لیکن وہ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ آپ کیوں اتنا نیگیٹیو سوچ رہی ہیں۔ وہ آپ کی شادی آپ کی مرضی کے بغیر نہیں کر سکتے۔" لیبہ نے ایشال کا ہاتھ تھام کر اسے سمجھایا۔
"تم بہت آگے کا سوچ رہی ہو لیبہ، میں اگر صارم کے لیے کوئی جذبہ رکھتی بھی ہوں تو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ صارم مجھے اپنی دوست سے بڑھ کر اور کچھ نہیں سمجھتا۔ اس نے اشارتاً بھی مجھے ایسا احساس نہیں دلایا کہ اس کے دل میں میرے لیے دوستی سے بڑھ کر کچھ ہے۔ ایک دوست ہونے کے ناتے وہ مجھے ایک ہسٹوریکل پوائنٹ دکھانا چاہتا ہے۔ اتفاق سے میں وہ جگہ تم لوگوں کے ساتھ دیکھ بھی چکی ہوں اور اب میں اسے منع کر چکی ہوں۔ مجھے تمہیں یہ بات بتانی ہی نہیں چاہیے تھی۔" ایشال نے دھیمی آواز میں کہا۔
"آپ غلط کہہ رہی ہیں انفیکٹ آپ نے مجھے یہ سب اسی لیے بتایا ہے کیونکہ آپ صارم کے ساتھ فال دیکھنے جانا چاہتی ہیں۔ ورنہ انہیں انکار کر کے اس بات کو مجھ سے کبھی نہ کہتیں۔" لیبہ کی بات پہ ایشال نے نظریں چرائیں۔
"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے لیبہ... یہ بھی تو ہو سکتا ہے یہ محبت یکطرفہ ہو اور اگر وہ بھی میری طرح اس مرضِ عشق میں مبتلا ہے تو یہ اور بھی پریشانی کی بات ہے۔ بابا کا ردِعمل سوچ کر میں کانپ جاتی ہوں۔"
"صارم بھائی ایک سلجھے ہوئے انسان ہیں، آپ کی فکر کرتے ہیں۔ اگر یہ دوستی ایک رشتے میں بدل

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



جائے تو اس بات کی مجھے دلی خوشی ہوگی۔ مجھے امید ہے انکل اگر اس سے مل لیں تو اس رشتے سے کبھی انکار نہیں کریں گے۔'' لیہہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر محبت سے کہا۔

اگلے دن لیہہ ڈیڈی سے کسی دوست کے گھر جانے کا کہہ کر نکلی تھی اور اس نے مجوزہ جگہ اسے چھوڑا تھا۔

☆☆☆

اس سے پہلے وہ یاسر اور ان کی فیملی کے ساتھ ویک اینڈ پہ یہاں آئی تھی۔ موسم گرما میں نیاگرا سیاحوں سے بھری ہوتی ہے۔ لیکن آج ویک ڈے کی وجہ سے وہاں بہت زیادہ ہجوم نہیں تھا۔ لیک میں فیری رائیڈ لیتے ہوئے وہ بہت ایکسائٹڈ تھی۔ فیری انہیں آبشار کے بہت نزدیک لے گئی تھی۔ آبشار سے اٹھنے والی پھوار سے وہ دونوں بری طرح بھیگ چکے ہوتے اگر جو انہوں نے وہ رین کوٹ نہ پہنے ہوتے جو فیری کے عملے نے انہیں سوار ہونے سے پہلے دیے تھے۔

''تمہیں بہت اچھا لگ رہا ہے ناں یہاں آکر؟'' صارم نے اس کے چہرے کو نظروں میں رکھتے ہوئے کہا۔

''بہت......'' وہ جوش سے بولی۔

''یہ اور بات ہے کہ تم نے یہ جگہ پہلے بھی دیکھی ہوئی تھی۔'' اس نے جتایا۔ اس کے پاس جواب نہیں تھا۔

''اب شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے تمہارے چہرے پہ خوشی کے تاثرات زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے تم اپنا کوئی بھی تاثر چھپا نہیں سکتیں، تمہارا چہرہ تمہاری ساری فیلنگز کو بیان کر دیتا ہے۔''

وہ بہت دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ میڈ آف مسٹ کے بعد اب وہ دونوں آئسکریم کھا رہے تھے۔ لیک کے ساتھ واک کرتے وہ دونوں اب وہاں کھڑے تھے جہاں سے آبشار نیچے گر رہی تھی۔ آبی پرندوں کے غول کے غول وہاں موجود تھے۔ اسی پل ایک پرندے نے پانی کی سطح سے مچھلی منہ میں دبا کر اڑان بھری۔ اس نے مسکراتی آنکھوں سے یہ حسین منظر دیکھا۔

''خوش رہا کرو، اچھی لگتی ہو۔ واپسی کب ہے تمہاری؟''

''پچیس جولائی تک۔''

''پھر دیکھو تم سے کب ملاقات ہو پائے گی۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

''تم کہیں جا رہے ہو؟''

''ہاں...... اٹاوا جا رہا ہوں چند دن کے لیے امید ہے ایکس تک واپس آجاؤں گا۔'' وہ دونوں اب پارک سے پرے جا رہے تھے۔ فال کے سامنے ایک بہت بڑا بازار تھا جیسے مری میں مال روڈ سیاحوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوتا ہے ایسے ہی نیاگرا میں یہ بازار سیاحوں کے لیے کشش کا باعث ہے۔ میوزیم، تھیٹر، ہوٹل، ریسٹورنٹ، کسینو، سوینیر اور گفٹ شاپس کی بھرمار تھی۔ اسی بازار میں گھومتے، گھومتے وہ ایک گفٹ شاپ میں گھس گئی اسے اپنے لیے ایک سکارف اور چند سو...... پسند آئے تھے۔

''جانتا ہوں آپ عبدالمنان احمد کی بیٹی ہیں لیکن اس وقت میرے ساتھ ہیں اور میری مہمان بھی اس لیے یہ والٹ واپس رکھ دیں۔'' وہ اپنے والٹ سے پیسے نکال کر اپنی شاپنگ کی ادائیگی کرنے لگی تھی لیکن صارم نے اسے روک دیا تھا۔ اب وہ خود اپنا کریڈٹ کارڈ کیشیر کو دے چکا تھا۔

''ارے ہاں مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔'' وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ چکے تھے جب صارم نے سر پہ ہاتھ مارا۔ اپنی پاکٹ سے ایک چھوٹا سا پیکٹ نکال کر اس نے ایشال کی طرف بڑھایا تھا۔ اسے لگا اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی ہے۔

''کیا ہے اس میں؟''

''خود ہی دیکھ لو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کندھے اچکائے۔

"Forever Friends" وہ ایک مشہور برانڈ کا قیمتی لاکٹ تھا۔ جس پہ لکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا کارڈ بھی تھا جس پہ دوستی سے متعلق چند اقتباس درج تھے۔

''پسند آیا؟'' صارم کے سوال پہ ایشال نے اثبات میں سر ہلایا۔

''بہت اچھا ہے۔ لیکن شاید اس کی ضرورت نہیں تھی۔''

''دوستوں سے اتنی فارمل باتیں نہیں کرتے۔ جب تم یہاں سے چلی جاؤ گی تو یہ تمہیں میری یاد دلائے گا۔''

''تمہیں یاد رکھنے کے لیے کسی تحفے کا ہونا ضروری نہیں صارم۔ میں نے تمہیں کوئی تحفہ نہیں دیا تو تم مجھے بھول جاؤ گے۔''

''کم آن ایشال میں تو بس ایسے ہی کہہ رہا تھا۔ یہ مجھے تمہارے لیے اچھا لگا تو خرید لیا۔''

''لیکن یہ بہت قیمتی ہے صارم۔''

''تو اپنی اتنی اچھی دوست کو مجھے کوئی معمولی تحفہ دینا چاہیے تھا؟''

''لیکن......'' وہ مزید کچھ بول نہیں پائی تھی۔

''تحفوں کی قیمت نہیں دینے والے کا خلوص دیکھا جاتا ہے۔''

وہ اچانک اداس ہوگئی تھی۔

''کیا سوچنے لگیں؟''

''صارم کیا تم میرے پاکستان جانے کے بعد مجھ سے رابطہ رکھو گے؟''

''اگر تم چاہو تو ہم ہمیشہ ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں گے۔''

''اور اگر ایسا نہ ہو سکا؟''

''میں پھر بھی تمہارا دوست رہوں گا ایشال۔ میں وعدہ کرتا ہوں تمہیں جب بھی میری ضرورت ہوئی میں تمہارے ساتھ ہوں گا۔''

بے دلی سے وہ پیکٹ اس نے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ اس کی توجہ، اس کی دوستی سے وہ کچھ اور ہی مطلب اخذ کر رہی تھی۔ دل ہی دل میں اسے بے پناہ چاہنے لگی تھی۔ اس کے اظہار محبت کی منتظر تھی، اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا خواب دیکھ رہی تھی۔ لیکن شاید صارم اسے ایک دوست سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا تھا۔

واپسی کا راستہ ہمیشہ طویل ہوتا ہے یا پھر ہمیں منزل پہ پہنچنے کی جلدی ہوتی ہے۔ صارم تو پہلے کی طرح اس کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا لیکن ایشال کے دل کی دنیا بدل چکی تھی۔

''بتائیں ناں ایشال آپی صارم نے آپ کو پرپوز کیا؟'' واپسی پہ لیہہ نے اس سے پرجوش لہجے میں پوچھا۔

''آئی ایم شیور اس نے آج آپ کو ضرور بہت رومینٹک انداز میں شادی کا پیغام دیا ہوگا۔'' لیہہ کی بات پہ ایشال نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

''ایشال آپی کیا ہوا ہے۔ آپ رو کیوں رہی ہیں؟ پلیز مجھے بتائیں آخر ہوا کیا ہے؟'' لیہہ اس کے رونے سے بے تحاشا پریشان ہوگئی تھی۔

''وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا لیہہ۔ وہ کبھی مجھ سے شادی نہیں کرے گا اس کی توجہ، اس کا میرا خیال رکھنا صرف دوستی ہے۔ میں ہی ان سب باتوں کو کسی اور پہلو سے سوچنے لگی تھی۔ ایک ٹیپیکل ایشین لڑکی کی طرح دوستی کو محبت کا رنگ دینے لگی تھی۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''لیکن آپی یہ غلط فہمی صرف آپ کو نہیں مجھے بھی ہوئی تھی۔ آپ پلیز رونا بند کریں۔ خود کو بلیم مت کریں جس طرح وہ آپ کو ٹریٹ کرتا ہے، آپ سے باتیں کرتا ہے کوئی بھی لڑکی اس کا یہی مطلب سمجھتی۔'' لیہہ نے اسے سمجھایا۔

آج بہت دنوں بعد وہ اکیلی پارک میں تھی۔ یوں تو وہ آنا ہی نہیں چاہتی تھی لیکن پچھلے دو ہفتے سے جس باقاعدگی سے وہ صبح واک کے لیے گھر سے نکل رہی تھی اس کا اچانک اپنی روٹین سے ہٹنا سب کو حیران کرتا۔ اتنا تو وہ جانتی تھی آج پارک اسے ویسا نہیں ملے گا۔ وہ سبزہ، بہتا پانی، بطخوں کے غول کا شور آج کچھ بھی اس کی توجہ حاصل نہیں کر پایا تھا۔ چند منٹ اسی بینچ پہ گزار کر وہ مرے، مرے قدموں سے چلتی واپس لوٹ آئی تھی۔

☆☆☆

''میں اور سینہ ہوٹل شنگریلا میں ہیں۔ ایشال کے لیے گاڑی بھجوا رہا ہوں تم اسے کہو اپنا سامان پیک کر لے۔'' یاسر کو عبدالمنان نے مختصر فون کر کے کہا تھا اور اس کی کوئی بھی بات سنے بغیر کال ڈسکنیکٹ کر دی۔

ان میں سے کسی کو بھی عبدالمنان سے اتنی

جلد بازی کی امید نہیں تھی۔ ایشال کی واپسی پچیس کو تھی لیکن عبدالمنان نے اسے ایک ہفتہ پہلے ہی بلا لیا تھا، شاید ان کا واپس جلدی جانے کا پروگرام تھا۔

”میرا خیال تھا عبدالمنان اور سبینہ، ایشال کو ہمارے گھر سے خود لینے آئیں گے۔“ ایشال کو سامان پیک کرنے کا کہہ کر یاسر اب عالیہ سے اپنی حیرت کا اظہار کر رہے تھے۔

”انہوں نے تو اپنی آمد کی اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا، کیسے غیروں کی طرح فون کیا ہے۔“ عالیہ کو عبدالمنان کی اس حرکت پہ غصہ آرہا تھا۔

”خیر چھوڑو ایشال کے سامنے اس بات کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ یاسر کہہ کر کمرے سے نکل گئے تھے۔

”لبیبہ کیا تم مجھے وہ کاغذ دے سکتی ہو جس پہ صارم نے اپنا نمبر لکھا تھا۔“ ایشال نے لبیبہ کے کمرے میں آکر کہا۔ پچھلے چند دن سے اس کا صارم سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ جانا تو اسے تھا ہی لیکن یوں اچانک اسے بتائے بغیر وہ چلی جائے گی ایسا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

”کیا آپ صارم کو کال کر کے اپنی واپسی کا بتانا چاہتی ہیں۔“ لبیبہ نے اپنے بیگ سے ایک کاغذ نکال کر اسے دیا۔

”میں نے اس بارے میں سوچا نہیں۔“ ایشال نے دھیمی آواز میں کہا۔

”میں بتادوں صارم کو کہ آپ جارہی ہیں؟“ لبیبہ کی بات پہ ایشال نے نفی میں سر ہلایا۔

”پلیز تم اس سے رابطہ مت کرنا۔ میں نہیں چاہتی تمہاری کسی بات سے اسے میرے دل کی حالت کا اندازہ ہو۔“ ایشال نے التجا کی۔

☆☆☆

عالیہ مامی، یاسر ماموں، لبیبہ اور فرقان سب نے اسے چلتے ہوئے قیمتی تحائف دیے تھے۔ اس کا یہ ٹرپ ایک حساب سے بہت اچھا تھا لیکن اس ٹوٹے دل کے ساتھ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

عبدالمنان کا موڈ شدید خراب تھا۔ جس جوائنٹ وینچر کے لیے وہ کینیڈا گئے تھے وہ معاہدے کے آخری مراحل میں ناکام ہوگیا تھا یہی وجہ تھی کہ ان کی واپسی وقت سے پہلے ہوگئی تھی۔

☆☆☆

انہیں کینیڈا سے آئے ایک ماہ گزر چکا تھا۔ گھر میں سب کچھ ویسا ہی تھا۔ عبدالمنان اپنے کاروبار میں مصروف ہوگئے اور سبینہ اپنی سوشل لائف میں، ایشال کی خاموشی کی نہ پہلے کسی کو فکر تھی اور نہ اب کسی کو یہ جاننے میں دلچسپی تھی کہ ایشال اداس کیوں ہے۔

”کل تم ایشال کے ساتھ شاپنگ پہ چلی جانا۔“ ناشتے کی ٹیبل پہ ایشال اور سبینہ دونوں ہی موجود تھیں جب عبدالمنان نے سبینہ کو مخاطب کیا

”کوئی خاص ایونٹ ہے۔“ سبینہ کو حیرت تھی اتنے سالوں میں پہلی بار عبدالمنان کو ایشال کی شاپنگ کا خیال کیسے آگیا۔

”ایشال کا رشتہ طے کردیا ہے۔ وقار سعید کے بیٹے ارسلان سعید کے ساتھ اگلے سنڈے اس کی منگنی ہورہی ہے پھر جلد ہی شادی بھی کردوں گا۔“ کافی کا سپ لیتے عبدالمنان نے تحمل سے کہا۔ ایشال تو ایشال خود سبینہ بھی ان کی اس بات پہ حیران رہ گئی۔

”آپ نے سب کچھ اتنی جلدی فائنل کرلیا۔ مجھ سے مشورہ نہ کرتے ایشال کی مرضی تو پوچھنی چاہیے تھی۔“ سبینہ خود پر کنٹرول نہیں رکھ پائی تھی۔

”میں اپنے فیصلوں میں مشورے لینے کا عادی نہیں ہوں۔ تمہیں جتنا کہا ہے بس اتنا کرو۔ کل اس کو لے جاکر منگنی کی شاپنگ کرآنا۔ وقار اور اس کی فیملی کے لیے کچھ گفٹس وغیرہ لے لینا۔“ ان کا لہجہ حکمیہ تھا۔

”یہ کوئی بزنس ڈیل نہیں آپ کی بیٹی کی زندگی ہے، ایشال کا حق بنتا ہے اس شخص کے متعلق جاننے کا جس سے اس کی شادی ہورہی ہے۔ آپ تو اتنے دقیانوسی خیالات نہیں رکھتے ہیں۔“ سبینہ کی بات پہ عبدالمنان کا

پارہ چڑھ گیا۔

"تم اس معاملے سے خود کو دور رکھو تو بہتر ہوگا۔ یہ میری بیٹی ہے اور میرا ہر فیصلہ اس کے بیسٹ انٹرسٹ میں ہے۔ اگر تمہیں منگنی کی تیاری نہیں کرنی ہے تو مت کرو میں کسی ملازم سے سارے انتظامات کروا سکتا ہوں۔" عبدالمنان غصے سے پیر پٹختے گھر سے نکل گئے۔

ایشال تو جیسے پتھر بن گئی تھی۔ سینہ کو عبدالمنان سے اختلاف تھا ہی ساتھ، ساتھ اسے ایشال پہ بھی شدید غصہ آرہا تھا جس نے ایک بار بھی احتجاج نہیں کیا تھا۔

"ایشال تم کیوں خاموش بیٹھی رہیں، اندازہ بھی ہے تمہیں کیا ہونے جارہا ہے تمہارے ساتھ۔" سینہ نے غصے سے کہا۔

"آنٹی میں کیا کہتی، بابا کب میری بات مانتے ہیں۔" بہت دیر سے رکے آنسو بہہ نکلے تھے۔

"وہ لڑکا جس سے تمہارے بابا نے تمہارا رشتہ طے کیا ہے میں اسے بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وقار گروپ کے مالک کی بگڑی ہوئی اولاد ہے۔ اور جتنا میں منان کو جانتی ہوں ضرور یہ رشتہ کسی بڑے فائدے کے لیے کیا جارہا ہے ورنہ کوئی بھی باپ اپنی اکلوتی بیٹی کا جانتے بوجھتے ایسی جگہ رشتہ نہیں کرسکتا۔" سینہ نے تاسف سے کہا۔

"پلیز آنٹی میری مدد کریں میں یہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔" ایشال کی بے بسی عروج پر تھی۔

سینہ کے خیال میں ایشال صرف ارسلان سعید کے بارے میں سن کر گھبرا گئی ہے لیکن یہ اس کی غلط فہمی تھی۔ عبدالمنان اگر کسی شہزادے سے بھی ایشال کا رشتہ طے کرتے تو وہ اتنی ہی تکلیف محسوس کرتی کیونکہ صارم کو دل سے نکالنا اتنا آسان نہ تھا۔ وہ جانتی تھی اس کے بابا جو بات ٹھان لیتے ہیں اس سے پیچھے نہیں ہٹتے ہیں۔ ان کا فیصلہ بدلنا ایشال اور سینہ دونوں کے بس کی بات نہیں ہے۔

اس رات بہت دیر تک وہ اپنے کمرے میں بیٹھی روتی رہی۔ اپنی بے بسی کا ماتم کرتی رہی۔ شاید صارم تو اسے بھول بھی چکا ہوگا لیکن وہ اس کو دل سے کیسے نکالے۔ اس جیسا خیال تو کبھی کسی نے نہیں رکھا تھا۔ وہ جس نے اسے مسکرانا سکھایا، جو اس کی پہلی محبت ہے اسے بھلا کر کسی اور کو زندگی میں شامل کرلینا کیسے ممکن تھا۔ روتے روتے اس نے اپنا موبائل فون اٹھایا۔ اپنی کانٹیکٹ لسٹ میں سے اس واحد بے نام نمبر کو ڈائل کرتے ہوئے وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔

"ہیلو" دوسری بیل پہ صارم نے فون اٹھایا۔ وہ اب بھی بدستور رو رہی تھی۔

"ہیلو، کون بول رہا ہے۔" صارم نے انگریزی میں پوچھا۔ "ایشال یہ تم ہو؟" اگلے ہی پل اس کے کانوں سے صارم کی آواز ٹکرائی۔

"ایشال کیوں رو رہی ہو؟ پلیز مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے۔" صارم نے پریشانی سے پوچھا۔ دوسری طرف سے کال منقطع ہوچکی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن اسے سینہ کے ساتھ جانا پڑا تھا۔ یہ اس کے بابا کا حکم تھا اور انہیں حکم منوانے کی عادت تھی۔ اس کی منگنی میں چار دن باقی تھے۔ منگنی کا فنکشن تو ہوٹل میں تھا لیکن گھر کو بھی خوب سجایا گیا تھا۔ دلوں میں خوشی ہو یا نہ ہو دنیا کو تو دکھائی دینی چاہیے۔ یہ عبدالمنان اور ان کی کلاس کا المیہ ہوتا ہے جو دکھاوے اور نمائش میں خود کو ہلکان کیے جاتے ہیں۔

"ایشال بی بی آپ سے کوئی صاحب ملنے آئے ہیں۔" منگنی سے ایک دن پہلے اماں صغریٰ نے ایشال کے کمرے میں آکر اطلاع دی۔

"بابا کہاں ہیں؟" اس نے کمرے سے نکلتی ملازمہ سے پوچھا۔

"وہ اور سینہ بی بی تو باہر گئے ہیں۔" صغریٰ نے بتایا۔

"آپ چلیں، میں آرہی ہوں۔ مجھ سے ملنے کون آسکتا ہے؟" ایشال بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکلی۔

ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے اس کی آنکھوں نے جو منظر دیکھا اس نے اس کے پیروں کو جکڑ لیا تھا۔ اپنے سامنے صارم کو دیکھ کر اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ کچھ بھی تو

نہیں کہا تھا اس دن ایشال نے فون پہ صارم کو پھر کیسے وہ اس کی ان کہی خواہش کو پورا کرنے اچانک اس کے سامنے آگیا تھا۔ وہ صارم سے ایک دفعہ پھر ل رہی تھی کیا یہ خواب تھا۔

''ایسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے کیا دیکھ رہی ہو، یہ میں ہی ہوں۔'' صارم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو؟'' ایشال کی آواز میں خوف تھا۔

''میں کیوں آیا ہوں؟ تمہاری سسکیاں سن کر میں رک سکتا تھا۔ فون کیا تھا اور کچھ بولی بھی نہیں، جانتی ہو میں کتنا پریشان ہوگیا تھا۔'' صارم نے نرمی سے کہا۔

''کیوں روک نہیں پائے خود کو تم، کیا رشتہ ہے میرا اور تمہارا جو مجھے روتا دیکھ کر تم کینیڈا سے پاکستان آگئے۔'' اس کے تلخ لہجے نے صارم کو حیران کردیا۔

''ایشال میں تمہارا......''

''دوست ہو۔'' ایشال نے اس کا جملہ مکمل کیا تھا۔

''ہزاروں میل کا سفر کر کے تم یہاں اپنی دوستی نبھانے آئے ہو؟ فقط چند دنوں کی دوستی تھی ہماری، میں نے تو ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا فون پہ، پھر تمہیں کیسے خبر ہوگئی کہ یہ میں ہی ہوں۔ ایک انجان لڑکی کے آنسو تمہارے لیے اتنے اہم ہیں کہ تم اپنی جاب اپنا ملک چھوڑ کر اس کے پیچھے چلے آئے۔ تم اسے دوستی کہتے ہو صارم؟'' وہ بے اختیار رو پڑی تھی۔

''ایشال تم رونا بند کرو، میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔'' صارم نے نرمی سے کہا۔

''کیوں نہیں دیکھ سکتے مجھے روتے ہوئے۔ آخر تم میرے لگتے کیا ہو؟'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''اور اگر میں یہ کہوں کہ میں تم سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہ کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو کیا میری بات کا یقین کرو گی؟'' صارم نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس اچانک شادی کے ارادے کی وجہ جان سکتی ہوں۔'' ایشال کو اس کی بات پہ یقین نہیں آرہا تھا۔

سن لو

کتنا خون بہاؤ گے
کتنوں کو تڑپاؤ گے
روشن آنکھیں ہنستے لب
دل میں جن کے رب ہی رب
کس، کس کو دفناؤ گے
دل میں درد لب خاموش
ایسا کرب ہوئے بے ہوش
حوا کی بیٹی کی خاطر
کتنا الاؤ دہکاؤ گے
انساں ہر انساں بنے گا کب
رب کا خوف بسے گا کب
کب دل میں رب بساؤ گے
آخر، کتنا خون بہاؤ گے
کتنوں کو تڑپاؤ گے

شاعرہ: ظل شاہین، رحیم یار خان

''ایشال تم مجھے پہلی نظر میں ہی بہت اچھی لگی تھیں۔ تمہیں اداس دیکھ کر میں خود کو تمہارے قریب آنے سے روک نہیں پایا تھا۔ میری شدید خواہش تھی کہ تمہیں مسکراتا دیکھوں۔ جو چہرہ اداس اتنا حسین لگ رہا ہے وہ مسکراتا ہوا کتنا دلکش لگے گا۔ میں نے تم سے دوستی فقط اس لیے کی کیونکہ میں تمہاری زندگی سے اداسی دور کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب تم پاکستان واپس آگئیں۔ تمہارے بغیر رہنا کتنا مشکل تھا یہ تب پتا چلا جب میں نے تمہیں کھو دیا۔'' صارم اس کا ہاتھ تھامے کہہ رہا تھا۔

''کتنی حسرت تھی مجھے تم سے اظہارِ محبت سننے کی۔ کتنا رُلایا ہے مجھے تم نے، یہ سوچ کر کہ میری محبت یکطرفہ ہے کتنا تڑپی ہوں میں۔'' ایشال کی آواز کا درد صارم نے دل سے محسوس کیا۔

"کئی بار تمہیں کال کرنے کا ارادہ کیا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ میری وجہ سے تمہاری زندگی میں کوئی پریشانی نہ آجائے میں نے خود کو روک لیا لیکن اس دن تمہاری کال نے میرا ضبط ختم کر دیا۔ اور میں تم سے ملنے چلا آیا۔ تمہارے آنسوؤں نے مجھے میرا فیصلہ بدلنے پہ مجبور کر دیا۔" صارم کی بات پر اچانک ایشال کو اپنی منگنی کا خیال آیا۔

"صارم، بابا نے میری شادی طے کر دی ہے، کل میری منگنی ہے۔ میں تمہارے سوا کسی سے شادی نہیں کروں گی۔" ایشال نے بے قراری سے کہا۔

"لیکن وہ یہ شادی تمہاری مرضی کے بغیر کیسے کر سکتے ہیں۔ تم پریشان نہ ہو میں آگیا ہوں میں خود ان سے بات کروں گا۔" صارم نے اسے تسلی دی۔

"لیکن بابا تمہاری بات نہیں سنیں گے۔ وہ کسی کی بات نہیں مانتے اس موضوع پہ آنٹی سے پہلے ہی ان کا جھگڑا ہو چکا ہے۔ تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" ایشال نے فکرمندی سے کہا۔

"ایشال مجھے بات تو کرنے دو میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں وہ کافی اصول پسند انسان ہیں۔ اگر ہم ان سے مناسب طریقے سے بات کریں گے تو وہ ہماری بات ضرور مانیں گے۔" صارم نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تم...... تم بابا کو کیسے جانتے ہو؟" ایشال کو صارم کی بات سے شدید جھٹکا لگا تھا۔

"ایشال میں نے تم سے اپنے بارے میں کچھ چھپایا ہے۔ میں تمہارے بابا کو کافی عرصے سے جانتا ہوں۔ کینیڈا وہ جس بزنس وینچر کی لیے آئے تھے وہ دراصل میری ہی کمپنی کے ساتھ تھا۔ میں کوئی ملازمت نہیں کرتا بلکہ کروگر انٹرنیشنل میری ذاتی کمپنی ہے۔"

"تم نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی۔ اس کا مطلب تم بابا کے ریفرنس سے مجھ سے پہلے سے ہی واقف تھے۔ تمہیں مجھ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ بہت اپ سیٹ لگ رہی تھی۔

"میں تمہیں بتانا چاہتا تھا لیکن تم نے جب بتایا کہ تم عبدالمنان احمد کی بیٹی ہو اور اپنے والد سے خائف بھی ہو تو مجھے یہی مناسب لگا کہ تمہیں اس ریفرنس کا پتا نہ لگنے دوں ورنہ تم مجھ سے بھی خوفزدہ ہو جاتیں اور میرے متعلق جانبدارانہ رائے قائم کر لیتیں، ہماری کافی عرصے سے کاروباری بات چیت چل رہی تھی لیکن اٹاوا میں پہلی بار میں ان سے ملا تھا۔ میرا ارادہ تھا جانے سے پہلے تمہیں یہ بات بتا دوں گا لیکن تم مجھ سے ملے بغیر ہی چلی گئیں۔" وہ دونوں ابھی یہ بات کر ہی رہے تھے کہ ایشال کو باپ کی آواز آئی۔

"مسٹر صارم وحید، آپ نے بتایا نہیں آپ پاکستان آنے والے ہیں۔" عبدالمنان نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

اور پھر ان کی نظر ایشال پہ پڑی۔ "تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ جاؤ اپنے کمرے میں۔" انہوں نے رعب دار آواز میں کہا۔

"مسٹر عبدالمنان میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں اور میں چاہوں گا وہ بات ایشال کی موجودگی میں کی جائے۔" عبدالمنان کے ماتھے پہ صارم کی بات سے بل آگئے تھے۔

"آپ ایشال کو کیسے جانتے ہیں مسٹر صارم؟" عبدالمنان نے تشویش سے پوچھا۔

"دراصل ایشال سے میری ملاقات کینیڈا میں ہوئی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور آج میں آپ سے ایشال کا ہاتھ مانگنے آیا ہوں۔" صارم نے بلاخوف پراعتماد لہجے میں کہا۔

"مسٹر صارم وحید کچھ بھی کہنے سے پہلے یہ سوچ لو کہ تم میری بیٹی کے بارے میں بات کر رہے ہو۔" عبدالمنان گرج کر بولے۔

"میں ایشال سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" صارم کی بات پر ان کے ماتھے پہ مزید بل پڑ گئے۔

"تم وہ آخری انسان ہو گے جس کے ساتھ میں اپنی بیٹی کی شادی کروں گا۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ ابھی اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ۔" انہوں نے تمام

لحاظ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا۔

''عبدالمنان صاحب آپ کے اور میرے درمیان کاروباری اختلافات ہیں اور میں سمجھ سکتا ہوں کہ آپ اس وقت مجھ سے خائف ہیں لیکن یہاں بات بزنس کی نہیں، آپ کی بیٹی کی خوشیوں کی ہے۔ ایشال اور میں......'' اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی عبدالمنان دہاڑے۔

''ایشال کا نام دوبارہ اپنی زبان پہ مت لانا ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ تم اس وقت میرے گھر میں مہمان ہو۔ میری بیٹی کی خوشی کس میں ہے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اور ایک بات، میں ایشال کا رشتہ طے کر چکا ہوں۔ کل اس کی منگنی ہے اور بہت جلد میں اس کی شادی کرنے والا ہوں۔'' عبدالمنان نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''لیکن ایشال اس لڑکے سے شادی نہیں کرنا چاہتی ہے۔'' صارم نے کہنا چاہا۔

''ایشال کیا چاہتی ہے اس بات کا فیصلہ صرف مجھے کرنا ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔'' وہ سنجیدگی سے بولے۔ صارم کے لیے مزید وہاں رکنا بیکار تھا۔

☆☆☆

''یہ صارم وحید یہاں کیا کر رہا تھا۔'' سبینہ گھر میں داخل ہو رہی تھی جب صارم کو باہر جاتے دیکھ کر عبدالمنان سے پوچھا۔

''ایشال کے رشتے کی بات کرنے آیا تھا۔ کہہ رہا تھا ایشال سے کینیڈا میں ملا تھا۔'' عبدالمنان نے بتایا۔

''تو پھر آپ نے کیا کہا؟'' سبینہ کو تجسس ہوا۔

''وہی جو مجھے کہنا چاہیے تھا۔ ایشال کی شادی وہیں ہوگی جہاں میں طے کر چکا ہوں۔'' انہوں نے قطعیت سے کہا۔

''لیکن آپ ایشال کی مرضی کے بغیر ایسا کیسے کر سکتے ہیں اور پھر صارم وحید میں برائی کیا ہے۔ ارسلان کے مقابلے میں صارم کو ریجیکٹ کر کے آپ بہت بڑی غلطی کر رہے ہیں۔'' سبینہ نے سمجھانا چاہا۔

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا سبینہ، تمہیں اندازہ ہے صارم کے عین موقع پر اس معاہدے سے انکار کر دینے کے بعد مجھے کتنا بڑا نقصان ہوا ہے۔ وقار اس وقت میرے آدھے پروجیکٹس میں سرمایہ لگا رہا ہے اور مجھے اس کی سپورٹ کی شدید ضرورت ہے۔'' سبینہ کو عبدالمنان کی کاروباری سوچ پہ افسوس ہوا۔

''منان آپ ایک کاروباری اختلاف کی بنیاد پر ایک بھلے انسان کا رشتہ ٹھکرا رہے ہیں اور ارسلان جیسے گھٹیا شخص کو صارم وحید پہ ترجیح صرف اس لیے دے رہے ہیں کیونکہ آپ کو اس کے باپ کا پیسہ چاہیے۔ آپ نے اپنی اکلوتی بیٹی کی زندگی کو مذاق بنا دیا ہے۔ کیا کریں گے اتنے مال کا؟ کس کے لیے ہے یہ بزنس ایمپائر؟ مجھے آپ نے اس لیے ماں نہیں بننے دیا کیونکہ آپ ایشال کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کرنا چاہتے تھے اور خود آپ نے اپنی معصوم بچی کے ساتھ کتنی زیادتیاں کی ہیں ان کا اندازہ ہے آپ کو۔ اور آج ایک بار پھر اپنی مرضی، اپنی جھوٹی انا اس پر مسلط کر کے اس کے ساتھ اتنا بڑا ظلم کرتے ہوئے آپ کا دل نہیں کانپ رہا۔'' سبینہ نے تلخی سے کہا۔

''بکواس بند کرو سبینہ، اپنی اوقات میں رہو یہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ میرے اور ایشال کے بارے میں کچھ بھی کہنے کا حق میں نے تمہیں نہیں دیا۔ تم اچھی طرح جانتی ہو تمہاری اتنی اوقات نہیں ہے۔'' سبینہ کو جواب دے کر انہوں نے پاس کھڑی ایشال کو گھورا جو ڈر سے پہلے ہی کانپ رہی تھی۔

''تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو۔ دس منٹ میں ریڈی ہو جاؤ، ارسلان تمہیں پک کرنے آ رہا ہے۔ وہ منگنی کی انگوٹھی تمہاری پسند سے خریدنا چاہتا ہے......'' وہ بے چارگی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

منگنی کے لیے انگوٹھی خریدنے جانے سے پہلے ارسلان اس کو ڈنر کرانا چاہتا تھا اسی لیے وہ اسے ایک ہوٹل میں لے آیا تھا۔

''میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔ میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے میری

خاطر کینیڈا سے پاکستان آیا ہے۔ پلیز آپ اس رشتے سے انکار کردیں، میں آپ سے ریکویسٹ کرتی ہوں۔'' ہوٹل کی پارکنگ میں گاڑی میں بیٹھی ایشال نے ارسلان سے نہ جانے کس جذبے کے تحت کہہ دیا۔

''ارے اس میں رونے والی کیا بات ہے۔'' ایشال کے بہتے آنسو دیکھ کر ارسلان نے اس کے گالوں کو اپنی انگلیوں سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

ایشال اس کے قریب آنے پر گھبرا گئی تھی۔

''اتنی خوبصورت آنکھیں آنسو بہاتے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ تم مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتیں مت کرو لیکن تمہیں میری ایک بات ماننی ہوگی اور گھبراؤ مت یہ میرے اور تمہارے درمیان رہے گا۔'' ایشال کے ہاتھ کو دباتے ہوئے ارسلان کہہ رہا تھا۔

''آپ پلیز میرا ہاتھ چھوڑیں۔'' ایشال نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

''اتنا حسین موقع کوئی بیوقوف ہی جانے دے گا سویٹی۔ یہ مجھ سے جان چھڑانے کی معمولی سی قیمت ہے۔ اتنا تو حق بنتا ہے میرا۔'' ایشال کا ہاتھ مروڑتے ارسلان کی آنکھوں میں شیطانیت اتر آئی تھی۔

ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھول کر کسی نے ارسلان کو باہر گھسیٹا تھا۔ ارسلان اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایشال نے موقع غنیمت جانا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

ارسلان کا گریبان صارم کے ہاتھ میں تھا۔ ایشال کی آنکھوں میں آنسو اور گھبرایا ہوا چہرہ دیکھ کر صارم کا غصہ اور بھی بڑھ گیا تھا۔

''تیری ہمت کیسے ہوئی، اپنے ناپاک ہاتھوں سے اس معصوم کو چھونے کی۔'' صارم نے ایک زوردار گھونسا اس کے منہ پہ مارا۔

''یہ میری ہونے والی بیوی ہے اور یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے تم ہوتے کون ہو ہمارے مسئلے میں بولنے والے۔'' صارم کے گھونسے سے ڈگمگاتا ہوا ارسلان غصے سے بولا۔ ایشال خوف کے مارے صارم سے لپٹ گئی۔

''اوہ تو تم ہو وہ مسٹر عاشق جس کے عشق میں پاگل ہوکر یہ مجھ سے شادی سے انکار کررہی ہے۔'' ارسلان تمسخر سے بولا۔

''یہ تمہاری کچھ نہیں لگتی سمجھے تم اور تم جیسے گھٹیا شخص کا تو میں اس پہ سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گا۔'' صارم غصے میں ایک بار پھر ارسلان کی طرف بڑھا لیکن ایشال نے اسے روک دیا۔

یہ ایک اتفاق تھا کہ صارم اسی ہوٹل میں رکا ہوا تھا وہ ایک بار پھر عبدالمنان سے ملنا چاہتا تھا اور ہوٹل کی پارکنگ میں اس نے ایشال کو ارسلان کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔

☆☆☆

صارم ایشال کو اس کے گھر لے آیا تھا۔

''سنبھالیں اپنی بیٹی کو۔ آج اگر میں وقت پہ نہ پہنچتا تو ارسلان آپ کی عزت دو کوڑی کی کردیتا۔ مجھے افسوس ہے آپ نے اپنی بیٹی کے لیے ایک بہت ہی گھٹیا شخص کا انتخاب کیا ہے۔ جو لڑکیوں کی عزت کرنا نہیں جانتا وہ اس کو کیا تحفظ دے گا۔'' صارم غصے میں بولا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے صارم وحید...... میں تمہاری اس جھوٹی کہانی پہ یقین کرلوں گا؟ تمہارے آنے سے پہلے ارسلان مجھے کال کرکے سب بتا چکا ہے کیسے تم نے غنڈہ گردی کرکے ہوٹل کی پارکنگ سے ایشال کو ارسلان کی گاڑی سے اغوا کیا ہے۔'' عبدالمنان کی بات پہ ایشال حیران رہ گئی تھی۔

''بابا وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ آپ میرا یقین کریں اس نے میرے ساتھ بدتمیزی کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر صارم وقت پر نہ پہنچتا تو پتا نہیں کیا ہوجاتا۔'' ایشال اس سارے معاملے میں پہلی بار بولی۔

''شٹ اپ ایشال...... تم اس چند دن پہلے ملے شخص کی وجہ سے اپنے باپ کے سامنے زبان کھول رہی ہو۔'' ایشال کی بات پہ انہوں نے چلا کے کہا۔

''عبدالمنان صاحب مجھے آپ پہ ترس آرہا ہے۔ آپ اپنی بیٹی کی حالت دیکھ کر اس کا سہا ہوا چہرہ دیکھ کر بھی کچھ نہیں سمجھے۔ میں اگر چاہتا تو ایشال کو کسی بھی

طریقے سے اپنے ساتھ لے جاتا۔ اس سے شادی کر لیتا۔ لیکن جسے میں اپنی عزت بنانا چاہتا ہوں اسے حاصل کرنے کے لیے اس کے باپ کی عزت کا تماشا نہیں بنا سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ ایشال کی شادی اس کے باپ کی مرضی، ان کی اجازت سے ہو۔ آپ ایشال کی شادی مجھ سے نہیں کرنا چاہتے تو مت کریں لیکن اس کی زندگی کو اپنے فائدے کی بھینٹ مت چھڑھائیں۔ میں ایشال کو گھر پہنچانے آیا تھا۔ اس کا خیال رکھیے گا اور ہو سکے تو کبھی اس کی خوشی جاننے کی کوشش ضرور کیجیے گا۔'' صارم اپنی بات ختم کر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

''رکو صارم، مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو۔'' ایشال کی آواز پہ صارم نے مڑ کر دیکھا۔

''میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ بابا کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔ ساری زندگی انہوں نے صرف وہ کیا ہے جو انہیں ٹھیک لگا۔ دوسرے کیا چاہتے ہیں انہیں کس بات سے خوشی ملتی ہے اس کی بابا نے کبھی پروا نہیں کی۔ ہمیشہ اپنی مرضی ہم پہ مسلط کرتے آئے ہیں۔ کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ تمہیں اگر یہ امید ہے کہ بابا تم سے امپریس ہو کر میری شادی تم سے کر دیں گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔'' ایشال زندگی میں پہلی بار عبدالمنان کے سامنے بولی تھی۔ یہ ان کے لیے بہت بڑا شاک تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ ایشال کو کچھ کہتے سینہ بول اٹھی۔

''ایشال ٹھیک کہہ رہی ہے صارم، کچھ لوگوں کے سینے میں دل نہیں پتھر ہوتا ہے۔ لاکھ سر پٹخو چوٹ ہمیں ہی لگتی ہے۔ زندگی میں پہلی بار ایشال نے اپنے حق کی لیے آواز اٹھائی ہے۔ شاید یہ دوبارہ اس کے لیے ممکن نہ ہو۔ میں تم دونوں کے ساتھ ہوں۔ یہ میرا خون تو نہیں لیکن مجھے اولاد کی طرح عزیز ہے۔ اس کی خوشی کے لیے میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ میں کرواؤں گی تم دونوں کی شادی بھلے اس جرم میں مجھے یہ گھر ہی کیوں نہ چھوڑنا پڑے۔'' سینہ ایشال کو لے کر صارم کے ساتھ جا رہی تھی۔

''مجھے حیرت ہے بابا، جس شخص کا آپ کو احسان مند ہونا چاہیے تھا آپ اس کے خلوص پہ شک کر رہے ہیں۔ ایک کم ظرف انسان کی بات آپ کے نزدیک زیادہ قابلِ اعتبار ہے۔ آپ کو اپنی اولاد نہیں دولت کے انبار عزیز ہیں تو سنبھا لیے اپنی دولت، میں جا رہی ہوں صارم کے ساتھ۔'' ایشال پھٹ پڑی تھی۔

''ایشال تمہیں اپنے بابا سے ایسے بات نہیں کرنی چاہیے۔'' صارم نے ایشال کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''اسے مت روکو صارم، یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' عبدالمنان کی آواز پہ ان تینوں نے چونک کے دیکھا۔

''میرے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔ اسی لیے تو آج میرا دامن خالی ہے۔ ساری زندگی دولت اور اختیار اکھٹے کرنے میں گزر گئی لیکن افسوس حاصلِ زندگی کچھ بھی نہیں۔ ایک وقت تھا جب عبدالمنان کے گرد رشتوں کا ہجوم تھا لیکن جیب خالی تھی۔ اگر غربت بڑی آزمائش ہے تو دولت بھی کم آزمائش نہیں۔ دولت کمانے کا جنون میرے اندر تلخی بھرتا رہا۔ پچیس سال کی انتھک محنت میں پیسہ تو بہت کمایا لیکن افسوس اپنے سب سے قیمتی اثاثے کی قدر نہ کر سکا۔'' عبدالمنان کے لہجے میں ندامت تھی۔

''میں تمہارا شکر گزار ہوں صارم، اپنی ہٹ دھرمی اور غرور کے باعث آج میں اپنی سب سے قیمتی چیز کا سودا کرنے چلا تھا۔ تم نے جو کیا ہے اس کے بدلے میں اپنی ساری دولت بھی تمہارے قدموں میں رکھ دوں تو یہ کم ہو گا لیکن ہاں میں ایک طریقے سے تمہارا بدلہ چکا سکتا ہوں۔'' صارم نے حیرت سے عبدالمنان کو دیکھا۔

''میری بیٹی ایشال کو اپنا لو صارم، میرے پاس تمہیں دینے کے لیے اس سے قیمتی تحفہ کوئی اور نہیں ہے۔''

''بابا؟'' ایشال بے یقینی سے بولی۔

''تم کہیں نہیں جاؤ گی ایشال، بیٹیاں اپنے باپ کے گھر سے رخصت ہوتی ہیں۔'' عبدالمنان نے مسکراتے ہوئے پہلی بار اسے پدری شفقت سے گلے لگایا، ایشال ان کے سینے سے لگی پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی لیکن آج اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

شادیٔ مرگ

عائشہ مسعود

شادی مرگ کا محاورہ تو بہت مرتبہ سنا تھا۔ البتہ اس کا تجربہ پہلی مرتبہ ہو رہا تھا۔ یہ کیفیت کیسی ہوتی ہے، کیسے بندہ حواس باختہ ہو جاتا ہے اور اپنے احساسات کا اظہار نہیں کر پاتا۔ اس کا ادراک اسے صحیح، صحیح ہی ہوا تھا۔ اکیس سالہ قیدِ با مشقت سے یوں اچانک چھٹکارا مل جائے گا۔ یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ بلکہ اب اس کی صورتِ حال پر یہ شعر صادق آتا تھا۔

اتنے مانوس صیاد سے ہو گئے
اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے

اللہ یوں بھی کسی کو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ ایسے کیسے



دن بدل جاتے ہیں جیسے گرم حبس زدہ موسم میں اچانک جل تھل ہو جائے۔ کالے بادل اچانک امڈ آئیں۔ یوں برسیں کہ پتا ہی نہ چلے ابھی کچھ لمحے قبل کتنی گرمی کتنا حبس تھا میرا رب تو کتنا مہربان ہے مجھے تو پتا ہی نہیں تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کیسے اپنے جذبات کا اظہار کرے خوشی سے جھومے ناچے گائے کیا کرے مگر ہائے رے زمانہ......

اس کا گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اگر وہ اپنے ہوش و حواس میں ہوتی تو یوں ایک دم اس خبر کو پھیلنے نہ دیتی۔ پہلے اس خوشی کو اچھی طرح محسوس کرتی۔ پھر کسی کو خبر دیتی۔ وہ ماں بیٹا ایک دوسرے کو آزادی کی مبارک دیتے' گلے لگتے۔ پتا نہیں کیا، کیا کرتے مگر اس کے حواس کب کام کر رہے تھے۔ جس رہائی کی اسے رتی بھر امید نہ تھی وہ اچانک اس کا مقدر بنے گی، دعائیں یوں بھی مستجاب ہوتی ہیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا فوراً اٹھے خوب نہا کر اکیس سالوں کی غلاظت سے اپنا جسم پاک کر دے۔ اپنی پسند کے کپڑے پہن کر اپنے رب کے حضور سر بسجود ہو جائے۔ سجدے میں پڑی رہے۔ یہاں تک کہ اس کی پیشانی زخمی ہو جائے۔ وہ شکر ادا کرتی رہے۔ مگر فی الحال وہ ایسا کرنے سے قاصر تھی۔ البتہ اس کا دل اپنے رب کے حضور سجدہ ریز تھا۔ اس کا رواں، رواں شکر گزار تھا۔ سنا ہے کسی جانور کے ساتھ بھی وقت گزاریں تو آپ کو انسیت ہو جاتی ہے مگر غفار تو انسان تھا۔ ان کی اکیس سالہ رفاقت تھی۔ عورتیں اسے رُلانے کی کوشش کر کے تھک چکی تھیں۔ ان کا خیال تھا شاید اسے سکتہ ہو گیا ہے۔ اچانک صدمے سے ایسا ہی ہوتا ہے۔ اچھا بھلا صحت مند انسان تھا، نہ کوئی بیماری نہ تکلیف بس ایک دم دل جواب دے گیا۔ ایسی اچانک موت میں ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ کئی بہشتی عورتیں تو خود بھی ساتھ ہی جان دے دیتی ہیں۔

''بھئی اسے کسی طرح رُلاؤ...... دیکھو کیسے ٹکر ٹکر دیکھ رہی ہے۔''

''دماغ پر اثر ہو جائے گا۔''

''ویسے پہلے کون سا ٹھیک ہے جھلی سی ہے بیچاری۔'' جتنے منہ اتنی باتیں......

''میرا گھر ہاں صرف میرا گھر میرا راج......'' وہ بڑبڑا رہی تھی۔

''زنداں نہیں، میرا گھر ہے۔'' جو اس وقت بے شمار عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ کمرے، ٹی وی لاؤنج، برآمدے، صحن ہر طرف عورتیں ہی عورتیں......مردوں کو بٹھانے کا انتظام گھر سے باہر گلی میں ٹینٹ لگا کر کیا گیا تھا۔

''کیا میرا بیس سالہ بیٹا اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ اس نے سب کچھ کر لیا۔'' اسے اس نے زیرِ لب کہا۔ اسے بہت اچھا لگا۔

''ہاں واقعی وہ بڑا تو ہو گیا ہے۔ اگر وہ آج ہمت نہ کرتا تو ہمیں یوں بھلا رہائی نصیب ہوتی؟ میں اور میری بیٹیاں، ہم تو ہمیشہ دل میں ہی سوچتے رہے۔'' وہ نفرت کی انتہا پر تھی مگر اس کی ہمت ہی نہیں پڑی شاید جہنم کا ڈر......مگر یہ زندگی بھی کسی جہنم سے کم تو نہ تھی دوزخ کے بارے میں لوگوں نے سنا تھا مگر اس نے بھگتا تھا۔ اکیس سالہ دوزخ کی زندگی جس کا ایک، ایک دن برسوں پر محیط تھا۔ اس کی زندگی کی کہانی تو اتنی لمبی ہے کہ لگتا تھا اس کا کوئی انت نہیں......لیکن اس کے مہربان رب نے اس کا انت کر دیا۔ وہ اپنے رب کے حضور سجدہ ریز تھی۔

''اے رب میں تیری نیک بندی نہیں ہوں مگر تو، تو غفور الرحیم...ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔'' وہ رو رہی تھی مگر شوہر کی جدائی پر نہیں بلکہ اپنی رہائی پر۔ اس کا بایاں ہاتھ تقریباً مفلوج تھا۔ اس کے پٹھوں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ ہڈیاں بھی سوجی ہوئی اور الگ سی۔ اس کی حالت کافی خوف ناک ہو گئی تھی اگر کوئی دیکھ لیتا تو اسے مشورے دے دیتا۔ فلاں ڈاکٹر کے پاس جاؤ وہ ہڈیوں کا اچھا ڈاکٹر ہے۔ دیکھو کیسا نیلا ہو گیا ہے۔ مگر وہ ڈاکٹر کو کیا بتاتی......اسے کیا ہوا ہے، یہ ہاتھ ہر رات اس کے شوہر کی چارپائی کے ایک پائے تلے رکھا ہوتا۔ اس کا علاج صبح شام دو درد کی گولیاں ہی ہے......سب کو تو کہہ دیتی کہ خود ہی ایسا ہو گیا۔ نئے ملنے والوں کے سامنے اسے دوپٹے میں چھپا کر رکھتی۔ کوئی دیکھ لے تو کہتی

پیدائشی ایسا ہے۔ ویسے اس سے ملنے والے تھے ہی کون...... اس ویران گھر میں آتا ہی کون تھا۔ جس میں ایک صحت مند چاق و چوبند پچپن سالہ قبل از وقت ریٹائرڈ بینک آفیسر رہتا ہے۔ جس نے گولڈن ہینڈ شیک لے رکھا تھا۔ اس کی سینتیس سالہ بوڑھی مدقوق کالی بد شکل چڑیل سی بیوی...... جس کی ویران آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں۔ گالوں کی ہڈیاں باہر کو نکلی ہوئیں۔ لاغر جسم، کھچڑی بال، بدرنگ کپڑے حواس باختہ ڈری سہمی جس کو کسی آئے گئے سے بات کرنے کی تمیز تھی نہ سلیقہ، اگر کوئی بھولا بھٹکا آ بھی جاتا تو اس وقت تک سلام کا جواب ہی سوچتی رہتی۔ جب تک اس کا مجازی خدا نہ آ جاتا اس کے بعد تو اس کی بولتی بالکل بند ہو جاتی کیونکہ وہ ایک عام سے فقرے سے سو مطلب اخذ کر سکتا تھا۔ کوئی تصور کر سکتا ہے کہ آج سے اکیس سال پہلے یہ رنگوں میں بسی روشن آنکھیں، کھلتی رنگت کی کھلکھلاتی سولہ سالہ لڑکی تھی۔ اس کی شادی اس کے گھر والوں نے ایک پڑھے لکھے بینک آفیسر سے کر دی جب وہ صرف نویں کلاس میں پہنچی تھی۔ اس کے یہ ہاتھ جواب دوپٹے میں چھپانے پڑتے ہیں، ان پر نیل پالش لگاتے ہوئے اس کی سہیلیوں کی رائے تھی کہ اس کا شوہر تو اس کے ہاتھوں کو دیکھ کر ہی عاشق ہو جائے گا۔ جلد شادی کی وجہ اس کی بڑی بہن تھی۔ جو کالج میں پڑھتی تھی اس نے اپنی مرضی سے کورٹ میرج کر لی تھی۔ اب والدین کے پاس ایک ہی راستہ تھا' دوسری کو عزت سے بیاہ دیں۔

یوں جو پہلا رشتہ آیا۔ رشتہ بھی اچھا خاصا پڑھا لکھا بینک آفیسر اکیلا لڑکا کوئی آگا پیچھا نہ سسرال کا ٹنٹا...... ایسا رشتہ تو مقدر والیوں کو ملتا ہے۔ اکیلی راج کرے گی۔ ایک ہفتے میں نہایت سادگی سے شادی ہو گئی۔ کیونکہ لڑکے کو شوشا پسند نہیں تھی۔ خیر شادی کے بعد وہ اسلام آباد آ گئی کیونکہ ٹرانسفر وہاں جو ہو گیا تھا، کروالیا تھا۔ اللہ جانے!

وہ لڑکی جو کھلا ہوا گلاب تھی چند دن میں سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ ماں کو تشویش ضرور تھی مگر کبھی کھل کر نہ پوچھا کیونکہ جب بھی آتی خاوند ساتھ ہوتا جسے ہر سیکنڈ میں بیوی اپنے حضور درکار...... اداکاری بھی اچھے شوہر کی خوب کرتا...... مشورے سب ہی دیتے کچھ کھایا پیا کرو صحت بناؤ آخر کس بات کی کمی ہے۔ ماں کا دل بھی دکھتا شاید میں نے زیادہ ہی چھوٹی عمر میں بیاہ دیا۔ ابھی ان جھنجٹوں کے قابل نہیں تھی۔ اوپر تلے چار بچے ہو گئے۔ بچے بڑے ہوئے مگر نہ بدلے تو حالات...... کیونکہ خاوند سوتیلی ماں کا ڈسا بچہ تھا جو کہ بدکردار عورت تھی اور بچے کو طرح، طرح کی جسمانی سزائیں دیتی تا کہ کسی کو کچھ بتا نہ دے۔ پتا نہیں اسے کہاں سے اپنی بیوی میں اپنی سوتیلی ماں کی جھلک نظر آتی۔ یا پھر ہر عورت اس کے نزدیک ایک جیسی تھی اپنی سوتیلی ماں کا کیا گیا ہر ظلم ہر تجربہ اس نے اس پر دہرایا۔ اب بیچاری نے اپنے زخموں کا شمار کرنا ہی چھوڑ دیا۔ جی، جی کے علاوہ کوئی لفظ بھی منہ سے نہ نکالا۔ بچے بھی اسی ماحول میں پروان چڑھ رہے تھے، وہ کیا نارمل ہوتے، جتنی دیر گھر میں ہوتا بیوی سامنے حاضر درکار چھوٹے بچے بے شک بلک رہے ہوں یا مریں۔ اسے ہلنے کی اجازت نہیں اور رات کو سوتے وقت بایاں ہاتھ چارپائی کے پائے کے نیچے...... شک کے خمیر میں گندھا مرد دس بارہ سالہ بچیوں پر بھی شک کرنے لگا۔ نہ کہیں آ جا سکتیں، نہ کوئی ان کے گھر آتا۔ بچے بھی قید میں صرف اسکول جاتے جہاں باپ لیتا اور چھوڑتا خود...... گھر سے جاتے ہوئے باہر تالا ایسے میں پتا نہیں کیسے سیندھ لگی۔ ایک دن بچے اسکول سے نہیں آئے چھٹی ہوئے تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ دل ہول رہا تھا۔ اختیار میں بس دعائیں تھیں جو مانگ رہی تھی۔ چار بجے پھر پانچ...... شام گئے وہ آیا تو صرف بیٹے ساتھ تھے۔ پتا چلا بیٹیاں اسکول میں نہیں، گندی ماں کی اولاد تھیں جرم تو ماں ہی کا تھا اسی نے بھگتا، زندگی کا عذاب اور بڑھ گیا۔ کون سا ظلم تھا جو نہ ٹوٹا۔ کچھ دن بعد اخبار سے خبر ملی بچیاں دارالامان میں ہیں اور انہوں نے باپ کے خلاف کورٹ میں بیان دیا ہے۔ بڑی بیٹی صرف چودہ سال کی عمر میں اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتی ہے۔ انسانی حقوق کی تنظیمیں آگے

بڑھیں اور بچیوں کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ چند دن اخبارات اور ٹی وی پر اس کے ظلم کی چٹ پٹی خبریں چلتی رہیں۔ اور وہ جو پہلے نیم پاگل تھا غصے میں بالکل ہی پاگل ہوگیا ہے۔ اسے بچانے البتہ کوئی نہ آیا۔ عدالت اور میڈیا میں نام اچھلنے کے بعد اس نے شہر چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اب ظلم کا نشانہ بننے کے لیے صرف ماں بیٹے ہی بچے...... بیٹے بھی کبھی کبھار باہر نکل جاتے۔ البتہ وہ ہر وقت حاضر تھی۔ شروع، شروع میں آس پڑوس کی فارغ عورتوں نے ملنے کی کوشش کی مگر نیم پاگل عورت میں کب تک دلچسپی لیتیں۔ آہستہ، آہستہ پیچھے ہٹتی چلی گئیں۔ البتہ مجازی خدا کی خوب واہ، واہ ہوئی۔ جو خوش شکل صحت مند اور دولت مند ہونے کے باوجود نیم پاگل بدشکل بڑھیا کو گھر میں بسائے ہوئے ہے۔ کچھ نے تو دوسری شادی کرانے کی بھی کوشش کی۔ اس کی دلی دعا تھی کہ وہ دوسری شادی کرلے، اس کے عذاب میں کچھ تو کمی ہو...... پہلے جو چند گھنٹے اس کے دفتر جانے کی وجہ سے آزادی کے ملتے تھے وہ بھی ختم ہوئے۔ اندھیرا بڑھتا گیا۔ مگر ہر اندھیرے کے بعد روشن صبح ہے۔ اور آج اس کی بھی صبح ہوگئی۔ ناشتے کی میز پر فرمان سنایا کہ بیٹے کی شادی کررہا ہوں۔ اپنے بیس سالہ بیٹے کی شادی پینتیس سالہ رشتے دار سے جس کا خاندان کچھ عرصہ پہلے فوت ہوا ہے۔ اور آج کل اس کی طرف کافی آنا جانا تھا۔ اس کے منہ سے آج پتا نہیں کیسے ہاں کے بجائے نہ نکل گیا۔ حسب معمول پہلے انڈے کی پلیٹ منہ پر آئی پھر چائے کی پیالی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور پھر اچانک بیٹے نے ہاتھ پکڑلیا اور کہا۔

''بس آج کے بعد دوبارہ نہیں، اب کبھی یہ ہاتھ اٹھا تو توڑ دوں گا سمجھے آپ !'' پھر تو مغلظات کا طوفان اٹھا مگر ہاتھ نہ اٹھا۔

''تمہاری ماں کو طلاق دے دوں گا۔''

''ضرور، دیر کیوں کررہے ہیں ابھی دیں تاکہ یہ عورت بھی زندگی کے چند دن سکون سے گزر سکے۔ اور ہاں اپنی اسی سہیلی سے شادی کرلیجیے گا۔ جس سے میری کرنے کا ارادہ تھا۔'' بیٹا اس کی زبان بنا ہوا تھا۔

''تم لوگ میرے بغیر دو ٹکے کے نہیں...... گلیوں میں رُلتے پھروگے۔ در، در کی ٹھوکریں کھاؤ گے۔ بھوکے مروگے۔'' مجازی خدا نے خدائی دعویٰ کیا۔

''کوئی بھوک کوئی ذلت اس سے بڑھ کر نہیں جو آپ کے ساتھ نے ہمیں دی، میری بہنیں آپ کو چھوڑ کر سو گنا بہتر زندگی گزار رہی ہیں۔ اب ذلت کی زندگی ہم نہیں آپ گزاریں گے۔ آج کے بعد اس گھر میں بس میری مرضی چلے گی۔ آپ تو مجھ سے اپنا ہاتھ نہیں چھڑا سکے کیا طاقت ہے آپ کی۔ آپ کا دور آج ختم ہوا۔'' بیٹے نے ابھی تک باپ کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ اور واقعی ظلم کا دور ختم ہوگیا۔ بیٹے کے ہاتھ جھٹکتے ہی وہ کرسی سے لڑھک گیا۔ ساری زندگی دوسروں کی تذلیل کرنے والا اپنی ایک منٹ کی تضحیک برداشت نہیں کرسکا۔ دل نے ساتھ چھوڑ دیا۔ کیا رہائی اتنی آسان تھی؟ اسے پتا ہی نہیں چلا۔ کب بیٹا ڈاکٹر کو لایا۔ کب لوگ اکٹھے ہونے شروع ہوئے۔ اسے پتا ہی نہیں چلا۔ وہ ششدر تھی اور انتہائی خوف زدہ بھی۔ جب یہ اٹھے گا تو پتا نہیں کون سا طوفان آئے گا۔

جنازہ صبح سے ابھی تک پڑا ہے کیونکہ اس کے بیٹے نے اپنی بہنوں کو یوم نجات کی نوید دے دی ہے اور وہ آرہی ہیں۔ وہ ابھی تک ویسے ہی بیٹھی ہے۔ عورتیں اسے پکڑ پکڑ کر چہرہ دکھانے کی کوشش کررہی ہیں۔

''اچھی طرح دیکھ لو...... پھر تمہیں کب یہ صورت دیکھنے کو ملے گی۔''

ان کو کیا پتا ہم میں سے کسی کو اس صورت کو دیکھنے کی کوئی حسرت نہیں......

''اب تو جنت میں ہی اس کا ساتھ ملے گا۔'' قاری صاحب کی بیوی نے اپنا فلسفہ سنایا۔

''استغفر اللہ پھر وہ کیسی جنت ہوئی اس سے تو دوزخ ہی بھلی...... اس کی اکیس سالہ دعائیں مستجاب ہوئیں۔ اس لمحے اس کی تو خواہش تھی کہ اسے فوراً دفن کرے کیونکہ کبھی کبھار مُردے بھی زندہ ہوجایا کرتے ہیں...... مگر ہائے زمانہ تیرے رسوم و رواج......

فیصلہ

شگفتہ شاہ

''حسن بیٹا! یہ لیں آپ کی فیورٹ پڈنگ تیار ہے۔''
''فنٹاسٹک آنٹی......!'' حسن نے فوراً ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔
''بس، بس بیٹا! اب اور خوشامد نہیں۔'' وہ بھی آٹھ سالہ حسن کو پیار کرتے ہوئے بولیں جو پڈنگ کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔
''صبا بیٹا! حسن کے والد اسے لینے آئے ہیں۔''
اس سے پہلے کہ صبا کوئی جواب دیتی، حسن اس سے فوراً



لپٹ کر بولا۔

"نہیں، نہیں آنٹی آج میں پپا کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ آج میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ مجھے گھر نہیں جانا...... آپ کے ساتھ رہنا ہے۔"

"مگر...... کیوں بیٹا؟ آپ کے پپا آئے ہیں لینے۔" وہ بولی۔

"آنٹی، آج ویک اینڈ ہے، میں اپنے دوست سے اسٹوری بکس لے کر آیا ہوں وہ آپ مجھے پڑھ کر سنایئے گا۔ وہاں تو سارے لوگ جلدی سو جاتے ہیں، بوا بھی اور پپا تو کام میں مصروف ہوتے ہیں، مجھے آپ سے اسٹوریز سننا اچھا لگتا ہے۔"

"بیٹا! آپ نے آج رات یہاں رہنے کی اجازت نہیں لی ہے اپنے پپا سے۔ آج تو آپ چلے جاؤ، میں کل کے لیے خود اُن سے اجازت لے لوں گی۔ آپ بڈنگ ساتھ ہی لے جاؤ۔" صبا اسے پیار سے سمجھانے لگی۔

"کل شام کو آؤٹنگ پر بھی جائیں گے اور آئس کریم بھی کھائیں گے۔" اس نے حسن کا موڈ بگڑا دیکھا تو کہنے لگی۔

"ہرا......" حسن خوشی سے چلایا پھر اپنا ننھا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "ملائیں ہاتھ......"

صبا نے ہنستے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا اور پھر پیار کیا۔ اتنے میں اماں خود چلی آئیں اور حسن کو اپنے ساتھ لے کر باہر چلی گئیں۔ جہاں اس کے والد اسے لینے کے لیے آئے تھے۔

☆☆☆

"صبا بیٹا، رات کو شاہدہ کی خالہ پھر ڈاکٹر ساجد کا پیغام لے کر آئی تھیں۔ دو تین بار جواب مانگا ہے۔ بتاؤ کہ میں آخر اسے کیا جواب دوں؟" صبا آفس جانے کے لیے تیار کھڑی تھی تو اماں نے اس سے کہا۔

"اماں! اس وقت تو مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔ پلیز! اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔ آج صبح تو آنکھ بھی دیر سے کھلی۔ خدا کرے کہ جلد ہی کوئی سواری بھی مل جائے۔" کہتے ہوئے وہ آگے بڑھی تو کانوں میں اماں کی آواز آئی۔

"بیٹا! ناشتا تو کر کے جاؤ۔"

"نہیں اماں! بالکل بھی ٹائم نہیں ہے۔" یہ کہتی وہ گھر سے باہر آ گئی اور گلیوں سے گزر کر مین روڈ پر آ گئی جہاں ٹریفک کا ایک سیلاب رواں دواں تھا۔ وہ کتنی دیر کھڑی رہی مگر کوئی رکشا نہیں مل سکا۔ موڈ اور بھی غارت ہو گیا کہ اچانک سے ایک کار عین اس کے سامنے آ کر رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اس نے ڈاکٹر ساجد کو بیٹھے دیکھا جو اس سے مخاطب تھے۔

"صبا صاحبہ! بیٹھیں، میں آپ کو آفس ڈراپ کر دوں گا۔"

"آپ تکلیف نہ کریں، مجھے کوئی سواری مل جائے گی۔"

"تکلف چھوڑیں مجھے بالکل بھی زحمت نہیں ہو گی۔" آپ کو مزید دیر ہو جائے گی۔"

وہ بھی سمجھ گئی کہ اب "نہ" کہنا حماقت ہی ہو گی۔ اتنے میں ڈاکٹر ساجد کار کا پچھلا دروازہ کھول چکے تھے۔ وہ خاموشی سے پیچھے بیٹھ گئی۔

"حسن کو اسکول چھوڑ آئے؟" اس نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"جی ہاں...... وہ تو جلدی چلا جاتا ہے ناں......!" وہ بہت شائستگی سے بولے۔

"صبا صاحبہ! آپ کو یقیناً میرا پیغام مل گیا ہو گا۔" وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد... پھر سے مخاطب ہوئے۔ وہ کنفیوز ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ وہ کچھ دیر اس کے جواب کے انتظار کے بعد بولے۔

"صبا صاحبہ! ہم اب عمر کے اس دور میں ہیں جہاں جذبات سے نہیں، عقل اور بردباری سے فیصلے کیے جاتے ہیں اور ہمارے درمیان روایتی تکلف بھی نہیں ہونا چاہیے کہ آپ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سمجھدار ہیں۔ میں آج شام آپ کے گھر حاضر ہوں گا تاکہ اس موضوع پر تفصیلی بات ہو سکے اور میں آپ کو اپنا مسئلہ

سمجھا سکوں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں......"

وہ بے بسی سے بولی۔

"اسی لیے تو میں حاضر ہو کر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ کو بھی کوئی فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔"

"آج شام وقت دے سکیں گی؟" وہ چپ رہی تو وہ پھر بولے۔

"جی......! جیسی آپ کی مرضی......" پھر آفس آنے تک وہ خاموش رہی اور ان کا شکریہ ادا کر کے کار سے اتر گئی۔

"میں بہت اسٹریٹ فارورڈ آدمی ہوں، تکلفات سے مجھے چڑ ہے، شکریہ کہنے کی ضرورت نہیں۔" وہ اسے حیران و پریشان چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔

☆☆☆

ٹریفک کا شور کان پھاڑے دے رہا تھا۔ وہ تھکن سے چور کب سے سواری کا انتظار کر رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر کھڑی وہ سوچ رہی تھی کہ آج تو لگتا ہے کہ قسمت ہی خراب ہے۔ صبح تو ڈاکٹر ساجد آگئے اب کیا کرے...... اچانک کار کے بریک کی ہلکی چرچراہٹ پر وہ چونک پڑی۔ اچانک رکی ہوئی گاڑی سے کسی نے اسے مخاطب کیا۔

"آپ، آپ صبا ہیں ناں......؟" اس نے حیران ہو کر مخاطب کرنے والے کو دیکھا تو ایک شدید جھٹکا لگا اور زبان سے بے اختیار نکلا۔

"رضا......؟"

"پھر تو یقیناً آپ صبا ہی ہیں، اتنے عرصے بعد دیکھ رہا ہوں۔ کچھ بدل بھی گئی ہیں پھر بھی میں نے پہچان لیا اور آپ نے بھی مگر کنفرم کرنا ضروری تھا۔" وہی شوخ لہجہ تھا، اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ہنسے کہ روئے...... اس کے منہ سے فقط اتنا نکلا۔

"آپ...... اس شہر میں...... کیسے؟"

"سب کچھ، پوچھ لیجیے گا مگر پہلے گاڑی میں بیٹھیں تو سہی...... پیچھے گاڑیاں ہارن دے رہی ہیں۔ کہاں جانا ہے چلیں میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔"

وہ کسی روبوٹ کی طرح اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی کہ اس نے وہی دروازہ کھولا تھا اس کے لیے۔ اسے لگا کہ اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کھو چکی تھیں۔

"رضا! یہاں کیسے آنا ہوا؟" وہ اچانک جیسے ہوش میں آکر پوچھنے لگی۔

رضا کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔

"کسی کام سے آیا ہوں اور کچھ دنوں میں چلا جاؤں گا۔ ویسے بھی تمہارا یہ شہر میرے لیے بہت ظالم ہے کیونکہ یہ میرے پیار، خوابوں اور حسرتوں کا مدفن ہے۔ اس لیے یہاں زیادہ ٹھہرنا خود میرے لیے عذاب ہے۔ قدم، قدم پر بکھری یادیں مجھے بے چین کر دیتی ہیں۔" اس نے بے حد دکھی لہجے میں کہا۔

"تم بالکل بھی نہیں بدلے رضا...... وہی ضد، وہی جنون، وقت تمہیں ذرا بھی بدل نہیں سکا۔" وہ اداس ہو کر بولی۔

"چھوڑو اس قصے کو، تم اپنے بارے میں بتاؤ۔" وہ ایک دم آپ سے تم پر آگیا تو وہ بھی جیسے ایک پل میں ماضی میں پہنچ گئی۔ پھر جب وہ بولی تو اسے اپنی ہی آواز پاتال سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"کیا بتاؤں رضا، تم نہ جانے کیا جاننا چاہتے ہو؟" یہ کہتے ہوئے وہ اسے گھر کا راستہ بتانے لگی۔

"تمہاری شادی تو تمہارے دور کے ایک کزن سے ہو گئی تھی ناں...... کیسی گزر رہی ہے زندگی؟" وہ اس سے پوچھنے لگا۔ اس نے جیسے ان سنی کر دی۔ اتنے میں اس کا گھر آگیا۔ وہ دروازہ کھولنے ہی لگی تھی کہ رضا پھر بولا۔

"صبا! میں نے کچھ پوچھا تھا۔ مجھے جواب کیوں نہیں دیا۔"

"اس نے شادی کے کچھ عرصے کے بعد مجھے طلاق دے دی تھی۔" وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔

''اوہ آئی ایم سوری...... اچھا! اس وقت تو میں جلدی میں ہوں...... انشاء اللہ جونہی وقت ملا تو میں ملنے کے لیے آؤں گا۔ بہت دن ہو گئے ہیں اماں اور ابا سے ملے ہوئے۔''

''صرف اماں سے مل پاؤ گے...... ابا کی تو پچھلے سال ڈیتھ ہو گئی۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''اوہ......! وری سیڈ......؟'' وہ بھی اداس ہو گیا۔ وہ گاڑی سے اتر گئی۔

''میں آؤں گا ملنے ضرور......'' وہ اتنا بولا اور گاڑی آگے بڑھا لی۔

☆☆☆

کمرے میں اندھیرا تھا۔ صبا اپنے پلنگ پر گھٹنوں میں سر دیے رو رہی تھی کہ بیڈ روم کا دروازہ کھول کر یاسمین داخل ہوئی اور کمرے کی لائٹ آن کی۔

''محترمہ! کس دنیا میں گم ہیں۔'' وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کی حالت دیکھ کر چونک گئی۔ اس کے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا اور آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ یاسمین فوراً اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

''کیا ہوا صبا......؟ سب خیر تو ہے ناں......؟''

''ہاں! سب خیر ہے۔'' وہ آنکھیں پونچھ کر ہاتھوں سے بال ٹھیک کرنے لگی۔

''مجھے تو خیر نہیں لگ رہی ورنہ تم اور تمہارا کمرا یوں اجڑا ہوا نہیں لگتا۔ میں تو فون پر تمہاری آواز سن کر ہی سمجھ گئی تھی کہ تم پریشان ہو۔'' وہ ابھی اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ اماں چائے اور کچھ لوازمات کی ٹرے اٹھائے کمرے میں آئیں تو یاسمین نے ان سے ٹرے لیتے ہوئے کہا۔

''آنٹی مجھے بلا لیا ہوتا، خود کیوں تکلیف کی؟''

''کیسی تکلیف بیٹا!'' اماں محبت سے بولیں۔ ''اچھا ہوا کہ تم آ گئیں۔ اب تم ہی اسے سمجھاؤ کہ ڈاکٹر ساجد دو تین بار جواب مانگ چکا ہے مگر یہ ہے کہ مانتی ہی نہیں، یہ تو اس کی خوش نصیبی ہے کہ اتنا اچھا رشتہ آیا ہے۔ وہ بہت سمجھدار اور عزت دار شخص ہے۔''

''بس آنٹی! اب آپ فکر نہ کریں۔ میں آ گئی ہوں ناں...... سب سنبھال لوں گی۔'' یاسمین نے تسلی دی تو وہ سکون کی سانس بھر کر وہاں سے چلی گئیں۔

''دیکھو صبا، آنٹی کتنی پریشان ہیں تمہارے لیے...'' یاسمین نے اس سے کہا۔

''اب پریشان ہو رہی ہیں، میری زندگی اماں اور ابا کی ضد نے ہی تو برباد کی تھی۔'' اس کی آنکھوں کے رکے آنسو دوبارہ گرنے لگے تو یاسمین نے اسے سمجھایا۔

''کہتی تو تم ٹھیک ہو مگر اب گزرا وقت تو واپس نہیں لوٹایا جا سکتا ناں...... اب جو بھی قدم اٹھانا وہ بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا۔ اب ڈاکٹر ساجد کے لیے کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟''

''کچھ بھی نہیں......'' وہ خالی، خالی لہجے میں بولی تو یاسمین نے اسے مہمیز دی۔

''کیوں؟ کیا حسن سے پیار نہیں کرتیں؟''

''حسن تو میرا بیٹا ہے، میری جان ہے، زندگی ہے۔'' وہ جیسے خواب سے جاگ کر بولی کہ کچھ زیادہ کہہ گئی ہے۔

''تو پھر یہ بھی سوچو کہ تمہارے سوا کوئی دوسری عورت اسے ماں جیسا پیار نہیں دے سکتی۔ اس معصوم کی زندگی کی ڈور تمہارے ہاتھ میں ہے۔''

''میں سمجھتی ہوں یاسمین اور آج رات ڈاکٹر ساجد اسی سلسلے میں مجھ سے بات کرنے آ رہے ہیں۔''

''ساجد بھائی بہترین انسان ہیں، انہیں بھی حسن کے مستقبل کی فکر ہے، ورنہ ان کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں کہ ایسے اچھے رشتے کہاں ملتے ہیں، اب خود کو سمیٹو اور اچھی طرح تیار ہو جاؤ، ویسے تو تم اس حلیے میں بھی غضب ڈھا رہی ہو......'' سہیلی کی بات سن کر اس کے لبوں پر اداس سی مسکراہٹ آ گئی۔

''بس یار! اتنی سی بات پر پریشان تھیں کہ محترمہ زار و قطار رو رہی تھیں؟'' یاسمین نے کہا۔

"نہیں یاسمین! اس کی وجہ یہ بات نہیں ہے۔" وہ تڑپ کر بولی۔

"پھر کیا بات ہو گئی جناب؟"

"یاسمین! آج اتنے سالوں کے بعد اچانک رضا ملا......"

"اوہ......" یاسمین سنبھل کر بیٹھ گئی۔ "کیسا ہے وہ؟"

"پتا نہیں، سرسری سی ملاقات ہوئی کیونکہ وہ جلدی میں تھا۔" اس کے چہرے پر اداسی کے سائے گہرے ہونے لگے۔

"آج اسے دیکھ کر میرا ماضی جیسے لوٹ کر آ گیا ہے۔ یاسمین! میرے والدین کی ضد نے میری زندگی برباد کر دی۔ انہوں نے مجھے اپنی خاندانی روایات کی بھینٹ چڑھا دیا۔"

یاسمین اس کا دکھ سمجھتی تھی کہ وہ خود ان کی محبت کی گواہ تھی جب وہ دونوں یونیورسٹی میں کلاس فیلوز تھیں۔ وہ صرف ایک دوسرے کی نام کی ہی دوست نہیں بلکہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ کی ساتھی تھیں۔ اس لیے آج بھی ویسی ہی دوستی تھی۔

"اس میں کچھ غلطی تو تمہاری بھی تھی ناں کہ تم اتنی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہونے کے باوجود تھوڑی سی مزاحمت نہیں کر پائیں۔ وہ تو تم سے نکاح کے لیے بھی تیار تھا۔ تم نے ہی ہمت نہیں کی حالانکہ یہ تمہارا قانونی اور شرعی حق تھا۔ وقت کے ساتھ تمہارے والدین بھی اس فیصلے کو قبول کر لیتے۔ مگر تم تو اپنے کزن سے شادی کرنے پر تیار ہو گئیں جو کسی بھی لحاظ سے تمہارے قابل نہیں تھا۔ آخر کیوں صبا؟"

"یاسمین تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تب میں کتنی مجبور ہو گئی تھی کیونکہ اس وقت میرے سامنے صرف میرا مستقبل نہیں تھا بلکہ میری چھوٹی بہنوں کا بھی مستقبل سامنے تھا۔ اگر میں کوئی ایسا ویسا قدم اٹھا لیتی تو وہ بغاوت سمجھا جاتا۔ تم تو جانتی ہو یاسمین کہ ہمارا کوئی بھائی نہیں۔ اس لیے ہمارے والدین نے ہم پر لڑکوں جتنی توجہ دی اور خاندانی رسموں کو توڑ کر ہمیں یونیورسٹی لیول تک کو ایجوکیشن میں پڑھایا اور آزادی دی تو پھر میں اس آزادی کا غلط استعمال کیسے کرتی؟"

"یہی تو حیرت ہے صبا کہ انہوں نے تم لوگوں کو اتنی آزادی دی مگر زندگی کے سب سے بڑا فیصلہ کرنے کی بالکل آزادی نہیں دی؟"

"یہی تو دکھ ہے یاسمین! اس معاملے میں میرے والدین بالکل روایتی ماں، باپ بن گئے۔ رضا دوسری ذات برادری کا تھا اس لیے وہ اس کے حق میں نہیں تھے۔ حالانکہ اس کا خاندان بھی اچھا تھا۔ اس وقت ان کے سامنے صرف اپنی خاندانی روایات تھیں اولاد کی خوشیاں نہیں اور اگر میں بغاوت کرتی تو اس کا الزام صرف مجھ پر نہیں بلکہ میری تعلیم اور میری آزادی پر آتا اور پھر شاید میری بہنوں کو یہ دونوں نعمتیں نہیں مل پاتیں۔ میرے کیے کی سزا انہیں بھگتنا پڑتی اور پھر شادی کے بعد جب مجھے طلاق نامہ ہاتھ میں دے کر معصوم بچے سمیت والدین کے گھر بھیجا گیا تو جب ان کی آنکھیں کھلیں پھر انہوں نے خاندانی رسم و رواج کو بالائے طاق رکھ کر خاندان سے باہر میری چھوٹی بہنوں کی شادی کی۔ آج وہ سب سکھی ہیں۔ بس اسی بات کی تو خوشی ہے کہ میری دی ہوئی قربانی اکارت نہیں گئی اور میری بہنوں کی شادی کے درست فیصلے ہوئے۔" وہ رو پڑی تھی۔

"دیکھو صبا! جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ اب ماضی کو بھول جاؤ، اب تو رضا کی بھی منگنی ہو چکی ہے، وہ تو شادی کے لیے راضی ہی نہیں ہو رہا تھا ایسا دل ٹوٹا تھا اس بیچارے کا مگر سالوں بعد اس کے والدین نے اسے شادی کے لیے رضامند کر ہی لیا اور جلد ہی اس کی بھی شادی ہونے والی ہے۔ وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے۔ پہلے والدین نے تمہارے لیے غلط فیصلہ کیا تھا مگر اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم خود باشعور ہو اور میں سمجھتی ہوں کہ تم ساجد بھائی کے حق میں فیصلہ کر کے سمجھداری کا ثبوت دو گی۔"

یاسمین ایک پُرخلوص دوست کی طرح اسے

سمجھا رہی تھی اور وہ اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ پھر یاسمین نے اس کے لیے اس کے وارڈ روب سے ایک خوب صورت جوڑا منتخب کیا۔ یاسمین نے اس کے ہلکا میک اپ کیا، ہلکی سی جیولری پہنائی تو وہ اور بھی پُرکشش لگنے لگی۔ وہ چونتیس سال کی تھی مگر سلم اور اسمارٹ ہونے کی وجہ سے اب بھی پچیس، چھبیس کی ہی لگتی تھی۔ یاسمین اسے ساجد کے ساتھ اچھی طرح بات کرنے کی تاکید کرتے ہوئے اور ڈھیروں دعائیں دیتی رخصت ہوگئی۔

☆☆☆

''ساجد صاحب! چائے لیجیے......'' صبا نے چائے کے ساتھ دوسرے لوازمات ڈاکٹر ساجد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ شکریہ کہتے ہوئے چائے پینے لگے۔

کچھ دیر کے لیے کمرے میں بالکل خاموشی چھا گئی۔ اماں جان بوجھ کر کمرے سے باہر نکل گئیں کہ دونوں کھل کر بات کر سکیں۔ ڈاکٹر ساجد اپنے خیالوں میں گم تھے۔ صبا آج پہلی مرتبہ اس طرح ان کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ چھتیس، سینتیس سال کے سوبر اور پُرکشش شخصیت کے مالک تھے اور بات کرنے میں بے حد شائستہ پن تھا۔

''صبا صاحبہ!'' ساجد نے اچانک صبا کو مخاطب کیا تو وہ گھبرا گئی۔

''حسن کو سنبھال کر آپ نے سچ مچ مجھ پر اور اس پر احسان کیا ہے۔''

''کیسا احسان ساجد صاحب؟'' وہ بولی۔

''اس کی ماں میری بے حد پیاری سہیلی تھی اور پڑوسن بھی......اس کی حادثاتی موت پر مجھے بھی اتنا ہی دکھ ہے جتنا آپ کو......اور حسن کے وجود نے تو مجھے جینے کا حوصلہ دیا۔ اپنی ممتا کی تسکین اسی سے تو کرتی ہوں میں۔ آج اگر میرا اپنا بیٹا زندہ ہوتا تو اسی کا ہم عمر ہوتا۔''

''آپ کے اسی جذبے کی قدر کرتے ہوئے تو میں نے پروپوزل بھیجا تھا۔'' ساجد نے کہا اور پھر اک گہری سانس لے کر گفتگو آگے بڑھائی۔

''آپ تو جانتی ہیں کہ میری ایک شادی شدہ بڑی بہن کے علاوہ اور کوئی رشتے دار نہیں۔ وہ میری ماں کی طرح ہیں اسی لیے وہ بار، بار مجھ پر حسن کی خاطر شادی کرنے کے لیے دباؤ ڈال رہی ہیں۔ مجھے خود بھی حسن کی فکر ہے ورنہ انہوں نے تو کچھ لڑکیاں بھی دیکھ لی ہیں مگر......''

''مگر......یہ کہ......آپ چاہتے ہیں کہ ایک طلاق یافتہ عورت پر احسان کریں جسے عموماً ہمارا معاشرہ ٹھکرا دیتا ہے؟'' اس کا موڈ ایک دم بگڑ گیا تو ڈاکٹر ساجد پریشان ہو کر اسے دیکھنے لگے۔

''نہیں! آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ مس صبا! میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ احسان تو آپ کا ہوگا ہم دونوں پر......اگر آپ ہمارا ساتھ قبول کریں گی۔ مجھے یہ سب کچھ اس لیے کرنا پڑا کہ میرا ٹرانسفر کراچی ہوگیا ہے اور اگلے ہفتے مجھے وہاں شفٹ ہو جانا ہے۔''

''اوہ......تو......کیا حسن بھی چلا جائے گا؟ میں، میں اس کے بغیر کیسے رہ پاؤں گی؟'' وہ یہ کہہ کر روہانسی ہوگئی تھی۔

''یہی بات تو میں آپ سے کرنا چاہتا تھا کہ خود حسن بھی آپ کے بغیر نہیں رہ پائے گا۔ ماں کا پیار دیا ہے آپ نے اسے......سچ پوچھیں تو ہم تینوں ایک کو دوسرے کی ضرورت ہیں۔ مجھے حسن کے لیے ایک اچھا مستقبل اور ماں جیسی ہستی چاہیے اور مجھے بھی ایک جیون ساتھی چاہیے اور اس معاشرے میں سروائیو کرنے کے لیے آپ کو بھی گھر چاہیے اور مرد کا سہارا چاہیے۔ اس لیے ان سب چیزوں کو نظر میں رکھ کر فیصلہ کریں۔''

''مجھے کچھ وقت چاہیے سوچنے کے لیے۔'' صبا نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''جی ضرور، میں آپ سے ایک دو دن بعد فون کر کے آپ کا فیصلہ سنوں گا۔ اچھی طرح سوچ لیجیے گا۔''

وہ ڈاکٹر ساجد کے جانے کے بعد بھی گم صم سی وہیں کمرے میں بیٹھی رہی۔

صبا اپنے بیڈ روم میں بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے ایک کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی مگر اس کا دھیان بار، بار کتاب سے ہٹ کر ساتھ سوتے ننھے حسن کی طرف جا رہا تھا جو اس وقت گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ اس کے معصوم چہرے کو تکتی رہی۔ آج وہ اسکول سے سیدھا اسی کے پاس چلا آیا تھا۔ آفس سے آکر صبا نے گھر میں پہلا قدم رکھا ہی تھا کہ وہ دوڑتا ہوا آیا اور اس سے لپٹ گیا اور روتے ہوئے کہنے لگا۔

''آنٹی، آنٹی آپ مجھے چھوڑ کر تو نہیں جائیں گی ناں......؟''

''کون کہتا ہے بیٹا؟'' صبا نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''آنٹی! پپا کہہ رہے تھے کہ اب ہم کراچی چلے جائیں گے۔ تو آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں گی ناں......؟'' وہ مچل کر بولا تو اس کے منہ سے فقط اتنا نکلا۔

''میں......میں؟''

''اگر آپ نہیں چلیں گی تو میں بھی نہیں جاؤں گا۔ میں آپ کے ہی پاس رہوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔ وہ بے حد حساس بچہ تھا۔ صبا اسے لے کر کمرے میں آئی اور کتنی ہی دیر اسے مناتی رہی پھر کھانا کھلایا۔ جب وہ سو گیا تو وہ بھی ایک کتاب پڑھنے بیٹھ گئی مگر اس کا ذہن بھٹک رہا تھا۔ وہ اب تک کوئی فیصلہ نہیں کر پائی تھی۔ مگر بالآخر وہ ایک فیصلے پر پہنچ ہی گئی اور پھر مسکرا کر اس نے حسن کی پیشانی کو چوما اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

''میں ہمیشہ ممتا کا سایہ بن کر تمہارے ساتھ رہوں گی، میرے بچے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ کر کہا۔

☆☆☆

بوا سے ڈرائنگ روم کی صفائی کروانے کے بعد صبا پردوں کو برابر کر رہی تھی کہ اسے اماں کی آواز سنائی دی۔

''صبا، بیٹا دیکھو تو کون آیا ہے؟'' صبا نے گردن موڑ کر دیکھا تو جیسے اس کا پورا وجود لرز اٹھا کیونکہ اماں کے ساتھ رضا احمد کھڑا تھا۔ وہ حیران ہو کر اماں کی طرف دیکھنے لگی کہ کیا یہ وہی اماں ہیں جنہوں نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ حالانکہ اسے بیٹا کہتی تھیں۔ شاید وقت انسان کو بہت بدل دیتا ہے۔

''اماں لگتا ہے کہ مجھے خود ہی بیٹھنا پڑے گا۔ کیونکہ صبا تو بیٹھنے کو کہے گی نہیں۔'' رضا نے کہا تو وہ شرمندہ ہو کر بولی۔

''اوہ! سوری......بیٹھیں پلیز......!''

''آپ لوگ بیٹھیں، میں چائے بھجواتی ہوں۔'' اماں یہ کہتے ہوئے وہاں سے چلی گئیں۔ صبا، رضا کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے دل کی عجیب حالت تھی۔ وہ شخص جو کسی زمانے میں اس کے خوابوں کا محور تھا اب وہ سامنے تھا مگر درمیان میں سالوں کے فاصلے تھے۔

''کیسی ہو صبا؟'' رضا نے دھیرے سے کہا تو وہ چونک گئی اور جب وہ بولی تو اسے اپنی آواز جیسے کسی کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

''ٹھیک ہوں، تم کس وقت آئے؟''

''کافی دیر سے۔''

''کمال ہے، مجھے تو پتا بھی نہیں چلا۔''

''باہر اماں صحن میں مل گئیں تو ان کے پاس ہی بیٹھ گیا اور حال احوال لیا۔'' وہ تھوڑا رکا اور پھر اداسی سے بولا۔

''تمہارے حالات جان کر تو بہت دکھ ہوا۔ ابا اور تمہارے بیٹے کی جدائی کی خبر ملی۔ صبا! کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسے حالات میں ہماری ملاقات ہوگی۔''

صبا نے سر جھکا دیا کہ وہ آنسوؤں کی نمی نہ دیکھ پائے۔

''صبا، باہر لان میں بوا کے ساتھ کھیلنے والا بچہ کون ہے؟'' رضا نے ایک دم سوال کیا۔

''وہ میرا بیٹا ہے۔'' وہ شیشے سے باہر لان میں کھیلتے حسن کو پیار سے دیکھتے ہوئے بولی تو رضا چونک گیا۔

''مگر......اماں نے تو بتایا تھا کہ......تمہارا بیٹا۔''

وہ ایک دم بولی۔

"دراصل یہ میری ایک بہت ہی پیاری سہیلی کا بیٹا ہے، میرے بیٹے کی ڈیتھ کے وقت حسن بھی اس کا ہم عمر تھا۔ اس لیے وہ اسے میرے پاس لے آتی تھی کہ میری ماتا کو کچھ تسلی دے سکے۔ مجھے یقیناً اس سے سہارا ملا۔ یہاں تک کہ وہ اسے اکثر میرے پاس بھیج دیتی تھی۔ پچھلے سال وہ روڈ ایکسیڈنٹ میں ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی۔ تو یہ بچہ بالکل تنہا رہ گیا مگر کیونکہ مجھ سے بہت مانوس تھا اس لیے میں نے اسے سنبھال لیا۔ اب اسکول کے بعد یہیں چلا آتا ہے۔ رات کو اس کے پپا اسے لے جاتے ہیں۔ کبھی تو وہ رات کو بھی جانے کے لیے تیار نہیں ہوتا تو یہیں میرے پاس سو جاتا ہے پھر میں اسے تیار کر کے اسکول بھیجتی ہوں، میرے لیے یہ میرا بیٹا ہے اور اس کے لیے میں ماں ہوں اس کی۔"

"ویری سیڈ! کتنا کیوٹ بچہ ہے۔" رضا نے کہا تو صبا موضوع بدلنے کے لیے بولی۔

"تم... اپنی خبر دو کیسے ہو تم... اور تمہارے گھر والے؟"

"میں ٹھیک ہوں، آج اتنے برسوں کے بعد تم سامنے ہو تو دل میں موجود شکوے زبان پر لانا چاہتا ہوں، تم تو ایک دم مجھ سے یوں دور چلی گئیں کہ فون پر بھی بات کرنے سے انکار کر دیا۔ کسی میسج یا ای میل کا جواب تک نہیں دیا، ملنا تو دور کی بات تھی۔" وہ شکوہ کر رہا تھا۔

"رضا! کس منہ سے تم سے ملتی یا بات کرتی؟ میں تمہاری مجرم تھی، مجھے اگر تھوڑا بھی اندازہ ہوتا کہ میری زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ کرنے کا اختیار مجھے نہیں تو محبت ہی نہیں کرتی۔ میرے گھر والوں نے مجھے پابندیوں میں کبھی نہیں رکھا اس لیے میری آنکھوں میں بھی سپنے بس گئے مگر میں نے محبت کر کے نہ صرف ایک جرم کیا تمہاری بھی مجرم بنی۔" وہ سر جھکا کر بولی۔

"تم خواہ مخواہ ہی مایوس ہو گئی تھیں۔ تم حوصلہ تو کرتیں ہم شادی کر کے ڈکلیئر کر دیتے تو سب ٹھیک ہو جاتا ناں..... ہاں، باپ کتنا ناراض رہ سکتے ہیں اپنے بچوں سے؟"

"نہیں رضا! تم میری مجبوریاں نہیں سمجھ سکتے تھے۔ میں تو کسی ایسے پرندے کی طرح تھی جس کے پر کاٹ کر کھلے میدان میں چھوڑا گیا تھا اور وہ مورکھ اسے آزادی سمجھ بیٹھا تھا۔ وہ دوڑا، دوڑا پھرتا مگر جب اڑنا چاہا تو پتا چلا کہ وہ اڑنے سے معذور ہے۔ اس کے پر کاٹ دیے گئے تھے......" وہ کہتے، کہتے رو پڑی تو رضا بے چین ہو گیا۔

"آپ ان گزری باتوں کو بھول جائیں رضا۔"

"ایسا ناممکن ہے، یہ، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ جذباتی ہو کر بولا۔

"اور اب یہ مجھ سے اتنا تکلف کیوں؟ میں آپ کب سے ہو گیا؟ تم، کہو ناں صبا۔"

"سمجھنے کی کوشش کریں رضا! اس وقت میں اور آج اس وقت میں بہت فرق ہے، اب ہماری راہیں جدا، جدا ہیں اور درمیان میں سالوں کے فاصلے ہیں۔"

"اور......اور...... اگر میں یہ فاصلے ختم کر دینا چاہوں تو......؟" کہتے ہوئے وہ ایک دم اٹھا۔

"کیا مطلب؟" صبا حیران ہو کر اس کا چہرہ تکنے لگی۔

"میں نے سب کچھ جان لینے کے بعد اب ایک فیصلہ کر لیا ہے۔" وہ جذباتی ہو کر بولا۔

"کیسا فیصلہ......؟"

"صبا! ایک وقت تھا کہ ہم دونوں جیون ساتھی بننا چاہتے تھے مگر درمیان میں بہت رکاوٹیں تھیں...... اب تو کوئی رکاوٹ نہیں...... اب تو ہم شادی کر سکتے ہیں ناں......"

"کیا......کیا کہہ رہے ہیں آپ......" وہ بے اختیار اٹھتے ہوئے بولی۔

"اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے؟"

اس کے قریب آ کر رضا نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھے تو وہ تڑپ کر اس کے ہاتھ اپنے شانوں سے جھٹک کر دور ہو گئی۔

''رضا! تمہاری منگنی ہو چکی ہے، جلد شادی ہونے والی ہے، کچھ ہوش کرو......'' وہ لرزتی ہوئی صوفے پر بیٹھ گئی تو رضا اس کے قریب قالین پر ہی بیٹھ گیا۔

''صبا، میری زندگی میں آنے والی کوئی بھی لڑکی تمہاری کمی پوری نہیں کر سکتی۔ میری زندگی کا خلا صرف تم ہی پُر کر سکتی ہو۔ میں تو شادی کرنا ہی نہیں چاہتا مگر ہو رہی ہے کہ میں ماں، باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں اس لیے ان کے مجبور کرنے پر منگنی کی تھی۔ اس لڑکی سے مجھے ذرا بھی لگاؤ نہیں ہے۔ صبا، تم، تم چاہو تو میری دنیا آباد کر سکتی ہو۔ صرف تم...... میں یہ منگنی توڑ دوں گا اور گھر والوں کو بھی قائل کر لوں گا۔ صرف منگنی تو ہوئی ہے، شادی تو نہیں......''

''کیا کہہ رہے ہو رضا......؟ رشتوں کے بندھن اتنی آسانی سے توڑے نہیں جاتے۔'' وہ اس کی ضد اور وہی پرانا جنون دیکھ کر لرز کر بولی۔

''تمہارے ساتھ بھی تو ایسا ہی ہوا تھا ناں......؟ اگر شادی جیسا مضبوط بندھن ایک جھٹکے سے ٹوٹ سکتا ہے تو منگنی کیوں نہیں؟'' وہ بھی ضدی لہجے میں بولا۔

''بس کرو رضا! میرے نصیب کی سزا کسی اور کو مت دو۔ ہر مرد کا اپنا الگ کردار ہوتا ہے۔ تم، تم ہو اور وہ، وہ تھا۔ کیوں موازنہ کرتے ہو خود کا اس سے؟''

مگر رضا تو جیسے ہوش میں ہی نہیں تھا۔

''صبا! دوبارہ مجھے اکیلا مت چھوڑو...... نکال لو مجھے مایوسیوں کے گرداب سے...... پلیز صبا......'' صبا نے اس کی طرف دیکھا تو لرز گئی۔ رضا کی آنکھیں اور چہرہ بالکل سرخ تھا وہ وہی رضا لگ رہا تھا۔ دس سال پہلے والا...... ضدی، جذباتی اور جنونی وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھ گئی۔

''آئی ایم سوری صبا! پلیز ریلیکس ہو جاؤ، اتنی پریشان مت ہو، میں تمہیں سوچنے کے لیے وقت دے رہا ہوں۔ جانے سے پہلے میں فون کر کے تم سے فیصلہ سنوں گا تم ہاں کہو گی تو میں گھر جا کر سب معاملات سنبھال لوں گا۔ پریشان مت ہو صبا......''

وہ اٹھا اور جانے لگا۔ اس کے جانے کے بعد بھی کتنی دیر تک اس کی آنکھیں صبا کو نظر آتی رہیں جن میں حسرتیں اور التجائیں تھیں۔

☆☆☆

صبا رو رہی تھی اور بیڈ پر قریب بیٹھی یاسمین اپنا سر ہاتھوں پر رکھے سوچوں میں گم تھی۔

''بس کرو صبا! خود کو سنبھالو۔'' اس نے صبا کو تسلی دی۔

''یاسمین! مجھے لگتا ہے کہ میں پاگل ہو جاؤں گی۔ زندگی مجھ سے بار، بار امتحان کیوں لیتی ہے۔''

یاسمین نے اٹھ کر اسے گلے لگایا پھر اس کے آنسو پونچھ کر پیشانی سے اس کے بال ہٹائے۔ کچھ دیر پہلے وہ اسے رضا سے ملاقات کا احوال سنا چکی تھی جسے سن کر یاسمین خود بھی چکرا سی گئی تھی۔

''اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ ایک طرف حسن ہے دوسری طرف رضا...... میں ایک دوراہے پر کھڑی ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ دونوں راہوں سے کس پر قدم بڑھاؤں؟'' صبا سخت شش و پنج کا شکار تھی۔

''ایک بات بتاؤ صبا!'' وہ اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم اب بھی رضا سے اتنی ہی محبت کرتی ہو؟'' اس کی بات پر صبا نے اسے بغور دیکھا۔

''یہ تم پوچھ رہی ہو جو یونیورسٹی کے دنوں میں میری گہری دوست تھیں اور جانتی تھیں کہ میں نے رضا سے اپنی زندگی سے زیادہ پیار کیا تھا۔ کیا میں اسے آج تک بھلا پائی تھی؟''

''بس تو پھر پریشانی کس بات کی۔ تم اس کے حق میں فیصلہ کرو۔ اب آنٹی کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہو گا اور اگر ہوا بھی تو میں اب ان کو راضی کر لوں گی۔''

''مگر دیکھو...... پھر...... رضا کی منگیتر کا کیا ہو گا؟ اس کا کیا قصور ہے؟ اسے کیوں سزا ملے؟ میں نے چھپ کر رضا سے اس لیے شادی نہیں کی تھی کہ میری

نظروں کے سامنے میری چھوٹی بہنوں کا مستقبل تھا اور اب وہ لڑکی...... جو رضا کی منگیتر ہے، جس کا نام بھی مجھے پتا نہیں نہ ہی میں اسے جانتی ہوں...... مجھے اپنی چھوٹی بہن کے روپ میں وہ نظر آرہی ہے۔ تو پھر میں کیسے اس سے اس کی خوشیاں اور مستقبل چھین لوں؟ اور...... یاسمین...... اب میں بھی تو وہ نہیں رہی ناں اب میں خود کو رضا کے قابل نہیں سمجھتی۔''

''تو کیا ڈاکٹر ساجد بہتر رہیں گے؟''

''میں نے کبھی اُن کے حوالے سے ایسا سوچا نہیں...... میرے لیے بس حسن اہم ہے۔''

یاسمین اس کی ذہنی کشمکش سمجھ رہی تھی اور جانتی تھی کہ کچھ فیصلے انسان خود ہی کرسکتا ہے دوسرے نہیں۔

''صبا، فیصلہ خود تمہارا اپنا ہونا چاہیے کسی اور کا نہیں...... بہر حال تمہیں سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہے...... اب تمہارے کسی بھی فیصلے پر کوئی دوسرا اثر انداز نہیں ہوسکتا۔''

وہ اسے کتنی ہی دیر سمجھاتی رہی۔ پھر چلی گئی کہ وہ دل و دماغ کی اس جنگ میں کسی ایک کی سن کر فیصلہ کرلے۔

☆☆☆

شام ڈھل چکی تھی اور ہلکے دھندلکے میں صبا اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر پت جھڑ میں درختوں سے گرتے پیلے پتوں کے نظارے میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ خود بھی خزاں رسیدہ لگ رہی تھی۔ اس نے پیلا سوٹ پہنا ہوا تھا اور لمبے بال بے ترتیبی سے اس کے چہرے کے آس پاس بکھرے ہوئے تھے۔ اور آنکھوں میں ویرانی بسیرا کیے ہوئے تھی۔ وہ مڑی اور بیڈ پر بیٹھ کر ہاتھوں میں سر دیے سوچنے لگی۔

''کیا کروں اے خدا......! زندگی نے ایک بار پھر کتنے اذیت ناک موڑ پر لا کھڑا کیا ہے مجھے؟ بارہ سال پہلے جب میں اور رضا شادی کرنا چاہتے تھے تو کیا، کیا رکاوٹیں تھیں اور آج اے کاش......! اب بھی وہ مجھے نہیں ملا ہوتا۔'' یکا یک وہ اٹھی اور بالوں کو ہاتھوں سے برابر کرتی ہوئی آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''یہ مجھے کیا ہوا ہے؟ میں اب بارہ سال پہلے والی لڑکی نہیں بلکہ میچور ہو چکی ہوں اور ایک ماں بھی ہوں کیا میں کوئی جذباتی فیصلہ کرسکتی ہوں؟''

دل و دماغ کی اس جنگ میں بالآخر وہ ایک فیصلے پر پہنچ گئی کہ ایک دم سے موبائل کی رنگ ٹون نے اسے چونکا دیا۔ اس نے کال اٹینڈ کی۔ ڈاکٹر ساجد کی کال تھی۔ وہ اس سے اس کا فیصلہ سننا چاہتے تھے۔

''ساجد صاحب! میں حسن کو زندگی کی کڑی دھوپ میں چلنے نہیں دوں گی بلکہ ماں کی ٹھنڈی چھاؤں بن کر اس پر سایہ کروں گی۔'' اس نے بہت ٹھہرے، ٹھہرے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

''تھینک یو صبا صاحبہ......! I am really very gratefull مجھے اور کچھ بھی نہیں چاہیے۔ کل ہی سادگی سے رخصتی ہوگی۔ پرسوں ہم کراچی چلے جائیں گے۔''

صبا نے کال ختم کی تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور وہ سسک اٹھی۔

''مجھے معاف کردینا رضا! ہم زندگی میں دوسری بار بچھڑ رہے ہیں۔ میرے پاؤں میں پڑی زنجیر نے ایک مرتبہ پھر مجھے اپنے بارے میں سوچنے نہیں دیا۔ میں ایک بار پھر تمہیں دکھ دے رہی ہوں۔ کیا کروں کہ زندگی پھر مجھ سے قربانی مانگ رہی ہے۔ مجھے معاف کردینا رضا۔''

اسی وقت ٹیلی فون کی رنگ بجی اس نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا۔ دوسری طرف رضا تھا۔ وہ بھی فیصلہ سننا چاہتا تھا مگر وہ خاموش آنسو بہاتی رہی۔ وہ بول رہا تھا۔

''صبا! چپ کیوں ہو؟ پلیز جواب دو۔ مجھے واپس جانا ہے کچھ دیر میں، مجھے بتاؤ کہ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے......؟ صبا...... صبا......''

''سوری...... رانگ نمبر......'' صبا نے روتی ہوئی آواز میں کہا اور ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

لاڈلی عفو

صدف آصف



عماد غزنوی اپنی چمکتی گاڑی میں بیٹھا انتظار کی کیفیت میں مبتلا دکھائی دیا۔ وہ اس ملاقات کے لیے خصوصی اہتمام سے تیار ہوا تھا۔ بلیو جینز پر گرے ٹی شرٹ پہنی، چمکدار گھنے بالوں کو جیل لگا کر پیچھے کیا' براؤن آنکھوں پر سن گلاسز لگانے کے بعد اس کی وجاہت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

''کافی دیر ہو چکی ہے۔'' اس نے بے چین ہو کر گھڑی دیکھی اور ڈیش بورڈ پر رکھی بوتل اٹھا کر گھونٹ،

گھونٹ پانی حلق سے نیچے اتارا، وہ دھوپ کی تمازت اور گرمی سے بیزار ہونے لگا کہ اچانک ابر سا چھا گیا، موسم خوشگوار لگنے لگا۔ وہ پارک کے سامنے والی گلی سے خراماں، خراماں آتی دکھائی دی۔ عماد نے سکون کی سانس لی اور گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول کر باہر نکلا، اجالوں سی رنگت اور سحر انگیز آنکھوں والی عفیفہ رحمان اِدھر اُدھر دیکھتی چل رہی تھی۔ عماد نے ہاتھ لہرا کر اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ مسکرا دی۔ عماد اس کی جانب خوش دلی سے بڑھا۔ وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ عماد مسحور ہو گیا۔ اسے ایک دم اپنی پسند پر فخر محسوس ہونے لگا۔

عفیفہ نے کڑھائی والا لمبا سا کرتا اور اسٹریٹ پاجامہ پہنا ہوا تھا، لمبے بالوں کا سادہ سا جوڑا بنائے، کانوں میں بڑی، بڑی سلور بالیاں پہنے اس کا حسن دو آتشہ ہو گیا تھا۔

”بے شک تم نظر انداز کیے جانے والی کوئی عام سی لڑکی تھوڑی ہو۔“ عماد نے دل ہی دل میں کہا۔ دونوں اب ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پارک میں داخل ہو گئے۔ گلاب کے پودوں کے پاس سے گزرتے ہوئے عماد ایک دم بے چین ہونے لگا۔ اس نے بڑا سا تازہ گلاب توڑا اور عفیفہ کے حسن کو خراج دینے کے لیے جھک کر پھول پیش کیا۔

عفیفہ نے کھلکھلا کر پھول پکڑا اور سنگ مرمر کی بینچ پر جا بیٹھی۔ وہ مسکراتی، بجلیاں گراتی، پھول کو سونگھتی، کبھی چومتی اور کبھی اپنے چہرے سے ٹکراتی۔ عماد جو اس سے بہت ساری باتیں کرنے کا خواہش مند تھا۔ سب بھول کر اسے پیار سے دیکھنے لگا۔

”چین بھی...... میرا درد بھی...... میری عاشقی......بس تم ہی ہو۔“ وہ گنگناتا ہوا بے اختیار اس کا ہاتھ تھامنے آگے بڑھا، عفیفہ نے شرارتی انداز میں دھکا دیا۔

”یہ کیا ہوا۔“ وہ تو بستر سے نیچے جا گرا تھا۔

”ہائیں عفیفہ کہاں غائب ہو گئی۔“ اس نے انگڑائی لے کر سر پر ہاتھ پھیرا مگر سامنے کھڑی دادی کو دیکھ کر جان نکل گئی۔

”اٹھ جاؤ، کیا پورے دن سونا ہے۔“ فریدہ بانو نے پوتے کو جھاڑا۔

”دھت تیرے کی، یہ خواب تھا۔“ عماد کی سمجھ میں نہیں آیا کہ گرنے سے آنکھ کھلی یا دادی کی چیخ وپکار سے کمر میں زور کی چوٹ آئی۔

”عماد اب کیا چھٹی کا پورا دن بستر پر ہی گزارنا ہے؟“ عماد نے سر جھٹکا۔

”عفو خوابوں میں اتنی قریب اور حقیقت میں کتنی دور ہوتی جا رہی ہو۔“ عماد نے تصور میں اسے پیار سے پکارا۔

”بچے، چلو جلدی سے ناشتا کر کے چھوٹے کا گوشت لا دو۔ شام کو تمہاری پھپھو کھانے پر آ رہی ہیں بہو نے اسٹو چڑھانا ہے۔“ فریدہ بانو نے اس کے گھنے بالوں کو مٹھی میں جکڑا اور پیار سے کہا۔

”توبہ ہے پوتی بنا ہوا ہے۔“ انہوں نے پوتے کو خیالوں میں کھویا دیکھا تو کمر پر ہاتھ رکھ کر بڑ، بڑ کرتی باہر نکل گئیں۔

”ہائے..کاش یہ سپنا سچ ہو جائے۔“ عماد کے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ چھا گئی، عفیفہ کی حسین صورت نگاہوں میں پھر گئی۔ حسن عماد کی کمزوری تھا۔ وہ خود بھی کسی سے کم نہیں تھا بلکہ خاندان کا سب ہینڈسم لڑکا کہلاتا تھا مگر بچپن سے اس میں یہ برائی تھی کہ ہر پیاری شے اسے اپنی طرف کھینچنے لگتی۔ جوان ہونے کے بعد عفیفہ وہ لڑکی تھی جو اسے پہلی نگاہ میں ہی پسند آ گئی، گو کہ کبھی کبھی عفو کی صاف گو طبیعت اور مزاج کا کھرا پن عماد کے لیے مسئلہ بن جاتا مگر پیار میں جہاں خوبیاں قابلِ قبول ہوتی ہیں، وہیں ایک آدھ خامی نظر انداز کرنے میں کوئی برائی نہیں۔

”عفو، میں تو تمہارے لیے سارے زمانے سے لڑ سکتا ہوں......مگر یہ بتا دو کہ تمہیں پانے کے لیے تم سے کیسے لڑوں؟“ عماد کو اس کی یاد نے افسردہ

کر دیا۔ وہ عجیب لڑکی تھی، وہ کسی کی بھی ہو، مجرم اسے ہی ٹھہرانے لگتی۔ شاید اسے عماد کی محبت پر بہت مان تھا۔

"عماد جلدی کرو، ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" فریدہ بانو نے دوبارہ پکارا تو وہ اس سنگ دل کی یادوں سے پیچھا چھڑاتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"جس دن پھپھو کو آنا ہوتا ہے۔ دادی اپنا لاڈ پیار بھلا کر ہٹلر بن جاتی ہیں۔ ان کا بس چلے تو ناشتے کے بغیر ہی مجھے مارکیٹ روانہ کر دیں۔" اس کی سوچوں کا دھارا اپنی پھپھو کی جانب مڑ گیا۔ دادی کی پھٹکار سے بچنے کے لیے تولیا اٹھا کر واش روم کی طرف بڑھا۔

"ٹنگ...... ٹنگ......" دروازے کی بیل زور، زور سے بجنے لگی۔ عماد گیلے چہرے کو پونچھتے ہوئے چونکا اور باہر نکلا، دروازہ کھولتے ہی اس کی نگاہ آنٹی گلشن آرا پر پڑی اور جیسے اس کی جان گئی۔

☆☆☆

"گلشن، بھئی اب تو عماد کے لیے کوئی اچھے خاندان کا رشتہ بتا دو۔ جب سے اس کی اتنی اچھی جاب ہوئی ہے، میں گھر میں بہو لانا چاہ رہی ہوں۔" عماد کی امی زلیخا نے رشتہ کرانے والی گلشن آرا کے صوفے پر بیٹھتے ہی پرجوش انداز میں کہا۔

"بہو، تم تو عجیب ہو۔ لوگ پہلے لڑکی کی شادی کا سوچتے ہیں۔ تم رابیل کو چھوڑ کر عماد کے پیچھے پڑ گئیں۔" فریدہ نے تاسف سے سر ہلا کر کہا۔ پوتے کا اترا منہ دیکھ کر وہ خود کو روک نہ سکیں۔

زلیخا نے ساس کو دیکھا۔ وہ خاندان میں اٹھنے والے اس طوفان کو دبانے کی خواہاں تھیں۔ جو عماد اور عفیفہ کی شادی کی وجہ سے سب کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا تھا۔

"اماں...... رابیل ابھی چھوٹی ہے۔" زلیخا نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ گلشن آرا ان دونوں کی باتوں سے بیزار دکھائی دی۔ اسے ابھی ایک دو جگہ اور جانا تھا۔

"ہاں بہن کوئی ایک اچھی سی لڑکی تو دکھاؤ۔" زلیخا نے گلشن کے موڈ کا اندازہ کر کے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"لو ایک لڑکی، میں نے تو عماد میاں کے لیے دو اچھی، اچھی لڑکیاں ڈھونڈ نکالی ہیں۔" گلشن آرا نے کاروباری مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر اپنے پرس سے کاغذ میں لپٹی ہوئی تصاویر نکال کر ان کو پیش کی۔

"نام کیا ہیں۔" زلیخا نے چشمہ لگا کر دونوں تصاویر بغور دیکھیں پھر پاس بیٹھی ساس کی طرف بڑھائیں، انہوں نے بے دلی سے تصویریں دیکھیں۔

"آپا! یہ گوری والی لڑکی مزنہ ہے۔ دیکھنے میں موم کی نازک سی گڑیا لگتی ہے۔ بس اس کی اپنی تعلیم کچھ زیادہ نہیں...... پر یہ گھر کے کاموں میں بہت تیز ہے۔ گھرانا بھی معقول ہے۔" گلشن آرا نے تفصیل بتائی۔ وہ ہمیشہ صاف اور کھری بات کرتی۔

"یہ جو دوسری لڑکی ہے ناں۔ اس کا نام سویرا ہے۔ اس کا۔ خاندان بھی اعلیٰ ہے اور یہ خود بھی کافی تعلیم یافتہ ہے۔ بہت حسین و جمیل نہیں مگر عادت و اطوار کی اچھی لڑکی ہے۔" گلشن نے تفصیل بتا کر گلا کھنکھارا۔ عماد، ماں کی آواز پر پانی کا گلاس لے کر اندر داخل ہوا تو اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ رابیل دوست کی طرف گئی ہوئی تھی۔

وہ بہانے سے اس خالصتاً زنانہ محفل میں بیٹھ گیا۔ دادی نے جلدی سے دونوں تصاویر اسے پکڑا دیں۔ اس کے حلق سے ایک ٹھنڈی آہ خارج ہوئی۔ لڑکیاں اچھی تھیں مگر وہ اس کا دل کیا کرتا جو صرف "عفو" کے نام کی مالا جپتا تھا۔

"ہاں، صحیح بات ہے۔ خوش مزاج اور بڑوں کا ادب کرنے والی بہو ہی اس گھر کے لیے مناسب رہے گی۔" فریدہ بانو نے کچھ سوچ کر بات نکالی مگر زلیخا نے فوراً بات گھما دی۔

"اور کیا بھئی۔ حجاب جیسی خودسر تو بالکل نہ ہو۔ بیچاری آپا کا حال برا کر دیا ہے۔" زلیخا نے جان بوجھ

کر بیٹے کی طرف دیکھ کر زور سے کہا۔ بہن کے ساتھ گھنٹوں فون پر باتیں ہونے کا نتیجہ کچھ ایسا ہی نکلنا تھا۔ بات ایک ہوتی چار لگائی جاتی۔

''یا اللہ، میری نیا کیسے پار لگے گی؟'' عماد نے اوپر منہ کر کے فریاد کی۔ وہ جو عفیفہ کا نام لینا چاہ رہا تھا۔ ماں کی تقریر کے بعد ہمت جواب دے گئی۔ فریدہ بانو نے دکھ بھری نگاہوں سے پوتے کا چہرہ دیکھا پھر بہو کو گھورا۔ زلیخا جان کر انجان بن گئیں۔

''عفیفہ کی وجہ سے تو خالہ اور حجاب بھابی کے تعلقات خراب ہوگئے ہیں۔ ماں کے سامنے اس کا مقدمہ لڑوں بھی تو کیسے؟'' وہ خاموشی سے سر ہلاتا ہوا اٹھ گیا۔ زلیخا، گلشن آرا سے دھیرے، دھیرے باتوں میں مصروف ہوگئیں۔

☆☆☆

حجاب، زلیخا کی بڑی بہن صاعقہ کی بہو تھی۔ صاعقہ انتہائی درجے کی وہمی عورت تھیں، زندگی کے ہر معاملے میں جی جان سے چھان پھٹک کرتیں اور ''چھنا چھانو اتنا کر کرا کے'' مصداق اکثر دھوکے بھی کھا بیٹھتیں مگر قسمت اچھی تھی جو انہیں بہو کے روپ میں بیٹی مل گئی۔ حجاب جو بڑی دقتوں کے بعد صاعقہ کو پسند آئی تھی، اس نے شادی کے بعد سسرال کے چوپٹ معاملات بڑی سلیقہ مندی سے سنبھال لیے، آنے جانے والوں سے اپنائیت سے ملتی۔ جلد ہی پورے خاندان میں فیصل بہو کی ملنساری کی دھوم مچ گئی۔

شادی کے دس سال ہنستے روتے گزر ہی گئے، حجاب نے خود کو صاعقہ کی پسند کے سانچے میں ڈھال لیا مگر وہ اس وقت مجرم بن گئی... جب والدین کے گزر جانے کے بعد اپنی جوان بہن عفیفہ کو سسرال میں لے آئی۔ فرقان اور عرفان، حجاب کے دو بھائی تھے۔ مگر ان کی بیویوں نے کنواری نند کا بوجھ اٹھانے سے صاف انکار کر دیا۔ کچھ عفیفہ کی صاف گوئی بھی اس کی راہ میں کانٹے بچھاتی چلی گئی۔ گھر بھر کی ''لاڈلی عفو'' کی حیثیت اب دو کوڑی کی رہ گئی۔ حجاب نے شوہر سے بہن کو گھر لانے کی اجازت مانگی۔ فیصل ایک نرم مزاج انسان تھا۔ وہ بیوی کی مجبوری کو سمجھ رہا تھا مگر ماں کو بھی اچھی طرح سے جانتا تھا، اسی لیے یہ قدم اٹھاتے ہوئے سوچ میں پڑ گیا۔ ان حالات میں حجاب بہن کو ہی صبر کی تلقین کرتی۔

ایک دن بڑا بھائی فرقان سر کھجاتا شرمندہ سا عفیفہ کو وہاں خود ہی چھوڑ گیا۔ عفو بہن سے لپٹ کر پھوٹ، پھوٹ کر رو دی۔ بھائیوں اور بھابیوں کے رویے نے اس کے مان اور عزتِ نفس کو شدید ٹھیس پہنچائی۔ حجاب کو مرے ہوئے والدین کا خیال آ گیا۔ وہ گھنٹوں روتی رہی۔ فیصل نے آفس سے لوٹنے کے بعد بیوی اور سالی کی حالت دیکھی تو عفیفہ کو ہمیشہ اپنے گھر رکھنے کا اعلان کر دیا۔ بیٹے کے جوش کو دیکھ کر صاعقہ ہائیں، ہائیں، کرتی رہ گئیں۔

حالات نے یوں پینترا بدلا کہ فیصل کو سالی کو گھر لا کر رکھنے والے معاملے میں ماں سے اجازت لینے کا وقت ہی نہیں مل سکا۔ صاعقہ کو یہ بات بہت بری لگی کہ گھر کے فیصلے اب ان کی مرضی کے بغیر ہونے لگے ہیں۔ وہ بیٹے اور بہو سے ناراض ہوگئیں۔

''دلہن تمہارے بھائیوں نے جب اماں باوا کی جائداد پر قبضہ جمالیا تو کنواری بہن کو بھی اپنے ساتھ ہی رکھتے۔ وہ تمہاری ذمے داری بنا دی گئی۔'' صاعقہ نے ایک دن گزر جانے کے بعد اس معاملے میں بہو سے خوب جرح کی۔

''اماں اگر بھائیوں کو اپنا فرض یاد نہیں تو کیا میں بھی جوان بہن کو اس برے وقت میں تنہا چھوڑ دوں؟ ویسے بھی اسے صرف رہنے کے لیے ایک ٹھکانا چاہیے، ورنہ ابو نے اس کے نام پر کافی کچھ چھوڑا ہے۔ ہمیں خرچ کی مشکل نہیں ہوگی۔'' حجاب نے دبی زبان میں انہیں سمجھانا چاہا۔

''اے لو...... تو کیا ہم پر ''لاڈلی عفو'' کی ایک روٹی بھاری ہے، نہ بھئی اتنے گئے گزرے نہیں۔ ہم تو

اس لیے کہہ رہے تھے کہ جوان جہان لڑکی کی ذمے داری اٹھانا کوئی آسان کام نہیں مگر تم نے تو ایک پل میں ہمیں لالچی بنا دیا۔'' صاعقہ کو موقع مل گیا، انہوں نے بات کو غلط ٹریک پر ڈال دیا۔

''اماں، وہ کوئی غیر لڑکی نہیں، حجاب کی سگی بہن ہے۔ ان حالات میں اسے تنہا کیسے چھوڑا جا سکتا ہے؟'' فیصل نے حیران ہو کر ماں سے کہا تو انہوں نے آنکھیں نکال کر بیٹے کو گھورا۔ وہ دبک گیا۔

''اماں! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو کہنا چاہ رہی تھی کہ ابو نے اپنی زندگی میں ہی کافی پیسہ عفیفہ کے لیے ڈپازٹ کروا دیا تھا۔'' حجاب کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان کی بدگمانی کیسے دور کرے۔

''بی بی' اپنے باوا کے پیسوں کا رعب کسی اور پر جھاڑنا۔'' وہ جل بلا کر بولیں۔ اور ہاتھ جھٹکا۔

''اماں! حجاب کا یہ مطلب نہیں۔'' فیصل نے پھر انہیں سمجھانا چاہا۔ عفیفہ کا رنج کے مارے برا حال ہوا جا رہا تھا۔ اسے عماد پر شدید غصہ آنے لگا اگر وہ ٹھیک وقت پر شادی کر لیتا تو آج اس کی ایسی درگت تو نہ بنتی۔

''تم تو چپ رہو، بیوی کے غلام۔ ماں کا خیال نہ آیا۔ بس بیوی کی بات پر کان دھر دیے۔'' انہوں نے انگلی اٹھا کر بیٹے کو ٹوک دیا۔ حجاب کو ساس کی یہ باتیں بہت بری لگیں۔ دونوں میں بحث مباحثہ شروع ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شام تک گھر کا ماحول ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ عفیفہ گھنٹوں کمرے میں بند رہی۔ حجاب نے سر درد کی کڑوی گولی پانی کی مدد سے حلق سے اتاری اور صاعقہ کا بی پی لو ہو گیا۔ انہوں نے واویلا مچا مچا کر اپنی چھوٹی بہن زلیخا کو مدد کے لیے بلوا لیا۔

''گھٹنا کہاں جائے پیٹ کی طرف۔'' زلیخا نے بہن سے روداد سننے کے بعد اپنے بھانجے فیصل کے کان کھینچے۔ مگر وہ اس معاملے میں مجبور تھا۔ سالی کو لا چکا تھا۔ اکیلے میں خالہ کو سارا مسئلہ بتایا وہ سمجھ گئیں کہ اب کچھ ہو نہیں سکتا تھا۔

''آپا جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب برا بھلا بول کر کیوں بیٹے اور بہو کی نظروں سے گرنا چاہتی ہیں۔'' زلیخا نے پیار سے بہن کو سمجھایا۔ صاعقہ نے بہت برے دل سے عفیفہ کا وجود گوارا کر لیا۔

☆☆☆

''چاچو' اتنے دنوں بعد آئے ہیں۔ ہم دونوں کتنا یاد کر رہے تھے۔'' عماد بہت بجھے دل سے خالہ کے گھر داخل ہوا تو فیصل کے بچوں پنکی اور سنی نے ہاتھ پکڑ کر پُرجوش استقبال کیا۔

''بس تم دونوں......؟'' عماد نے منہ لٹکا کر کہا تو ان کی کھی کھی نکل گئی۔

''یار تھوڑا بزی تھا۔ خیر خالہ کہاں ہیں؟'' عماد نے چاروں اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے ان سے پوچھا۔

''دادی تو پاپا کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس گئی ہیں۔'' پنکی نے اپنی پونی ہلاتے ہوئے بتایا۔ خالہ کی غیر موجودگی کا سن کر عماد نے سکون کی سانس لی۔ آج کل وہ ماں اور خالہ دونوں کے زیرِ عتاب تھا۔ اسی لیے ڈرتے ڈرتے یہاں آیا۔

''ارے تم کب آئے؟ بیٹھو میں چائے لے کر آتی ہوں پھر بیٹھ کر باتیں کریں گے۔'' حجاب نے عماد کو دیکھا تو چونکی پھر مسکرا کر استقبال کیا اور چائے بنانے چل دی۔ وہ دل ہی دل میں شکر بجا لائی کہ صاعقہ اپنی خود ساختہ بیماری کا علاج کرانے گئی ہوئی ہیں۔ آج کل وہ انتہائی وہمی اور شکی ہو رہی تھیں۔ فیصل ماں کی تسلی کے لیے انہیں اپنے ساتھ لے گیا۔

''آج تو کوئی اچھی سی فیری ٹیل سنا دیں۔ ورنہ ہم ناراض ہو جائیں گے۔'' عماد کو سوچوں میں گم دیکھ کر سنی بولا۔

''نہیں بچوں، آج نہیں پھر کبھی.....'' عماد نے اداسی سے منہ لٹکا کر کہا، اس کی نگاہوں نے ہر طرف کا جائزہ لے لیا۔ جانے وہ کہاں جا چھپی تھی۔ ایک جھلک

بھی دکھائی نہیں دی۔

''چاچو...... چاچو...... سنائیں نا ورنہ ہم زور سے شور مچائیں گے۔'' پنکی اور سنی اس کو گدگدی کرنے لگے۔ بچوں کی معصومیت پر وہ ہنستا چلا گیا۔

''اچھا تو...سنو پرانے زمانے کی بات ہے۔ پرستان میں ایک پری رہتی تھی۔'' عماد نے ذہن میں سوچ کر ایک کہانی بنائی اور شروع ہوا۔

''پری، چاچو پری کیسی ہوتی ہے؟'' پنکی اور سنی شرارت پر آمادہ تھے۔ ایک ساتھ بولے۔

''پریاں بہت خوب صورت ہوتی ہیں۔'' وہ انہیں سمجھانے لگا، عفیفہ جھنجلائی ہوئی سٹنگ روم میں داخل ہوئی۔ عماد کو بھانجے' بھانجی کے ساتھ بیٹھا دیکھا تو چونک گئی۔

''آنی کی طرح تو نہیں؟'' پنکی نے عفیفہ کو دیکھا اور پوچھا۔ وہ سرخ، کرتے، شلوار پر جارجٹ کا بڑا سا دوپٹا پہنے، بہت حسین لگ رہی تھی۔

''پریاں...... شاید ایسی ہی ہوتی ہوں گی۔'' عماد کے دل نے گواہی دی تو اس نے خیال میں سر ہلا کر تائید کی۔ سرخ لباس میں وہ ایک تروتازہ کلی لگ رہی تھی بس اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات کانٹے چبھو رہے تھے۔

''یہاں...... ہو کیا رہا ہے؟ تم سب یوں چیخ رہے ہو... جیسے گھر میں نہیں کسی جنگل میں بیٹھے ہو۔'' عفیفہ نے پتلی کمر پر ہاتھ ٹکا کر باری، باری تینوں کو گھورا۔

''کیا ہے آنی! ہم پریوں کی کہانی سن رہے تھے۔ مزہ خراب کر دیا۔'' سنی نے کھی کھی کرتے ہوئے کہا۔ عماد کو دیکھ کر عفیفہ کا موڈ آف ہو گیا۔

''تم دونوں کو پڑھائی کا بھی کچھ ہوش ہے؟ امتحان سر پر آ گئے ہیں مگر نہ کوئی فکر نہ کوئی پریشانی......'' عفیفہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، اس نے ہاتھ میں پکڑی کتاب سے سنی کی پٹائی لگائی، پنکی کو جھڑکا' ہاتھ سے زیادہ تیز اس کی زبان چل رہی تھی۔ وہ دونوں منہ بسور کر عماد سے جا چپکے۔

''چہ...... چہ...... بیرا... میرا غصہ بچوں پر اتارا جا رہا ہے۔'' عماد نے لبوں تک آتی مسکراہٹ کو زبردستی روکا۔

عفیفہ ماتھے پر تیوریاں ڈالے کتاب ہاتھ میں پکڑے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئی اور ہل' ہل کر رٹا لگانے لگی۔

''آنی کا انگلش کا پیپر ہے۔'' سنی نے عماد کے پوچھنے پر سرگوشی کی تو اس کے دل میں گدگدی ہوئی جانتا تھا انگریزی سے اس کی جان جاتی ہے۔

''آنی آپ اندر جا کر پڑھیں ناں۔ ہم ڈسٹرب ہو رہے ہیں۔'' پنکی بھائی کے مقابلے میں کافی تیز تھی تھوڑی دیر برداشت کیا پھر ٹھنک کر بولی۔

''اندر کافی اندھیرا ہو رہا ہے۔ لائٹ نہیں ہے ناں۔ اس لیے مجھ سے وہاں پڑھا نہیں جا رہا ہے۔'' اس نے بہانہ بنایا، عماد کے لب ایک بار پھر مسکرائے۔

''تو...... آپ نے جنریٹر آن کرنے کا کہا کیوں نہیں؟'' سنی بھی مار کھانے کے بعد اپنی لاڈلی آنی کو کوئی رعایت دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔

''بچوں کوئی بات نہیں۔'' ''پری'' میرا مطلب ہے اپنی آنی کو یہیں بیٹھنے دو۔ میں تم لوگوں کو دھیمی آواز میں کہانی سناتا ہوں۔'' عماد نے اسے گہری نگاہ سے دیکھتے ہوئے معاملہ نمٹایا، ویسے بھی دشمنِ جاں کو کتنے دنوں بعد دیکھا تھا، ابھی تو نگاہوں کی پیاس بجھی بھی نہ تھی۔

''ہاں تو چاچو، پری اچھی ہوتی ہے؟'' سنی نے شوخی سے پوچھا۔

''بیٹا! پری سب سے بہت پیار کرتی ہے۔'' عماد نے کہانی میں اپنے مطلب کی باتیں شامل کیں عفیفہ کے کان کھڑے ہوئے۔

''ہاں، پری تو بہت اچھی ہوتی ہے مگر وہ اس وقت بری بن جاتی ہے جب کوئی جن اسے دھوکا دیتا ہے۔'' عفیفہ نے کتاب ایک طرف رکھ کر بڑے جوش سے ان کی کہانی میں لقمہ دیا۔

''اوہ...... جل وہ کون ہے؟'' پنکی نے ہونٹ نکال کر پوچھا۔ عماد کی آنکھوں کی جوت بجھنے لگی۔

''یہ کتنا بدل گئی ہے۔ امی اور خالہ کی باتوں کا بدلہ مجھ سے لے رہی ہے۔'' اس کا دل اتنا دکھا کہ وہ ان سب کے بیچ سے اٹھ کر ایک دم باہر نکل گیا۔

''عماد...... عماد رکو تو...! کمال لڑکا ہے یہ بھی۔'' حجاب جو چائے اور لوازمات سے بھری ٹرالی لیے چلی آرہی تھی حیران ہو کر اسے پکارنے لگی مگر وہ سنی ان سنی کرتا چلا گیا۔

عفیفہ نے بہن کو کوئی جواب نہ دیا۔ باہر نکلتے ہوئے عماد کی پشت گھورتی رہی۔ مگر ہمیشہ کی طرح اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ عفیفہ کو اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔ ساتھ ہی بھری دنیا میں تنہا رہ جانے کا احساس شدید تر ہو گیا۔

☆☆☆

صاعقہ بستر پر بیٹھی، دھوپ والا کالا چشمہ آنکھوں پر چڑھائے، دل ہی دل میں عفیفہ کے بخیے ادھیڑنے میں لگی ہوئی تھیں۔ اچانک کام والی ماسی گوری جو نام کے برعکس پیٹ بھر کر کالی تھی، کمر لچکاتی، ہاتھ میں جھاڑو لیے ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔

''توبہ ہے، یہ دلہن کی بہن بڑی سبز قدم لڑکی ہے۔ جب سے یہاں آئی ہے۔ ہم مسلسل بیمار رہنے لگے ہیں۔'' صاعقہ نے جھاڑو لگاتی گوری کو اپنی درد بھری کتھا سنائی۔ وہ کام چھوڑ چھاڑ سیاہ رنگت پر سفید دانت چمکاتی، دلچسپی سے ان کی باتیں سننے لگی۔

''سبز قدم لڑکیاں بڑی منحوس ثابت ہوتی ہیں۔'' گوری نے ہنکارا بھرا۔

''سچ بات ہے۔ جس دن سے ''لاڈلی عفو'' یہاں رہنے آئی ہے۔ ہماری طبیعت خراب رہنے لگی ہے، پہلے ہم سیڑھیوں سے پھسل گئے۔ وہ تو اللہ کا کرم ہوا کہ ٹانگ نہیں ٹوٹی۔ اس کے چند دنوں بعد ہمارا سر دیوار سے جا ٹکرایا۔ اتنا بڑا گومڑا نکل آیا۔'' انہوں نے ہاتھ سے سائز بتاتے ہوئے کچھ زیادہ ہی بڑا بنا دیا۔

''ہائے، ہائے اماں...... ایسی لڑکیوں سے تو کئی ہاتھ دور رہنا چاہیے۔ آپ نے تو سر پر ہی لا کر بٹھا لیا۔'' گوری نے سامنے، سامنے جھاڑو پھیرتے ہوئے مزے سے کہا۔

''کیا کریں، جوان لڑکی کو اکیلا بھی نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اب دیکھو ہم آج صبح سو کر اٹھے تو آنکھ ہی نہیں کھولی جا رہی تھی... پلکیں چپک گئیں۔ پتا چلا یہ دکھنے آگئی ہیں۔'' صاعقہ نے چشمہ اتار کر سرخ کیچڑ جمی آنکھیں دکھائیں تو گوری قہقہہ مار کر ہنس دی۔

''لو اماں! اس لیے چشمہ لگایا۔ میں آپ ہی سمجھتی رہی کہ بوڑھی کو پرانی فلموں کی ہیروئن بننے کا شوق چڑھا ہے۔'' گوری نے مذاق اڑایا تو صاعقہ جل بھن گئیں۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے کام چور۔ بیڈ کے نیچے صحیح سے جھاڑو مار۔ نہیں تو ابھی بہو سے شکایت لگاتے ہیں۔'' صاعقہ نے مروت کو ایک طرف رکھ کر گوری کو دھمکایا۔ وہ جانتی تھی کہ حجاب نوکروں کو ایک حد میں رکھنے کی قائل ہے۔ گوری عزت افزائی پر منہ بناتی، دوبارہ صفائی کرنے لگی۔

''ویسے اماں! ایک بات کہوں۔ اپنے اوپر تھوڑا دم وم کروالو۔ ساری بلاؤں سے محفوظ رہو گی۔'' گوری نے کچھ سوچ کر دھیرے سے ان کے پاؤں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''چل ناس پیٹی'' میں نہیں پڑتی ان چکروں میں۔'' صاعقہ نے پاؤں جھٹک کر گوری کو دور کیا۔

''آپ کی مرضی مجھے کیا؟ پر میرے پیر بابا بڑے کراماتی ہیں۔ اپنے آستانے پر بیٹھے، بیٹھے ایسا حصار باندھیں گے کہ آپ کے دشمن منہ کی کھائیں گے۔'' گوری کے چہرے کا تاثر کچھ عجیب سا ہوا۔ صاعقہ لحہ بھر سوچ میں ڈوب گئیں۔

''اچھا، بات سنو۔'' صاعقہ نے اسے بلا کر دھیرے سے کچھ کہا۔ عفیفہ جو بہن کے کہنے پر صاعقہ کو آنکھ میں لگانے والی دوائی کا ٹیوب دینے آرہی تھی، اپنا ذکرِ خیر اس انداز میں سن کر اسی واپس پلٹنے لگی۔

"کاش! عماد تم میں اتنی جرأت ہوتی تو میں کیوں دوسروں کے در پر پڑی اپنی بے عزتی کرواتی۔" عفیفہ کھڑکی کے پاس بیٹھ کر روتے ہوئے ماضی میں کھوگئی۔

☆☆☆

عماد اور عفیفہ کی پہلی ملاقات حجاب کی شادی پر ہوئی۔ ڈھولکی، مہندی، مایوں غرض کے شادی کی تمام رسومات میں دونوں کی نوک جھوک چلتی رہی۔ ایک دوسرے کے لیے سیر پر سوا سیر ثابت ہوئے۔ اور دلوں کے فاصلے کم ہو کر مٹ گئے۔

حجاب کے گھر آنا جانا بڑھا تو ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ یوں جانے کب ہنستے کھیلتے ان دونوں کو محبت ہوگئی۔ کئی سالوں کا ساتھ تھا۔ ان دونوں کو اپنی شادی میں کوئی رکاوٹ نظر نہ آئی۔ خاندان بھر میں حجاب کی مقبولیت دیکھ کر عماد کو یقین تھا کہ امی عفیفہ کے لیے انکار نہیں کریں گی۔

عفیفہ کے والدین اب اس کی شادی کے لیے سنجیدہ ہو رہے تھے۔ اسی لیے وہ بھی عماد پر رشتہ بھیجنے کے لیے مسلسل دباؤ ڈال رہی تھی۔

تعلیم مکمل ہونے کے ساتھ ہی وہ نوکری کی تلاش میں لگ گیا۔ اس نے ماں پر زور دیا کہ وہ حجاب بھابی سے عفو کے رشتے کی بات کریں۔ زلیخا کو اس رشتے پر کوئی خاص اعتراض نہیں ہوا۔

"عفیفہ، حجاب جیسی سعادت مند بہو کی بہن ہے۔ یقیناً اس جیسا ہی سسرال نبھائے گی۔" فریدہ بانو نے پوتے کی سفارش کی تو زلیخا مان گئیں۔ جب بڑی بہن سے تنہائی میں مشورہ مانگا تو صاعقہ کو بھانجے کی یہ خواہش اتنی اچھی نہیں لگی۔

"چھوٹی، تم کیا اماں کی نصیحت بھول گئی ہو؟" صاعقہ نے کچھ سوچ کر کہا اور پاندان میں سے سونف نکال کر کھائی۔

"اماں بی کی نصیحت؟ آپا میں کچھ سمجھی نہیں۔" زلیخا نے حیرانی سے بڑی بہن کا منہ تکتے ہوئے پوچھا۔

"ہماری اماں ہمیشہ سے ایک گھر میں دو بہنیں لانے کی مخالفت کرتی رہیں۔" انہوں نے بلاوجہ کا اعتراض اٹھایا۔

"آپا! ٹھیک ہے مگر ہمارے گھر تو الگ، الگ ہیں۔" زلیخا نے سمجھانا چاہا۔ مگر صاعقہ اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہیں تھیں۔ انہیں شادی کے پہلے دن سے ہی عفیفہ بری لگنے لگی تھی۔

"دلہن، اپنے شادی کے کپڑے سنبھال کر پہنا کرو۔ ہم نے اتنا مہنگا جوڑا بنوایا ہے۔ ابھی سے اس کا حال برا ہو گیا تھا۔" صاعقہ نے شادی کے ہفتے بھر بعد ہی حجاب کو دعوت میں جاتے ہوئے ٹوکا۔ عفیفہ جو وہاں آئی ہوئی تھی اسے صاعقہ کا "مہنگا جوڑا" کہنا مزہ دے گیا۔

"آنٹی! مائنڈ نہ کیجیے گا۔ مگر آپ لوگ ایسی سستی بری لائے تھے کہ پورے خاندان میں ہمارا مذاق بن کر رہ گیا تھا۔ عفیفہ نے جھٹ سے بہن کی طرفداری کرتے ہوئے انہیں آئینہ دکھایا۔ حجاب نے بہن کا ہاتھ دبا کر مزید کچھ کہنے سے روکا۔ مگر صاعقہ تن فن کرتی ہوئی وہاں سے باہر نکل گئیں۔

"کیا ہوا آپا...... کہاں کھو گئیں؟" زلیخا نے بہن کو ہلایا تو وہ چونک اٹھیں۔

"ہونہہ، ٹھیک ہے۔ مگر ایک بات پہلے ہی بتا دوں۔ وہ حجاب بہو جیسی نہیں ہے" لاڈلی عفو" بڑی زبان دراز ہے۔" صاعقہ نے دانت کچکچا کر کہا۔ انہوں نے اس سے بلاوجہ کا بیر باندھ لیا تھا۔

"کیا مطلب، میں سمجھی نہیں؟" زلیخا نے بھولے پن سے پوچھا تو صاعقہ نے سچ مچ میں اپنا ماتھا پیٹ لیا۔

"ارے بھئی! عماد تو اس لڑکی کے پیچھے پاگل ہو گیا ہے۔ شادی کے بعد تم بیٹے سے ہاتھ دھونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" صاعقہ نے عفو کی صاف گوئی کو بڑھا چڑھا کر عیب بنا ڈالا۔

"اللہ نہ کرے۔" زلیخا نے ایک دم دل پر ہاتھ

رکھ کر کہا تو وہ مایوسی سے سر ہلانے لگیں۔ کون جانتے بوجھتے مکھی نگلتا ہے۔

"ہمارا کام تھا سمجھانا۔ اب بنے میاں کی مرضی وہ مانے یا نہ مانے۔" صاعقہ کو مذاق سوجھا تو ہنس دیں۔

"ویسے، دیکھنے میں تو عفو پیاری اور کم گو بھی لگتی ہے۔" زلیخا کے سامنے بیٹے کا چہرہ آگیا تو ایک کوشش اور کی۔

"سنو بہن...... سمجھانا ہمارا فرض تھا۔ باقی تمہاری مرضی۔" صاعقہ نے ہاتھ نچا کر کہا اور بات ختم کردی۔ زلیخا کے چہرے پر پھیلی سوچ کی پرچھائیوں کو دیکھ کر وہ سمجھ گئیں کہ اب یہ رشتہ ہونا مشکل ہے۔ زلیخا گھر لوٹیں تو ان کے خیالات میں واضح تبدیلی آچکی تھی۔

عماد جو ماں کا خالہ کے گھر جانے کا سن کر پریشان ہوگیا تھا اس نے عفیفہ کے یہاں جانے کا پوچھا تو انہوں نے بیٹے کو ہری جھنڈی دکھادی۔ وہ پریشان ہوکر دادی کی گود میں سر رکھ کر دکھڑا رونے لگا۔ فریدہ بانو نے اسے جھوٹی تسلیاں بھی نہیں دیں۔ وہ جانتی تھیں اس گھر میں بہو کی بات پتھر کی لکیر ثابت ہوتی ہے۔ وہ اگر بیٹے سے بات بھی کریں گی تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

☆☆☆

"کیا ہوا؟ آنٹی ہمارے گھر کب آرہی ہیں؟" عفیفہ نے تھک ہار کر خود ہی عماد سے رشتہ بھیجنے کے بارے میں سوال پوچھ لیا۔

"ہاں بس! وہ ایک، دو دن رک جاؤ۔" عماد کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ سوٹا لینے لگا۔

"جہاں اتنے دن انتظار کیا، وہاں ایک، دو دن اور سہی۔" عفیفہ نے منہ بگاڑ کر کہا۔ اس کے دل میں اندیشے پلنا شروع ہوگئے۔

"اللہ میری مدد فرما۔ ورنہ عفو تو مجھے کچا چبا جائے گی۔" عماد نے مسکرا کر سوچا۔ اس کے لیے راستہ بدلنا کچھ مشکل نہ تھا پر اسے عفیفہ سے سچی محبت تھی۔ اسی لیے وہ ماں کو منانے میں لگ گیا مگر زلیخا تو اب عفیفہ کا نام سننے کو تیار نہ تھیں۔

عماد نے عفو کے روز، روز کے سوال جواب سے تنگ آکر اس سے بچنا شروع کردیا۔ ارادہ تھا کہ اب عفیفہ سے اس وقت ہی بات کرے گا جب سنانے کو کوئی خوش خبری ہوگی۔

اسی دوران زلیخا کو نمونیہ کا اٹیک ہوگیا، پورا گھر اس پریشانی میں لگ گیا۔ عماد کبھی ماں کو اسپتال لے کر جاتا۔ کبھی ان کے ٹیسٹ کرواتا۔ رابیل ابھی چھوٹی تھی تو وہ ساری ذمے داری اکیلے نہیں سنبھال سکتی تھی۔ ان حالات میں عماد چڑچڑا ہوگیا، حالات سے پریشان ہوکر وہ جب بھی عفیفہ سے بات کرکے تازہ دم ہونا چاہتا وہ لڑنے کو تیار بیٹھی ہوتی۔ وہ ایک دم تھک سا گیا۔ اسی دوران عفو کے فون آنے پر صحیح سے بات نہ کرسکا۔ جس کی وجہ سے عفیفہ کے دل میں وسوسے اور بدگمانی بڑھتی چلی گئی۔

☆☆☆

"زلیخا کی طبیعت ٹھیک ہوجائے تو ہم اپنے بھانجے کی منگنی دھوم دھام سے کریں گے۔" صاعقہ نے گوری سے بات کرتے ہوئے حجاب کو سنایا۔ وہ ایک دم چونک اٹھی۔ بہن اور دیور کے حالِ دل سے واقف جو تھی، اس کے کان اُدھر ہی لگ گئے۔

"اماں، کیا لڑکی پسند کرلی ہے؟" گوری نے اپنی چاندی کی جھانجھروں کو پانی سے دھوتے ہوئے پوچھا۔ وہ ابھی صحن کی دھلائی کررہی تھی۔

"اسے لڑکیوں کی کوئی کمی ہے زلیخا نے ایک، دو جگہ بات چلائی ہوئی ہے۔ ایک لڑکی تو اس کی سسرال میں ہے۔" صاعقہ نے بلاوجہ کی کہانی گھڑلی۔ حجاب بُرے دل سے اندر کی جانب بڑھی اور بہن کو فون کرکے ساری بات بتائی۔ عفیفہ یہ سب سن کر پریشان ہوگئی۔

"عماد میں تو تمہیں بہت اچھا سمجھتی تھی مگر تم بھی دوسرے لڑکوں کی طرح نکلے۔" عفیفہ ان باتوں کے

بعد غلط فہمی کا شکار ہو گئی۔ اس نے خاموشی سے پیچھے ہٹنے کا سوچا۔

عفیفہ ابھی عماد کی محبت کے غم میں مبتلا تھی کہ اچانک اس کے والدین آگے پیچھے چل بسے۔ وہ باپ کا غم منا بھی نہیں پائی تھی کہ ماں عدت میں ہی شوہر کے پیچھے دنیا سے چلی گئیں۔ دکھ کیا ہوتا ہے اس بات کی حقیقت اسے پہلی بار پتا چلی۔ یوں محسوس ہوا جیسے سب کچھ ختم ہو گیا ہو۔ جان لٹانے والی بھابیوں نے ایسا پینترا بدلا کہ ”لاڈلی عفو“ کا انسانوں پر سے اعتبار اٹھ گیا۔

”اگر تم ہمت کر کے اپنی محبت کو ایک جائز رشتے کا نام دے پاتے تو آج مجھے بہن کی سسرال میں یوں باتیں سنتے ہوئے گزارہ نہیں کرنا پڑتا۔“ عفیفہ ماضی سے حال کی جانب لوٹی تو اس کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔

عماد نے کئی بار عفو کو سمجھانے، پیار سے منانے کی کوشش کی۔ مگر اب وہ خود سے ہی محتاط ہو کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ وہ یہاں اپنی بہن حجاب کو کسی نئے امتحان میں ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔

☆☆☆

”چھوٹی، دیکھو کوئی ہم پر جادو کروا رہا ہے۔ ہائے صبح سے اٹھا نہیں جا رہا ہے۔“ صاعقہ نے بہن کو دیکھتے ہی دکھڑا سنایا۔ حجاب جو ساس کے سرہانے بیٹھی تھی، دوپٹے سے آنسو پونچھتی... سب کو سلام کر کے کمرے سے باہر چل دی۔ عماد نے چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ عفیفہ کی بھی کچھ خبر نہیں تھی۔

فیصل کے فون پر عماد، امی ابا اور چھوٹی بہن رابیل کے ساتھ... یہاں چلا آیا۔ دیکھا تو خالہ صاعقہ سر پر پٹی باندھے بستر پر نڈھال پڑی، ہائے وائے کر رہی تھیں۔

”آپا، اللہ کا نام لیجیے۔ کسی کو آپ پر جادو کرانے کی کیا ضرورت ہے؟“ زلیخا نے اُن کے سرہانے بیٹھ کر تسلی دیتے ہوئے شوہر سے نگاہ چرائی جو بڑی سالی کی ایسی جہالت بھری باتوں کے سخت خلاف تھے۔

”نہیں۔ چھوٹی... انسان کے سو دوست تو سو دشمن بھی ہوتے ہیں۔“ صاعقہ نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

”بھئی فیصل بیٹا، آپا کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔ چیک اپ کرواؤ۔ کمزوری کی وجہ سے اٹھا نہیں جا رہا ہو گا۔“ غزنوی احمد نے مسکرا کر کہا۔

”میاں ہم پر اتنی مشکل گھڑی پڑی ہے اور آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔“ صاعقہ برا مان گئیں۔

”بیگم ٹھیک بات تو ہے۔ یہاں کس کو جادو ٹونے کی پڑی ہے۔“ فیصل کے والد شریف الدین جو زچ ہو چکے تھے، سختی سے بولے تو وہ بھل بھل آنسو بہانے لگیں۔

”ہائے کیوں نہیں۔ ویسے بھی جب سے ہم نے حجاب کی بہن کی مخالفت کی“ دلہن ایک دم بدل کر رہ گئی ہیں۔“ صاعقہ نے بہن کا ہاتھ تھام کر فریاد کی۔ عماد نے دکھ سے خالہ اور ماں کو دیکھا۔

”یہ شک کا کیڑا کلبلایا ہے۔ آپا بی کے دماغ میں مگر کیسے؟ میرا مطلب جادو ٹونے سے ہے۔“ غزنوی احمد نے اپنے ہم زلف سے شگفتگی سے پوچھا۔

”پتا نہیں بھائی صاحب، میں تو جب آفس سے لوٹا تو گھر میں یہ ہنگامہ مچا ہوا تھا۔“ انہوں نے بیچارگی سے کہا۔

”ہم سے پوچھیں، کوئی ہماری بات پر یقین نہیں کر رہا مگر ہم پر کوئی کالا جادو کروا رہا ہے۔“ صاعقہ ایک دم تنک کر شوہر کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ حجاب نے پہلے شوہر کے ہاتھوں چائے بھجوائی، تھوڑی دیر بعد خود بھی منہ دھو کر ان کے بیچ آ بیٹھی۔ عماد نے ترس بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

”اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟“ زلیخا نے خشک لہجے میں کہا۔ عماد نے ماں کے انداز پر پہلو بدلا۔ رابیل کا بھی یہ سب دیکھ کر منہ بن گیا۔

”دیکھنا چھوٹی...... جس نے ہمارا برا چاہا۔ وہ خود اس کے پھیرے میں آ جائے گا۔“ صاعقہ نے دوپٹا

پھیلا کر پہلے دعا مانگی اور پھر زور سے خود ہی ''آمین'' کہا۔ حجاب کا چہرہ شرمندگی سے پھیکا پڑ گیا۔ وہ جانتی تھی کہ سب کچھ اسے ہی سنایا جا رہا ہے۔

''آپ کو جادو والی بات پر اتنا یقین کیوں ہے؟'' زلیخا نے بہن سے پوچھا۔ عماد کو اب اس ماحول سے کوفت محسوس ہونے لگی۔ فیصل الگ پہلو پر پہلو بدل رہا تھا۔

''ہا، ہا...... دیکھو یہ آنکھوں دیکھی بات ہے۔ میرے واش روم میں اتنے سارے کالے بال بکھرے پڑے ہیں۔'' صاعقہ نے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بتایا تو سب چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

''بال......'' رابیل کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''حیرت ہے بال کہاں سے آگئے؟'' ان سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

''جو بھی یہ سب کروا رہا ہے۔ وہ جان لے کہ ایک بہت بڑے کراماتی بابا کی دعائیں ہمارے ساتھ ہیں۔ وہ پہلے ہی ہمیں ہونے والی انہونی کے بارے میں بتا دیتے ہیں۔'' صاعقہ نے دھمکایا۔ تاہم کسی کے چہرے پر بھی ندامت کی پرچھائیں نہیں ابھری۔

''آپا کیا ہو گیا ہے آپ کو؟'' زلیخا نے بہن کی باتوں پر شرمندہ ہوتے ہوئے کہا۔

''تم یقین کرو نہ کرو۔ مگر ہمارے ساتھ کچھ تو غلط ہو رہا ہے۔ دو دن پہلے ہی گوری نے ہماری کرسی کی گدی سے سوئی نکال کر دی تھی۔'' صاعقہ نے بہن کو جتلایا۔

''صاعقہ، میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ تم نے ساری عمر تو ہمارا تماشا بنا کر رکھا ہے اب بڑھاپے میں بہو کے سامنے تو ذلیل نہ کرو۔'' شریف الدین نے زچ ہو کر بیوی کو گھورا۔

''خالہ کسی کو آپ پر دم تعویذ کرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' عماد نے دبے لفظوں میں حجاب کی سائیڈ لی۔ فیصل نے مشکور انداز میں کزن کو دیکھا۔

''ارے میاں تم ہمیں کیا نصیحت کرنے لگے، صاف اور سیدھی بات ہے ہماری وجہ سے جن کے راستے بند ہوئے... وہ ہی یہ سب کرا رہی ہوں گی ناں۔'' صاعقہ ہاتھ نچا کر ایک دم بولیں۔ شریف الدین نے انہیں تاسف سے دیکھا، فیصل نے پہلو بدلا اور حجاب کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

''خالہ، یوں کسی پر الزام لگانا درست نہیں۔'' عماد سمجھ رہا تھا کہ ان کا اشارہ عفو کی طرف ہے۔ ایک دم مٹھیاں بھینچ کر کھڑا ہوا، زلیخا نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں ٹھنڈا رہنے کا اشارہ کیا۔

''واہ بیٹا! ہم سے سوال جواب...... ارے یہ ہماری دلہن بیٹھی ہیں۔ ان سے پوچھو۔ تین چار بجے سے دونوں بہنیں کہاں نکل جاتی ہیں؟ یقیناً کسی چھو چھکڑ والے بابا سے میرے لیے تعویذ لینے جاتی ہوں گی۔'' وہ ایک دم جوش میں اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔

سب کی سوالیہ نگاہیں حجاب کی جانب اٹھیں تو وہ چور سی ہو گئی۔

''آنٹی یہ ہے وہ جادوگر جو بقول آپ پر جادو کرا رہا ہے۔'' عفیفہ غصے میں گوری کو گھسیٹتے ہوئے سب کے بیچ میں لے آئی۔

''لاڈلی عفو، اپنے گناہ چھپانے کے لیے۔ اس غریب پر تو الزام نہ لگاؤ۔'' انہوں نے چبا چبا کر اس کا نام لیا اور نفرت سے منہ سکیڑا۔

''گوری بتاؤ، آنٹی کے واش روم میں بال کہاں سے آئے؟ ورنہ ابھی پولیس کو فون کرتی ہوں۔'' عفیفہ نے گوری کی کلائی کو مروڑا اور دھمکی دی۔

''مجھے کچھ نہیں پتا، میں نے کچھ نہیں کیا۔'' وہ خوف زدہ ہو کر اس سے ہاتھ چھڑانے لگی۔

''ایک منٹ...... گوری، سچ سچ بتاؤ اصل بات کیا ہے؟'' فیصل نے اس کو گھورا تو وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں صاعقہ سے التجا کرنے لگی۔

''فیصل، اس کا پیچھا چھوڑ دو۔ یہ ہی تو ایک

ہماری بھی رو ہے، جس کے کراماتی بابا نے ہمیں آنے والی ہر آفت کا پتا پہلے ہی بتادیا تھا۔"

انہوں نے آگے بڑھ کر بیٹے سے ماسی کا ہاتھ چھڑوایا۔

"اچھا، تو یہ معاملہ ہے۔ دنیا کو انگلیوں پر نچانے والی سالی صاحبہ ایک نوکرانی کے ہاتھوں بے وقوف بن رہی تھیں۔" غزنوی احمد نے طنز کرتے ہوئے، بھویں اچکا کر بیوی کو دیکھا۔ ان پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

"گوری نے دو دن پہلے ہی ہمیں بتایا کہ ہمارے اوپر بڑا گندا عمل کرایا جارہا ہے مگر بابا کی کرامت سے کوئی نہ کوئی نشانی ظاہر ہوجائے گی۔" ہی ہوا۔ آج اتنے سارے کالے بال واش روم میں گرے ہوئے تھے، وہاں تو کوئی جاتا بھی نہیں۔" صاعقہ کے حواس شک اور وہم کے شکنجے میں جا پھنسے تھے۔ الٹی سیدھی باتیں کرکے رونے بیٹھ گئیں۔

"سنی، پلیز تم بتانا کہ آج کیا دیکھا؟" عفیفہ نے تمام لوگوں کو دیکھتے ہوئے بھانجے سے پوچھا۔

"میں باہر بال سے کھیل رہا تھا۔ گوری آنٹی، ہمارے گھر کام کرنے آئیں۔ وہ اپنی چادر میں ایک تھیلی چھپا کر لائیں اور اسے گملے کے پیچھے چھپادیا پھر صفائی کرنے اندر چلی گئیں۔ انہیں پتا نہیں تھا کہ میں نے یہ سب دیکھ لیا ہے۔ ان کے کمرے میں جانے کے بعد میں نے جاکر چپکے سے تھیلی میں جھانک کر دیکھا تو اس میں کالے، کالے بال تھے۔ میں ڈر کر وہاں سے ہٹ گیا اور چپکے سے جاکر آنی کو یہ بات بتادی۔" سنی نے بڑے فخر سے اپنا کارنامہ بتایا۔ گوری کا چہرہ مزید کالا پڑ گیا۔

"میں نے کافی دنوں سے گوری پر نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ وہ آنٹی کو کافی دنوں سے بے وقوف بنارہی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ کراماتی بابا سے دعا کرانے کے بہانے اس نے کافی پیسے بھی بٹور لیے ہوں گے۔" عفیفہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"تمہیں سب پتا تھا تو پہلے ہی بھانڈا کیوں نہ پھوڑا۔ بلاوجہ میری آپا کب سے پریشان ہیں۔" زلیخا نے ناگواری سے کہا۔

"ایک تو آنٹی نے مجھے سبز قدم مشہور کر رکھا تھا۔ دوسرے میرے پاس ان باتوں کا کوئی ثبوت نہ تھا۔ میں گوری کو رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتی تھی۔ یہ موقع مجھے آج مل گیا۔ گوری، آنٹی کا واش روم صاف کرنے اس وقت گئی جب وہ نماز میں مشغول تھیں۔ اس نے چپکے سے وہاں بال پھیلائے اور دوسرے کاموں میں لگ گئی۔ آنٹی جب واش روم گئیں تو وہاں بکھرے بال دیکھ کر گھبرا گئیں، خوب شور مچا کر سب کو جمع کرلیا، مجھے پتا تھا، گوری شام میں پڑوس میں کام کرنے آتی ہے بس وہیں سے جاکر اسے پکڑ لائی۔" عفیفہ کے تفصیلی بیان پر صاعقہ کے ہوش ٹھکانے آگئے۔ عفیفہ نے فاتحانہ نگاہوں سے چور بنی صاعقہ کو دیکھا اور بہن کو کچھ اشارہ کیا۔

"میں ایک بات اور کہنا چاہوں گی۔ گوری نے جو سوئی کرسی کے کشن سے نکال کر اماں کو دکھائی، وہ میری بے پروائی کی وجہ سے ہوا۔ میں نے پنکی کی فراک پر بٹن لگاتے ہوئے بے دھیانی میں سوئی وہیں لگی چھوڑ دی۔ کیونکہ گوری کے سامنے گھر کی ساری باتیں ہوتی رہتی ہیں، اسی لیے اس نے رائی کا پربت بنا ڈالا۔ اماں کو کراماتی بابا کے چکر میں ڈال کر ان سے پیسے بھی اینٹھے اور ہمارے گھر میں فساد الگ برپا کیا۔" حجاب نے ساس کو گھورتے ہوئے سچائی بیان کی تو سب سوچ میں پڑ گئے۔

"ان سب باتوں کی وجہ یہی ہے کہ اپنے گھر کے معاملات میں باہر والوں کو انوالو کیا گیا۔ صاعقہ بیگم جب ہمارا ذہن شک کے شکنجے میں کسا ہوا ہو تو پھر منفی سوچ ہی ذہن میں آتی ہے مثبت باتوں کی رسائی وہاں تک نہیں ہوپاتی۔ اب آپ کو اس شیطانی شکنجے سے اپنے آپ کو آزاد کرانا ضروری ہے۔ ورنہ گھر کا ماحول اس سے بھی ابتر ہوجائے گا۔" شریف الدین نے کڑک دار لہجے میں بیوی کو

سنایا۔ وہ سر جھکا کر بیٹھ گئیں۔

سب نے سکون کی سانس لی۔ چہروں پر سکون چھا گیا۔ حجاب دوبارہ چائے بنانے کے لیے کچن کی جانب چل دی۔

''ایک منٹ حجاب! تم دونوں بہنیں کہاں جاتی ہو۔ یہ بات بھی بتادو۔'' فیصل کے انداز پر سب چونکے، وہ تمام باتوں سے واقف تھا سو اس موقع کا فائدہ اٹھا کر بیوی کی پوزیشن کلیئر کرنا ضروری سمجھا۔

''ہا، ہا...... گھر کے کشیدہ ماحول سے گھبرا کر اور میری محبت میں۔ عفیفہ نے یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا۔ میں اس بات پر راضی نہیں تھی مگر عفیفہ اپنی بات پر اڑ گئی۔ مجھے اس لیے مجبوراً یونی ورسٹی میں عفو کے داخلے اور ہاسٹل میں رہائش کے انتظامات کے سلسلے میں کئی بار گھر سے باہر جانا پڑا۔'' حجاب نے دھیرے سے بتایا تو عماد کے دل پر ایک گھونسا پڑا۔ اس نے عفیفہ کو بغور دیکھا، وہ پہلے سے کافی کمزور اور زرد دکھائی دے رہی تھی۔

''دلہن...... اگر تم ہمیں یہ بات بتا کر جاتیں تو کوئی حرج تھا۔'' صاعقہ نے منہ بگاڑا۔

''اماں! فیصل کو اس بارے میں سب کچھ بتادیا تھا۔ آپ کو اس لیے نہیں بتایا کہ عفو کا نام سنتے ہی آپ کی طبیعت خراب ہونے لگتی تھی۔ اپنے گھر کا ماحول صحیح رکھنے کے لیے میں نے بہن کو یہاں سے بھیجنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔'' حجاب نے روتے ہوئے ساری گرہیں کھول دیں۔ عماد کی آنکھیں عفیفہ کی نم آنکھوں سے ٹکرا کر جھک گئیں۔

زلیخا کے ساتھ، ساتھ صاعقہ کو بھی شرمندگی نے آگھیرا۔ وہ اپنی بے جا بدگمانی اور وہم کے زیرِ اثر آکر گوری جیسی مطلب پرست عورت کی جھوٹی باتوں کے جال میں پھنس گئیں اور ایک یتیم لڑکی پر زمین تنگ کر کے رکھ دی۔

''لاڈلی عفو...... یہاں سے اب کہیں نہیں جائے گی۔'' زلیخا نے ایک دم کھڑے ہو کر کہا اور سب کو چونکا دیا۔ وہ بہت دیر تک سب کی سوالیہ نگاہوں کا سامنا نہیں کرسکیں اور مسکرا کر اسے گلے لگانے بڑھیں۔

''آپا...... آپ کچھ بھی سوچیں مگر آج سے ٹھیک ایک مہینے بعد عفو میری لاڈلی بہو بن کر میرے گھر جائے گی۔'' زلیخا کے منہ سے نکلنے والے الفاظ نے وہاں موجود کئی افراد پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری کردی خاص طور پر عماد کا دل خوشی سے ناچ اٹھا۔ اس نے ماں سے لگی کھڑی عفیفہ کو دیکھتے ہوئے ایک آنکھ بند کرلی۔ وہ شرما گئی۔

''چھوٹی، کیا کہہ رہی ہو؟'' صاعقہ نے سر پر بندھی پٹی نوچ، ناچ کر ایک دم ہراساں ہو کر بہن کو دیکھا۔

''فیصل بیٹا! اب ہم تمہارے گھر عماد کی بارات لے کر آئیں گے۔ امید ہے کہ کسی کو اس بات پر اعتراض نہیں ہوگا۔'' غزنوی احمد نے بیوی کے فیصلے کی تائید کرتے ہوئے سالی کی کیفیت سے حظ اٹھایا۔

''خالہ۔ ایسے اچانک مگر ابھی تو کوئی تیاری ہی نہیں ہے۔'' حجاب حیران ہو کر کہنے لگی۔ اس کے مضطرب دل پر اطمینان کے چھینٹے پڑ گئے تھے۔

''میری بچی نے بہت تکلیف اٹھالی۔ اس معاملے میں کہیں نہ کہیں ہماری بھی کوتاہی ہے۔ اب مزید دیر نہیں ہونی چاہیے۔ ہمیں بس عفیفہ کی ضرورت ہے۔ باقی باتوں کو رہنے دو۔'' زلیخا نے بہن کو نظر انداز کر کے بھانجے اور اس کی بیوی کو اپنا فیصلہ سنایا۔

فیصل نے حجاب کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ بیوی کے اثبات میں سر ہلانے پر فیصل نے ہامی بھرلی۔

رابیل نے دوڑ کر عفیفہ کے سر کو دوپٹے سے ڈھانپا۔ وہ اسٹل پوزیشن میں زندگی کے اس خوب صورت موڑ پر آنکھیں پٹ پٹا کر سب کو دیکھ رہی تھی اور...... عماد اپنی محبت کی سرخروئی پر مسکرا رہا تھا۔



شمع ہدایت

اختر شجاعت

شہادت...... مقصودِ الٰہی

شہید کے لغوی معنی ہیں "اللہ کی راہ میں قربان ہونے والا......" ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ "جو اطاعت کرتے ہیں اللہ اور رسول اللہ کی تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا۔ یعنی انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین اور یہ بہترین رفیق ہیں۔" (سورۂ نساء) اس آیت مبارکہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبوت ،صدیقیت، شہادت اور صالحیت اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں، دوسرے یہ کہ اللہ اور رسول کے فرمانبرداروں کو ان کی رفاقت نصیب ہوگی......تو شہادت ایک بہت بڑا انعام ہے۔

شہادت دو قسم کی ہوتی ہے۔

1......شہادتِ جہری اور

2......شہادتِ سری

1......شہادتِ جہری یہ ہے کہ ایک مسلمان اللہ کی راہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے دشمنوں سے لڑتا ہوا اور طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کرتا ہوا اعلانیہ جان دے دے یا مظلومانہ طور پر قتل ہو جائے۔

2......شہادتِ سری یہ ہے کہ کسی کے زہر دینے سے یا طاعون کی وبا سے یا اچانک کسی حادثے کا شکار ہو جائے مثلاً کوئی عمارت گر جائے اور یہ نیچے آ کر دب جائے یا کہیں آگ لگ جائے اور یہ جل جائے یا تیرتا ہوا یا نہاتا ہوا سیلاب کی وجہ سے ڈوب جائے یا طلبِ علمِ دین یا سفرِ حج یا پیٹ کے اور دق کے مرض میں انتقال کر جائے یا عورت حالتِ نفاس میں مر جائے۔

یہ شہدا کی قسمیں ہیں جو دنیا کے اعتبار سے بھی اور آخرت کے اعتبار سے بھی شہید ہیں۔

شہید کے خون کا قطرہ زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ اس کی بخشش فرما دیتا ہے۔ قبر میں اس سے حساب کتاب نہیں ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام انبیا کے سردار ہیں اس کے باوجود آپؐ ارشاد فرماتے ہیں کہ "میرا جی چاہتا ہے کہ میں اللہ کے راستے میں قتل ہو جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل ہو جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل ہو جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں...... یہ سلسلہ چلتا ہی رہے......" یہ اندازہ لگائیں کہ جس موت کی تمنا آپؐ فرما رہے ہیں وہ موت کتنی اشرف اور کتنی قیمتی ہوگی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے......" اور جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جاتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں مگر اس زندگی کا تم شعور نہیں رکھتے۔" (سورۂ بقرہ) اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا......" بلکہ وہ زندہ ہیں اور ان کے رب کے پاس سے ان کو رزق دیا جاتا ہے۔"

حدیث مبارکہ ہے......" اللہ تعالیٰ کے عرشِ اعظم کے ساتھ قندیلیں لگی ہوئی ہیں اور وہ شہدا کا مستقر ہیں۔ وہ شہدا کے رہنے کی جگہ ہے اور سبز پرندوں کی شکل میں اللہ تعالیٰ ان کو سواریاں عطا فرماتا ہے اور ان کی روحیں ان سبز پرندوں میں جنت کے اندر پرواز کرتی ہیں اور جہاں چاہتی ہیں کھاتی پیتی ہیں۔" یہ تو قیامت سے پہلے کا معاملہ ہے، قیامت کے دن ان کے ساتھ جو معاملہ کیا جائے گا وہ تو سبحان اللہ کیا بات ہے......

☆☆☆

محرم کا مہینہ اسلام کی آمد سے قبل بھی حرمت کا مہینہ جانا جاتا تھا اسی طرح یومِ عاشور یعنی دس محرم کے دن کو بھی بہت حرمت والا دن گنا جاتا تھا۔

یہ زمین و آسمان یومِ عاشور کو تخلیق کیے

گئے...... حضرت آدمؑ کو یوم عاشور ہی کو جنت میں داخل کیا گیا...... حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش یوم عاشور کی ہے۔

رسول اللہؐ کے پردہ فرمانے کے بعد واقعۂ کربلا رونما ہوا...... اور مسلمانوں کے لیے اس دن کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی۔ اس دن حضرت امام حسینؓ نے بندگی، اطاعت اور صبر کی انتہائی حدوں کو چھولیا اور ثابت کر دیا کہ کس طرح سے انسان ہوتے ہوئے بھی انسان فرشتوں سے آگے نکل جاتا ہے۔

حضرت امام حسینؓ کا واقعۂ شہادت نہ صرف اسلامی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے بلکہ پوری دنیا کی تاریخ میں بھی اسے ایک خاص امتیاز حاصل ہے...... جگر گوشۂ رسول حضرت امام حسینؓ کی دردناک مظلومانہ شہادت پر تو زمین و آسمان روئے، جنات روئے، جنگل کے جانور متاثر ہوئے۔ انسان اور پھر مسلمان...... تو ایسا کون ہے جو اس درد کو محسوس نہ کرے؟

حضرت امام حسینؓ شہزادۂ سادات، پیکر اخلاق، نشانِ ہدایت، نواسۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت بی بی سیدہ فاطمہ الزہرہؓ کے فرزند...... آپ سید الشہدا کے لقب سے یاد کیے گئے۔

حضرت امام حسینؓ کی عظمت بحیثیت نواسۂ رسولؐ کسی بیان کی محتاج نہیں امام کس حد تک آپؐ کے لاڈلے تھے کس طرح سے آپؐ نے اپنے نواسوں کو سینے سے لگا کر پالا اور کیسی تربیت کی یہ سب پر واضح ہے۔

جب نبی کریمؐ کا وصال ہوا تو اس وقت امامؓ کی عمر صرف چھ سات سال تھی۔ لیکن یہ تمام سال نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت، شفقت و محبت میں گزرے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر انہیں گود میں لیتے کبھی کندھے پر سوار کرتے اور ان کا بوسہ لیتے انہیں سونگھتے اور فرماتے "تم اللہ کی عطا کردہ خوشبو ہو۔" آپؐ کی محبت و شفقت کا یہ عالم تھا کہ دونوں بھائی بچپن میں حالت نماز میں آپؐ کی کمر مبارک پر چڑھ جاتے...... وہ کمر پر چڑھے رہتے آپؐ سجدے سے سر نہ اٹھاتے۔

اس میں کیا شک ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ دونوں نواسے اللہ کے بھی محبوب اور اللہ کے رسول کے بھی محبوب اور ان دونوں سے محبت رکھنے والے بھی اللہ اور اس کے رسول کے محبوب ہیں۔

ایک بار ایسا ہوا کہ حضور اقدسؐ خطبہ دے رہے تھے کہ دونوں نواسے آگئے۔ آپؐ نے خطبہ روک کر آگے بڑھ کر ان کو اٹھا لیا اور اپنے پاس بٹھا لیا اور پھر باقی خطبہ پورا کیا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا......

"حسینؓ میرے ہیں اور میں حسین کا...... جو حسین سے محبت کرے اللہ اس سے محبت کرے۔"

"حسین منی وانا من الحسین......" کے کلمات انتہائی محبت، اپنائیت اور قلبی تعلق کے اظہار کے لیے ہیں۔

دونوں بھائی بہت عبادت گزار تھے۔ دونوں نے بار، بار مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ تک پیدل سفر کر کے حج کیے۔ اللہ کے راستے میں کثرت سے مال خرچ کرتے تھے۔ جود و سخاوت ماں، باپ اور نانا جان سے وراثت میں ملی تھی۔

☆☆☆

حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ "حسنؓ و حسینؓ میرے جنت کے دو پھول ہیں۔"

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک روز حضور اکرمؐ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت امام حسینؓ کو آپؐ نے اپنی پشت مبارک پر سوار کر رکھا ہے ڈوری کا ایک حصہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے اور دوسرا حصہ حضرت امام حسینؓ کے ہاتھ میں ہے۔ حضرت امام حسینؓ آپ کو چلاتے ہیں اور حضور اکرمؐ زانو اور دست ہائے مبارک کے ذریعے چلتے رہے...... میں نے جب یہ حال دیکھا تو کہا...... "اے ابو عبداللہ کتنی اچھی سواری ہے آپ کی۔" حضور اکرمؐ نے حضرت عمر فاروقؓ سے فرمایا۔

"اے عمر! یہ سوار بھی تو کتنا عمدہ ہے۔"

حضرت امام حسینؓ نہایت عبادت گزار...... نماز، روزہ اور حج کا بہت اہتمام فرماتے تھے۔ آپؓ نے بیس یا پچیس حج پا پیادہ کیے۔ (کہیں بیس حج اور کہیں پچیس حج کی روایات ہیں) حضرت امام حسینؓ ایک مرتبہ ایک گھوڑے پر سوار گزر رہے تھے غربا کی ایک جماعت نظر آئی جو زمین پر بیٹھی روٹی کے ٹکڑے کھا رہی تھی۔ آپؓ نے ان کو سلام کیا ان

لوگوں نے کہا...... اے فرزند رسولؐ ہمارے ساتھ کھانا تناول فرمایئے...... آپ گھوڑے سے اتر کران کے ساتھ بیٹھ گئے اور کھانے میں شریک ہوئے آپؓ نے اس موقع پر سورہ نحل کی آیت پڑھی۔ یعنی اللہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا...... آپؓ جب ان لوگوں کی روٹی کے ٹکڑوں پر شرکت فرما چکے اور فارغ ہوئے تو آپؑ نے فرمایا۔ "بھائیو! آپ نے مجھے دعوت دی میں نے قبول کیا۔ اب آپ سب میری دعوت قبول کیجیے......" ان لوگوں نے بھی آپؓ کی دعوت قبول کی اور آپؓ کے درِ خانہ پر آئے۔

☆☆☆

عمران بن سلیمان سے روایت ہے کہ حسنؓ و حسینؓ اہلِ جنت کے ناموں میں سے دو نام ہیں جو کہ دورِ جاہلیت میں پہلے کبھی نہیں رکھے گئے تھے۔

حضرت علیؓ روایت کرتے ہیں کہ حسنین کریمین شبیہ رسول تھے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرمؐ نے ارشاد فرمایا...... "حسنؓ و حسینؓ جنتی جوانوں کے سردار ہیں......"

حضرت امام حسینؓ کا نسب اتنا اعلیٰ اور بے مثل ہے کہ دنیا میں کسی کو یہ شانِ رفعت حاصل نہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اکرم کو حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کے متعلق فرماتے ہوئے سنا ہے "جو مجھ سے محبت کرتا ہے اس پر ان دونوں سے محبت کرنا واجب ہے۔"

☆☆☆

حضرت امام حسینؓ کا وہ عظیم کارنامہ جس نے اقوامِ عالم میں ان کا سر فخر سے بلند کردیا اور وہ اپنے لقب سید الشہدا پر مہرِ حقیقت ثبت کرتے ہوئے آفاقی شہرت حاصل کر گئے۔ تاریخ میں یہ واقعۂ کربلا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

شریعتِ مطہرہ میں مشکل وقت پر دو راستے بتائے جاتے ہیں دونوں راستے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تجویز کردہ ہیں ایک کو راہِ رخصت کہا جاتا ہے اور دوسرے کو راہِ عزیمت...... اگر حالات سازگار ہوں اور جبر و ظلم اور کفر کی طاقتوں کا آسانی سے صفایا کیا جاسکتا ہو تو ان حالات میں ہر چھوٹے بڑے کلمہ گو پر اس ظلم کے خلاف میدانِ کارزار میں نکل آنا فرض اور واجب ہو جاتا ہے...... لیکن جب حالات ناسازگار ہوں اسلحہ، عسکری قوت ساتھ نہ ہو، باطل زیادہ مضبوط، زیادہ منظم و قوی تر ہو تو ایسے حالات میں شریعت نے امتِ مسلمہ کو دو راستے عطا کیے ہیں ایک یہ کہ وہ رخصت پر عمل کرے گوشہ نشین ہو جائے چپکے سے لعنت و ملامت کرے اور دل سے برا جانے، ہر دور میں اکثریت رخصت پر عمل کرتی رہی ہے۔ اب اگر سب کے سب لوگ ایسے حالات میں رخصت پر ہی عمل کرنا شروع کردیں تو پھر ظلم اور کفر کی طاغوتی طاقتوں کو روکنا ناممکن ہو جائے گا...... اس لیے شریعت میں باوجود رخصت کی موجودگی کے کچھ لوگ راہِ عزیمت پر بھی چل نکلتے ہیں وہ حالات کی سازگاری اور ناسازی کو نہیں دیکھتے، فوج اور لشکر کی بھاری اکثریت پر نظر نہیں ڈالتے بلکہ ان کی توجہ صرف اور صرف اس امر پر مرکوز ہوتی ہے کہ وہ اپنے تن من کو دینِ خداوندی کی سربلندی کے لیے کیسے قربان کریں؟ لہٰذا وہ راہِ عزیمت پر چلتے ہیں اور اس راہ پر چلنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

اور امام حسینؓ نے اسی مشکل راہ کو اپنایا اگر آپ بھی میدانِ کارزار میں علمِ حق بلند کرنے کے لیے نہ نکلتے اور یہ 72 تن بھی اپنے خون کا نذرانہ نہ پیش کرتے تو آج اسلام کی جو متاع، جمہوری قدروں، آزادیٔ اظہار، جاہ و حشمت اور نفاذِ شریعت کی مسلسل جدوجہد کی صورت میں نظر آرہی ہے۔ اس کا کہیں بھی وجود نہ ہوتا......

اسلام کی پوری تاریخ خانوادۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس عظیم قربانی کی مرہونِ منت ہے۔ جس نے راہِ رخصت چھوڑ کر راہ عزیمت کو اپنایا اور اپنا سب کچھ قربان کردیا...... اور زمانے کی تاریکیوں کو اجالے میں بدل دیا۔ جس نے چودہ سو سال سے انسانیت کی راہیں روشن کر رکھی ہیں۔

حضرت امام حسینؓ کی شہادت کی یہ منفرد خوبی ہے کہ حضورِ اقدسؐ نے اس شہادت کے بارے میں بہت پہلے ہی بتادیا تھا اور پتا تھا کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے۔

حضرت اُمِ سلمیٰؓ فرماتی ہیں کہ ایک دن نبی کریمؐ

استراحت فرما رہے تھے کہ اچانک بیدار ہوگئے اور آپ پریشان وملول تھے اور آپ کے ہاتھ میں سرخ مٹی تھی۔ میں نے دریافت کیا...... ''یا رسول اللہ ﷺ یہ مٹی کیا ہے؟'' فرمایا۔ ''مجھے جبرائیلؑ نے خبر دی ہے کہ میرا حسینؓ عراق کی سرزمین پر قتل کر دیا جائے گا اور یہ وہاں کی مٹی ہے......'' نبی کریم ﷺ روئے اور فرمایا۔ ''اے ام سلمیٰ جب یہ مٹی خون ہوجائے تو جان لینا کہ میرا یہ بیٹا قتل ہوگیا۔'' ام سلمیٰؓ نے اس مٹی کو ایک شیشی میں رکھ دیا تھا اور وہ ہر روز اس مٹی کو دیکھتیں اور فرماتیں جس دن یہ مٹی خون ہوجائے گی وہ دن عظیم دن ہوگا۔

حضرت یحییٰ حضرمیؓ فرماتے ہیں ''میں سفر صفین میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ، ساتھ تھا جب آپؓ نینوا کے برابر پہنچے تو آپؓ نے فرمایا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے جبرائیلؑ نے بتایا ہے کہ حسینؓ فرات کے کنارے قتل ہوگا اور مجھے وہاں کی مٹھی بھر مٹی دکھائی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ہمیں اور اکثر اہل بیت کو اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں تھا کہ حسینؓ زمینِ کربلا میں شہید ہوں گے۔

ان روایات سے ثابت ہوا کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا اظہار و اعلان فرمادیا تھا اور بہت سے صحابہ و اہل بیت کو معلوم تھا کہ حضرت امام حسینؓ شہید ہوں گے اور ان کی شہادت گاہ کربلا ہے۔

اور یہ کہیں روایات میں نہیں ملا کہ کسی نے دعا کی ہو کہ الٰہی کربلا میں ہونے والا واقعہ اور آنے والے مصائب نہ آئیں۔

حضور اکرم ﷺ حضرت علیؓ، حضرت بی بی فاطمہؓ اور حضرت امام حسنؓ اور خود حضرت امام حسینؓ ہی دعا فرمادیتے...... کیونکہ کاملین کی دعائیں تقدیرِ مبرم کو بھی بدل دیتی ہیں تو کسی نے دعا کیوں نہیں فرمائی؟ اس لیے کہ وہ راضی برضا تھے۔

☆☆☆

جب کوئی چیز یقینی ہونے والی ہوتی ہے تو اس کے اسباب بھی پیدا ہوجاتے ہیں۔ رجب 60 ہجری میں حضرت امیر معاویہؓ کا انتقال ہوا اور یزید ان کا جانشین ہوا۔ تختِ حکومت پر بیٹھنے کے بعد اس کے لیے سب سے اہم مسئلہ حضرت امام حسینؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی بیعت کا تھا...... کیونکہ ان حضرات نے یزید کی ولی عہدی کو تسلیم نہیں کیا تھا اور یزید کو یہ خوف تھا کہ ان حضرات میں سے کوئی خلافت کا دعویٰ نہ کردے اور ایسا نہ ہو کہ سارا حجاز میرے خلاف اٹھ کھڑا ہو۔ اور حضرت امام حسینؓ کے دعویٰ خلافت کی صورت میں عراق میں بغاوت کا سخت اندیشہ تھا، ان وجوہ کی بنا پر یزید کے پیشِ نظر سب سے بڑا مسئلہ اپنی حکومت کی بقا اور تحفظ کا تھا اس لیے اس نے ان حضرات سے بیعت لینا ضروری سمجھا۔ چنانچہ اس نے ولید بن عقبہ گورنر مدینہ کو امیر معاویہؓ کی وفات کی خبر اور ساتھ ہی ان حضرات سے بیعت لینے کے لیے سخت تاکیدی احکام بھیجے۔

اور بیعت طلب کرنے کے جواب میں آپ نے صاف اور واضح لفظوں میں ولید بن عقبہ سے فرمایا کہ ''میرے جیسا شخص چھپ کر بیعت نہیں کرسکتا۔ اگر آپ باہر نکل کر عام لوگوں کو ان کے ساتھ ہمیں بھی بیعت کی دعوت دیں تو یہ ایک بات ہوگی۔''

☆☆☆

یزید کی بیعت آپؓ کو قلبی طور پر سخت ناپسند تھی کیونکہ وہ نااہل تھا اور اس کا تقرر بھی خلفائے راشدین کے اسلامی طریقہ انتخاب کے بالکل خلاف اور غیر شرعی طور پر ہوا تھا۔ بلکہ آپؓ کے نزدیک یہ قیصرو کسریٰ کے طرز کی پہلی شخصی حکومت تھی۔ اس لیے احتجاجاً آپؓ اس کے خلاف تھے۔ پھر حالات کچھ ایسے ہوتے گئے کہ آپ کا مدینے میں رہنا مشکل ہوگیا۔ آپؓ نے والدۂ گرامی کے مدفن اور پھر روضۂ رسول میں حاضری دی اور امام عالی مقام اپنے اہل وعیال کو ساتھ لے کر مدینہ سے مکہ مکرمہ ہجرت کرگئے۔

☆☆☆

آپؓ کے مکہ مکرمہ پہنچنے کی خبر سن کر لوگ جوق در جوق آپؓ کے پاس آنے لگے اور زیارت کا شرف حاصل کرنے لگے اہلِ مکہ کو آپؓ کے آنے کی بہت خوشی تھی۔ پھر جب اہلِ کوفہ کو حضرت امیر معاویہؓ کی وفات کی خبر ملی اور یہ کہ حضرت

حسینؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ وغیرہ نے بیعتِ یزید سے انکار کر دیا تو اہلِ کوفہ نے امام کو خطوط لکھے کہ ہم بھی یزید کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے لیے تیار نہیں آپؓ کوفہ آجائیں ہم سب آپؓ کے ہاتھ پر بیعت کریں گے...... آپ نے کوفہ کے حالات معلوم کرنے کے لیے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیلؓ کو وہاں بھیجا اور انہوں نے وہاں جا کر اور تمام صورتِ حال کا جائزہ لے کر امام عالی مقام کو کوفہ آنے کا عندیہ بھی دے ڈالا مگر اس دوران حالات نے پلٹا کھایا اور عبیداللہ بن زیاد جو کوفے کا گورنر بن کر آیا تھا نے کوفے کے لوگوں کے متعلق جان کر کہ وہ امام حسینؓ کے ساتھ ہیں ان پر شدید مظالم ڈھائے۔ اور جناب مسلم بن عقیلؓ اور ان کے حامیوں کو بے دردی سے شہید کر دیا اور جو بچے وہ خوف سے خاموشی اختیار کر کے گھروں میں بیٹھ گئے۔

اُدھر امام عالی مقام نے حضرت مسلم بن عقیل کے خط کے بعد کوفہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ اور ادھر کوفہ میں جو انقلاب برپا ہو چکا تھا اس کی امام کو کوئی خبر نہیں تھی۔ جب اہلِ مکہ کو آپ کی تیاری کا علم ہوا تو انہوں نے آپ کو بے حد روکا کہ وہ اہلِ کوفہ کی بے وفائیوں کو خوب جانتے تھے۔ ان تمام لوگوں کا آپؓ نے شکریہ ادا کیا اور ان کو دعا دی اور 60ھ کو اہل بیت کا قافلہ مکہ مکرمہ سے روانہ ہوا...... مقامِ صفاح پر آپ کی ملاقات عرب کے مشہور شاعر فرزدق سے ہوئی آپؓ نے اس سے عراق کے حالات پوچھے...... اس نے کہا آپؓ نے ایک باخبر شخص سے حال پوچھا ہے حضرت ان لوگوں کے دل تو آپؓ کے ساتھ ہیں لیکن تلواریں بنی امیہ کے ساتھ ہیں۔ تاہم قضائے الٰہی آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ آپؓ نے فرمایا...... تم نے سچ کہا...... اور اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور ہمارے رب کی ہر روز ایک نئی شان ہوتی ہے۔ اگر آسمانی فیصلہ ہماری پسند کے موافق ہوا تو ہم اس کی نعمتوں پر اس کے شکر گزار ہوں گے اور اس ادائے شکر میں بھی وہی معین و مددگار ہے اور اگر فیصلہ امید کے خلاف ہوا تو جس شخص کا مقصود حق ہو اور تقویٰ اس کا بھید اور راز ہو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ فیصلہ موافق ہوا یا مخالف......

آپ کے چچازاد بھائی عبداللہ بن جعفرؓ نے مدینہ منورہ سے آپ کو خط بھیجا کہ...... ”میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتا ہوں آپ اپنے ارادے سے باز آجائیں کیونکہ اس میں آپ کے لیے ہلاکت اور آپ کے اہلِ بیت کے لیے بربادی ہے اگر آپ قتل ہو جائیں گے تو زمین کا نور بجھ جائے گا اس وقت ایک آپ ہی ہدایت کا نشان اور اہلِ ایمان کی امیدوں کا مرکز ہیں۔“

بہر حال کافی کوشش کی گئی کہ حضرت امام حسینؓ واپس لوٹ جائیں اس وقت آپؓ نے اپنے عزم کی ایک اور وجہ بیان کی...... کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا ہے اور مجھے آپؐ کی طرف سے حکم دیا گیا ہے اور میں اس کی بجا آوری کے لیے جا رہا ہوں۔ خواہ مجھ پر کچھ گزر جائے...... آپؓ سے خواب کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپؓ نے فرمایا آج تک وہ خواب میں نے کسی سے بیان نہیں کیا ہے اور نہ کروں گا یہاں تک کہ میں اپنے پروردگار سے جا ملوں۔

ابن زیاد جو بہت سخت حاکم تھا اسے آپؓ کے آنے کی اطلاع ملی تو اس نے اپنے پولیس کے افسر کو آگے بھیجا کہ مقابلے کی تیاری کرے۔

سفر کے دوران ایک ہزار فوج کے ساتھ حُر بن یزید نے آپ کے مقابل آ کر پڑاؤ ڈالا۔ امام حسینؓ ہر وقت نماز خطبہ دیتے اور اپنے قیام کا مقصد بتاتے کہ مجھے اہل کوفہ نے لاتعداد خطوط بھیج کر بلایا ہے۔

اس وقت حر جو آپ کے ساتھ، ساتھ ہی چل رہا تھا نے کہا...... ہمیں ان خطوط اور وفود کی کچھ خبر نہیں کہ وہ کیا ہیں اور کس نے لکھے ہیں...... حضرت امام عالی مقام نے دو تھیلے خطوط سے بھرے ہوئے نکالے اور ان لوگوں کے سامنے الٹ دیے...... حر نے کہا بہر حال ہم یہ خط لکھنے والے نہیں اور ہمیں امیر کی طرف سے حکم ملا ہے کہ ہم آپؓ کو اس وقت تک نہ چھوڑیں جب تک ابن زیاد کے پاس کوفہ نہ پہنچا دیں۔ امام نے فرمایا...... اس سے تو موت بہتر ہے۔ تب حر نے کہا مجھے آپ کے قتال کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ حکم یہ ہے کہ میں آپؓ سے اس وقت تک جدا نہ ہوں جب تک آپ کو کوفہ نہ پہنچا دوں اس لیے آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ کوئی ایسا راستہ اختیار کریں جو نہ کوفہ پہنچائے اور نہ مدینہ......

حضرت امام حسینؓ نے غریب اور قادسیہ کے راستے

سے بائیں جانب چلنا شروع کر دیا...... اور حر اپنے لشکر کے ساتھ چلتا رہا۔ سفر کے دوران ایک اور خطبے میں آپؑ نے ارشاد فرمایا۔ ''جو شخص کسی ایسے بادشاہ کو دیکھے جو اللہ کے حرام کو حلال سمجھے اور اللہ کے عہد کو توڑے، سنتِ رسولؐ اللہ کی مخالفت کرے، اللہ کے بندوں کے ساتھ گناہ اور ظلم کا معاملہ کرے اور یہ شخص اس کے ایسے افعال و اعمال کو دیکھنے کے باوجود کسی قول و فعل سے اس کی مخالفت نہ کرے تو اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے کہ اسے بھی ظالم بادشاہ کے ساتھ اس کے مقام (یعنی دوزخ) میں پہنچادے۔''

حُر بن یزید کچھ تو پہلے سے اہلِ بیت کا احترام کرتا تھا کچھ خطبوں سے متاثر ہو رہا تھا یہ کلام سن کر لشکر سے علیحدہ ہو گیا مگر ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

جب آپؑ مقامِ نینوا پہ پہنچے تو وہاں ایک گھڑ سوار حر سے آکر ملا اور ابن زیاد کا خط پہنچایا۔ جس میں تحریر تھا کہ ''جس وقت تمہیں میرا یہ خط ملے تو حسینؓ پر میدان تنگ کر دو۔ اور ان کو کھلے میدان کے سوا کسی پناہ کی جگہ میں نہ اترنے دو...... اور ایسے میدان کی طرف سے جاؤ جہاں پانی نہ ہو اور اس نے اپنے قاصد کو حکم دیا ہے کہ جب تک میرے اس حکم کی تعمیل نہ کر دو گے یہ تمہارے ساتھ رہے گا۔''

یہ خط پڑھ کر حر نے اس کا مضمون امام کو سنایا اور اپنی مجبوری ظاہر کی کہ اس وقت میرے سر پر جاسوس مسلط ہے۔ بالآخر یہ لوگ بستی عقر پہنچے جو فرات کے کنارے واقع ہے۔ دو محرم سے نو محرم تک ابن زیاد کے لشکر آتے رہے ادھر امام حسین کے اصحاب اور اقربا عبادت میں مشغول رہے۔ اب کسی اور راستے پر جانا ممکن نہیں تھا اسی دوران عمر بن سعد ایک بڑا لشکر لے کر پہنچا جب امام حسینؓ اور ان کے رفقا یزید کے قاصدوں کے مطالبوں کی نفی کرتے رہے تو آخر میں یہ حکم آیا کہ امام حسینؓ کے سامنے صرف ایک بات رکھو کہ یزید کے ہاتھ پہ بیعت کریں جب وہ ایسا کریں تو پھر ہم غور کریں گے کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے اور نہ ماننے پر ان پر اور ان کے رفقا پر پانی بالکل بند کر دو۔

عمر سعد نے پس و پیش کی تو ابن زیاد کا سخت حکم نامہ اس کے پاس پہنچا کہ میں نے تمہیں اس لیے نہیں بھیجا کہ تم جنگ سے بچو یا ان کو مہلت دو یا ان کی سفارش کرو...... اگر حسینؓ اور ان کے ساتھی میرے حکم پر صلح کرتا اور میرے پاس آنا چاہتے ہیں تو ان کو صحیح سالم یہاں پہنچادو...... ورنہ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ ان کو قتل کرو...... مثلہ کرو پھر قتل کے بعد ان کو گھوڑوں کی ٹاپوں میں روند ڈالو...... اگر تم نے اس حکم کی تعمیل کی تو تمہیں ایک فرمانبردار کی طرح انعام ملے گا اور اگر اس کی تعمیل نہیں کرتے ہمارے لشکر کو فوراً چھوڑ دو اور سب کچھ شمر کے سپرد کر دو......''

آخر امام عالی مقام کو یہ آخری پیغام پہنچایا گیا آپ نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا اور فرمایا۔ ''اس ذلت سے تو موت بہتر ہے۔'' یعنی یزید کی بیعت کسی صورت قبول نہیں۔

غرضیکہ 7 محرم سے لشکرِ حسینی پر پانی بند کر دیا گیا۔ نو تاریخ کی شب حضرت امام حسینؓ وصیت، نماز دعا اور استغفار میں مصروف رہے۔ اپنے اصحاب اور اہل بیت کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا...... ''میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ راحت میں بھی اور مصیبت میں بھی...... یا اللہ تو نے ہمیں شرافت، نبوت سے نوازا اور ہمیں کان، آنکھ اور دل دیے جن سے ہم نے تیری آیات سمجھیں اور ہمیں تو نے قرآن سکھایا اور دین کی سمجھ عطا فرمائی۔ ہمیں اپنے شکر گزار بندوں میں داخل فرمالے۔'' پھر فرمایا۔ ''میرے اہلِ بیت کو اللہ جزائے خیر عطا فرمائے میں سمجھتا ہوں کہ کل ہمارا آخری دن ہے، میں آپ کو خوشی سے اجازت دیتا ہوں کہ آپ کو جہاں پناہ ملے چلے جائیں کیونکہ دشمن میرا طلب گار ہے۔'' نو اور دس محرم کی درمیانی رات جب امام حسینؓ نے اپنے ساتھیوں سے خطاب کیا تو یہ خطاب آپ کے اخلاق کا انتہائی اعلیٰ نمونہ تھا...... آپ کے وہ تاریخی جملے ''تم میں سے جو واپس جانا چاہے جا سکتا ہے مجھے کوئی شکایت نہیں ہوگی...... میں چراغ بجھا دیتا ہوں تاکہ تم میں سے جانے والوں کو شرمندگی نہ ہو۔'' سامنے یقینی شہادت ہے اور کل کا سورج بہت سے ساتھیوں کے بچھڑ جانے کا پیغام لے کر آئے گا جبکہ اس وقت آپ کو زیادہ سے زیادہ ساتھیوں کی ضرورت تھی مگر آپؓ نے کسی پہ جبر نہیں کیا ہر موقع پر آپ کا اعلیٰ کردار و اخلاق سامنے رہا۔

بہر حال سب نے کہا...... ''ہم ایسا ہرگز نہیں کریں گے......'' ادھر حر جس کے دل میں اہلِ بیت کی محبت کا جذبہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



بیدار ہو چکا تھا اپنی سابقہ کارروائی پر نادم ہو کر حضرت امام عالی مقامؓ کے لشکر میں آملا...... نماز فجر کے بعد امام حسین نے ایک اور خطبہ دیا ابھی آپ کا کلام جاری تھا کہ صفِ دشمناں سے تیر آنے شروع ہوئے تب حضرت حر آگے بڑھے اور کہا...... اے اہلِ کوفہ تم ہلاک و برباد ہو جاؤ، کیا تم نے ان کو اس لیے بلایا تھا کہ وہ آجائیں تو تم ان کو قتل کردو...... تم نے ان کو قیدیوں کی شکل بنالیا ہے ان کو اجازت کیوں نہیں دیتے کہ یہ جہاں چاہیں چلے جائیں۔ دریائے فرات کا پانی بند کردیا ہے جسے یہودی، نصرانی، مجوسی سب پیتے ہیں۔ حسینؓ اور ان کے اہلِ بیت پیاس سے بے ہوش ہو رہے ہیں تم نے محمدؐ کے بعد ان کی اولاد کے بارے میں نہایت شرمناک سلوک کیا۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ تم کو پیاسا رکھے اگر توبہ نہ کرو اور اپنی اس حرکت سے باز نہ آجاؤ۔'' اب حر پر تیر پھینکے گئے پھر تیر اندازی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پھر شقی و بدبخت فوج نے چاروں طرف سے حضرت امام حسینؓ اور ان کے رفقا پر حملہ بول دیا...... آپ کے رفقا نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اس کے بعد آپ کے انصار، اعزا یہاں تک کہ امام کے ننھے فرزند علی اصغر بھی شہید ہو گئے۔ امام عالی مقام تن تنہا دشمنوں کے مقابلے پر تھے۔ آپ شدید پیاس اور زخموں کے باوجود ان کا دلیرانہ مقابلہ کرتے رہے تھے اور جس طرف آپ بڑھتے یہ بھاگتے نظر آتے۔ یہ ایک ایسا بے نظیر واقعہ ہے کہ جس شخص کی اولاد، احباب اور اہلِ بیت شہید کردیے گئے ہوں اور اس کے خود شدید زخم لگے ہوں وہ انتہائی ثابت قدمی سے مقابلہ کر رہا ہے کہ جس طرف کا رخ کرتا سب بکریوں کی طرح بھاگنے لگتے...... تب شمر نے اس صورتِ حال کو دیکھ کر سب کو یکبارگی حملہ کرنے کو کہا۔ اس پر بہت سے بدنصیب آگے بڑھے نیزوں اور تلواروں سے حملہ کیا اور یہ ابن رسول اللہؐ خیر خلق اللہ فی الارض ظالموں کا دلیرانہ مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) امام پاک کی عمر اس وقت 56 سال پانچ ماہ اور پانچ دن کی تھی۔ شمر نے خولی بن یزید سے کہا کہ ان کا سر کاٹ لو...... وہ آگے بڑھا مگر ہاتھ کانپ گئے بعض روایات میں ہے کہ شمر نے یا پھر بدبخت سنان ابن انس نے یہ کام انجام دیا۔ ابنِ زیاد کا حکم تھا کہ لاشوں کو گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندا جائے پھر چند سواروں کو یہ حکم دیا گیا اور بدبختوں نے یہ بھی کر ڈالا۔ بیبیوں کے خیمے جلائے گئے۔ امام حسینؓ کے اصحاب میں بہتر (72) حضرات شہید ہوئے۔

☆☆☆

خولی بن یزید اور حمید بن مسلم شہداء کے سروں کو لے کر کوفہ روانہ ہوئے اور ابن زیاد کے سامنے پیش کیے۔ ابن زیاد نے لوگوں کو جمع کر کے سب سروں کو سامنے رکھا اور ایک چھڑی سے حضرت امام حسینؓ کے دہن مبارک کو چھونے لگا...... زید بن ارقمؓ سے رہا نہیں گیا اور بول اٹھے کہ چھڑی ان متبرک ہونٹوں سے ہٹالے قسم ہے اس عظیم ذات کی میں نے رسول اللہؐ کو دیکھا ہے کہ ان ہونٹوں کو بوسہ دیتے تھے۔

ابن زیاد کی شقاوت نے اس پر بھی بس نہیں کیا بلکہ حکم دیا کہ امام عالی مقام اور دیگر سرہائے مبارک کو نیزوں پر رکھ کر کوفہ کے بازاروں اور گلیوں میں گھمایا جائے اور پھر ان سروں کو یزید کے پاس ملک شام بھیج دیا جائے۔ اور ساتھ ہی امامؓ کے خانوادے کی بیبیوں کو بھی قیدی بنا کر شام لے جایا گیا۔ یزید کو خبر کردی گئی کہ مکمل فتح حاصل ہو گئی ہے۔ سر مبارک جس وقت یزید کے سامنے رکھا گیا تو اس وقت یزید کے ہاتھ میں چھڑی تھی۔ یزید نے جیسے ہی چھڑی آپ کے دہن مبارک پر رکھی تو ابو برزہ اسلمیؓ وہاں موجود تھے آپؓ نے کہا اے یزید تو اپنی چھڑی حسینؓ کے دندانِ مبارک پر لگاتا ہے اور میں نے رسول اللہؐ کو ان ہونٹوں کو بوسہ دیتے ہوئے دیکھا ہے۔ اے یزید قیامت کے روز تو آئے گا تو تیری شفاعت ابن زیاد ہی کرے گا اور حسینؓ آئیں تو ان کے شفیع نبی کریمؐ ہوں گے۔'' یہ کہہ کر ابو برزہؓ مجلس سے باہر نکل گئے۔

حضرت امام حسینؓ کی شہادت کی خبریں جب مدینے میں پہنچیں تو مدینے میں کہرام مچ گیا تھا کہ در و دیوار رو رہے تھے۔ امام کی شہادت کے بعد دو تین مہینے تک یہی فضا کی کیفیت رہی جب آفتاب طلوع ہوتا اور دھوپ در و دیوار پر پڑتی تو سرخ ہوتی تھی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک رات آنحضرتؐ کو خواب میں دیکھا کہ دوپہر کا وقت ہے اور آپؐ پراگندہ بال پریشان حال ہیں آپؐ کے ہاتھ میں ایک شیشی ہے جس میں خون ہے، ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا اس

میں کیا ہے؟ فرمایا...... حسینؓ کا خون ہے جسے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کروں گا...... حضرت عباسؓ نے اسی وقت لوگوں کو خبر دے دی کہ حسینؓ شہید ہو گئے ہیں۔ اس خواب سے چند روز کے بعد جب امام کی شہادت کی خبر ملی اور حساب کیا گیا تو ٹھیک وہی دن اور وقت تھا۔ اس صادق جاں باز نے اپنے نانا کے ساتھ کیا ہوا عہد پورا کیا اور دین حق پر قائم رہ کر اپنے کنبہ اور اپنی جان راہ خدا میں ایسی ثابت قدمی کے ساتھ نذر کی کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔

کربلا میں آلِ رسولؐ پر وہ ظلم عظیم ہوا جس پر زمین و آسمان خون کے آنسو روئے...... اور کائنات پر تاریکی چھا گئی۔ علامہ ابن حجر عسقلانیؒ، امام بیہقیؒ، حافظ ابونعیمؒ، علامہ ابن کثیرؒ، علامہ ابن حجر مکیؒ، امام سیوطیؒ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ جیسے جلیل القدر محدثین نے اپنی، اپنی معتبر تصانیف میں واقعہ نقل فرمایا ہے۔ حضرت بصرہؒ فرماتی ہیں کہ جب حضرت امام حسینؓ شہید کیے گئے تو آسمان سے خون برسا۔ صبح کو ہمارے گھڑے مٹکے اور سارے برتن خون سے بھرے ہوئے تھے۔

حضرت زہریؒ فرماتے ہیں کہ جس دن حضرت امام حسینؓ شہید کیے گئے اس دن بیت المقدس میں جو پتھر اٹھایا جاتا تھا اس کے نیچے سے تازہ خون پایا جاتا تھا۔

امام ابن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ دنیا پر تین روز تک تاریکی چھائی رہی پھر آسمان پر سرخی ظاہر ہوئی۔

علامہ ابن جوزیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا آسمان کا سرخ کرنا اور خون کی بارش برسانا اس کے بہت زیادہ ناراض اور غضبناک ہونے کی علامت ہے۔

☆☆☆

امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ جو لوگ قتلِ حسینؓ میں شریک تھے ان میں سے ایک بھی نہیں بچا کہ جس کو آخرت سے پہلے دنیا میں سزا نہ ملی ہو، کوئی قتل کیا گیا کسی کا چہرہ سخت سیاہ ہو گیا یا مسخ ہو گیا۔ چند ہی روز میں ملک، سلطنت چھن گئے اور ظاہر ہے کہ یہ ان کے اعمال کی اصلی سزا نہیں بلکہ اس کا ایک نمونہ ہے جو لوگوں کی عبرت کے لیے دنیا میں دکھا دیا گیا ہے۔

جس شخص نے امام کے تیر مارا اور پانی نہیں پینے دیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے ایسی پیاس مسلط کی کہ کسی طرح اس کی پیاس بجھتی نہ تھی، پانی کتنا ہی پیا جاتا پیاس سے تڑپتا رہتا تھا یہاں تک کہ اس کا پیٹ پھٹا اور وہ مر گیا۔

شہادت کے بعد یزید کو ایک دن کا بھی چین نصیب نہیں ہوا۔ تمام اسلامی ممالک میں خونِ شہدا کا مطالبہ اور بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ اس کی زندگی اس کے بعد دو سال آٹھ ماہ رہی...... دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس کو ذلیل کیا اور اسی ذلت کے ساتھ ہلاک ہو گیا۔

قاتلانِ حسینؓ کا عبرت ناک انجام دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ عذاب ایسا ہی ہوتا ہے اور آخرت کا عذاب اس سے بھی بڑا ہے کاش وہ سمجھ لیتے۔

واقعہ کربلا کی تفصیل پڑھ کر اندازہ ہوا کہ ظالم مظلوم سے زیادہ اپنی جان پہ ظلم کرتا ہے اور جن مظلوموں کو فنا کرنا چاہا وہ آج تک زندہ ہیں اور قیامت تک زندہ رہیں گے۔ گھر، گھر میں ان کا ذکر خیر ہے۔ اور یہ رب کا ہو جانے کا اعجاز ہے کہ کروڑ ہا کروڑ مسلمان حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا سوگ مناتے ہیں جگہ، جگہ ختم اور قرآن خوانی کا اہتمام ہوتا ہے اور یہ سب کرنے والے وہ لوگ ہیں جن کا امام سے خون کا رشتہ نہیں کہ حق و باطل کے معرکے میں آخری فتح و کامیابی حق کی ہوا کرتی ہے...... حُبِ اہل بیتِ اطہار جزوِ ایمان ہے تو ان پر وحشیانہ مظالم کی داستان بھلانے کے قابل نہیں۔ حضرت امام حسینؓ اور ان کے رفقا کی درد ناک شہادت کا واقعہ جس کے دل میں رنج و غم اور درد نہ پیدا کرے وہ مسلمان کیا انسان بھی نہیں...... لیکن ان کی سچی اور حقیقی محبت و عظمت اور ان کے مصائب سے حقیقی تاثر یہ نہیں کہ سارے سال خوش و خرم پھریں، کبھی ان کا خیال نہ آئے اور صرف عشرہ محرم میں واقعہ شہادت سن کر افسوس کر لیں رو لیں بلکہ حقیقی محبت تو یہ ہے کہ جس عظیم مقصد کے لیے انہوں نے یہ قربانی پیش کی ان کے اخلاق و اعمال کی پیروی کو سعادتِ دنیا و آخرت سمجھیں۔

یا اللہ ہم سب کو، اپنے رسول اللہؐ اور آپؐ کے اصحاب کرام اور اہل بیت اطہارؓ کی محبت کاملہ اور اتباعِ کامل نصیب فرمائے۔ (آمین)

☆☆☆

باتیں بہار و خزاں کی

زندگی رات دن کی گردش ہے
کچھ خزاں کی ہے کچھ بہار کی بات

اس گردش لیل و نہار میں ہمارے شب و روز سیل رواں کی طرح گزرتے چلے جارہے ہیں۔ انہی گزرتے پل میں بے شمار کہانیاں، ڈھیروں قصے اور ان گنت واقعات جنم لیتے چلے جا رہے ہیں اور ہم ان کے کردار بنے تماشائے اہلِ کرم بھی دیکھتے اور کبھی دکھاتے چلے جاتے ہیں۔ آپ سب لوگ جو مصنفین اور بالخصوص قارئین کی حیثیت سے ہمارے ساتھ برسوں سے وابستہ ہیں اور کسی نہ کسی انداز میں پاکیزہ صفحات کو رونق بخشتے چلے آتے ہیں اور یہی پاکیزہ کی کامیابی کا راز ہے کہ مخلص اور محنتی مصنفات اپنی پُرتنوع تخلیقات کے ذریعے اور تبصرہ نگار بہنیں اپنے دقیق تبصروں اور قیمتی آراسمیت ہمارے ساتھ رہی ہیں اور انشاءاللہ رہیں گی۔

ہم ہمیشہ ہی سے کچھ نہ کچھ نیا اور دلچسپ کرتے چلے آئے ہیں سو آج بھی ایک مختصر مگر جامع سوالنامہ حاضر خدمت

صبا سجاد......دبئی

1۔ سب سے پہلے تو آپ کے شعر کے انتخاب کی داد دوں گی بے شک زندگی شب و روز کی گردش کے سوا کچھ نہیں......اور شب و روز تو گزرنے کے لیے ہی ہوتے ہیں سو ہم خواتین بھی اس گورکھ دھندے کا حصہ ہیں مگر محض زندگی گزارنی نہیں ہے بلکہ بہت اچھی گزارنی ہے اسی لیے ہم اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ جب اسٹوڈنٹ لائف تھی جب بھی ہماری کوشش ہوتی تھی کہ نمایاں رہیں گھر کے چونکہ بڑے ہیں اس لیے ویسے بھی اہمیت ملتی رہی۔ پھر تعلیمی مراحل بھی کامیابی سے طے کیے......اردو ادب کی طالبہ ہونے کی حیثیت سے شعر و شاعری سے بہت لگاؤ رہا اور کالج کے بیت بازی کے کئی مقابلوں میں انعامات بھی جیتے تو اس سے بھی ارد گرد کے لوگوں پر رعب ہی پڑتا رہا پھر شادی کے بعد سسرال اور میاں جی کی نظروں میں نمایاں رہنے کے لیے ہزار جتن کبھی خدمتیں تو کبھی کچھ اور اب جا کر جب بچے بھی جوان ہوگئے تو کچھ معاشی طور پر اپنے آپ کو مضبوط کیا یعنی میاں جی کی مدد سے چھوٹا موٹا بزنس گارمنٹس کا شروع کیا اور جناب فلاحی طور پر رشتے بھی کرائے صرف لوگوں کی خدمت کی غرض سے اس طرح ہم نے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی شخصیت کو پُراثر بنایا اور یہ سب ماں، باپ کی دعاؤں اور اللہ کی مدد سے ہی ممکن ہوا۔

2۔ واقعات اور لمحات تو زندگی کا حصہ ہیں اور ہر حساس انسان ہر لمحے ہی ان سے کچھ نہ کچھ سیکھتا ہی ہے اور اس کی زندگی میں نمایاں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ میں اسے دلچسپ واقعہ تو نہیں کہوں گی بلکہ یہ میرے لیے المیہ تھا کہ جب میرے والد صاحب کا انتقال ہوا تو سب بہن، بھائی چھوٹے......ماں پرانے زمانے کی سیدھی سادی خاتون......اگرچہ میری شادی ہو چکی تھی مگر اس لمحے میں، میں نے اپنے آپ کو بے حد تنہا محسوس کیا کہ والد صاحب چھوٹے بہن، بھائیوں کی ذمے داری مجھ پر چھوڑ کر گئے ہیں۔ سو اس دن سے ہی میں اپنے بہن، بھائیوں اور ماں کی سرپرست سی بن گئی......ہر آن، ہر لمحہ میرا ان ہی کی فکر میں گزرتا، میاں جی چونکہ کزن بھی ہیں تو وہ بھی......حالات سے آگاہ تھے۔ بس والدہ صاحبہ کی ہمت اور میاں جی کے تعاون سے میں نے یہ مشکل وقت گزار لیا انسان کو ہر لمحے مورل سپورٹ اور ہمت بندھائی کی ضرورت رہتی ہے۔ بس جب ہی سے میں مزید حساس، ذمے دار اور ہمت والی بنتی چلی گئی تاکہ اپنے بہن بھائیوں کو باپ کی

ہے تا کہ آپ کی اپنی شخصیت کے بھی کچھ نہاں پہلو سب کے سامنے آئیں اور آپ کے ذاتی افکار، خیالات اور تجربات سے ہم سب بھی آگاہ ہوں اور لطف بھی اٹھائیں۔ امید ہے آپ کو یہ اچھوتا سلسلہ بہت پسند آئے گا۔

سوالات حاضرِ خدمت ہیں۔

1۔ روز و شب کے اس گزرتے گورکھ دھندے میں خواتین اپنی شخصیت کو کیسے پُراثر بنا سکتی ہیں، آپ کا مشورہ اپنے تجربے کے حوالے سے......

2۔ آپ کی زندگی کا کوئی دلچسپ قصہ، واقعہ یا لمحہ جس نے آپ کے فکر و خیال کا رخ موڑ دیا۔

3۔ پاکیزہ کے مختلف سلسلے کیوں پسند ہیں؟ اور آپ کون سا ایسا سلسلہ شروع کرنا چاہیں گی جو سب کو پسند بھی آئے؟

4۔ پاکیزہ مصنفات سے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں...... کوئی دل کی بات؟

5۔ اپنے تعارف کو دو جملوں یا دو اشعار میں بیان کیجیے۔

آپ کے قیمتی خیالات کا انتظار رہے گا۔ آپ چاہیں تو اپنی تصویر بھی ارسال کر سکتی ہیں۔

کمی کا احساس کم سے کم ہو اور اللہ کی مدد شاملِ حال رہی۔ آج سب شادی شدہ ہیں اور اللہ کے فضل سے جیسے بھی ہوا ہے، اپنے مقام پر سیٹ ہیں۔

3۔ پاکیزہ کے سب سلسلے ہی اچھے ہیں اور الگ، الگ بھی ہیں اور جو مختلف موقعوں سے نمبرز نکلتے ہیں وہ بھی اچھے ہوتے ہیں۔ مجھے چونکہ شاعری سے دلچسپی ہے اس لیے چاہوں گی کہ نامور شعرا کا کلام ضرور دیا کریں بلکہ ان کا تھوڑا، تھوڑا تعارف بھی ہو۔

4۔ پاکیزہ مصنفات بہت اچھا لکھ رہی ہیں...... دل کی کیا بات کروں وہ تو چپکے سے ہی ہوتی ہے پھر بھی کہوں گی کہ اور زیادہ پُراثر لکھیں اور بلاوجہ کی تفصیلات مت لکھا کریں بھی، کبھی تو نصیحتیں بہت ہو جاتی ہیں۔

5۔ ویسے تو اوپر کے سوالوں کے جوابوں میں، میں نے اپنا تعارف کروا ہی دیا ہے پھر بھی دو شعر میں ضرور لکھوں گی وہ بھی اپنے بارے میں......

زخمِ ہنر کو سمجھے ہوتے ہیں گل سیر
کس شہرِ ناسپاس میں پیدا کیا مجھے
دی تشنگی خدا نے تو چشمے بھی دے دیے
سینے میں دشت آنکھوں میں دریا کیا مجھے

ماہ نور خان...... بھارہ کہو

1۔ ویسے تو میں ابھی چھوٹی ہی ہوں یعنی زیادہ تجربہ نہیں ہے تو میں اتنا کہوں گی کہ بڑوں کی خصوصاً ماں، باپ اور اپنے ٹیچرز کی باتوں پر عمل کر کے ہم اپنی شخصیت کو پُراثر بنا سکتے ہیں۔ کیونکہ ماں، باپ ہمارے بڑے یا ٹیچرز ہمیشہ اچھی بات ہی بتاتے ہیں تو جیسے ہر لڑکی اپنی ماں کی طرح بننا چاہتی ہے۔ میری بھی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اپنی امی کی طرح رہوں اور اپنی سب سے اچھی ٹیچر جیسی بنوں۔

2۔ میری زندگی میں ایسا کوئی واقعہ، لمحہ نہیں آیا...... ہاں، میں نے ایک دفعہ اپنی امی کی بات نہیں مانی تو تھوڑی پریشانی ہوئی تھی جب سے یہی سوچا کہ اپنی مرضی نہیں کرنی چاہیے کہ لڑکیوں کو اپنا اچھا برا معلوم نہیں ہوتا ہے سو پہلے میں ضد کرتی تھی اب آرام سے بات سن لیتی ہوں۔

3۔ 'پاکیزہ' میں سکس، سیونتھ سے پڑھ رہی ہوں...... پہلے چھوٹے سلسلے پڑھتی تھی اب تو میٹرک میں آ گئی ہوں کہانیاں بھی پڑھ لیتی ہوں۔ انٹرویوز وغیرہ جو آتے ہیں۔ وہ پڑھ کر بہت سی باتیں پتا چلتی ہیں اور ہاں جو کارنرز وغیرہ لگے ہوتے ہیں وہ اچھے لگتے ہیں۔ میری بات پوچھیں تو میں زیادہ سے زیادہ شاعری دوں گی۔ اچھے شاعروں کا کلام اور پھر شعر کے ساتھ اگر شاعر کا نام بھی ہو تو اچھی بات ہو گی اس طرح

پتا بھی چل جائے گا کس کا شعر ہے۔

4۔ میں تو پاکیزہ مصنفات کی تعریف ہی کرنا چاہوں گی کہ اللہ آپ کو اور صلاحیت دے اور اچھے سے اچھا لکھیں اور آج کل کی لڑکیوں اور اسٹوڈنٹ لائف کے متعلق بھی کہانیاں دیا کریں۔

5۔ میرا تعارف یہی ہے کہ میں مطالعے کی بہت شوقین ہوں، سہیلیاں زیادہ نہیں ہیں کیونکہ میری امی اور میری بہن ہی میری سہیلی ہے اور مجھے فیشن کا زیادہ شوق نہیں بس کبھی، کبھی کوئی چیز زیادہ پسند آجاتی ہے تو پہن لیتی ہوں ویسے آج کل تو ہر قسم کا لباس ہی فیشن ہے۔ ویسے مجھے جیولری کا بھی شوق ہے۔

نگہت آصف ...... اسلام آباد

1۔ یوں تو پاکیزہ رسالہ عرصے سے پڑھ رہی تھی اور کبھی، کبھی خط بھی لکھ دیتی تھی مگر اب اس سلسلے میں دل چاہا کہ کچھ لکھ ہی ڈالوں...... سوالات مختلف نوعیتوں کے ہیں میں تو سیدھا سادہ ہی لکھوں گی کہ زندگی کے اس گورکھ دھندے میں تو ہم خود الجھ کر رہ گئے۔ بچپن اور جوانی کیا مزے کی بے فکری زندگی ہوتی ہے مگر جی پھر ذمے داریاں یعنی کہ شادی اور سب حرے ہوا ہو گئے۔ بھئی لاابالی پن اور بے فکری کی بات کر رہی ہوں کہ لڑکی تو شادی کے بعد بدل کر رہ جاتی ہے۔ بس دوسروں کی مرضی پر چلو ایسے میں اپنی زندگی، اپنی شخصیت کو پُراثر کیسے بنائیں؟ میں تو سوچتی رہ جاتی ہوں اور دوسرے بازی لے جاتے ہیں یعنی اگر اپنے آپ کو دیکھیں تو دوسرے لوگ بلاوجہ ہی متاثر ہو جاتے ہیں (بھئی یہ دوسرا والا ''متاثر'' ہے) خیر ہم ان حالات میں بھی انفرادیت برقرار رکھے ہوئے ہیں وہ اس طرح کہ ہر ممکن طور پر اپنے گھر کو بھی سنبھال رہے ہیں اور رشتے داریوں کو بھی...... بھائی، بہنوں حتیٰ کہ نند، دیور کے بچوں کی بھی فیورٹ آنی ہوں اور اپنے اسٹوڈنٹس کی بھی پسندیدہ شخصیت ہوں (لیکچرار جو ہوں) تو بس اپنے عمل، رویے اور سلوک سے ہی اپنے آپ کو پُراثر بنایا ہے مگر بااثر نہیں۔

2۔ زندگی کا دلچسپ واقعہ تو میری شادی کا ہی ہے کہ جب لائف اسٹائل اور سوچ ہی بدل گئی۔ کہاں گھر کی چھوٹی اور لاڈلی کچھ اللہ کی طرف سے دی گئی حُسن کی دولت (ماشاء اللہ) اس سے بھی ہم مغرور ہو گئے تھے۔ قد و قامت کا کیا بتائیں اب خود ہی اپنی تعریف کرنا پڑے گی۔ میں جو نہایت چُوزی اور نخرے والی ہوا کرتی تھی شادی کے بعد بڑی بہو بننے کا فرض نبھایا جو آج بھی نبھا رہے ہیں جبکہ شادی کی سلور جوبلی بھی ہو چکی بس اسی واقعے نے خیالات کا رخ موڑ کر اپنے بجائے دوسروں کا خیال رکھنے پر لگا دیا سو کر رہے ہیں جیسا بھی ہو۔

3۔ پاکیزہ کے سلسلے اگرچہ مختلف ہیں ضرور مگر مجھے تو کہانیاں پڑھنے میں مزہ آتا ہے۔ الگ، الگ رائٹر کے خیالات، کردار، منظر نگاری اور نت نئے مسائل اور بعض دفعہ دل یہ کہہ اٹھتا ہے کہ اچھا ایسا بھی دنیا میں ہو رہا ہے۔ میں تو کوئی سلسلہ خود سے شروع کرنا نہیں چاہوں گی جو چل رہا ہے ٹھیک ہے ہاں کبھی کبھی فنکاروں کے متعلق بھی خبریں دے دیا کریں ویسے تو خیر اب الیکٹرانک میڈیا پر ہی سب کچھ دیکھ لیتے ہیں۔

4۔ پاکیزہ مصنفات سے اور کیا کہوں کہ سب ہی طرح، طرح کا اچھا لکھ رہی ہیں۔ کچھ عرصے سے رائٹر ہاجرہ ریحان کی چھوٹی، چھوٹی کہانیاں اچھا موضوع لیے ہوتی ہیں۔ نایاب جیلانی کی منظر نگاری بہت اچھی لگتی ہے۔ اس کے علاوہ سعدیہ رئیس، عالیہ حرا، فرحین اظفر اور شیریں حیدر کی کہانیاں اچھی لگتی ہیں۔ بس آپ لوگ اچھے سے اچھا لکھتی رہیں اور سبق آموز کہانیاں دیتی رہیں۔

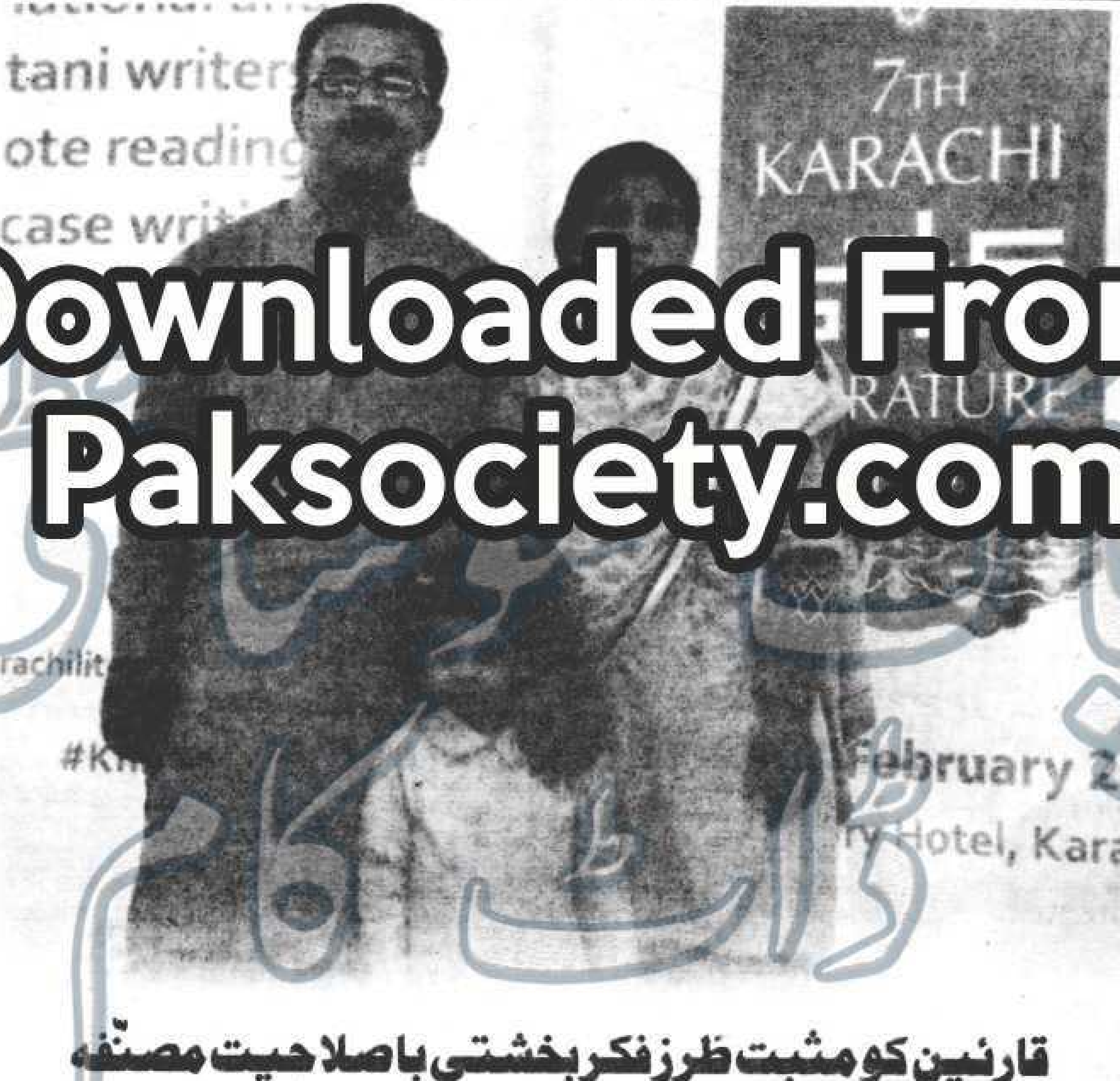
5۔ اپنی شخصیت تو شعر میں بیان نہیں کر سکتی بس ایک اچھا شعر کہیں پڑھا تھا آپ بھی پڑھیں۔

اے آنکھ! اب تو خواب کی دنیا سے لوٹ آ
مژگاں تو کھول! شہر کو سیلاب لے گیا

☆☆☆

وہ آئے بزم میں....

نزہت اصغر



قارئین کو مثبت طرزِ فکر بخشتی باصلاحیت مصنّفہ

ثمینہ عظمت علی سے پُرلطف گفتگو

عزیز قارئین! مصنفات سے بات چیت کے اس سلسلے میں آج ہم نے اپنی بزم کو رونق ایک ایسی مصنفہ کی شخصیت سے دی ہے جو اگرچہ کم کم لکھتی ہیں مگر جب بھی لکھتی ہیں قلم کی عظمت و حرمت کا حق ادا کرتے ہوئے قارئین کے ذہنوں کے بند دریچے وا کرتی چلی جاتی ہیں، جو باتیں عام ذہنوں میں نہیں آتیں اس کی تحریک ثمینہ عظمت کا قلم دیتا ہے اور قارئین اسی پہلو سے سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہاں اتنی سی بات

کے پیچھے کس قدر مثبت فکر ہے۔ ان کی پاکیزہ میں چھپنے والی حالیہ کہانی ''یادگار'' کہ تین سہیلیاں کچھ نہ کچھ نیا کرتی ہیں اور ایک نے اپنی ملازمہ کو تعلیم دینے کی ذمے داری بخیر و خوبی نبھائی...... یعنی کوئی اچھا اور مثبت کام پہلے اپنے گھر سے شروع کرو اور فوری کرو اس کے لیے بڑی، بڑی تنظیموں، انجمنوں اور این جی اوز بنانے کی ہرگز ضرورت نہیں۔

ثمینہ عظمت علی نے سادہ طرزِ بیان اختیار کرتے ہوئے گہری سوچ دی اور کرداروں کو اس پر عمل کرتے ہوئے دکھایا تاکہ یہ محض کاغذی نصیحت نہ ہو...... آج ہماری بزم اسی ہونہار لکھاری کی سادہ مگر پُرروح باتوں سے سجی ہے۔ آئیں ان سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... ثمینہ عظمت علی صاحبہ ہماری بزم میں آپ کی آمد یقیناً بہت خوشگوار ہے، ہمارے لیے بھی اور قارئین کے لیے بھی...... آپ کو کیسا محسوس ہو رہا ہے؟

ثمینہ عظمت علی ✧...... سب سے پہلے تو مجھے اس بزم میں دعوت دینے کا شکریہ۔ مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ امید ہے کہ قارئین کو بھی اچھا لگے گا۔ بھئی میں کوئی مشہور و معروف رائٹر تو ہوں نہیں...... اگر چند لوگ مجھے جانتے ہیں تو یہ ان کی مہربانی ہے۔ (آپ کسرِ نفسی سے کام لے رہی ہیں)

پاکیزہ ✧...... آپ کے انٹرویوز شاید ہی کبھی پڑھے ہوں اس سلسلے میں آپ کیا کہیں گی، کیا اپنے بارے میں گفتگو کرنا اچھا نہیں لگتا یا کوئی اور وجہ؟

ثمینہ عظمت علی ✧...... نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ شاید یہ وجہ ہو کہ میں نے زیادہ تر دیگر رسائل میں لکھا، وہاں کافی عرصے سے رائٹرز کے انٹرویوز کا ایسا کوئی سلسلہ ہے نہیں۔ مختلف مواقع پر جو سروے کیے جاتے ہیں ان میں وقتاً فوقتاً میرے بھی جواب شائع ہوتے رہے۔ قارئین سے سوال جواب کا سلسلہ اکثر کسی ناول کے اختتام پر ہوتا ہے جو مجھے کبھی لکھنے کی توفیق ہوئی نہیں۔

پاکیزہ ✧...... سب سے پہلے اپنے قلمی سفر کے آغاز کی مختصر کہانی تو ہمیں سنائیں کہ کب سے لکھنا شروع کیا۔ مطلب باقاعدہ کہانیاں لکھنا کب سے شروع کیں کیونکہ اکثر مصنفین جواب دیتے ہیں کہ بچپن سے شوق تھا تو کتنے بچپن سے؟

ثمینہ عظمت علی ✧...... مجھے تو بچپن سے پڑھنے اور بس پڑھنے کا شوق تھا...... یہ شوق تو میرے گھر والوں کو تھا کہ میں ضرور لکھوں کیونکہ ان کو یقین تھا کہ میں لکھ سکتی ہوں۔ میرے بھائی اس سلسلے میں میری ہمت بندھاتے تھے، مجھ سے بڑے بہن، بھائی بھی اخباروں، رسالوں میں کہانیاں وغیرہ لکھا کرتے تھے خصوصاً میرے ایک بھائی اعجاز نے تو بہت ریگولر لکھا۔ اکثر وہ اپنی کہانیاں مجھ سے فیئر کرواتے یا ڈکٹیٹ کرواتے تھے... تو یوں میں نے بھی لکھنا شروع کر دیا۔

پاکیزہ ✧...... پہلی کہانی کس موضوع پر لکھی؟ اور چھپنے کے بعد کیا محسوس کیا؟

ثمینہ عظمت علی ✧...... پہلے بچوں کے رسالوں میں کافی لکھا۔ 2005ء میں میرا پہلا افسانہ ایک ڈائجسٹ میں شائع ہوا جو میاں کے اصرار پر لکھا اور ان ہی پر لکھا۔ (ہاہاہا)

پاکیزہ ✧...... گھر والوں نے کس حد تک پذیرائی کی بلکہ کیا کچھ سننے کو ملا؟

ثمینہ عظمت علی ✧...... گھر والوں، دوستوں، سب نے یہ ہی کہا کہ دیکھا ہم تو پہلے ہی کہتے تھے۔ (یعنی کریڈٹ ان کا)

پاکیزہ ✧...... آپ نے جب لکھنا شروع کیا تو کن موضوعات پر قلم آزمائی کرتی تھیں؟

ثمینہ عظمت علی ✧...... میں نے کرکٹ، کرنٹ افیئرز، مارننگ شوز، کوکنگ شوز کو اپنا موضوعِ قلم بنایا۔

پاکیزہ ✧...... کیا اردگرد کا کوئی واقعہ لکھنے کی تحریک بنتا ہے یا خود ہی کچھ نہ کچھ سوچ کر قلم کاغذ سنبھال لیتی ہیں؟ جیسے شاعری میں تو آمد ہوتی ہے، نثر میں کس طرح کچھ لکھنے کی تحریک ہوتی ہے؟



تفریح کے حسین لمحات سے لطف اندوز ہوتی ثمینہ عظمت علی اپنی فیملی کے ہمراہ

ثمینہ عظمت علی ✧......اکثر تو خبریں ہی لکھنے کا سبب بنتی ہیں، ملکی حالات، نام نہاد سیاسی تجزیہ کار، ممتاز مذہبی اسکالر، نیوز اینکرز، یوں کہہ لیں کہ میڈیا تحریک دیتا ہے۔اور یہی آمد ہے۔

پاکیزہ ✧......اب تک کتنا کام کیا؟ کیا کتابی شکل میں بھی آپ کی کاوشیں منظرِ عام پر آئیں؟

ثمینہ عظمت علی ✧......میں لکھنے کے معاملے میں اور بہت سے دیگر معاملات میں بھی کافی سست واقع ہوئی ہوں۔ 30/35 افسانے ،ناولٹ ہوں گے۔ کتابی شکل میں نہیں آئے۔ (آج کل تو دس افسانے نہیں ہوتے اور مجموعہ آجاتا)

پاکیزہ ✧......آپ کے خیال میں مطالعے کی خصوصاً رائٹرز کے لیے کیا اہمیت ہے یعنی مطالعہ لکھنے کی صلاحیتوں کو بہتر بناتا ہے؟ بڑھاتا ہے؟ مقابلے کی فضا پیدا کرتا ہے؟

ثمینہ عظمت علی ✧......جی یقیناً مطالعہ لکھنے کی صلاحیت کو بہتر بناتا ہے۔ ذخیرۂ الفاظ، انداز، تکنیک وغیرہ......

پاکیزہ ✧......بعض دفعہ دیکھا جاتا ہے کہ موضوع بڑا لے لیا گیا اور معلومات بالکل نہیں، بس کسی طرح کام چلایا گیا آپ کے خیال میں ایسا ہوتا ہے؟

ثمینہ عظمت علی ✧......بالکل، ایسا تو بہت دیکھا ہے ،آج کل تو اور بھی زیادہ کہ بڑے، بڑے موضوعات میں ہاتھ ڈالا جاتا ہے۔ میرے کچھ آئیڈیاز مدت سے محض اس لیے التوا کا شکار ہیں کہ انہیں لکھنے کے لیے جو تفصیلات درکار ہیں وہ مجھے میسر نہیں ہیں۔ (بے شک باقاعدہ ہوم ورک کر کے لکھنا چاہیے)

پاکیزہ ✧......آج کل تو شوقیہ لکھاری بھی کافی کمرشل ہیں......آپ نے جب لکھنا شروع کیا تو کیا سوچا تھا شہرت، پیسہ یا خود کی تسکین؟

ثمینہ عظمت علی ✧......میں نے جیسے پہلے بتایا کہ اپنے گھر والوں کے اصرار پر لکھنا شروع کیا اور اب تک کسی نہ کسی کے اصرار پر ہی لکھتی آئی ہوں۔ کہانی نویس کو اتنا پیسہ نہیں ملتا کہ وہ پیسے کے لیے لکھے اور شہرت بھی بس ایک مخصوص حلقے تک ہی ہوتی ہے۔ ہم ہی کیا بڑے، بڑے ڈائجسٹ رائٹرز اور ڈراما رائٹرز کو

عام لوگ نہیں جانتے۔ جہاں تک بات اب کمرشل ازم کی ہے جو ڈائجسٹ رائٹرز کے اسکرپٹ رائٹرز ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے تو یہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔ آخر جب سب کما رہے ہیں تو رائٹر نے کیا قصور کیا ہے۔

پاکیزہ ❖...... اچھا ثمینہ صاحبہ یہ بتائیں کہ شادی سے پہلے اور بعد کی تحریروں میں نمایاں فرق کیا ہے، ویسے آپ کے والدین تو یقیناً حوصلہ افزائی کرتے ہوں گے؟ شادی کے بعد شوہر صاحب کے کیا تاثرات سننے کو ملے، وہ کس حد تک معاون ہیں؟

ثمینہ عظمت علی ❖...... میں نے باقاعدہ لکھنا ہی شادی کے بعد شروع کیا ہے اور جتنا بھی لکھا ہے ان کے تعاون سے ہی لکھا ہے۔ ان کو تو بے حد شوق ہے کہ اتنا لکھوں، اتنا لکھوں کہ خوب نام پاؤں۔ (واہ بھئی)

پاکیزہ ❖...... بچوں میں آپ کی یہ صلاحیت منتقل ہوئی یا آپ چاہتی ہیں کہ ایسا ہو؟

ثمینہ عظمت علی ❖...... میری ایک ہی بیٹی ہے ساڑھے تین سال کی اور وہ کہانیاں بنانے میں بڑی ماہر ہے۔ لگتا تو ہے کہ اس میں لکھنے کی صلاحیت ہوگی۔ یہ شوق بھی اس کے بابا کو ہے۔ (پھر تو ضرور لکھے گی)

پاکیزہ ❖...... زندگی کے حقائق پر لکھنا کتنا مشکل ہے؟ کبھی ایسا تو نہیں ہوا کہ کوئی یہ سمجھا ہو کہ ہم پر ہی اس نے یہ کہانی لکھ ڈالی؟

ثمینہ عظمت علی ❖...... ہاں قریبی لوگوں پر لکھنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ میرے بھائی مذاقاً کہتے ہیں کہ جس پر غصہ ہو کہانی لکھ کر اس کی خوب خبر لو...... حتیٰ کردار پر کوئی یہ نہیں پوچھے گا کہ مجھ پر کیوں لکھا۔ خیر میں تو اوائڈ کرتی ہوں۔ ہاں مزاحیہ کہانیوں میں لوگوں کا ذکر کردیتی ہوں اور آس پاس کے لوگ پہچان بھی لیتے ہیں۔ (اچھا بالکل ٹھیک کرتی ہیں، ویسے تحریروں کے ذریعے غصہ نکالنا، واقعی کوئی اچھی بات نہیں ہے)

پاکیزہ ❖...... اپنے اردگرد لوگوں کے رویے کتنا آپ پر اثر انداز ہوتے ہیں؟ مطلب کیا ہماری شخصیت ان کے عمل کا ردِعمل ہوتی ہے یا ہمارے اپنے اصول قائم رہتے ہیں؟

ثمینہ عظمت علی ❖...... رویے تو بہت اثر انداز ہوتے ہیں، میں تو بہت حساس ہوں۔ مزے کی بات یہ کہ کسی کا رویہ ہرٹ کرے تو میں خود سے عہد کرتی ہوں کہ اب میں بھی ایسا ہی کروں گی لیکن اگلی بار وہ شخص ملے یا میرے گھر آئے تو دانت نکالے بچھ، بچھ جاتی ہوں۔ بعد میں یاد آتا ہے ارے میں نے تو سوچا تھا کہ لفٹ نہیں کرواؤں گی، یعنی ردِعمل نہیں ہوتا، اصل شخصیت قائم رہتی ہے۔ آخر میں، میں یہی کہتی ہوں کہ کسی کی برائی کی وجہ سے ہم اپنی اچھائی کیوں چھوڑ دیں۔ (جی بالکل سو فیصد سچی بات کہی آپ نے کاش سب ہی ایسا سوچیں)

پاکیزہ ❖...... مگر یہ بھی تو ہوتا ہے ناں کہ لوگوں کے سلوک، برتاؤ، رویے آپ کو اپنی ڈگر سے ہٹنے پر مجبور کردیتے ہیں؟

ثمینہ عظمت علی ❖...... وہی بات کہ سوچتی بہت ہوں کہ ڈگر سے ہٹ جاؤں لیکن ہوتا نہیں۔ ہاں یہ کہ دونوں ہی ڈگر بدل لیں تو ٹھیک لیکن ملنا جلنا رہے تو پھر میں سرد مہری اختیار نہیں کرسکتی۔ (بہت اچھی بات ہے)

پاکیزہ ❖...... آپ کی کہانیاں کیا پیغام دیتی ہیں؟

ثمینہ عظمت علی ❖...... میں نے کبھی خاص طور پر پیغام دینے کی نیت سے نہیں لکھا لیکن بعض اوقات کوئی نہ کوئی ایسا پہلو نکل ہی آتا ہے۔ (یہی رائٹر کی خوبی ہوتی ہے)

پاکیزہ ❖...... محبت اور رومانس کہانی کا لازمی جزو یا پڑھنے کے قابل بنانے کے لوازمات میں سے ایک؟

ثمینہ عظمت علی ❖...... ضروری نہیں، مجھے تو لَو اسٹوری لکھنا آتی ہی نہیں ہے۔ میری کہانیاں بغیر ہیرو، ہیروئن کے ہوتی ہیں، محبت خیر اہم جزو تو ہے کہانی کا

لیکن انحصار اس پر ہے کہ کس طرح لکھی اور بیان کی گئی۔

پاکیزہ ✧...... زندگی کو آپ گزار رہی ہیں یا وہ خود ہی گزرتی چلی جارہی ہے مطلب حالات کے دھارے پر خود کو چھوڑا ہوا ہے؟

ثمینہ عظمت علی ✧...... اپنی بیٹی علینہ کی پیدائش سے پہلے تو زندگی بس یوں ہی گزار رہی تھی۔ علینہ شادی کے نوسال بعد اس دنیا میں آئی لیکن اس کے بعد سے زندگی مکمل طور پر بدل گئی۔ اب یہ سوچ ہوتی ہے کہ یہ کرنا ہے اور وہ کرنا ہے حتیٰ کہ اپنے کپڑوں پر بھی نظرِ ثانی کرنی پڑتی ہے۔ میری بیٹی کو شوخ رنگ پسند ہیں اور فرمائش کہ پنک (لپ اسٹک) ضرور لگائیں۔

پاکیزہ ✧...... ارے سوالات عجیب لگ رہے ہوں تو ضرور بتائیں اس لیے...... ہیر پھیر کر پوچھ رہی ہوں کہ آپ تو رائٹر ہیں متاثر کن ہی جواب آئے گا کیوں کیا خیال ہے؟

ثمینہ عظمت علی ✧...... او ہو نہ بھئی میں تو سیدھا سیدھا لکھتی جارہی ہوں۔ (چلیں ٹھیک ہے)

پاکیزہ ✧...... آج کی نوجوان نسل خصوصاً لڑکیاں...... مجموعی طور پر کیا طرزِ فکر ہے؟ آپ کا کیا مشاہدہ ہے؟

ثمینہ عظمت علی ✧...... میں نے کچھ عرصہ قبل ہی کالج میں پڑھانا شروع کیا ہے اور فرسٹ ایئر انٹر کی لڑکیوں کو پڑھاتی ہوں۔ لڑکیاں آج کل ماشاء اللہ زیادہ ذہین، زیادہ اسمارٹ اور کیریئر مائنڈڈ ہیں۔ نئی، نئی فیلڈز میں جانا چاہتی ہیں اور اس کے لیے زیادہ محنت کر رہی ہیں لیکن افسوس کہ بچیوں کا ایک گروپ ایسا بھی ہے جو موبائل کو کل زندگی سمجھتا ہے۔ ان کی رہنمائی ضروری ہے۔ (جی بالکل)

پاکیزہ ✧...... اپنے جوانی کے دور کو یاد کرتی ہیں یا آج کی لڑکیوں کے انداز سے مقابلہ کرتی ہیں کہ پہلے کیا دور تھا اور اب کیا ہے؟

ثمینہ عظمت علی ✧...... اپنی جوانی...... (ہائے کیا میں بوڑھی ہوگئی ......) وہ تو خیر ہونا ہی ہے، ہم جب اسٹوڈنٹ تھے تو لڑکیوں کے واضح طور پر دو گروپ ہوا کرتے تھے۔ ایک وہ جو صرف پڑھا کو بیبیاں تھیں، باقی کاموں سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور دوسری وہ جو پڑھائی میں صفر اور فیشن، فلموں میں آگے لیکن آج کی لڑکیاں میں دیکھتی ہوں تو فیشن کا بھی سب پتا ہے، فلمیں، ڈرامے، میوزک، سوشل میڈیا ہر چیز میں دلچسپی ہے اور پڑھائی میں بھی ٹاپ کر رہی ہیں یعنی ہر چیز ساتھ...... باقی عمومی رویے تو وہی ہیں...... ہم روبینہ اشرف، مرینہ خان، مشی خان...... پرنٹڈ قمیص، وہائٹ شلوار اور دوپٹا کاپی کیا کرتے تھے اب آج کل اداکارائیں ٹی وی پر جو پہن رہی ہیں تو بچیاں بھی ان ہی کو کاپی کر رہی ہیں۔ ہم نعمان اعجاز، نبیل، وغیرہ پر مرتے تھے لیکن اس وقت کرش کا مطلب نہیں آتا تھا۔ ہم سب کو بھائی کہتے تھے۔ (ہاہاہا) اور اصل ہیرو تو کرکٹرز تھے۔ اب لڑکیاں فواد اور حمزہ عباسی کو پسند کرتی ہیں۔ ہم تو آج تک دھوپ کنارے سے ہی نہیں نکل سکے۔ آج بھی مجھے وقت ملے تو یوٹیوب پر راحت کاظمی کے پرانے ڈرامے دیکھنا میری ترجیح ہوتی ہے۔ پی ٹی وی نے ہمارے ذوق کی تربیت کی۔ اب گلیمر اور انڈیا کی نقل زیادہ ہے۔ ہم ماؤں پر زیادہ ڈیپینڈ کرتے تھے۔ اچھی خاصی بڑی ہوجانے پر جو امی دلاتی تھیں وہی پہن لیتے تھے۔ اب تو دیکھتی ہوں کہ بیٹیاں، ماں کی شاپنگ کرتی ہیں کہ امی یہ لے لیں، وہ لے لیں...... حالانکہ کوئی سو پچاس سال بھی نہیں گزرے لیکن نوے کی دہائی اور اس کے بعد دنیا اور خود ہماری زندگیاں بہت بدل گئی ہے۔ (کیا، کیا یاد دلا دیا آپ نے ثمینہ)

پاکیزہ ✧...... آج کے والدین کو زیادہ باخبر اور ذمے دار ہونا ہے...... وہ کس طرح، کچھ گائڈ کریں؟

ثمینہ عظمت علی ✧...... بالکل! والدین کا باخبر رہنا تو بہت ضروری ہے، خاص طور پر کمپیوٹر اور موبائل کا استعمال ضرور آنا چاہیے سب سے اچھی بات تو یہ ہے

کہ بچوں کو زیادہ وقت دیں، دوستانہ ماحول رکھیں اور بچوں کو اچھی سرگرمیوں کی عادت ڈالیں۔ بہر حال اس کا کوئی خصوصی کلیہ نہیں ہے۔ بس اللہ کی مہربانی ہونی چاہیے۔ (وہ تو ہے)

پاکیزہ ✧...... کتب بینی، اخبار بینی اور وقت گزاری کے لیے کچھ بھی پڑھنا آج بہت کم، کم ہے کیا اس کی وجہ الیکٹرانک ڈیوائسز ہیں؟ آپ نے اپنی بچی کی تربیت میں اپنے والدین کے تجربوں سے کس طرح فائدہ اٹھایا؟

ثمینہ عظمت علی ✧...... میں نہیں سمجھتی کہ کم پڑھنے یا نہ پڑھنے کی وجہ الیکٹرانک ڈیوائسز ہیں کیونکہ جو ممالک ہم سے ٹیکنالوجی میں آگے ہیں وہ کتاب پڑھنے میں بھی ہم سے آگے ہیں، میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ اگر آپ خود پڑھتے ہیں اور گھر میں کتابیں ہوں تو آپ کے بچے بھی پڑھیں گے۔ مجھ سے اکثر والدین کہتے ہیں کہ ہمارے بچے کتاب نہیں پڑھتے تو میں ان سے یہ ہی سوال کرتی ہوں کہ کیا آپ خود پڑھتے ہیں؟ اکثر بچوں سے چھٹیوں کے بعد یا ویک اینڈ پر ہی پوچھ لیں کہ کہاں گئے تھے تو وہ گھومنے پھرنے کی جگہوں اور شاپنگ مالز کے نام بتائیں گے۔ ان کے والدین سے پوچھیں کہ کبھی بچوں کو بک فیئر میں لے کر گئے؟ لٹریچر فیسٹول میں لے کر گئے؟ بیس ہزار کا ٹیبلیٹ لے دیں گے بچے کو دو سو کی کتاب نہیں لے کر دیں گے۔ (واہ کیا سچی بات کہی ہے آپ نے)

پاکیزہ ✧...... میں نے رومانس، محبت کے بارے میں پہلے بھی پوچھا تھا، آپ کی زندگی میں ایسا کوئی خوشگوار لمحہ آیا؟

ثمینہ عظمت علی ✧...... جی ہاں بالکل اور الحمدللہ وہ محبت آج بھی قائم ہے بلکہ وقت کے ساتھ اس میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ (بہت خوب)

پاکیزہ ✧...... فطری طور پر آپ کس مزاج کی ہیں، کن باتوں کو، کاموں کو ترجیح دیتی ہیں؟

ثمینہ عظمت علی ✧...... فطری طور پر الحمدللہ خوش مزاج، دوستانہ مزاج اور مہمان نواز ہوں۔ سوشل ہوں، چھوٹی چھوٹی خوشیاں منانا اچھا لگتا ہے۔ سب کے برتھ ڈیز یاد رکھتی ہوں، دوستوں، رشتے داروں، بہن بھائیوں کے ساتھ مل بیٹھنا بہت پسند ہے۔ بچوں سے خوب دوستی ہے اور سب کی فیورٹ خالہ، پھپو، چاچی اور مامی ہوں۔ ہر چیز سے زیادہ رشتوں کو اہمیت دیتی ہوں۔ (بہت اچھے)

پاکیزہ ✧...... اگرچہ سوالات تو ظاہر ہے پاکیزہ کی رائٹر ہونے کے ناتے ہی پوچھے ہیں، یہ بھی بتادیں کہ ماہنامہ پاکیزہ سے دوستی کب اور کیسے ہوئی؟

ثمینہ عظمت علی ✧...... بچپن کی بات ہے شاید میں پانچویں میں تھی۔ میری آپا باقاعدگی سے پاکیزہ پڑھا کرتی تھیں۔ اس میں ایک چینی والی کہانی آتی تھی جس کا نام سلسلے وفا کے تھا۔ (رائٹر کا نام یاد نہیں) ایک بار میں نے اس کی ایک قسط پڑھی تو مجھے بہت اچھی لگی۔ بڑی بہن منع کرتی تھیں۔ یہاں ایک بات کی وضاحت بھی کر دوں کہ ہمارے گھر میں یہ تصور نہیں رہا کہ ڈائجسٹ نہیں پڑھنے چاہئیں۔ بچیاں خراب ہوتی ہیں وغیرہ لیکن میری بہن کے منع کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت میرے لیے بچوں کے چار ماہانہ رسالے اور اشتیاق احمد صاحب کے چار ناول آیا کرتے تھے، دیگر کہانیاں، ناول وغیرہ جو ہر بار بک شاپ پر دیکھ کر خرید لیتی تھی۔ وہ الگ...... تو آپا کا کہنا تھا کہ میں پہلے ہی اتنا پڑھ رہی ہوں تو مزید نہیں پڑھنا چاہیے۔ اب جو مجھ سے بڑے شکیل بھائی جان ہیں وہ بھی سلسلے وفا کے شوق سے پڑھا کرتے تھے اور ان کی کمزوری تھی وہ آج بھی ہے کہ کوئی ان کے بالوں میں انگلیاں گھما کر بال سہلاتا رہے تو ہم نے یہ ترکیب نکالی کہ جب وہ قسط پڑھ رہے ہوتے تو میں پیچھے بیٹھ کر ان کے بال سہلاتی رہتی اور ساتھ، ساتھ پڑھتی رہتی، اُف...... بتا نہیں سکتی کہ وہ کس قدر آہستہ پڑھتے تھے...... میں دونوں طرف کے صفحے پڑھ لیا کرتی تھی اور وہ آدھا بھی نہیں پڑھ پاتے تھے (آج بھی میں انہیں طعنے دیتی ہوں) پھر تو

وہ ناول کئی برس چلا اور بعد میں، میں اسے آزادی سے پڑھتی رہی۔ پہلی بار جو ناول رائٹر کے نام کی شناخت کے ساتھ پڑھا وہ رفعت سراج کا شاہکار تھا۔ اسکول میں کسی لڑکی نے تعریف کی تو اس سے لے کر پڑھا اور خود ڈائجسٹ لے کر پڑھنا شروع کر دیا۔ بس اس کے بعد میں رفعت سراج، عنیزہ سید، ہما کوکب بخاری کی ایسی فین ہوئی کہ کیا بتاؤں۔ پچھلے دنوں پاکیزہ میں تابندہ نعیم کے ناول نے بہت متاثر کیا۔ عالیہ بخاری کا قسط وار ناول بھی شوق سے پڑھتی تھی۔ سائرہ رضا کی بہترین تحریریں پاکیزہ میں پڑھیں۔

پاکیزہ ✧...... آپ جیسے قلمکاروں نے قلم کی حرمت کو برقرار رکھتے ہوئے مطالعے کا رجحان نئی نسل میں بھی جاری رکھا ہوا ہے۔ لوگ آپ کو پڑھنا چاہتے ہیں پھر تو اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ پڑھنے کا سلسلہ چل رہا ہے، آپ کیا کہتی ہیں اس بارے میں؟

ثمینہ عظمت علی ✧...... جی بالکل، پڑھنے کا تسلسل تو ہے اور نئی نسل ہمیں پڑھ بھی رہی ہے لیکن اس سلسلے کو آگے جانا چاہیے۔ میں بہت سے قارئین ایسے دیکھتی ہوں جو ڈائجسٹ تک آکر رک جاتے ہیں، ادب بہت وسیع ہے لیکن بہت سے قارئین مشکل ادب (جو ان کے نزدیک مشکل ہے) پڑھنے سے گھبراتے ہیں، حتیٰ کہ ڈائجسٹ میں بھی جو رائٹر ذرا سنجیدہ یا گمبھیر لکھے تو اسے نہیں پڑھتے۔ میری نظر میں ادب پڑھنے کی بھی مشق ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ نہ سمجھ آنے والی چیزیں سمجھ میں آنے لگتی ہیں۔ ویسے تو خیر ہمارے قارئین بہت باشعور اور سمجھدار ہیں اور ایک اچھے رائٹر کا فوراً مقبول ہو جانا بھی اس بات کی دلیل ہے۔

پاکیزہ ✧...... ثمینہ آج کی نئی لکھنے والیوں میں اور اپنے عصروں میں آپ کیا نمایاں فرق پاتی ہیں؟

ثمینہ عظمت علی ✧...... اکثر اوقات مختلف جگہوں پر لکھنے والے کسی ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جاتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے ٹھیک سے سینئر جونیئر کا اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی نئی رائٹر پہلی تحریر سے چونکا دیتی ہے اور کوئی آٹھ، دس کہانیوں کے بعد نظر میں آتی ہے اور پھر اچھا لکھے چلی جاتی ہے لیکن کچھ سینئر نام نمایاں ہوتے ہیں۔ فرق تھوڑا ہے یا نظر آتا ہے کہ پہلے لکھنے والوں میں اردو ادب کا رنگ نمایاں ہے اور اب کافی نئی لکھنے والیوں میں غیر ملکی عنصر نظر آتا ہے۔ (بلکہ غیر ملکی عنصر بے حد زیادہ نظر آتا ہے)

پاکیزہ ✧...... لکھنے پڑھنے کی مصروفیات کے علاوہ آپ کے کیا مشاغل ہیں؟

ثمینہ عظمت علی ✧...... آج کل تو دراصل لکھنا، پڑھنا ہی کم ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ میرے مشاغل گھر داری، کرکٹ اور ٹینس دیکھنا، پرانے ڈرامے دیکھنا، گوگل پر پھرتے رہنا...... لیکن علینہ کی آمد کے بعد زندگی بالکل بدل گئی ہے۔ اب تو اسی کے پیچھے چلتی ہوں۔ گزشتہ ورلڈ کپ شروع ہونے پر مجھے فیس بک پر بہت سے پیغام ملے کہ آپ ورلڈ کپ کے لیے لکھ رہی ہیں تو میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ کون سا ورلڈ کپ؟ پھر میری دوست شائلہ میسج کرتی ہے کہ راجر فیڈرر ومبلڈن کے کوارٹر فائنل میں آگیا ہے تو میں کہتی ہوں ہائیں...... ومبلڈن چل رہا ہے؟ (اوہ یہ حال ہو گیا ہے)

پاکیزہ ✧...... اپنی بیٹی کی سرگرمیوں میں کس حد تک شامل ہوتی ہیں؟

ثمینہ عظمت علی ✧...... ہر سرگرمی میں، ہر وقت، ہر پل، فل ٹائم امی، ٹیچر، دوست، بندر، سب...... ہاہاہا صرف میں ہی نہیں، امی اور بابا دونوں......

پاکیزہ ✧...... اپنی فیملی کا بھی مختصر تعارف کروا دیں؟

ثمینہ عظمت علی ✧...... میرے والد صاحب غلام نبی بروڑو سرکاری ملازم تھے۔ ہم ٹرانسفرز میں رہتے تھے پھر ٹھٹھہ آئے تو مستقل سکونت اختیار کی۔ یہیں بابا کا انتقال ہوا، ہم ماشاء اللہ چھ بھائی اور چار بہنیں۔ سب مختلف شہروں میں اپنی جابز اور فیملیز کے ساتھ۔ ٹھٹھہ میں تین بھائی اور دو بہنیں۔ سسرال، صدیوں سے ٹھٹھہ میں، میرے ہزبینڈ عظمت علی شاہ، APS ٹھٹھہ میں

واکس پرنسپل ہیں۔ (ماشاء اللہ)

پاکیزہ ✧......کچھ باتیں آپ کی پسند ناپسند کی بھی ہو جائیں شوق سے کیا ڈش کھاتی ہیں...... بناتی کیا ہیں؟ پسندیدہ رنگ، موسم، تفریحی مقام، گیت، کتاب، خوشبو؟

ثمینہ عظمت علی ✧......سب کچھ شوق سے کھاتی اور بناتی ہوں اور کچھ چیزوں کے علاوہ الحمد للہ سب اچھا بناتی ہوں اور کھانے سے زیادہ کھلا کر خوش ہوتی ہوں۔ مجھے سبزیاں پسند ہیں، کھانے پینے کی بہت شوقین ہوں۔ رنگ سفید اور سیاہ، لائٹ پرپل، موسم سردی کا پسند ہے لیکن اب مشکل لگتا ہے۔ چھوٹے بچوں کو سردیوں میں سنبھالنا مشکل ہوتا ہے۔ مجھے پھرنے سے زیادہ لوگوں سے ملنے کا شوق ہے یعنی شہر کی اہمیت اس وجہ سے کہ وہاں کون رہتا ہے۔ اسلام آباد خاص طور پر رفعت ناہید سجاد سے ملنے گئی۔ کتابیں بے شمار پسند ہیں، مستنصر حسین تارڑ کے ناول بہت پسند ہیں۔ خوشبو سے الرجی ہوتی ہے، استعمال نہیں کرسکتی۔ ویسے open پسند ہے۔

پاکیزہ ✧......کوئی یادگار جملہ جو اکثر ذہن میں آتا ہو، کوئی پسندیدہ شعر بھی بتائیں؟

ثمینہ عظمت علی ✧......تارڑ صاحب کے ناول راکھ کا جملہ "چار مرغابیوں کا خوشی سے کوئی تعلق نہیں۔" اور مرزا اطہر بیگ کے ناول صفر سے ایک تک کا جملہ...... "یہ سالا میرا ہے" یہ دو جملے اکثر بولنے کی عادت ہے۔

پاکیزہ ✧......نثر کے ساتھ شاعری میں بھی طبع آزمائی کی؟ کن شاعر کو زیادہ پڑھتی ہیں؟

ثمینہ عظمت علی ✧......اسکول، کالج میں...... پیروڈیز کے علاوہ کبھی شاعری نہیں کی۔ پہلے شاعری پڑھنے کا بہت شوق ہوتا تھا پھر طبیعت فکشن کی طرف مائل ہو گئی۔ انشاء جی، امجد اسلام امجد، غالب، اقبال، حسرت موہانی، نظیر اکبر آبادی، فراز کی شاعری کے علاوہ میں ان کی شخصیت سے بھی بہت متاثر تھی۔

پاکیزہ ✧......ٹی وی بینی اور فلم بینی کی کس حد تک شوقین ہیں؟ وقت ملے تو کیا دیکھتی ہیں؟

ثمینہ عظمت علی ✧......شوقین تو بہت ہوں لیکن وقت نہیں ملتا پھر لوڈ شیڈنگ اور اس کے علاوہ اتنے چینلز، ڈرامے۔ اگر اتفاق سے کوئی دیکھ لوں اور پسند بھی آجائے تو اگلی بار دن، چینل، وقت نام کچھ یاد نہیں رہتا۔ اب طریقہ یہ نکالا ہے کہ جس کی شہرت سنتی ہوں، کسی ایک دن نیٹ پر بہت ساری اقساط اکٹھے دیکھ لیتی ہوں۔

پاکیزہ ✧......باورچی خانے سے کس حد تک دوستی ہے؟ وہ تو دوستی ہو نہ ہو خاتون کو آدھی سے زیادہ زندگی وہیں بسر کرنی ہوتی ہے۔ آپ کس طرح انتظام کرتی ہیں خوشی، خوشی یا بس مارے باندھے؟

ثمینہ عظمت علی ✧......ارے بھائی کچن سے دوستی مثالی ہے، شادی سے پہلے میں نے کبھی باقاعدہ کام نہیں کیا تھا۔ امی اور دو بڑی بہنوں کی وجہ سے بہت کم کام کیا لیکن جب شادی کے بعد گھر سنبھالا تو مجھے کوکنگ میں بڑا مزہ آیا اور اب تک آتا ہے۔ تو کھانے کا اہتمام تو بہت شوق سے کرتی ہوں۔ لیکن بعد کے کام ہاہاہا (چلیں کبھی آکر دیکھیں گے)

پاکیزہ ✧......کوئی الگ سے ڈش جو آپ نے خود بنائی ہو اور سب نے پسند بھی کی ہو تو ہمارے قارئین سے بھی شیئر کریں؟

ثمینہ عظمت علی ✧......ایسے تجربات تو میں بہت کرتی ہوں، اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ اسی وقت کوئی ڈش ایجاد کر کے بنائی۔ پھر کوئی ترکیب پوچھے تو کیا بتائیں اور کیسے بتائیں کہ کیا، کیا ڈالا ویسے ترکیب بھی کبھی ضرور شیئر کروں گی۔ (ہاں ضرور)

پاکیزہ ✧......ایک خاتونِ خانہ شوہر، بچوں، گھر، رشتے داریاں اور پھر اپنی ذاتی مصروفیت بھی...... کس طرح سنبھال سکتی ہے سب کو کیسے مطمئن رکھ سکتی ہے جبکہ وہ خود بھی خوش ہو مگر کیسے؟ کچھ اپنے تجربے کی روشنی میں بتائیں؟

ثمینہ عظمت علی ✧......ہاں یہ سب کچھ کرنے

میں بعض اوقات بڑی تھکن ہو جاتی ہے لیکن مزہ بھی اسی میں ہے لیکن میں یہ سب کچھ علی (اپنے شوہر) کے تعاون کے بغیر نہیں کر سکتی۔ وہ ہر کام، ہر پلان، ہر پروگرام میں میرے لیے اتنی آسانیاں پیدا کرتے ہیں کہ میں یہ سب کچھ بخوبی کر لیتی ہوں اور اللہ کا احسان ہے کہ اس معاملے میں ماشاء اللہ بہت خوش قسمت ہوں۔ (اور ایسا ہی تمام بیویوں کے شوہروں کو ہونا چاہیے)

پاکیزہ✧......اپنی ذات کو کتنا وقت دیتی ہیں اور کیسے؟

ثمینہ عظمت علی✧......اپنی ذات کیا ہوتی ہے، گھر، گھر والے یہ ہی اپنی ذات ہوتے ہیں۔ اگر اپنی ذات کو وقت دینے سے مراد ظاہری ہے تو جب کسی کی شادی کا کارڈ ملتا ہے تو میری دوست شیریں جو بیوٹیشن ہے، اس کے پاس چلی جاتی ہوں کہ تھوڑی انسان لگوں۔ ویسے تو بس یہ خواہش ہوتی ہے کہ روزانہ تھوڑا کچھ پڑھنے کا وقت مل جائے...... لکھنے کا مل جائے تو کیا ہی بات ہے۔ لیکن جاب کے بعد یہ بھی ناممکن ہو گیا ہے، کالج میں اپنی کلاس لینے کے بعد فری وقت لکھنے پڑھنے میں یا بعض اوقات محض گپ شپ میں گزار دیتی ہوں۔ اس میں بہت مزہ آتا ہے۔

پاکیزہ✧......اپنی زندگی سے کس حد تک مطمئن ہیں مزید کیا کرنے کی تمنا ہے؟

ثمینہ عظمت علی✧......اپنی زندگی سے الحمد للہ بہت مطمئن ہوں۔ اللہ کا کرم اس نے اولاد کی کمی بھی پوری کی۔ اب یہ ہی تمنا ہے کہ اچھی ماں بنوں...... لگے ہاتھوں ایک ناول بھی لکھ ڈالوں۔ ہاں سچ ایک ناول لکھنے کی خواہش ہے۔ (اللہ آپ کی خواہش پوری کرے، آمین)

پاکیزہ✧......ہمارے قارئین کے لیے کوئی پیغام، کوئی بات، کوئی نصیحت......کوئی شگفتہ بات؟

ثمینہ عظمت علی✧......قارئین کے لیے بہت ساری دعائیں، خوش رہیں، پڑھتے رہیں، آج کے زمانے میں قاری ہونا بہت قیمتی چیز ہے۔ (جی بالکل)

پاکیزہ✧......ہماری اس بزم کی بابت بھی ضرور اظہارِ خیال کیجیے کیسا لگا یہاں آنا؟

ثمینہ عظمت علی✧......پاکیزہ کی میں نہایت شکر گزار ہوں۔ آپ لوگوں نے ہمیشہ بہت عزت دی۔ میں نے پاکیزہ کے لیے بہت کم لکھا ہے لیکن جب بھی لکھا، میرا نام ٹائٹل پر آیا۔ اس عزت افزائی پر نہایت مشکور ہوں۔ یہاں یہ بھی بتا دوں کہ پاکیزہ میں مجھے لکھنے کے لیے ہماری سینئر رائٹر اقبال بانو نے بہت موٹیویٹ کیا لیکن سب سے اہم کردار غزالہ آپا (غزالہ نگار اورکزئی) کے ڈنڈے کا ہے۔ انہوں نے نہایت محبت اور نہایت جلال سے حکم دیا کہ پاکیزہ کے لیے ضرور لکھو اور تمام اراکینِ پاکیزہ اور قارئین کے لیے نیک تمنائیں...... ایک مرتبہ پھر آپ سب کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

(ارے اقبال بانو اور غزالہ آپا کا بہت شکریہ)

پاکیزہ✧......بہت شکریہ ثمینہ عظمت علی ہمیں بھی آپ کی آمد سے اور آپ کے خیالات جان کر بہت خوشی ہوئی۔

☆☆☆

جی قارئین! یقیناً آپ بھی آج کی اس بزم سے بہت لطف اندوز ہوئے ہوں گے کہ ثمینہ کی باتوں میں روانی، دراصل سچائی کی وجہ سے ہی ہے کہ جو وہ محسوس کرتی ہیں وہی لکھتی چلی جاتی ہیں۔ ہماری دعائیں ثمینہ کے ساتھ ہیں کہ وہ اسی طرح پاکیزہ کو اپنی تحریروں سے نوازتی رہیں۔ اب اجازت چاہیں گے اس دعا اور خواہش کے ساتھ کہ آپ خود خوش رہیں، اپنے پیاروں کو خوش رکھیں اور سب کو خوش ہوتا دیکھنے کا حوصلہ بھی پیدا کریں۔

جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں
مگر یہ راستے منزل تلک نکلتے ہیں
زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا
عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں

☆☆☆

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور ومعروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماءے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ......!

☆ حمد وستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود وسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا...... اللہ پاک آپ کو ہمیشہ خوش رکھے اور اپنے خزانۂ غیب سے وہ سب کچھ عطا فرمائے جو آپ کے حق میں بہتر ہو...... یاالٰہی دونوں جہاں میں ازل سے ابد تک سب کی خیر ہو اور تو ہم سے ہمیشہ راضی رہے...... الٰہی آمین۔

☆☆☆

☆ پیاری بہنو! گزشتہ ماہ ہم نے جعلی باباؤں سے متعلق دو افسانے کیا شائع کیے تو میرے پاس ٹیلی فون کا تانتا بندھ گیا۔ بے شمار بہنیں تھیں جو جعلی پیروں، فقیروں کی مکاریوں کا شکار ہوئی تھیں اور ہماری ایک مستقل قاری، تبصرہ نگار بہن کا تو ایسا ہولناک خط آ گیا جسے اس ماہ آپ بھی پڑھ کر یقیناً دہل جائیں گی۔ بات صرف اتنی ہے کہ آگ میں جب آپ اپنا ہاتھ جلا لیتی ہیں تب ہی آپ کو پتا چلتا ہے کہ آگ کا کام جلانا ہے گو کہ ہمارے ہاں دینی معلومات بے حد کم ہیں...... پاکستان میں بہت سارے ایسے علاقے موجود ہیں جہاں کے لوگوں کو پاکی اور ناپاکی تک کے بارے میں بنیادی معلومات نہیں ہیں...... بہت سارے لوگ ایسے بھی ہیں جن کو یہ تو معلوم ہے کہ وہ مسلمان ہیں مگر وہ صحیح طرح سے کلمہ تک نہیں پڑھ پاتے، نماز پڑھنا تو کیا وہ وضو تک کرنا نہیں جانتے (اور اس طرف طبقۂ امرا کو توجہ کی شدید ضرورت ہے) بات کہاں سے کہاں چلی گئی...... میں ذکر کر رہی تھی جعلی باباؤں کا...... ان لوگوں کا کاروبار صرف اس وجہ سے ہی چمک رہا ہے کہ وہاں ہماری خواتین جاتی ہیں، وہ لوگ تو آپ کے گھر میں نہیں آ رہے ناں، آپ کیوں ان کے آستانوں پر جاتی ہیں، ہمارے ہاں ایک رویہ اور بھی مقبول ہے کہ فلاں بابا پیسے نہیں لیتا مگر عزت برباد کر دیتا ہے۔ سوشل میڈیا پر ایسے بہت سے کلپس موجود ہیں اور آپ اپنے نام نہاد مسائل کو حل کرنے کے لیے ایسے لوگوں کے پاس جاتی ہیں جن کو اگر شیطان کہا جائے تو درست ہوگا۔ (ان میں جو لوگ واقعی عالم ہیں ان کی تعداد بے حد کم ہے۔

پیاری بہنو! جب آپ صدقِ دل سے یہ کہتی ہیں کہ آپ الحمدللہ مسلمان ہیں تو صرف اپنے اللہ پر یقین رکھیے، وہی ہے جو ہر چیز پر قادر ہے...... وہ سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے، وہی تو ہے جو ہماری دعائیں سنتا ہے تو پھر اسی سے مانگو جو سب کو دیتا ہے، یاد رکھیں غیر اللہ کے آگے سر جھکانا اور اس سے مانگنا سخت گناہ ہے اور اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہم سب کو دین کی راہ پر چلائے اور نیک کام کی توفیق عطا فرمائے آمین ثم آمین......

☆ آیئے اب سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے پہلے صرف ایک بار درود ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔

مصنفات، شاعرات اور قارئینِ پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ شاعرہ شگفتہ شفیق ماشاء اللہ نانی بن گئی ہیں، ان کی لندن میں مقیم بیٹی ڈاکٹر کنزل کے ہاں پیاری سی بیٹی ہوئی ہے، جس کا نام ضویا تابش رکھا گیا ہے۔ (بہت ساری دعائیں) اور ان دنوں شگفتہ اپنی بیٹی اور نواسی کے پاس لندن میں ہیں۔ (ماشاء اللہ)

☆ اسلام آباد میں مقیم میری بھتیجی ڈاکٹر بینش ندیم کے ہاں پیاری سی بیٹی ہوئی ہے۔ (مبارکباد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار ثمینہ وحید، پنجاب کے بھائی کے ہاں جڑواں بچیاں ہوئی ہیں۔ (مبارکاں)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار اور شاعرہ فریدہ جاوید فری ان دنوں لاہور سے مری گئی ہوئی ہیں (ماشاء اللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری حمیرا ساجد، لاہور کے والدین انگلینڈ گئے ہوئے ہیں اور وہ ان کو بہت یاد کر رہی ہیں۔ (آ جائیں گے جلد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری زیبا نعیم، کینیڈا سے کراچی آئی ہوئی تھیں، ایک ماہ قیام کے بعد وہ یہاں سے امریکا روانہ ہوگئیں۔ (جہاں رہو خیر و عافیت کے ساتھ رہو)

☆ مصنفہ تسنیم منیر علوی، دبئی میں رہتی ہیں، اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ حج کی ادائیگی کے لیے کراچی سے سعودی عرب روانہ ہوئیں۔ (دلی مبارک باد)

☆ ڈاکٹر آرزو عظیم کے بھائی سید عدیل جیلانی اپنی اہلیہ نیلوفر کے ساتھ حج کی ادائیگی کے لیے سعودی عرب روانہ ہوگئے۔ (مبارک باد)

☆ 4 ستمبر عالمی یوم حجاب کی مناسبت سے ریجنٹ پلازہ کراچی میں بھی ایک پُر وقار تقریب منعقد کی گئی جس میں عورت اور اس کا حجاب مرکزِ گفتگو تھا اور حجاب کی مذہبی ضرورت، قرآن حکیم اور دنیاوی افادیت کے بارے میں سیر حاصل گفتگو کی گئی۔ اور اپنے، اپنے شعبوں میں نمایاں کارکردگی دکھانے والی باحجاب خواتین سے سیر حاصل گفتگو بھی ہوئی...... اس تقریب میں رائٹرز کی بڑی تعداد تھی جس میں سیما ردا، صحافی شہر بانو، رضیہ سلطانہ، نگہت اعظمی، غزالہ رشید، نزہت اصغر، کلثوم عباس، صبیحہ شاہ و دیگر نے بھرپور شرکت کی۔

☆ پاکیزہ کی نئی تبصرہ نگار طاہرہ، خوشاب نے جڑی بوٹیوں کا ایسا تیل بنایا ہے جس کے استعمال سے آپ کے گرتے بال رک جائیں گے۔ رابطہ کرنا چاہیں تو نمبر یہ ہے۔ 0333.6819533

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری شہلا ظفر، کراچی کا پتے کی پتھری کا آپریشن ہوگیا ہے مگر ان کی پوری پتھری نہیں نکل پائی ہے اور یورین انفیکشن بھی بہت بڑھ گیا ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری غزل خان، امریکا کو آپ کی دعاؤں کی بدستور ضرورت ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری آرزو شاہد، کراچی بسترِ علالت پر ہیں۔

☆ ہم سب کی لاڈلی امینہ عندلیب، سلانوالی اس ماہ شدید بیمار ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری انجم طاہر کے بہنوئی کے لیے دعائے صحت کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

✉ شاہینہ مبارک، ہالہ سے۔ ”پہلی مرتبہ کسی بھی ڈائجسٹ کے لیے رائے اس لیے دے رہی ہوں کہ انجم باجی ہم آپ سے بہت پیار کرتے ہیں اور پاکیزہ میں لکھا ہر لفظ پڑھتے ہیں۔ اور ہم بہت کچھ اس سے سیکھتے ہیں۔ امینہ عندلیب اور دیگر تمام بیمار بہنوں کے لیے مشورہ ہے کہ جب بھی وہ دوائی کھائیں وہ اللہ شافی اللہ کافی اللہ معافی پڑھ کر کھایا کریں۔ انشاء اللہ بڑی سے بڑی بیماری ختم ہوجائے گی۔“ (پیاری شاہینہ مبارک اس محفل میں خوش آمدید اور اب اس محفل میں آتی جاتی رہنا کہ ہم بھی اپنی سب بہنوں سے پیار کرتے ہیں۔ ہاں امینہ اور دیگر بہنیں جزاک اللہ کہہ رہی ہیں)

✉ شگفتہ شفیق، لندن سے۔ ”باجی میں اپنی نواسی کی وجہ سے بیٹی کنزل کے پاس ہوں اور یہاں بہت سی بہنوں سے ملاقات بھی ہو رہی ہے۔ ستمبر کا پاکیزہ پڑھا، ٹائٹل دلہن نمبر کے حوالے سے بہت اچھا ہے، اداریہ تو ہمیں ہمیشہ ہی اچھا لگتا ہے۔ اس ماہ نیلوفر عباسی کے انٹرویو کا دوسرا حصہ پڑھا بہت لطف آیا۔ ان کے پرانے ڈرامے یاد آئے، شائستہ زریں کا انٹرویو ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی اچھا رہا۔ گم شدہ محبت کی تازہ قسط ہنسی سے بھرپور رہی...... اب ناول تیزی سے بڑھ رہا ہے اور لوگوں کے رویے اور چاہتوں کے نئے ابواب سے روشناس کروا رہا ہے۔ رفعت سراج کا ابھی آغاز ہے اس لیے آئندہ رائے دوں گی۔ یقیناً اچھا ہی ہوگا۔ دُرِ ثمن بلال کی قسط اچھی لگی۔ فاخرہ گل کا اندازِ تحریر ہمیں پسند ہے۔ اس ماہ جو افسانے خصوصی طور پر پسند آئے وہ ماجرہ ریحان، نگہت اعظمی، طیبہ عنصر مغل، ہالہ احمد، سلمٰی غزل کے تھے مگر بقیہ افسانے بھی اچھے ہیں۔“ (پیاری شگفتہ تبصرے کا شکریہ...... ہاں سنا ہے کہ لندن کے ایک ٹی وی چینل پر تمہارا انٹرویوز بھی آیا ہے، مبارک ہو)

✉ تسنیم فضل خالق، پشاور سے۔ ”آپ نے کبھی غور کیا انجم کہ زندگی میں جتنی زیادہ سہولتیں آگئی ہیں اتنی ہی مصروفیت بڑھ گئی ہے۔ پتا نہیں اس کی وجہ کیا ہے...... حالانکہ پہلے کپڑے ہاتھ سے دھلتے تھے اب مشین سے دھوئے جاتے

ہیں، مسالے اب ریڈی میڈ ملتے ہیں پہلے خود پیسنے پڑتے تھے۔ مصروفیات کیوں بڑھ گئی ہیں انجم...... میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا آپ ہی بتادیں (وقت میں برکت نہیں رہی شمیم) ستمبر کا شمارہ ابھی کل ہی آیا ہے اور حسب معمول گل رخ کی دسترس میں ہے آپ کا ناول دلوں میں جگہ بناتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے ہر قسط کے بعد اگلی قسط کا انتظار ہوتا ہے۔ پروین عذرا تشنہ کا افسانہ بہت پسند آیا، بدلی ساون کی رت، ”دُرِ ثمن بلال کے ناول اے عشق تُرے ہیں کھیل عجب کی یہ قسط بھی بھرپور رہی نیلوفر عباسی سے ملاقات مزہ دے گئی۔ شمہ وری یار، بار یاد آتا رہا۔ امینہ عندلیب، شہلا ظفر، ڈاکٹر میمونہ غوری، غزل خاں، ذکیہ ایوب، عذرا بی بی اور باقی سب کے لیے صحت اور زندگی کی دعائیں قبول ہوں۔“ (تبصرے اور دعاؤں کے لیے ممنون ہوں)

✿ افتخار شوق، میاں چنوں سے۔ ”انجم امید ہے سب خیریت ہوگی پاکیزہ چونکہ میرا اپنا ہے اور آپ بھی اس میں میری سرگرمیاں اور خبریں لگاتی رہتی ہیں اس لیے دل بھی چاہتا ہے کہ جب بھی کوئی ایسی خاص بات ہو تو اپنی بہنوں کی محفل میں اور مصنفات کی سرگرمیوں میں ضرور لگواؤں تو جناب ضلع خانیوال اور ضلع جھنگ کی ٹیچرز اور اسٹوڈنٹس گرلز گائیڈ کیمپ کے سلسلے میں اس دفعہ گھوڑا گلی گئیں۔ جہاں ہم نے مری کے پُرفضا ماحول میں یوم آزادی منایا۔ چودہ اگست کی صبح flag hois ting کی تقریب ہوئی اس میں طالبات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ویسے بھی رائٹرز کو ہر جگہ پروٹوکول ضرور ملتا ہے تو جناب ہم نے ان خوب صورت قدرتی مناظر کو دیکھتے ہوئے اپنا یوم آزادی منایا۔“ (آپ نے بالکل صحیح کہا رائٹر کی ہر جگہ عزت ہوتی ہے...... آپ کو بے حد مبارک باد آپ نے اپنا یوم آزادی اپنے وطن کے قدرتی مناظر دیکھتے ہوئے منایا)

✿ عتیقہ محمد بیگ، سیالکوٹ سے۔ ”اس ماہ کا پاکیزہ دیکھا، سرورق پر بہت سی مصنفات کے نام دیکھے بہت اچھا لگا۔ میں اپنی ٹی وی کی مصروفیات کے باعث رابطہ نہیں کرسکی مگر جنوری میں جب گم شدہ محبت کی پہلی قسط شائع ہوئی تھی اور آپ نے پروڈکشن ہاؤسز کے ماحول کے بارے میں بڑی خوب صورتی سے لکھا تھا اور میں نے پاکیزہ کے آفس میں فون کرکے اس کی تعریف کی تھی۔ یہ ناول بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ دیگر کہانیاں بھی بہت عمدہ ہیں، خاص طور پر نیلوفر عباسی کا انٹرویو بہت اچھا لگا ہے۔“ (عتیقہ بہت دنوں بعد آئیں...... امید ہے کہ اب اتنی لمبی غیر حاضری نہیں ہوگی۔ جی ہاں، آفس میں بذریعہ فون رائے دینے والی بہنوں کے نام سے مجھے ہمیشہ آگاہ کیا جاتا ہے۔ جنہیں میں بہنوں کی محفل میں بھی شامل کیا کرتی ہوں مگر پہلا حق ان بہنوں کا ہوتا ہے جو ہمیں خطوط ارسال کرتی ہیں)

✿ ثمینہ، لاہور سے۔ ”میں پاکیزہ میں سب سے زیادہ دلچسپی سے آپ کے بتائے ہوئے روحانی مشورے پڑھتی ہوں۔ سرورق مجھے سمپل سے پسند ہیں۔ پاکیزہ سمیت زیادہ تر رسائل میں دلہن، دلہن کی تصاویر سرورق پر شائع کی جاتی ہیں۔ ہم دلہنوں کو دیکھ دیکھ کر بور ہوچکے ہیں۔ پلیز سمپل لڑکیوں کی تصاویر بھی لگایا کریں۔“ (ثمینہ بہن گزشتہ شمارہ دلہن نمبر تھا تو اس میں دلہن لگانی ضروری تھی۔ مگر آپ کا مشورہ نوٹ کرلیا گیا ہے)

✿ نفیسہ طیب اور پروین طیب، کراچی سے۔ ”باجی ہم بہنیں اپنے بچپن سے ہی پاکیزہ رسالہ بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس میں شامل کہانیاں و دیگر تمام سلسلے بہت ہی اچھے اور کوئی نہ کوئی اصلاحی پہلو لیے ہوتے ہیں۔ میں تو اپنی بچیوں کو پڑھواتی ہوں۔ ایک تقریب میں آپ لوگوں سے ملاقات کرکے بہت اچھا لگا تھا۔ میں نے کبھی خط تو نہیں لکھا مگر سب سے ملنے کی بہت تمنا تھی کچھ سے تو ملاقات ہوگئی۔“ (انشاء اللہ ملاقات بھی ضرور ہوگی، اگر آپ تبصرے بذریعہ ڈاک بھیجیں تو مجھے خوشی ہوگی)

✿ زرینہ مشتاق، منڈی بہاؤالدین سے۔ ”آج کوشش کرکے تبصرہ کررہی ہوں اگر لگادیں تو مہربانی ہوگی۔ پاکیزہ میں کچھ اور نیا بھی سلسلہ شروع کریں۔ ویسے باتیں بہار و خزاں کی بھی اچھا ہے مگر کبھی، کبھی نہیں ہوتا...... میں نے بھی لکھا ہے کچھ آپ کو بھیجوں گی۔ کیا پاکیزہ چھ ماہ کے لیے بھی گھر میں لگوا سکتے ہیں۔ یہاں میرے گھر سے دور ملتا ہے تو میں کافی دیر سے اس ماہ کا پڑھتی ہوں۔ آپ لوگ ٹریجڈی والی کہانیاں بھی لگایا کریں جو دل میں جا کر لگیں۔ اسلامی مضمون کافی اچھے ہوتے ہیں، بہت کچھ ہم سیکھتے ہیں، اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔“ (زرینہ بیٹا آپ باتیں بہار و خزاں کے لیے اپنے جوابات بھیج دیجیے...... دیگر بہنیں بھی ضرور بھیجیں۔ ہاں آپ کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے جی ہاں پاکیزہ چھ ماہ کے لیے 400 روپے مع ڈاک خرچ بھیج دیں رسالہ آپ کے گھر پر آجائے گا)

٭ کوثر یوسف، میاں چنوں سے۔ ”میں میاں چنوں میں اپنا ایک اسکول چلا رہی ہوں، سارا دن بچوں کے ساتھ ہی گزرتا ہے۔ مگر گھر جا کر پاکیزہ لازمی پڑھتی ہوں۔ سب سے پہلے بہنوں کی محفل اور روحانی مشورے پڑھتی ہوں۔ پاکیزہ کے ناولز بھی بہت اچھے ہوتے ہیں آپ کا ناول گم شدہ محبت اس وجہ سے زیادہ پسند آ رہا ہے کہ اس میں دیورانیاں، جیٹھانیاں، کزن در کزن جیسی محبتیں اور لڑائی جھگڑے نظر نہیں آ رہے بلکہ اس سے ہم بہت کچھ سیکھ رہے ہیں۔ یوں تو پاکیزہ کی ہر کہانی ہی سبق آموز ہوتی ہے۔ ہاں نیلوفر عباسی کا انٹرویو کا دوسرا حصہ پڑھ کر بھی بہت مزہ آیا۔“ (پیاری کوثر یوسف اس محفل میں خوش آمدید، امید ہے کہ آئندہ بھی اپنی رائے دوگی بلکہ بھرپور دوگی...... ٹھیک ہے ناں)

٭ سلمٰی بانو، گجرات سے۔ ”باجی گزشتہ دنوں میرے بھائی کی شادی ہوئی میں اس کی نیوز لگوانا چاہتی تھی مگر آپ سے فون پر رابطہ ہی نہیں ہوا۔“ (پیاری سلمٰی اللہ آپ کو خیر سے مزید خوشیاں عطا فرمائے۔ آپ کا اگر مجھ سے رابطہ نہ ہو سکے تو پاکیزہ کے آفس میں آمنہ حماد کو بھی اپنی نیوز لکھوا سکتی ہیں۔ وہ سب میرے پاس ہی آجاتی ہیں۔ آپ بے فکر رہیں۔ فون نمبر ان صفحات کے آخر میں درج ہیں)

٭ شہناز قدیر، نارتھ ناظم آباد، کراچی سے۔ ”پاکیزہ کے شمارے پابندی سے پڑھتی آ رہی ہوں۔ شروع میں بہت حصہ لیا ہے۔ پھر 1980ء میں شادی ہو کر یو اے ای چلی گئی وہاں 24.25 سال رہ کر آئی مگر وہاں بھی برابر ہر ماہ پاکیزہ پڑھتی اور دوستوں کو بھی دیتی تھی...... مصروفیتوں کی انتہاؤں پر رہی مگر کسی بھی حال میں مطالعہ نہیں چھوڑا ہے اب تک۔ ہاں نالائقی یا مجبوری جو بھی سمجھ لیں کہ پابندی سے جس طرح پڑھتی ہوں محفل میں شامل نہیں ہو پاتی ہاں روح وہیں رہتی ہے۔ اس بار بڑی مشکلوں سے حاضر ہوئی ہوں امید ہے کہ جگہ ضرور دیں گی۔ ماشاء اللہ پاکیزہ روز بروز نکھرتا ہی رہا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ...... سبھی اپنی جگہ بہترین کام کر رہے ہیں۔ عظمیٰ آفاق کی ہر تحریر خاص کر مختلف موقعوں کا حال سچائی کے ساتھ، مزاح بھی، مزہ ہی دے جاتا ہے۔ ذہن فریش کرنا ہو تو عظمیٰ اور انجم انصار کو پڑھ لو...... اور زیادہ ہی فریش کرنا ہو تو بذاتِ خود ان سے مل لو...... (اللہ خوش رکھے) اب آئیں اگست کے پاکیزہ کی طرف...... تمام ناولز زبردست ہیں کس، کس کی تعریف کروں...... جلترنگ لاجواب، نیلوفر علیم کی باتیں بہت مزہ دیتی ہیں۔ نایاب جیلانی کا دیارِ صبح شروع سے آخر تک دلچسپ رہا۔“ (پسندیدگی کا شکریہ...... ہاں مجھے یاد ہے آپ سے کوئی دس بارہ سال پہلے ملاقات ہوئی تھی۔ اس زمانے میں بڑے دلچسپ تبصرے بھی بھیجا کرتی تھیں۔ اور اب مجھے اسی پرانی شہناز کے تبصرے چاہئیں اور وہ بھی باقاعدگی کے ساتھ۔)

٭ حرا قریشی، بلال کالونی ملتان سے۔ ”بصد احترام قلم کو آج زحمت دی کہ بہنوں کی معتبر محفل میں کچھ حرا کا حصہ بھی ڈال دیا جانا چاہیے۔ پاکیزہ عزیزِ من میں موثر تحریریں ہیں، میں سوچ رہی ہوں کہ پہلے مجھے کچھ کہنا ہے پڑھوں یا بہنوں کی محفل کا ابتدائیہ...... اپنی ذات سے منسلک انجم انصار جی کے لفظوں سے انسیت کی طلوع ہوتی کرنیں محسوس ہوتی ہیں۔ دین کی باتوں کی چھاؤں میں خود کو لا کر بٹھایا تو نور کے اشجار سے نکلتی ضیا نے تاباں ہوا کے جھونکے فراہم کرتے استقبال کیا۔“ (شکریہ پیاری حرا، اگر سادہ لفظوں میں تبصرہ کرو تو احسان مند ہوں گی تمہارا بقیہ خط اس وجہ سے شامل نہیں کیا کہ اس کی تشریح بہت سی بہنیں نہیں کر سکیں گی)

٭ ایک ہولناک خط بہن این ایس کا پنجاب سے۔ ”اگست کے شمارے میں کچھ عامل حضرات کے متعلق دو افسانے پڑھے۔ یقین کریں کہ میں ان عاملوں کی وجہ سے گھر سے بے گھر ہوں۔ لاکھوں کا قرض ہے، بہن بھائی چھوٹ چکے ہیں، والدین، بیٹیوں، بہوؤں کے آگے مجبور ہیں، عزت بھی گئی، پیسہ بھی گیا اور کام کرنے کے بجائے تباہی پھیر کے رکھ دی ذلیلوں نے...... یہ عامل نہیں عزتوں کے لٹیرے ہیں۔ زیادہ تر عامل وہ ہیں جو بدکاری کیے بغیر کام میں ہاتھ نہیں ڈالے گا۔ لیکن ہم عورتیں بے وقوف ہوتی ہیں، عقل سے پیدل جو ان بدکاروں کو پیر و مرشد سمجھ لیتی ہیں۔ میرے جیسی کئی عورتیں ہیں جو ان باباؤں سے اپنی عزت لٹا بیٹھی ہیں لیکن وہ زبان کھولنے کے قابل نہیں۔ میری تو چلیں عمر گزر گئی لیکن ایک 20 سالہ پیاری سی لڑکی جو کالج کا یونیفارم پہنے ہوئے تھی اور ایک عامل کے پاس آئی کسی لڑکے سے محبت کا چکر تھا اور بدلے میں اپنی عزت لٹا بیٹھی اس کا کیا ہوا ہوگا وہ دروازے کے آگے بیٹھی رو اور گرلا رہی تھی لیکن میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکی...... بہت سارے واقعات بکھرے پڑے ہیں۔ جگہ جگہ جو کھولے بیٹھے ہیں، زیادہ تر عامل بدکار ہیں اور بلیک میلر ہیں انہوں نے زنا کے اڈے

کھولے ہوئے ہیں...... ایک عامل کے پاس ایک لڑکی آئی تھی اس نے پسند کی شادی کرنی تھی شادی تو خیر خود ہی ہوئی مگر اس لڑکی کی عامل بابا سے ایک بیٹی پیدا ہوئی ہے جس کے ساتھ پسند کی شادی کی وہ اسے دھوکا دے رہی ہے اولاد کسی کی ہے پال کوئی اور رہا ہے۔ خدا کی قسم میں خود گواہ ہوں۔ اخباروں میں اشتہار آتا ہے کہ تعویذ ہاتھ میں محبوب آپ کے پیچھے، پیچھے یا پسند کی شادی، کاروبار، جادو کا توڑ وغیرہ...... یہ سب جھوٹ بولتے ہیں یہ کمائی کا ذریعہ ہے۔ بہنوں سے میری گزارش ہے کہ چاہے کوئی کتنی ہی قسمیں کھائے اور کہے کہ میں یہ کام کردوں گا قطعاً نہ مانیں آپ کو کوئی پریشانی ہے اللہ سے مدد مانگیں، نماز کے ساتھ دعا اور قرآن کے ساتھ‘ میں نے باباؤں پہ اعتبار کیا ان کو سچا مانا لیکن کیا ہوا سب کچھ چھن گیا۔ والدین میری شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن میں کسی کو دھوکا نہیں دے سکتی اس قابل بھی نہیں ہوں۔ میں اپنا دکھ کسی کو نہیں بتا سکتی۔ خود روتی ہوں خود ہنستی ہوں رات کا انتظار ہوتا کہ کب رات ہوگی اور میں کھل کے روؤں گی کہ دنیا والوں کے سامنے بندہ رو بھی نہیں سکتا...... بڑی بیٹی تھی والدین کی لاڈلی بھی تھی ہر بات مانی گئی۔ آج ایک صاحب کے گھر کام کرتی ہوں کوارٹر ملا ہوا ہے 800 تنخواہ ہے جب تک گھر میں تھی عاملوں کے شر سے محفوظ تھی کسی نے بغیر نقاب دیکھا تک نہیں تھا آج صاحب کے جوتے تک مجھے لا کر پکڑانے پڑتے ہیں تو زندگی سے تنگ آچکی ہوں لیکن اللہ سے یہی دعا کرتی ہوں کہ مجھے قرض سے نجات مل جائے پھر بے شک موت آجائے۔ آپ سب بہنیں میرے لیے دعا کیجیے گا...... میرے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ شاید کوئی بہن ان ذلیلوں کے شر سے بچ جائے ایک اور بات جو کہنا چاہوں گی کہ کبھی اپنے والدین خاص طور پر ماں کو بتائے بغیر کوئی کام نہ کریں۔ والدین آپ کے لیے اچھا سوچ رہے ہوتے ہیں وہ آپ کے دشمن نہیں اگر آپ من مانی کرتے ہیں تو پھر میری طرح پچھتاتے ہیں۔ اب کیا پچھتائے ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت...... ذکیہ آنٹی سے دعا کے لیے درخواست ہے۔ باجی اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس کو شائع کردیں لیکن میرا نام شائع نہ ہو کیونکہ پہلی دفعہ میں یہ راز کسی کو بتا رہی ہوں۔“ (اللہ آپ کی تمام پریشانیاں دور فرمائے۔ آپ کا نام بہنوں کی محفل میں جانا پہچانا ہے اس لیے احتیاط کی جارہی ہے)

٭ رخسانہ ناصر، کراچی سے۔ ”اگست کے شمارے میں بہنوں کی محفل میں اپنے آپ کو شامل دیکھ کر بچوں کی طرح سارا دن خوشی مناتی رہی، بیٹی کو پکڑ کر دکھایا کہ دیکھو میرا خط بھی شامل ہوگیا تمام اچھی بہنوں کے خطوں کے ساتھ پھر باری، باری سب نے میرا خط پڑھا۔ کوئی ہنس دیا کسی نے مسکرا کر دیکھا۔ خیر میرے ہونٹوں پر رات تک مسکراہٹ جمی رہی۔ انجم آپ کا بہت، بہت شکریہ کہ آپ نے میرے مان کو قائم رکھا۔ ساون کا سروے ہمیں بھی بہت کچھ یاد دلا گیا۔ بدلی ساون کی رُت پڑھ کر بے اختیار پاکستان زندہ باد کا نعرہ بلند ہوا۔ گم شدہ محبت تو بڑا سسپنس پھیلا رہی ہے کہ آخر اصل ہیرو کون ہے۔ اور ہاں جناب عذرا جی کے انٹرویو کے لیے اور کتنا انتظار باقی ہے۔ نیلوفر کے فسانۂ زندگی نے ساری پرانی یادیں تازہ کردیں اس دور کے سارے ٹی وی ڈرامے نظروں میں گھوم گئے میٹھے لفظوں والی میٹھی سی گڑیا عظمیٰ آفاق کو عمرے کی بہت مبارک باد میری طرف سے، انجم میں نے بھی اپنی پوتی کا نام حورعین رکھا ہے۔ دعا کریں کہ وہ بھی سرگودھا کی سعدیہ ہما شیخ کی حورعین کی طرح ذہین اور قابل نکلے، آمین۔“ (تبصرے کا شکریہ...... آپ کی پوتی کے لیے دعائیں...... انشاء اللہ آپ سے ملاقات جلد ہوگی)

٭ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ ”اگست کا شمارہ خوب صورت سرورق سے سجا میرے ہاتھوں میں ہے۔ دین کی باتیں پڑھ کر اپنے ایمان کو تازہ کیا۔ رضوانہ پرنس نے ہماری اپنی شہنوری، نیلوفر عباسی کا دلچسپ انٹرویو کی پہلی قسط فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ کی صورت میں پڑھنے کو ملی مزہ آگیا۔ نیلوفر عباسی جب ریڈیو پر کمرشل پروگرامز کیا کرتی تھیں تو میرے میاں جانی پرنس افضل شاہین شادی سے پہلے ان کے کمرشل پروگرامز میں خطوط لکھتے تھے اور یادگار کے طور پر کئی انعامات تو اب بھی گھر پر رکھے ہیں، ہوسکتا ہے نیلوفر عباسی کو بھی میرے میاں کا نام ذہن میں ہو۔ قلعہ روہتاس کے بارے میں پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ پچھلے ماہ ہم سب کی لاڈلی آپی فریدہ جاوید فری کی طرف سے میرے لیے ایک بہترین سوٹ، خوب صورت پرس اور پرفیوم کا تحفہ بطور خاص عیدی بھیجا گیا جس کے لیے میں ان کی بہت شکرگزار ہوں۔“ (آپ کی رائے پہنچائی جارہی ہے)

٭ نرگس نسیم، صابہ موہڑہ چکوال سے۔ ”ماہ اگست پاکیزہ کے شمارے نے بہت ترسا، ترسا کر اپنے درشن کرائے۔ مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ نے بہت حساس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے اردگرد لوگوں ہی

کو لے لیں جن میں بے پناہ ٹیلنٹ ہوتا ہے مگر وہ اپنے اندر کی خوبیوں سے آگاہ ہوتے ہوئے بھی ان کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کا شعور نہیں رکھتے...... رفعت سراج کا نیا ناولٹ پہلی قسط ہی پڑھ کر لگتا ہے کہ اچھا ناول ہوگا۔ گم شدہ محبت شہلا کی نادانیوں سے خوب محظوظ ہوتے ہوئے پتھر کا دیس میں نت نئے کرداروں ان کی گھٹیا ذہنیت سوچ، پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ پچھلی قسط میں تو ہم علیزہ کو فراڈی سمجھے تھے مگر اس قسط میں علیزہ سے بڑھ کر بھی دھوکے باز کردار نکلے...... دیارِ صبح کے اجالوں میں اینڈ اچھا تھا۔ بہنوں کی محفل میں نگہت سیما کا خط بہت پسند آیا۔ آپی پلیز ان کا بھی انٹرویو لیں ناں...... (نگہت سیما کا انٹرویو بہت جلد شائع ہوگا) جلترنگ کے دونوں خاکے بے حد دلچسپ تھے۔ افسانوں میں مجھے آمنا ہے، پڑھ کر بہت افسوس ہوا اور اسی سے ملتا جلتا ناولٹ آئینوں کے درمیان پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ہمارے علاقے میں بھی اسی طرح کا واقعہ ہوا تھا۔ لڑکیاں احتیاط کریں۔ نیلو کی پیار بھری باتوں کو پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ ان کی پیار بھری باتیں پڑھنے میں اتنی محو ہوئی کہ باقی آئندہ کا پڑھ کر منہ کڑوا ہوگیا۔ (ستمبر میں نیلوفر کے انٹرویو کی دوسری قسط پڑھ کر آپ کا موڈ اچھا ہوگیا ہوگا)

سدرہ کلثوم مروت، صوبہ سرحد سے۔ ''پاکیزہ کے سلسلے وار ناولوں کی تو کیا ہی بات ہے واؤ زبردست...... پاکیزہ ہمیشہ آگے جارہا ہے، سب سے آگے۔ ہماری ڈھیروں دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔'' (دعاؤں کے لیے شکریہ، پسندیدگی کا شکریہ...... دعاؤں کے لیے جزاک اللہ)

صدف نورین، لاہور کینٹ سے۔ ''پاکیزہ سے بہت مضبوط رشتہ قائم ہوچکا ہے، جب تک پاکیزہ کا مطالعہ نہ کرلوں چین نہیں ملتا۔ پاکیزہ کے سارے سلسلے بہت عمدہ ہیں۔ ہماری تمام رائٹرز بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ آنٹی مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ مجھے کہانی لکھنے کا شوق ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو ایک کہانی لکھ کر بھیجوں آپ کو اگر پسند آئی تو آپ شائع کردینا۔'' (صدف آپ کہانی کو آپ بیتی اسٹائل میں لکھیے اور شروع میں مختصر سی)

نگینہ ضیا بخش، کراچی سے۔ ''ٹائٹل گرل ماریہ رضوی کیوٹ لگی روز بیوٹی پارلر کا میک اپ شاندار تھا خاص کر آئی میک اپ...... مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ نے بہت کچھ لکھ دیا...... زورِ قلم اور زیادہ...... دین کی باتوں سے دل منور کیا۔ سبحان اللہ...... گم شدہ محبت کی یہ قسط بھی مزہ دے گئی۔ ویری ویل ڈن باجی شہلا کے ساتھ برا مت کیجیے گا پلیز...... افسانے سب ہی زبردست لگے۔ خاص کر بدلی ساون کی رُت بدلی، پروین عذرا انجم برستا ساون اور مس غزالہ فرخ نے بھی بہت زبردست لکھا شکر ہے زوہا کو سائبان ملا۔ رفاقت جاوید نے بھی خوب لکھا...... رفعت سراج کے ناول کی پہلی قسط پسند آئی باقی تحریریں ابھی پڑھی نہیں اس لیے تبصرہ محفوظ...... شمع ہدایت پر محترمہ اختر شجاعت صاحبہ کو جزاک اللہ ہی کہوں گی زورِ قلم اور زیادہ...... نیلوفر عباسی سے مل کر مزہ آیا اب اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار رہے گا کیونکہ یادیں بہت دلچسپ ہیں، قلعہ روہتاس کی سیر اچھی لگی۔ شائستہ زریں کا سروے ہمیشہ کی طرح شاہ کرے لگا، ویری ویل ڈن۔ شگفتہ شفیق کے جوابات مزے کے لگے۔ سیما رضا کے جوابات میں چھپے دکھ کو میں نے بہت محسوس کیا۔ عظمیٰ آفاق اور ان کی فیملی کو عمرے کی سعادت بہت، بہت مبارک ہو۔ عظمیٰ جلدی سے سفرنامے کے ساتھ حاضر ہو جاؤ اور ہمیں بھی ان پاک جگہوں کی سیر کراؤ پلیز...... اللہ ہم سب کو ایسی پاک جگہ کی

انتقالِ پُرملال

جاسوسی ڈائجسٹ کی مدیرہ لبنیٰ خیال کے شوہر مختار آزاد 19 اگست کی شب کے اولین لمحات میں خالقِ حقیقی سے جاملے۔ ادارہ پسماندگان کے دکھ میں برابر کا شریک ہے۔ ہماری دعا ہے کہ رب العزت مرحوم کی مغفرت فرمائے اور انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ مرحوم ایک معروف کہانی کار اور مترجم تھے۔ اردو، سندھی اور انگریزی زبانوں پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ بی بی سی سے نیشنل بک فاؤنڈیشن تک بہت سے خوشحال اور معتبر اداروں سے وابستہ رہے لیکن اپنی اصول پرستی کی بنا پر کہیں بھی زیادہ عرصے سمجھوتے نہ کرسکے۔ ایسی نوبت آئی تو اپنا راستہ ہی بدل لیا۔ نام کے ساتھ آزاد کے لاحقے کا اثر تھا یا جبلت کا...... کہ مرحوم آخر ایام میں آزادرہ کر اپنی مسہری اور لیپ ٹاپ کے ذریعے آزادی سے روزی کماتے اور اپنے اہلِ خانہ کی کفالت کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ لبنیٰ کو صبر، ہمت اور استقامت عطا فرمائے اور وہ اپنی تین اولادوں کو زندگی میں بہتر مقام دلانے میں کامیاب رہیں۔ آمین۔

زیارت نصیب کرے، آمین۔" (تبصرے کا شکریہ آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

✉ بہن این اے امریکا۔ آپ کا خط پڑھا...... اس تمام معاملے میں کہیں نہ کہیں آپ کی سہیلی بھی قصور وار ضرور ہوگی۔ تالی ایک ہاتھ سے کبھی بجا نہیں کرتی ہے۔ اس سے کہیں کہ فی الحال وہ صبر سے سب دیکھے...... اور اپنی جانب سے اپنے شوہر کا خیال رکھے...... ورنہ گھر توڑنا تو کوئی مشکل کام نہیں ہوتا...... یہ تو کبھی بھی کیا جا سکتا ہے۔ نماز کی باقاعدگی رکھے اور روزانہ سورۂ بقرہ...... پڑھے چاہے تھوڑی ہی پڑھے...... دیگر باتوں کے لیے آپ مجھے فون کر سکتی ہیں۔ (021.36964779)

✍ طیبہ عنصر مغل، راول پنڈی سے۔ "بہنوں کی محفل میں سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ رضوانہ پرنس اور صائمہ اکرم دونوں مصنفات کے دکھ میں برابر کا شریک محسوس کرتی ہوں اور مرحومین کے لیے دعائے مغفرت اور لواحقین کے لیے صبر کی دعا کرتی ہوں۔ سب بیماروں کے لیے دعائے صحت کہ اللہ تعالیٰ ان کو شفائے کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے۔ بالخصوص امینہ عندلیب، فریدہ جاوید فری اور ڈاکٹر ممتاز ضیا صاحبہ کے لیے مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ سچ سچ اتنا کچھ پُراثر کہتی ہیں کہ اس کی واقعی ایک کتاب الگ سے ہونی چاہیے۔ اب میں آتی ہوں آپ کے ناول کی جانب...... ناقص عقل میں یہ بات کچھ کچھ آرہی ہے کہ صبا اور شہلا ہو یا کسی بھی جگہ کی عورت لوگ اس سے فائدہ ضرور اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یقیناً آپ کے گزشتہ ناولز کی طرح یہ ناول بھی بچیوں کو اپنی زندگی کی ترجیحات میں کردار کی عظمت ضرور سکھائے گا۔ بہت ہی سادگی مگر سحر کاری سے لکھا ہوا آپ کا ناول ہمیں قلم کاری کی کاملیت سکھا رہا ہے۔ بہت دلچسپ قسط تھی اس دفعہ...... ہاجرہ ریحان نے بھی قلم سے انصاف کیا۔ عورت کا استحصال یقیناً ہو رہا ہے۔ عذرا فردوس بھی خوب تحریر لے کے آئیں۔ مدیحہ شاہد نے جس طرح خوب صورت اقساط لکھیں ویسا ہی دلکش اختتام بھی کیا۔ نگہت اعظمی کی تحریر بھی دلکش ہے۔ معاشرتی مسئلے کی نشاندہی بہت خوبی سے اجاگر کی۔ ہمیں ہر چیز بے عیب کہاں مل سکتی ہے۔ رفعت سراج جی کا تو نام ہی انجم آپی کی طرح ضمانت ہے کہ سب بہترین ہوگا۔ لیکن اس ناول کو وہ دھیرے، دھیرے کھول رہی ہیں۔ رسالوں کے رنگ مختصر مگر سچی بات ہے نظیر فاطمہ کی دیر سے سمجھے بہت اچھی لگی۔ عمر قید ایک ایسی کہانی جو زندگی کے اصل سبق پڑھا گئی ویل ڈن۔ درثمن اب آپ کا ناول بھی کچھ کم مزیدار نہیں رہا۔ تجسس نے اس کی خوب صورتی دوچند کر دی ہے۔ اوپن میرٹ واقعی یہ تحریر تو سچ اس معاشرے کے گندے ناسوروں کا کچا چٹھا کھول گئی۔ سسرال کا مان اچھی کاوش کہیں کوئی جھول نہیں تھا لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ کرن اپنی ساس کو آنٹی نہیں امی یا ماما کہتی...... سلمٰی غزل نے تو کمال کر دیا دل پر لگی بغاوت کی چنگاری تباہ کر کے تو ہم اچھل کر عقیلہ حق جی کی رسی پر لٹک گئے اور کاش ہر ماں اس رسی کا سرا تھام کر سوچے کہ لوگ مجھ میں ہی تو عکس دیکھیں گے میری بیٹی کا...... بہت خوب وہ ہے ایک افسوس کی کیفیت طاری ہوئی کہ ہم خود کتنی آسانی سے بے ایمانی اور بدعنوانی کے مرتکب ہوتے ہیں اور حکومتوں کو الزام دیتے ہیں۔ فاخرہ گل جی! محبت ہے سمندر سی۔ تو کچھ ایسا سبق پڑھا رہی ہے کہ شادی سے پہلے لڑکا، لڑکی کی انڈر اسٹینڈنگ ضروری ہے۔ خوب صورت تحریر...... موضوع کچھ جما نہیں یہ میرا ذاتی خیال ہے نیلو فر جی کی خوب صورت باتیں واقعی دلپذیر ہیں، شادی مبارک کی تصاویر دیکھ کر میرا بھی دل چاہا کہ اپنی تصویر بھیج دیتی۔ شگفتہ یاسمین کا انٹرویو بہت دلچسپ رہا اور جلترنگ کو پڑھ کر دل چاہ رہا ہے کہ آپ کوئی مزاحیہ ناول بھی تحریر کریں آپی۔ خوب صورت دلہن کارنر کی تحاریر اور بالخصوص عظمٰی کی ترتیب دی ہوئی ڈائری کی کیا بات ہے، ایک بہن لکھتی ہیں کہ پاکیزہ تمام ڈائجسٹوں کا سردار بن جائے گا۔ ابھی نہیں پاکیزہ الحمدللہ سردار ہے۔" (طویل تبصرے کا شکریہ)

✍ سلمٰی غزل، کراچی سے۔ "آپ کا ناول اور بہنوں کی محفل سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ شہلا کی حرکتیں نسوانیت کو مجروح کر رہی ہیں ایسی لڑکیاں مجھے کبھی اچھی نہیں لگیں عورت کو باوقار، باحیا اور خوددار ہونا چاہیے۔ نگہت اعظمی کی کہانی حقیقت سے بے حد قریب بلکہ تجربہ بھی، میں ریٹائرمنٹ کے بعد اور تحریری طور پر رشتہ لگانے کا نیک کام کرنے کی کوشش کرتی ہوں بے حد خوب صورت C.A پیاری لڑکی صرف پیر پر نشان کی وجہ سے مسترد کر دی گئی حالانکہ کاسمیٹک پرابلم تھا اور لڑکی والوں نے خود بتا بھی دیا تھا مجھے بہت افسوس ہوا اور پھر اسی بچی کی بہت اچھے پڑھے لکھے خاندان میں شادی ہوگئی بہت خوب نگہت...... عقیلہ حق کی رسی اچھی رہی لیکن عام طور پر خواتین خاص طور پر ساسوں کو دوسروں کا بال نظر آجاتا ہے اپنی آنکھ کا شہتیر

نہیں اور بڑی بھابی نے غلطی کی مانی ورنہ اپنی غلطی کسی کو نظر ہی نہیں آتی۔ شگفتہ یاسمین اور ان کے شوہر کا انٹرویو سب پر بازی لے گیا۔ ایسی ذہنی ہم آہنگی، مطابقت اور محبت...... ماشاء اللہ ان کے انٹرویو سے نئے شادی شدہ جوڑوں کو سبق لینا چاہیے مجھے بہت اچھا لگا اور دل سے ان کی دائمی خوشیوں کے لیے دعا بھی نکلی......دل تو چاہ رہا تھا کہ ایک ہی نشست میں پورا رسالہ پڑھ لوں مگر اوپر کا گھر نیا بنایا ہے اس لیے آج کل مہمانوں کی آمد و رفت زیادہ ہی ہو رہی ہے۔" (آپ نے اپنی مصروفیات میں بھی خط لکھا۔ بہت شکریہ)

☚ فہمیدہ غوری۔ مقام نامعلوم "پاکیزہ کے سلسلے بہت پسند ہیں۔ آپ سے ملنے بات کرنے کا بے انتہا شوق ہے۔ اللہ پاک آپ کو ہمیشہ صحت مند خوش خرم رکھیں۔ آپ کی شخصیت اور نرم گفتار ہی ہے۔ جس نے ہم سب کو ایک ڈوری سے باندھ رکھا ہے اور آپ کی شخصیت کی جھلک شگفتگی میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔ عذرا رسول بھی بہت نائس رہیں۔ ان کی پرسنالٹی بہت گریس فل ہے۔ پاکیزہ کے ویسے تو سب ہی سلسلے لاجواب ہیں لیکن میں سب سے پہلے جلترنگ پڑھتی ہوں کہ کتنی بھی اداسی ہو یا فکر زمانہ جلترنگ پڑھ کر جو مسکراہٹ لبوں پر آتی ہے تو آپ کے لیے ہزار دعائیں نکلتی ہیں کسی کو ہنسانا بھی صدقہ جاریہ ہے۔ پاکیزہ کے سب سلسلوں میں بھی حصہ لینا چاہتی ہوں امید ہے کہ آپ حوصلہ افزائی کریں گی۔ میں تو خط لکھتے ہوئے بھی بہت ڈر رہی تھی مگر میری پیاری دوست سیما یاسمین مجتبیٰ نے آپ کی اتنی تعریف کی اور آپ کے پُر خلوص رویے کے بارے میں بتایا تو مجھے بھی حوصلہ ہوا ہے۔ میں ہاؤس وائف ہوں، گھر میں اور بچوں کی تعلیم و تربیت میں وقت کیسے گزر گیا، پتا نہیں چلا اب بچے بڑے ہو گئے ہیں تو دل چاہا کچھ وقت اپنے لیے بھی نکالوں کچھ اچھا پڑھنے کا شوق تو بچپن ہی سے ہے اور پاکیزہ تو میری بچپن کی سکھی ہے۔ جب میں شادی ہو کر سسرال آئی تو ہماری ساس صاحبہ پاکیزہ بڑے ذوق شوق سے پڑھتی تھیں ہم نند بھاوج انتظار کرتے تھے کہ کب ہماری باری آئے گی تو پہلے بڑی نند صاحبہ کی باری آتی۔ ریشماں امیر غوری جو بعد میں ریشماں بشیر وارثی کے نام سے آپ کو خط لکھا کرتی تھیں اس کے بعد حسنہ امیر غوری کی پھر اس مظلوم بھاوج کی اور پھر ساس صاحبہ کا حکم کہ رسالے پر کوئی داغ، نشان نہ آئے کوئی ورق مڑا ہوا نہ ہو بھلا بتائیں پاکیزہ جیسا رسالہ اور ہم بڑی عقیدت اور مسکراہٹ سے پڑھتے تھے بعد میں ہم تینوں خوب ہنستے تھے۔ ہماری ساس صاحبہ ماشاء اللہ اب بھی پاکیزہ پڑھتی ہیں اور سب سے پہلے کور چڑھاتی ہیں۔ پھر وہ رسالہ ان کی خفیہ دراز میں غائب ہو جاتا ہے۔ اب ہم سب اپنا، اپنا پاکیزہ خریدتے ہیں اور خوب بے فکر ہو کر پڑھتے ہیں۔" (پیاری فہمیدہ اس محفل میں خوش آمدید......آپ پاکیزہ کے تمام سلسلوں میں حصہ لیجیے مجھے خوشی ہوگی اور سیما یاسمین کو ہمارا اسلام کہیے گا بہت عرصے سے پتا نہیں وہ کہاں غائب ہیں)

☚ یاسمین کنول، پسرور سے۔ "ستمبر کا شمارہ دلہن نمبر ہے، آج کی دلہن ایسی ہی بولڈ ہوتی ہے جیسی کائنات حیات نظر آ رہی ہیں دس بیس سال قبل کی دلہن بہت شرماتی تھی۔ شادی کے موسم میں آپ اچھا کرتی ہیں دلہن نمبر رکھ لیتی ہیں قارئین بہنوں پر اچھا تاثر پڑتا ہے۔ عام روٹین میں بھی شادیاں اٹینڈ کر رہی ہوتی ہیں۔ (عید کے بعد شادیوں کا موسم چلتا ہے) نیلوفر عباسی کے پرانے قصے بہت مزیدار تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں زندگی میں پل، پل خوشیاں دی ہیں جو غم دیے ہیں ان پر بھی وہ صابر رہیں۔ تمام افسانے اچھے لگے...... فاخرہ گل کا نیا ناول محبت ہے سمندر سی بے حد اچھا لگا۔ گم شدہ محبت پسند آئی۔ جلترنگ اور روحانی مشورے سب سے پہلے پڑھتی ہوں، بہنوں کی محفل میں اتنی اپنائیت ہوتی ہے کہ بیان نہیں کر سکتی۔ اینہ عندلیب کی صحت کے لیے دعا گو ہیں۔ 1992.93 میں یاسمین طاہر صاحبہ کا پروگرام رنگ چلتا تھا ریڈیو لاہور پر وہ بھی ان کی صحت کے لیے دعائیں کروایا کرتی تھیں۔" (تبصرے کا شکریہ، اللہ انہیں صحت دے، آمین)

☚ ساجدہ ظفر، بمکالیہ سے۔ "دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد حاضرِ محفل ہونے کی کوشش کر رہی ہوں کیونکہ جولائی میں مرے گھر کی رونق، عزیز از جان میری ساس انتہائی مختصر علالت کے بعد داعی اجل کو لبیک کہہ گئیں۔ اس دن سے ذہن ماؤف ہے۔ آنکھوں کی برسات تھمنے کا نام نہیں لے رہی۔ کیونکہ مری ساس نے ہمیشہ میری رہنمائی کی۔ ان کے ہوتے ہوئے مجھے کہیں باہر جانا پڑ جائے تو پیچھے گھر کی کبھی فکر نہیں ہوتی تھی۔ ان کی عمر ماشاء اللہ 85 برس کے لگ بھگ تھی مگر اس عمر میں بھی گھر کے بہت کام نہایت سلیقے سے انجام دیتی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد گھر کی رونقیں بالکل ماند پڑ چکی ہیں۔ کہیں آنے جانے کا بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ اور......اور......بس کیا بتاؤں......مسائل ہی مسائل نظر آ رہے ہیں۔ آپ اور قارئین بہنیں ضرور ان کی

مغفرت کے لیے دعا کیجیے گا۔" (اللہ آپ کی ساس صاحبہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین)

٭ صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ سے۔ "آپ بہت اچھا تجزیہ کرتی ہیں کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے کہ ایک دن پورا آپ کے ساتھ گزاروں اور آپ کے تجربات سے مستفید ہوسکوں۔ (کراچی آؤ تو آجانا میرے پاس...... میں بھی تم سے کچھ سیکھ لوں گی) طیبہ عنصر مغل کا ڈیزائنر سوٹ بلاشبہ آج کل کی اندھادھند تقلید کے مطابق اچھی تحریر تھی۔ مقابلے کی دوڑ نے ہمیں چادر سے پاؤں باہر کرنے پر مجبور کردیا ہے۔ اس اندھی تقلید کو روکنا ہوگا۔ فاخرہ گل، محبت سمندر سی اچھا لکھا ہماری ہمدردیاں کوکب کے ساتھ نہیں تھیں لیکن اینڈ میں واپس جانے کا فیصلہ اچھا تھا۔ عقیلہ حق نے بہت اچھے موضوع پر لکھا...... بے شک اللہ کی رسی دراز ہے وہ جب چاہے کھینچ لے انسان تو بس خطا کا پتلا ہے۔ گم شدہ محبت بہت اچھا جارہا ہے۔ کریم کی حرکتیں ایک آنکھ بھی نہیں بھارہی ہیں۔ رضوانہ پرنس کے بھائی نمائمہ اکرم کے والد کی وفات کا سن کر بہت افسوس ہوا اللہ ان کے درجات بلند کرے۔" (تبصرے کا شکریہ)

٭ شہلا نواز، لاہور سے۔ "آنٹی جی میں بہت ماندے دل سے تبصرہ لکھ رہی ہوں کیونکہ میرا تبصرہ شائع نہیں ہوتا اب کیا وجہ ہے یہ میں نہیں جانتی۔ (نہیں ایسا ہوتا نہیں) بہرحال تبصرہ پیش خدمت ہے۔ سرورق کی ہیوی ویٹ ماڈل کو دیکھ کر بچاری کزن مہوش جس کا وزن 100 کلو ہے نے اعلان کیا کہ اگلے ماہ پاکیزہ کے سرورق پر میری تصویر ہوگی تو ہم نے کہا قارئین کہیں گے یہ بھڑولہ (ایک لمبا چوڑا لوہے کا ڈرم نما برتن جس میں گندم رکھتے ہیں) کہاں سے امپورٹ کیا ہے تو بڑی ادا سے مہوش نے دو انچ کی ہیل پہن کر کاؤ واک کرنی شروع کردی اور گرتے، گرتے بچی۔ ویسے یہ سچ ہے کہ مہوش کا چہرہ بہت پیارا اور معصوم سا ہے اور جسم کا پھیلاؤ بہت زیادہ ہے۔ دلہن نمبر میں دلہنوں کی تصویریں بہت کم تھیں افسانے تقریباً تمام اچھے تھے مگر عمر قید اور ڈیزائنر سوٹ بازی لے گئے۔ دلکش حجاب کا زنگی تحریر دل پر اثر کرگئی۔ نیلوفر چنچل آواز اور دلکش چہرے کی مالکہ کا انٹرویو بھی زبردست تھا۔ پاکیزہ ڈائری تقریباً تمام کی تمام اچھی تھی اور جلترنگ مزیدار تھا۔ ایسا کریں حسن نکھار پے کا صفحہ ہمارے حوالے کردیں ایسے ٹپس دیں گے کہ بہنیں یاد کریں گی اگر کسی بہن کا رنگ کالا ہو تو وہ بینگن کا گودا چہرے پر لگائیں اندھیرے میں بھی چمکیں گی اگر کسی کے دانت لمبے ہیں تو ریتی سے گھس دیں اگر کسی کی بغلوں میں پسینے کی بُو آتی ہے تو اسے چاہیے کہ بغلوں میں لہسن کی پوتیاں رکھے اور اگر کسی کے بال نہیں بڑھ رہے تو اسے چاہیے کہ تیزاب سے دھوئے نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری...... اور اگر کسی کی اسکن فریش نہیں ہے تو اسے چاہیے کہ کپڑے دھونے والا بلیچنگ پاؤڈر اپنے چہرے پر لگائے بعد میں کیچے کا ماسک چہرہ پر لگائے اور خاکسارہ کو دعائیں دے...... پیاری آنٹی خط ضرور شائع کرنا۔" (شہلا تمہارا خط شائع تو کردیا ہے اب اگر کسی معصوم بہن نے غلطی سے بھی کوئی تمہاری بتائی ہوئی ترکیب پر عمل کرلیا تو اس کا تو بیڑا غرق ہوجائے گا ناں...... اس پر تمہارا یہ شکوہ کہ تمہارے خط شائع کیوں نہیں ہوتے)

٭ ظل شاہین، رحیم یار خان سے۔ "اگست کا پاکیزہ شدید گرمی اور حبس میں خوشگوار جھونکے کے مانند ثابت ہوا سرورق کا چہرہ دلکش ہے۔ سب سے پہلے میں یادگار روحانی سلسلہ، یادوں کی مالا کا ذکر کروں گی۔ آخری حصہ پڑھ کر یوں لگا کہ بہت قریبی کوئی شے ہم سے جدا ہورہی ہے آخری حصہ بھرپور تھا اس لیے کہ کچھ سوالات ہمارے بھی ذہنوں میں تھے۔ وہ آپ نے پوچھ ڈالے بلکہ اس سوال جواب کے سلسلے نے ہی ساری تشنگی مٹا ڈالی اور نعتوں کے بارے میں آپ نے جو بات بتائی میں تو پڑھ کر حیران رہ گئی۔ واقعی ذکیہ آنٹی عہد حاضر کی ولی خاتون ہیں۔ دوسری تحریر نگہت جی کا ناول، اعتبار وفا ہے۔ مصنفہ نے ہر کردار کے ساتھ مکمل انصاف کیا اس سے خوب صورت اور بہتر اینڈ اس کا ہو ہی نہیں سکتا تھا اور اب اس ماہ کے افسانوں کی بات ہوجائے۔ شمیم فضل خالق، کائنات غزل اور فرحین اظفر کی تحریریں اچھی لگیں مگر رفاقت جاوید منفرد ٹاپک پر قلم اٹھا کر بازی لے گئیں۔ ایک حساس مگر ناقابلِ یقین کہانی ایک تنہا عورت اپنے ہی گھر کو گیسٹ ہاؤس بنا ڈالے آج کے دور میں ہمارا معاشرہ کس قدر اخلاقی تنزلی کا شکار ہے۔ محترمہ نیلوفر عباسی کا انٹرویو بہت دلچسپ لگا اگلے حصے کا انتظار ہے۔ شمع ہدایت تکبر کے موضوع پر بہترین تحریر ہے اللہ پاک ہم سب کو اس برائی سے پاک رکھے۔ روحانی مشورے بھی بہترین اور پاکیزہ ڈائری بھی...... شائستہ کے سروے کے تو کیا کہنے...... جلترنگ کے دونوں خاکے مزے دار اور مجھے حیرانی ہوئی کہ پڑوسیوں نے کیبل کٹ جانے کے خوف سے کیسے سرینڈر کیا زیادہ وقت ٹی وی دیکھنے والی خواتین کے پاس اتنا وقت کہاں سے آجاتا

ہے۔" (بھرپور تبصرے کا شکریہ)

شازیہ سرفراز، کراچی سے۔ "میرا نہیں خیال کہ میرا نام بھولے سے بھی آپ کو ذہن میں آئے گا یہ شازیہ سرفراز بھی کبھی آپ سب کے درمیان پاکیزہ کی ایک قاری بہن اور تبصرہ نگار رہی ہے یہ عزت ماہ دولت کو پاکیزہ کی مدیرہ یعنی سب کی آنٹی انجم نے دی تھی۔2000ء تک تو میں باقاعدگی سے پاکیزہ پڑھتی اور تبصرہ بھیجتی رہی ہوں۔1999ء جولائی کے پاکیزہ میں جیون ساتھی کے کالم میں آپ نے تصویر کے ساتھ جگہ دی 2001ء میں ماہ دولت کی انگیجمنٹ کی نیوز بھی پاکیزہ میں شائع کی بس اس کے بعد زندگی کے جھمیلوں میں پڑ کر ہمارا پاکیزہ سے پڑھنے کی حد تک کا سلسلہ رہ گیا۔2004ء میں اپنے فرسٹ کزن سید انوار علی سے شادی ہوگئی اور 2007ء تک اللہ تعالیٰ نے ہمیں تین پیارے سے پھول ارسل، جویریہ اور ارحم کو ساتھ خیریت کے ساتھ ہماری جھولی میں ڈال کر ہماری زندگی مکمل کر دی۔ شوہر، سسرال سب کچھ اللہ کے کرم سے بہت اچھا ملا بس یوں سمجھیں کہ نادانیوں میں زندگی کا سلیقہ کھو جاتا ہے۔ عقل و شعور ہوتے ہوئے بھی بہت جگہ سو جاتا ہے۔ وقت، حالات اور تجربات انسان کو بہت پرکھنا سکھا دیتے ہیں، بہت کچھ پایا بہت کچھ کھویا، بس سوچو تو وقت لوٹ کر نہیں آ سکتا۔ ڈائجسٹوں سے دلچسپی لکھنے کا شوق بھی شروع سے ہے بہت بار قلمی دنیا سے رشتہ جوڑنے کا بہت بار دل مچلا مگر شرارتی گروپ کو یہ بات منظور نہیں ہوئی تھی۔ اب ڈھائی ماہ قبل اپنے پیارے ابو کی جدائی کا دکھ ایسا ملا کہ جیسے دل کا روگ بن گیا ہے۔ 29 رجب کو ساری رات عبادت کرنے کے بعد فجر کی نماز پڑھانے کے دوران دوسری رکعت میں الحمدللہ کہہ کر پیارے ابو اس جہانِ فانی سے ایسے کوچ کر گئے کہ ہم بہن، بھائیوں کو ان سے آخری ملاقات، آخری دیدار کا موقع بھی جیتے جی نہ مل سکا۔ آج بھی دل کو صبر نہیں آتا، رات کروٹ بدلتے گزر جاتی ہے، نیند روٹھ کر جانے کب آتی ہے۔ جی تو بس یہ چاہتا ہے کہ دنیا کو بھول کر جوگی بن جاؤں مگر وہی بات کہ مرنے والے کے ساتھ جایا نہیں جاتا فرائض اور ڈھیر ذمہ داریاں نبھانے کے لیے اپنے آپ کو زندہ رکھنا پڑتا ہے۔ پہلے ماں پھر ہم سب کے بڑے عزیز تایا ابو کے جانے کا غم دیکھا لاسٹ ائیر ہماری اینورسری کے دن ہماری ساس بھی راتوں رات دنیا چھوڑ گئیں۔" (پیاری شازیہ اللہ آپ کے ابو کو جنت الفردوس میں جگہ دے، آمین)

☆☆☆

پیاری بہنو! اب آئیے آپ سے رخصت ہونے سے پہلے درود پاک پڑھتے ہیں اور پھر وحدہ لاشریک کی بارگاہ میں دعا مانگتے ہیں۔ یا اللہ، یا رحمٰن، یا رحیم اے کریم اللہ ہمارے اور اپنے پیارے حبیبؐ کی ساری امت کے سارے گناہوں کو معاف فرما دے اور ہمارے تمام گناہوں کو نیکیوں میں بدل دے اور نیک کام کی توفیق، ہمت، طاقت اور مہلت ہم کو ضرور عطا کرنا...... اے پاک پروردگار موت سے پہلے ہماری مغفرت فرما اور موت کے وقت ہم پر رحم فرما اور موت کے بعد ہمیں عذاب نہ دینا اور قیامت کے روز ہمارا نامۂ اعمال ہمارے داہنے ہاتھ میں دینا...... بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے، اے اللہ، اے میرے معبود، اے عرشِ عظیم کے مالک تو آدمؑ سے لے کر آج تک اور آج سے لے کر قیامت تک آنے والے سارے ایمان والے مردوں، عورتوں، انسانوں، جنوں سب کو ہی بخش دے ہمارے تمام مسائل حل کر دے...... اے سلامتی دینے والے اور سب سے بڑھ کر رحم کرنے والے ہمیں ہر بیماری اور ہر پریشانی سے بچا، خاص کر لاعلاج بیماریوں، اور جان لیوا پریشانیوں سے بچا...... یا اللہ ہمیں تمام شرور سے بچا...... ہمیں ہمیشہ عافیت والی زندگی دے تاکہ ہم تیرے دین کو ساری انسانیت تک پہنچا سکیں...... آمین ثم آمین۔

یا مجیبؐ یا مجیبؐ یا مجیبؐ

دعا گو

آپ کی اپنی باجی انجم انصار

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔63.c فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35804200 , 021-35386783,021-35802552 EXT 107,118

پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

حمد باری تعالیٰ

غموں کی تلخیاں بھی پی گئی ہوں
تری رحمت کے دم سے جی گئی ہوں
میرے مالک، میرے اللہ، میں تیرے سہارے
دکھوں کی آگ تنہا سہہ گئی ہوں
پکارا ہے تجھے جب بھی تڑپ کر
کرم کی بارشوں میں بہہ گئی ہوں
میں پتھر تھی تیری رحمت میں آکر
چمکتے موتیوں سی ہوگئی ہوں
کسی سجدے میں گر کے جب بھی روئی
سکونِ قلب پا کر سوگئی ہوں
بس اِک قرآں کی دولت لے کے دل میں
میں دولت دو جہاں کی پاگئی ہوں
الٰہی! بے نوا کو بخش دینا
ثنا کے پھول لے کر آگئی ہوں

شاعرہ: آصفہ شفیق

مرسلہ: صبا نور، لیہ

نعتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

آپ کو دل میں بسا لوں گی رسولِ عربیؐ
اور آنکھوں میں چھپا لوں گی رسولِ عربیؐ
آپ سے عشق کیا ہے یہ کوئی کھیل نہیں
عمر بھر عشق نبھاؤں گی رسولِ عربیؐ
میرا قرآں میری آنکھوں کی ہے ٹھنڈک آقا
اس کو ہمراز بناؤں گی رسولِ عربیؐ
میری تنہائی میں کرتا ہے یہ باتیں مجھ سے
روشنی دیتا ہے ہر حرف رسولِ عربیؐ
آپ کو دل میں بسایا ہے تو پھر ڈر کیسا
اپنے مولیٰ کو منالوں گی رسولِ عربیؐ
معاف کردے گا میری ساری خطائیں مولیٰ
دل پہ لکھا ہے جو اک نام رسولِ عربیؐ

کلام: ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کراچی

درِ نبیؐ پر حاضری کے بعد

کیا تم کو بتائیں ہم کو کیا کیا ملیں سوغاتیں
سب حسن کے جلوے تھے، واں کی تھیں مناجاتیں
ہر درد کا درماں ہیں سر چشمۂ رحمت ہیں
ہر دل کی تسلی ہیں، ہر روح کی سوغاتیں
ہر سو ہیں سلاموں کے انوار نمایاں بھی
ہم صلِ علیٰ کہہ کر کرلیں گے مناجاتیں
انوارِ نبیؐ کیا ہے وہ شانِ کرم کیا ہے
دن ہیں کہ محبت ہیں، رحمت ہے کہ باراتیں
اسرارِ تجلی ہیں، محبوبِ دو عالم ہیں
کشکولِ محبت میں برسیں یہی برساتیں
اس حسن کی چوکھٹ پر رحمت ہی برستی ہے
کاشانۂ رحمت سے کب پائیں گے سوغاتیں
اے کاش وہ دن آئے پھر حسن وہی دیکھوں
انوارِ محبت ہو، مخفی سے ہوں پھر باتیں

شاعرہ: فریدہ ہاشمی مخفی، کراچی

الحمدللہ کہنے کی فضیلت

☆ یہ بہترین شکر ہے۔
☆ اس سے نعمتوں کی حفاظت ہوتی ہے۔
☆ بیماری اور تنگدستی دور ہوتی ہے۔
☆ الحمدللہ کا قرآن پاک میں ۳۸ بار ذکر آیا ہے۔
☆ الحمدللہ کہتے رہیے اور اللہ کی نعمتوں اور رحمتوں کے حقدار بنتے رہیے۔

از: زریں زبیر کوٹھاری، کراچی

پرہیز کریں۔

از: ایمن زرناب، ڈوگر، ٹوبہ ٹیک سنگھ

توجہ طلب

اللہ کی چار رحمتیں جو انسان سے برداشت نہیں ہوتیں

1۔ بیٹی 2۔ بیماری 3۔ بارش 4۔ مہمان۔

اللہ کے پانچ عذاب جو انسان بہت خوشی سے قبول کرتا ہے۔

1۔ سود 2۔ جہیز 3۔ جھوٹ 4۔ غیبت 5۔ حرام

مرسلہ: نجل شاہین، رحیم یار خان

ایسا بھی ہوتا ہے

ڈاکٹروں کی قسمت میں شاید شہرت زیادہ لکھی ہوتی ہے، اپنے مریض کو اچھی دوا دے دیں تو شہرت کیونکہ مریض ہر جگہ ان کے گن گاتا پھرتا ہے۔ مریض کو غلط انجکشن بھی لگا دیں تو تب بھی شہرت بات کورٹ کچہری سے پہلے میڈیا میں چلی جاتی ہے اور ہر طرف آگ لگا دیتی ہے، ڈاکٹر ٹاک شوز میں آجائیں یا اینکر بن جائیں تب بھی شہرت...... اتنی کڑوی کسیلی شاید وہ ادویات اپنے مریضوں کو نہ دیتے ہوں جتنی کڑوی کسیلی باتیں وہ یوں کر جاتے ہیں کہ بندہ منہ دیکھتا رہ جاتا ہے...... ارے اس نے کیا کہا ہے؟ ہائے اللہ یہ کیا کہہ رہا ہے؟ اور اکثر اوقات تو اللہ توبہ، اللہ توبہ کہتے ہوئے اپنے گال بھی خود پیٹنے پڑ جاتے ہیں...... یہ جانے بغیر کہ وہ سچ کہہ رہا تھا یا جھوٹ......

اقتباس از تحریر: عظمیٰ آفاق سعید

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

وہی تو ہے

وہ بخشتا ہے گناہِ عظیم بھی لیکن
ہماری چھوٹی سی نیکی سنبھال رکھتا ہے
ہم بھول جاتے ہیں اس کو روشنی میں
وہ تاریکی میں ہمارا خیال رکھتا ہے
جو بھی دیر سے لوٹوں تو میری ماں کی طرح
وہ میرے رزق کا حصہ نکال رکھتا ہے
گھروں میں جن کے چراغ نہیں ان کے لیے
فضا میں چاند و تارے اچھال رکھتا ہے
محبت اپنے بندوں سے کمال رکھتا ہے
وہ اللہ احد ہے جو سب کا خیال رکھتا ہے

مرسلہ: لاریب، ماہ زیب، چونیاں

سوال نامہ

سلسلہ تو شروع ہے
سلسلے نبھاؤ گے
کر چکے جو وعدہ تم
بھول تو نہ جاؤ گے
لے کے امتحانِ ورد
یونہی آزماؤ گے
تجھ سے روٹھ جاؤں تو
کیا مجھے مناؤ گے؟
انتظار میں تیرے
عمر یونہی گزرے گی
میری یاد آئے جو
پھر سے لوٹ آؤ گے

شاعرہ: فریدہ افتخار، اسلام آباد

شیطان کے رشتے دار

☆ شیطان کہتا ہے کہ اذان کی آواز سن کر نماز کو نہ جانے والا میرا باپ ہے۔

☆ فضول خرچی کرنے والا میرا بھائی ہے۔

☆ امام صاحب سے پہلے رکوع کرنے والا اور پہلے سجدہ کرنے والا میرا بیٹا ہے۔

☆ مہمان آنے پر منہ چڑانے والی عورت میری ماں ہے۔

☆ بغیر بسم اللہ کے کھانا شروع کرنے والی میری اولاد ہے۔

چنانچہ شیطان سے رشتے داری قائم کرنے سے

فاسٹ بولر

کرکٹ کی دنیا میں ایک نیا فاسٹ بولر آیا جو ایک ڈاکٹر تھا ایک صاحب کچھ دیر سے اسٹیڈیم میں پہنچے...... انھوں نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے صاحب سے پوچھا۔
"کیوں صاحب! نیا بولر کیسا ہے؟"
دوسرے صاحب نے جواب دیا۔ "کم بخت نے آتے ہی تین وکٹ اور دو مریض حاصل کر لیے۔"

مرسلہ: نور افشاں، شکار پور

میں دونوں سے دور
دریچے کے نزدیک
اپنی ہتھیلی پر اپنا چہرہ رکھے
کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھ رہی ہوں
سوچ رہی ہوں
گئے دنوں میں ہم بھی یونہی ہنستے تھے

شاعرہ: پروین شاکر

پسند: رفعت مبین رفی، یو ایس اے

دل کی باتیں

اب تو ہم کو بچھڑے بھی
کافی عرصہ بیت گیا ہے...... لیکن
جب سے یہ معلوم ہوا ہے
کل تم نے آجانا ہے
اس وقت سے بیٹھا سوچ رہا ہوں
کیا مجھ کو پہچانو گے...... ؟
شاید تم پہچان نہ پاؤ
لیکن کوئی بات نہیں
کیونکہ...... میرا دوش ہے یہ
کہ پہلے سا شوخ نہیں ہوں
اک انہونا لگتا ہوں
اب میں اک ٹوٹا، پھوٹا سا
ایک کھلونا لگتا ہوں

شاعر: سید بشارت علی

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

مشرق و مغرب

مشرق تقدیس اور معصومیت میں ڈوبے ہوئے شاہکار کا تصور ہے۔ مشرق کی بیٹی بھی اس طرح معصوم ہے۔ اس کی آنکھوں میں حیا کی جھلک اور سانسوں میں پاکیزگی ہوتی ہے۔ اسی لیے سورج نے بھی مشرق سے طلوع ہونا پسند کیا لیکن سورج ہر صبح مشرق سے طلوع ہو کر اجالا پھیلاتا ہے اور دن کا سفر طے کرنے کے بعد مغرب میں ڈوب کر ہر طرف گھور اندھیرا پھیلا دیتا ہے۔ گویا درس دیتا ہے کہ مغرب کی طرف اندھا دھند مت بھاگو۔ ورنہ تم بھی اندھیروں میں ڈوب جاؤ گے۔

از: ساجدہ ظفر، کمالیہ

غزل

مجبور کس قدر یہاں ہوتی ہیں لڑکیاں
سینے کے داغ اشکوں سے دھوتی ہیں لڑکیاں
کر کے نثار اپنی محبت کے سارے پھول
اپنے جگر میں خار چبھوتی ہیں لڑکیاں
جن کے نفس، نفس سے ہوس آشکار ہو
ایسی بھی اس جہان میں ہوتی ہیں لڑکیاں
ہنستی ہیں ایک بار کسی اجنبی کے ساتھ
پھر ساری عمر ٹوٹ کے روتی ہیں لڑکیاں
اپنے دل و نگاہ پہ جن کی گرفت ہو
شب بھر وہی تو چین سے سوتی ہیں لڑکیاں
تمثیلہ زندگی کے سمندر کی تہ میں

آئینہ

لڑکی سر کو جھکائے بیٹھی
کافی کے پیالے میں چمچہ ہلا رہی ہے
لڑکا، حیرت اور محبت کی شدت سے پاگل
لانبی پلکوں کے لرزیدہ سایوں کی
اپنی آنکھوں سے چوم رہا ہے
دونوں میری نظر بچا کر
اک دوجے کو دیکھتے ہیں ہنس دیتے ہیں

کچھ سیپیوں کے روپ میں موتی ہیں لڑکیاں
شاعرہ: حمنیلہ لطیف، لاہور

ارینج میرج اور لو میرج کے سائڈ افیکٹس

لو میرج میں انسان خود کو دنیا کا خوش نصیب انسان سمجھتا ہے۔ بیوی محبوبہ نظر آتی ہے، بیوی کا نمبر موبائل میں سویٹی، ہنی، جانو کے نام سے سیو ہوتا ہے جبکہ اس کے برعکس ارینج میرج والے سال بعد بھی بیوی کو متوجہ کرنے کے لیے اولاد کا سہارا ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں بیگم سے بات کرنی ہو تو بچے سے کہیں گے چنو بیٹا، ٹیپو ماما کو بلالو......اور بیگم کا نمبر موبائل میں کچھ یوں سیو کرتے ہیں (چھوٹا مکینک) مستری، ہوم وغیرہ، وغیرہ لیکن درحقیقت لو میرج کرنے والے کو اکثر بیگم کے ساتھ بچے بھی خود ہی سنبھالنے پڑتے ہیں کیونکہ دور کے ڈھول سہانے جو ہوتے ہیں۔

از: صائمہ سجاد بخش، کوہاٹ

آرزو

آرزو ہی تو زندگانی ہے
زندگی کی حسیں نشانی ہے
ذہن میں روشنی سی کرتی ہے
اس کے دامن میں شادمانی ہے

شاعرہ: یاسمین کنول، پسرور

خوب صورت بات

زندگی ایسے جیو کہ کوئی ہنسے تو تمہاری وجہ سے ہنسے، تم پر نہیں اور کوئی روئے تو تمہارے لیے روئے، تمہاری وجہ سے نہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ...... کھیل بہت سے لوگ کھیلتے ہیں، اس میدان میں بہت سے اترتے ہیں سکندر وہی ہے جس کا مقدر اس کا ساتھ دے۔

بہت سوں میں سے صرف تین لوگ جیتتے اور انعام پاتے ہیں محنت کرنے والے، ثابت قدم، خوش قسمت......

از: ارم کمال، فیصل آباد

زندہ کھنڈر

تمہیں کھنڈر بھایا
کرتے تھے
ویران اندھیری جگہوں پر
تم اکثر جایا کرتے تھے
کھنڈروں کو سراہا کرتے تھے
ان جگہوں سے
منسوب تھے جو
وہ سب قصے
تم مجھ کو سنایا کرتے تھے
اب دیکھو ذرا تم مجھ کو بھی
میں بھی اب
اِک جیتا جاگتا کھنڈر ہوں
اور کھنڈر بھی
انوکھا کھنڈر ہوں
جو ہوں اندر ہی اندر ہوں
اب کے مجھ کو بھی دیکھو تم
اور شاید خوش ہو جاؤ

شاعرہ: سیدہ علیشاہ، بہاول پور

جب لوگ

جب لوگ جدا ہو جاتے ہیں
سب عہد ہوا ہو جاتے ہیں
جب نیت میں فتور سا ہو
سب عمل گناہ ہو جاتے ہیں
جب غربت در پہ دستک دے
سب یار خفا ہو جاتے ہیں
جب وقت دکھاتا ہے آنکھیں
سلطان گدا ہو جاتے ہیں
جب نفرت لفظوں میں اترے
تو اپنے جدا ہو جاتے ہیں
یہ دنیا مطلب پرست ہے
یہاں انسان خدا ہو جاتے ہیں

انتخاب: مہوش جواد، لیہ

☆☆☆

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ایڈ فری لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہماراویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-





جلترنگ

انجم انصار

تکالیف

”اسے کہتے ہیں عورت کا سلیقہ کہ گھر جا کر دل خوش ہو گیا۔“ شاہد اپنے جوتے اتار کر سامنے کی دیوار پر عادتاً مارتے ہوئے بولے۔

”ان کے میاں بھی گھر کا خاصا کام کرتے ہیں۔ آپ کی طرح نہیں ہیں کہ سارے گھر میں آپ کی چیزیں ہر وقت بکھری رہتی ہیں۔“ مجھے غصہ ہی تو آ گیا۔

”بکھری تو اس وجہ سے رہتی ہیں کہ تم انہیں سمیٹتی ہی نہیں ہو۔ اور سلتی ہر وقت کچھ نہ کچھ سنگواتی رہتی ہے۔ جب ہی تو اس کا گھر چمک رہا تھا۔ واہ، جا کر لطف آ گیا جیسے بندہ شیشے کے محل میں بیٹھا ہو۔“

”کس قدر تو اس کے گھر میں الماریاں ہیں، چیزیں کیوں بکھری نظر آئیں گی۔ ہمارے گھر میں اسٹوریج نہیں ہے کہ گھر کا کاٹھ کباڑ اس میں ڈال دیا جائے۔ بکھری ہوئی چیزیں سیٹ کر رکھ دی جائیں۔“ میں جل ہی تو گئی تھی۔

”چھوٹے گھروں میں سامان کم رکھا جاتا ہے کم از کم فلیٹ میں رہنے والوں کو تو کاٹھ کباڑ ہرگز نہیں بڑھانا چاہیے مگر تمہیں تو بیکار کے سامان سے الفت جس قدر ہے شاید ہی کسی کو۔“ وہ چڑاتے ہوئے بولے۔

”کاٹھ کباڑ زندگی کا لازمی جزو ہوتا ہے اس کے بغیر رہنا آسان نہیں ہوتا۔ یہ بڑے، بڑے دیگچے، کالے ٹیڑھے برتن، خالی ڈبے، کنستر، ردی، اخبار، رسالے سب کام آتے ہیں۔ سل بٹا، ترازو، ہاون دستہ ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ ان کو پھینک دیا جائے۔ آئے دن پانی کی تکلیف رہتی ہے۔ اس وقت ان سب برتنوں میں پانی بھر کر رکھا جاتا ہے۔ اس ترازو کی جان کو تم آئے دن آتے ہو۔ بقر عید کے موقع پر اس پورے پلازہ میں گھومتا ہے گوشت تولنے کے لیے۔“ میں اترائی۔

”پاگل ہو تم بس، ہمارے کاٹھ کباڑ کا فائدہ جب ہم سے زیادہ دوسروں کی طلب ہو تو ہمیں رکھنے کا فائدہ کہ دوسرے لوگوں کو فیض پہنچانے کے لیے ہم یہ مصیبتیں سمیٹتے رہیں۔“

”مگر ہم کیا کریں کہ کوئی جگہ ہی ایسی نہیں ہے جہاں یہ سب سامان چھپا دیں۔ فری میں نہیں ملتیں یہ چیزیں۔ نصیبوں والوں کے ہاں ہوتا یہ سب سامان...... فقیروں کے ہاں کچھ نہیں ہوتا۔ وہی مانگتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے کر لیں گے اس کا بندوبست بھی۔“ وہ ٹائی اچھالتے ہوئے بولے۔ موزے تو وہ ڈریسنگ ٹیبل پر ناخن پالش کے برابر میں سجا چکے تھے۔

”آج تک تو اس موضوع پر سوچا نہیں، اب آپ بندوبست بھی کرنے لگے۔“ مجھے ہنسی ہی تو آ گئی۔

”جب کچھ کریں گے ناں تو دیکھتی رہ جاؤ گی۔“ وہ جھلاتے ہوئے باہر نکل گئے اور یہ ان کی ہمیشہ کی عادت تھی۔

اور پھر واقعی وہ اگلے دن دفتر سے واپسی پر تین پٹ کی الماری خرید لائے۔ میں نے آنکھیں حیرت سے مل کر دیکھا۔

”یہ اتنا بڑا جہاز کہاں رکھا جائے گا؟“ میں ہونق بنی انہیں دیکھ رہی تھی جو کارپینٹر سے الماری کے پٹ سیٹ کروا رہے تھے۔

”اب تمہارا سارا پھوہڑ پن اس میں سمٹ جائے گا۔“ انہوں نے آنکھیں گھما کر مسخرانہ انداز میں کہا۔

”مگر یہ اتنی بڑی توپ رکھی کہاں جائے گی؟“ میں واقعی ہول رہی تھی۔

”سائڈ کی دیوار کے ساتھ رکھیں گے۔ سامنے تو

بچوں کے بستر لگتے ہیں۔'' انہوں نے بشاشت سے کہا۔
''بجلی کے بٹن تو سب الماری کے پیچھے آجائیں گے۔ پنکھا اور لائٹ کیسے جلے گی۔'' میں ہنس رہی تھی۔
''ضرورت ایجاد کی ماں ہے الماری کے پچھلے حصے میں سوراخ کردیں گے۔ جب پنکھا یا لائٹ جلانے کی ضرورت ہو الماری کھولی سوراخ میں سے ہاتھ ڈالا اور بٹن دبا دیا۔'' انہوں نے ذہانت سے کہا۔
''اس کے لیے آپ الماری کاٹ ڈالیں گے؟'
مجھے یہ مشورہ ہرگز پسند نہیں آیا تھا۔
''مجبوری ہے کیا کرسکتے ہیں دائیں دیوار کے ساتھ نہیں رکھ سکتے کہ بچوں کے پڑھنے کی میز ہے، ڈریسنگ ٹیبل ہے اور پھر باہر کا دروازہ بھی اسی دیوار سے چپک کر کھلتا ہے۔''
''مگر باتھ روم کا دروازہ بھی کم کھل رہا ہے۔ اس بڑی الماری کی وجہ سے۔'' میں ہاتھ دھونے گئی تو اس تکلیف کا بھی اندازہ ہوا کہ ہاتھی جیسی الماری نے ساری ہی جگہ گھیر لی تھی۔
''باتھ روم کا دروازہ کم ہی کھلنا چاہیے۔ کوئی باتھ روم میں بھی سینہ تان کر جاتا ہے۔'' یہ ان کی نئی منطق تھی۔
''اب کوئی چوروں کی طرح بھی نہیں جاتا کہ اس الماری کی وجہ سے سامنے کی دیوار سے کمر لگا کر آہستہ، آہستہ کھسکتے ہوئے غسل خانے میں داخل ہوں۔''
''ٹھیک ہے، مجبوری جو ہوئی۔'' انہیں میری بات پر ہنسی آگئی۔
''ابو، اگر آپ غصے میں آکر چار پٹ والی الماری لے آتے تو......؟'' بڑا بیٹا قہقہہ لگا کر پوچھ رہا تھا۔
''پھر زمین پر رینگتے ہوئے غسل خانے میں داخل ہونے کا مشورہ دیا جاتا۔'' میں غصے میں بڑبڑا رہی تھی۔
''موٹو، اپنے آپ کو کم مت کرنا، چھوٹے دروازے کا ہی رونا روتی رہنا۔'' وہ ہنستے ہوئے بدستور کہہ رہے تھے۔
اور میں کلستی جارہی تھی کہ اس سے کہیں بہتر تھا کہ گھر کا تمام کاٹھ کباڑ ہی پھینک دیتی جس کو سکواتے کے عوض کم از کم یہ تکلیف تو نہ ہوتی جو ہم سب پر از خود نازل ہوئی تھی۔ درست کہا ہے داناؤں نے کہ ہم اکثر چھوٹی تکالیف سے بچنے کے لیے اپنے لیے بڑی تکالیف کا انتخاب خود کرتے ہیں۔

بے وقوف عورت

''سنو، بہت اداس نظر آرہے ہو؟''
''ہوں......!
''کیا بات ہے؟''
''سنو! یہ شادی کے پندرہ سال بعد پچھتاوے کیسے ہیں؟ یوں لگتا ہے کہ تم نے شادی کرکے نقصان اٹھایا ہو۔''
''ہاں، نقصان تو ہوا ہے اگر فلاں، فلاں جگہ میری شادی ہوجاتی تو بہت جلد مستحکم ہوجاتا۔ اب ایڑیاں رگڑ رگڑ کر پنپ رہا ہوں۔''
''بڑی دیر لگی پچھتانے میں......؟''
''نہیں، پہلے دل میں پچھتاتا تھا مگر اب تمہارے باپ کا پانچ لاکھ کا انعام نکل آیا ہے تو میرا دل پھٹ گیا ہے۔''
''یہ تو بہت برا ہوا......''
''تم فکر نہیں کرو، دل جڑ جائے گا، تم اپنے باپ سے کچھ روپے مانگ لاؤ۔''
''نہیں، میں ہرگز نہیں لاسکتی۔''
''بہت بے وقوف عورت ہو، بیٹیوں کا آخر حق ہوتا ہے، اپنے والدین کے اوپر، تم اگر مانگ لاؤ گی تو کیا ہوا......؟ پچھلے دنوں تو ان کے پانچ، پانچ لاکھ کے تین پرائز بونڈ لگے ہیں ناں۔''
''میں ہرگز نہیں لاؤں گی کہ تمہاری کمینی باتوں سے میرا دل پھٹ گیا ہے۔''
''واقعی بہت بے وقوف ہو تم......باؤلی ہو۔ ارے...... پگلی جب تم اپنے باپ سے صرف پانچ لاکھ ہی مانگ لاؤ گی کہ آخر ان کو بھی تو فری میں ہی ملے ہیں تو میں تمہارا دل اپنے پیار سے جوڑ دوں گا۔''

☆☆☆



☆ ساجدہ ظفر...... کمالیہ
پرندوں میں بھی شاید آگئی انسان کی خصلت
کہ بچھڑی کونج کو لینے کوئی لشکر نہیں آتا

☆ سمیرا بنت یوسف...... کراچی
کب کون کس کا ہوتا ہے سب رشتے ناتے جھوٹے ہیں
سب دل رکھنے کی باتیں ہیں سب اصلی روپ چھپاتے ہیں
اخلاص کے خالی لوگ یہاں لفظوں کے تیر چلاتے ہیں
ایک بار نگاہوں میں آکر پھر ساری عمر رُلاتے ہیں

☆ ثمینہ سعید...... کراچی
پت جھڑ کے ٹوٹے ہوئے پتوں کے ساتھ ساتھ
موسم کبھی تو بدلے گا یہ آسرا بھی ہو
اس کے لیے تو میں نے یہاں تک دعائیں کیں
میری طرح سے کوئی اسے چاہتا بھی ہو

☆ سکینہ شاہد...... دالبندین
کوئی کہہ دے ذرا یہ وقت کے فرعونوں سے
خاک ہو جاتے ہیں سورج کو بجھانے والے

☆ شہناز قدیر...... کراچی
حسد کی آگ میں کس، کس کا گھر جلاؤ گے
کہ اہلِ عشق تو سارے جہاں میں رہتے ہیں

☆ زرینہ مشتاق...... منڈی بہاؤالدین
صبح سے ڈھونڈ رہے تھے کہ کہاں ہے سورج
اب نظر آئے ہو تو سارا جہاں روشن ہے

☆ یاسمین کنول...... پسرور
ملتی ہے زندگی سے ایک بار زندگی
اس میں نہ ہو جو پیار تو بیکار زندگی

☆ عرشیہ جنید...... کراچی
یہ زندگی تو الجھتی ہے زندہ لوگوں سے
اسی کی بنتی ہے جو اس سے کچھ بنا کے چلے
تیرے نصیب میں جو کچھ ہے تجھ کو ملنا ہے
تو زندگی سے نظر کس لیے چرا کے چلے

☆ نگہت اعوان...... سرگودھا
ہم کو شاہوں سے عدالت کی توقع تو نہیں
آپ کہتے ہیں تو زنجیر ہلا دیتے ہیں

☆ انجم شہزاد...... ڈیرہ اللہ یار
تمنا آبرو کی ہو اگر گلزارِ ہستی میں
تو کانٹوں سے الجھ کر زندگی کرنے کی خو کرے

☆ امینہ عندلیب...... سلانوالی
جس کو معلوم نہیں منزل مقصود اپنی
کتنا بیکار ہے اس شخص کا چلتے رہنا

☆ ناعمہ تحریم...... کراچی
میں نے سینے سے لگا رکھے ہیں دشمن اپنے
ہر گھڑی برسرِ پیکار کوئی ہوتا ہے

☆ ایمہ زینب فاروق...... لیہ
اس ایک چہرے سے چہرہ بنانا تھا آفاق
سو ایک دو نہیں سو بار گارا تازہ کیا

☆ ایمان چوہدری...... فیصل آباد
ہوا بھی خوب ہے واقف میرے سلیقے سے
میں ٹوٹ سکتا ہوں لیکن بکھر نہیں سکتا
یہ دشتِ دل ہے اڑانا پڑے گی خاک یہاں
سفید پوش اِدھر سے گزر نہیں سکتا

☆ پروین افضل شاہین...... بہاول نگر
بڑی طلب ہو رہی ہے تیرے دیدار کی بے چین نگاہوں کو
کبھی اچانک چلے آؤ نا اس حسین موسم کی طرح

☆ مہرین ضیا...... کیماڑی
وہی ضد وہی حسرت نہ درد دل میں کمی ہوئی
عجیب ہے میری محبت نہ مل سکی نہ ختم ہوئی

☆ نگینہ ضیا بخش...... کراچی

کتنی عجیب ہے میرے اندر کی تنہائی بھی اے دوست
ہزاروں اپنے ہیں مرے گرد مگر یاد تم ہی آتے ہو

☆ ارم کمال...... فیصل آباد

دل بھی کوئی آسیب کی نگری ہے کہ محسن
جو اس سے نکل جاتے ہیں مڑ کر نہیں آتے

☆ نورین زمان...... انگوری

ایسی ہوئی ہے ہم میں زمانے کی ٹوٹ پھوٹ
ہم اپنی دیکھ بھال سے آگے نہ جاسکے
خواب عروج دیکھنے والے اسیرِ خواب
اس عہد کے زوال سے آگے نہ جاسکے

☆ نور افشاں...... شکار پور

مجھ کو اس شہر سے کچھ دور ٹھہر جانے دو
میرے ہم راہ میری بے سرو سامانی ہے
اس طرح ہوش گنوانا بھی کوئی بات نہیں
اور یوں ہوش میں رہنے میں بھی نادانی ہے

☆ صبا نور...... لیہ

غزل نے بہتے ہوئے پھول چن لیے ورنہ
غموں میں ڈوب کر ہم لوگ مر گئے ہوتے
بہت دنوں سے ہے دل اپنا خالی، خالی سا
خوشی نہیں تو اداسی سے بھر گئے ہوتے

☆ تمثیلہ لطیف...... جوڑ ھالہ

مرے دل میں درد کے پیڑ ہیں یہاں کوئی خوفِ خزاں نہیں
یہ درخت کتنے عجیب تھے کبھی موسموں میں ہرے رہے

☆ نگہت غفار...... کراچی

دن کھلا ہے پھول سا اور رات بھیگی آنکھ سی
کوئی موسم ہو یہاں دونوں ہوائیں ساتھ ہیں
میں ہوں اِک کاغذ کا ٹکڑا جانے کس کی کھوج میں
کیوں مرے پیچھے زمانے کی ہوائیں ساتھ ہیں

☆ ناظمہ شاہین اعوان...... واہ کینٹ

صدیوں سے تجھے تکتے ہوئے سوچ رہا ہوں
جی تیرے خدوخال سے بھر کیوں نہیں جاتا

☆ ممتاز خانم...... کراچی

اب مگر کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں ہو سکتا
اپنے جذبوں سے یہ رنگین شرارت نہ کرو
کتنی معصوم ہو نازک ہو حماقت نہ کرو
بارہا تم سے کہا تھا کہ محبت نہ کرو

☆ ثوبیہ ظہور...... ضلع اٹک

یہ ضبط چھوٹ گیا تو تمہاری یاد آئی
میں تھک کے ٹوٹ گیا تو تمہاری یاد آئی
تمہارے بعد نہ تھا کوئی میرا دل کے سوا
یہ دل بھی روٹھ گیا تو تمہاری یاد آئی

☆ نازیہ ترزی...... نوشہرہ

پیاسی آنکھوں میں بھی نہ جانے کیوں
سمندر دوڑتا ہے حیرت ہے
نزی انہونیوں کی راہوں میں
مقدر ڈولتا ہے حیرت ہے

☆ رفعت محمد یونس...... ملتان

تمہارے پیار کی زنجیر میں بندھا ہوں میں
سزا یہ کیسی ملی ہے سزا نہیں لگتی
کسی سے پیار کرو اور تجربہ کرلو
یہ روگ ایسا ہے جس میں دوا نہیں لگتی

☆ زرینہ خان...... بہارہ کہو

قید سے کب ہمیں نجات ملی
صرف پھیلا ہے دائرہ کچھ اور

☆ ماہ نور ارسلان...... لاہور

خود اپنے دونوں کناروں سے جو ابلنے لگے
سمندروں میں وہ دریا اتر نہیں سکتا

☆ صائمہ سجاد بخش...... کوہاٹ

زندگی تو نے مجھے قبر سے کم دی ہے زمیں
پاؤں پھیلاؤں تو دیوار میں سر لگتا ہے

☆ عروبہ ناز...... کوٹلی

ہر دھڑکتے پتھر کو لوگ دل سمجھتے ہیں
عمریں بیت جاتی ہیں دل کو دل بنانے میں

منتخب غزلیں

ماہِ اکتوبر، معروف شاعر مصطفیٰ زیدی کا ماہِ پیدائش بھی ہے اور ماہِ وفات بھی......
اسی مناسبت سے اس مقبول شاعر کی دو منتخب غزلیں نذرِ قارئین ہیں۔

زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے
وہ خود اگر کہیں ملتا تو گفتگو کرتے

وہ زخم جس کو کیا نوکِ آفتاب سے چاک
اسی کو سوزنِ مہتاب سے رفو کرتے

سوادِ دل میں لہو کا سراغ بھی نہ ملا
کسے امام بناتے کہاں وضو کرتے

جنوں کے ساتھ بھی رہیں، خرد کے ساتھ بھی قید
کسے رفیق بناتے کسے عدو کرتے

حجاب اٹھا دیے خود ہی نگار خانوں نے
ہمیں دماغ کہاں تھا کہ آرزو کرتے

کلام: مصطفیٰ زیدی

مرسلہ: فریدہ افتخار، اسلام آباد

کسی اور غم میں اتنی خلشِ نہاں نہیں ہے
غمِ دل مرے رفیقو غمِ رائگاں نہیں ہے

کوئی ہم نفس نہیں ہے کوئی ہم زباں نہیں ہے
فقط ایک دل تھا اب تک سو مہرباں نہیں ہے

مری روح کی حقیقت مرے آنسوؤں سے پوچھو
مرا مجلسی تبسم مرا ترجماں نہیں ہے

کسی آنکھ کو صدا دو کسی زلف کو پکارو
بڑی دھوپ پڑ رہی ہے کوئی سائباں نہیں ہے

انہی پتھروں پہ چل کر اگر آسکو تو آؤ
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

کلام: مصطفیٰ زیدی

پسند: نفیسہ آرا، راس الخیمہ



چکن ایگ پلانٹ اِن ریڈ ساس

اشیا: چکن، آدھا کلو۔ سفید بینگن، آدھا کلو۔ ٹماٹر، آدھا کلو۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ لہسن، تین سے چار جوئے۔ پیاز، ایک عدد۔ کالی مرچ پسی ہوئی، ایک چائے کا چمچ۔ یخنی، دو پیالی۔ آئل، آدھی پیالی۔

ترکیب: پیاز کو باریک کاٹ لیں، لہسن کو چھل کر رکھ لیں۔ ٹماٹر کو صاف دھو کر بلینڈ کر لیں۔ چکن کو دھو کر چھلنی میں رکھ لیں بینگن کے سلائس کاٹ کر نمک ملے ٹھنڈے پانی میں رکھ لیں۔ پین میں چار کھانے کے چمچ کوکنگ آئل کو گرم کریں اور اس میں پیاز اور لہسن کو ہلکا سا سنہری فرائی کریں پھر اس میں ٹماٹر کا پیسٹ یخنی، نمک اور کالی مرچ ڈال کر درمیانی آنچ پر پکنے رکھ دیں۔ علیحدہ فرائنگ پین میں دو سے تین کھانے کے چمچ کوکنگ آئل کو گرم کریں اور اس میں تیز آنچ پر چکن کو پانچ سے سات منٹ فرائی کر کے نکال لیں۔ پھر اسی فرائنگ پین میں بینگن کو دو سے تین منٹ فرائی کر کے رکھ لیں۔ ٹماٹر کی گریوی کو پندرہ سے بیس منٹ پکانے کے بعد اس میں فرائی کی ہوئی چکن ڈال دیں۔ اس کے پانچ سے سات منٹ کے بعد فرائی کیے ہوئے بینگن ڈال کر حسبِ پسند گریوی گاڑھی ہونے تک پکائیں۔ ڈش میں نکال کر باریک کٹا ہوا دھنیا چھڑک دیں اور اُبلے ہوئے چاول یا چپاتی کے ساتھ پیش کریں۔

مرسلہ: نفیسہ آرا، راس الخیمہ

اسپائسی گارلک بیف

اشیا: بیف، آدھا کلو۔ لہسن کے جوئے، چھ سے سات عدد۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ کالی مرچ پسی ہوئی، ایک چائے کا چمچ۔ ثابت لال مرچیں، چار سے چھ عدد۔ چینی، آدھا چائے کا چمچ۔ انڈے کی زردی، دو عدد۔ سرکہ، آدھا چائے کا چمچ۔ کوکنگ آئل، حسبِ ضرورت۔ (اس میں چکن بون لیس بھی استعمال کر سکتے ہیں)

ترکیب: اس ڈش کو بنانے کے لیے سب سے پہلے چٹپٹی سی مایونیز بنا لیں۔ وہ اس طرح کہ صاف خشک پیالے میں انڈے کی زردی ڈال کر اس میں چینی، نمک، آدھا چائے کا چمچ، کالی مرچ اور دو جوئے لہسن کو چھل کر ڈالیں۔ ایک منٹ الیکٹرک بیٹر سے پھینٹ کر اس میں تھوڑا، تھوڑا کر کے آدھی پیالی کوکنگ آئل شامل کریں اور گاڑھا ہونے پر آخر میں اس میں سرکہ ڈال کر ایک منٹ پھینٹ لیں۔ گوشت کی چھوٹی بوٹیاں کر کے صاف دھو کر چھلنی میں رکھ کر خشک کر لیں۔ پین میں دو کھانے کے چمچ کوکنگ آئل ڈال کر ایک منٹ گرم کریں۔ اس میں لال مرچوں کو سنہری فرائی کر کے نکال لیں پھر اسی میں لہسن کے جوؤں کو پیس کر ڈالیں۔ ایک سے دو منٹ فرائی کر کے اس میں گوشت کی بوٹیاں، نمک اور کالی مرچ ڈالیں اور اسے ہلکی آنچ پر ڈھک دیں۔ (ضرورت محسوس کریں تو تھوڑا سا پانی شامل کر دیں) جب گوشت گلنے پر آ جائے تو اس میں فرائی کی ہوئی لال مرچیں اور مایونیز ڈالیں۔ تین سے چار منٹ دم پر رکھ کر اتار لیں۔ اس سادہ اور مزیدار ڈش کو ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

مرسلہ: نگہت آصف، اسلام آباد

چاکلیٹ شیفون

اشیا: کوکنگ چاکلیٹ، 100 گرام۔ جیلاٹن

پاؤڈر، دو کھانے کے چمچ۔ چینی، ایک پیالی۔ آئسنگ شوگر، دو کھانے کے چمچ۔ پانی ایک پیالی۔ انڈے کی سفیدی، دو عدد۔ فریش کریم، دو پیالی۔

ترکیب: پانی ابالیں اور ابال آنے پر اس میں چینی ڈال کر دس سے بارہ منٹ پکا کر شیرہ بنائیں اور چولھے سے اتار لیں۔ جیلاٹن میں دو کھانے کے چمچ نیم گرم پانی ملا کر اسے تھوڑی دیر پکالیں پھر اسے چینی کے شیرے میں ملا کر ٹھنڈا کرنے رکھ دیں۔ چاکلیٹ کے چھوٹے ٹکڑے کر کے پیالے میں ڈالیں اور اسے ابلتے ہوئے پانی میں رکھ کر پگھلائیں۔ جب پگھلنے پر آجائے تو اس میں ایک پیالی کریم ڈال کر ملالیں اور چولھے سے اتار لیں۔ صاف خشک پیالے میں چاکلیٹ کا آدھا مکسچر تہ میں ڈالیں پھر اس پر انڈے کا تیار شدہ مکسچر ڈال دیں اور ٹھنڈا کرنے فریج میں رکھ دیں۔ کریم کو پیکٹ سے نکال کر صاف خشک پیالے میں ڈالیں اور اس میں آئسنگ شوگر ڈال کر ٹھنڈی کرلیں پھر برف کے پیالے پر رکھ کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ ٹھنڈے کیے ہوئے پیالے کو فریج سے نکال کر اس پر کریم پھیلا کر ڈالیں اور اوپر سے چاکلیٹ چپ سے سجادیں۔ چاہیں تو پیالے میں پہلے بسکٹ کی بیس لگالیں (دس سے بارہ سادہ بسکٹ کو چورا کر کے اس میں دو سے تین کھانے کے چمچ پگھلا ہوا مارجرین یا مکھن ملالیں)

مرسلہ: کلثوم عباس، کراچی

اسپیشل بریانی

اشیا: گوشت بکرے کا، ایک کلو۔ چاول، ایک کلو۔ پیاز، ایک پاؤ۔ دہی، ایک پیالی۔ ادرک، لہسن، چار کھانے کے چمچے۔ (پسا ہوا) سفید زیرہ، ایک چائے کا چمچ۔ لال مرچ، دو کھانے کے چمچ۔ کالا زیرہ، ایک چائے کا چمچ۔ تیز پات، دو عدد۔ الائچی، چار عدد۔ لونگ، چار عدد۔ دار چینی، دو اسٹک۔ جائفل، جاوتری، آدھا چائے کا چمچ۔ بادام، کٹے ہوئے ایک چوتھائی پیالی۔ کشمش، ایک چوتھائی پیالی۔ تیل، ایک پیالی۔ گرم مسالا، پسا ہوا ایک چائے کا چمچ۔ خشخاش، دو کھانے کے چمچے۔ زعفران، ایک چٹکی۔ ابلے انڈے، چند عدد۔

ترکیب: گوشت میں پیاز سنہری تل کر ڈالیں، ساتھ ہی ادرک لہسن، خشخاش، زیرہ، گرم مسالا، لال مرچ ڈال کر دو گھنٹے رکھ دیں۔ بعد ازاں ہلکی آنچ پر گوشت پکائیں۔ گوشت گل جائے اور پانی خشک ہونے لگے تو جائفل، جاوتری اور الائچی پاؤڈر ڈال دیں۔ چاول بھگو کر ایک کنی ابال لیں۔ ابالتے وقت ثابت گرم مسالا بھی ڈال دیں۔ اب ایک برتن میں ابلے ہوئے چاول اور گوشت کی تہ بچھائیں۔ درمیان میں گرم مسالا تھوڑی سی تلی ہوئی پیاز، زعفران اور میوہ ڈالیں پھر باقی چاول اور بقیہ پیاز، زعفران ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ ڈش میں نکال کر ابلے ہوئے انڈے اور میوہ ڈال دیں۔ مزیدار بریانی تیار ہے۔

کشمیری چاول

اشیا: چاول، ایک کلو۔ گھی، ایک پاؤ۔ ادرک، لہسن، دو کھانے کے چمچ۔ نمک، حسب ذائقہ۔ زیرہ، دو کھانے کے چمچ۔ دہی، آدھا پاؤ۔ پستہ، چلغوزہ، کھوپرا، مونگ پھلی، اخروٹ سب ملا کر سو گرام۔ سیب، آدھا کلو۔ بادام، سو گرام چھلے ہوئے۔

ترکیب: گھی گرم کر کے پیاز باریک کاٹ کر سنہری تل لیں۔ بعد ازاں اس میں زیرہ، دہی، میوہ جات، نمک اور پانی ڈال دیں۔ ابال آنے پر بھیگے ہوئے چاول ڈال دیں۔ چاول نیم گل جائیں تو سیب چھیل کر باریک کاٹ کر ڈال دیں۔ بادام بھی تل کر ڈال دیں اور دم پر رکھ دیں۔

مرسلہ: زرینہ خان، بھارہ کہو

☆☆☆



1 ۔ چہرے کی شادابی اور خوب صورتی کا اصل راز مناسب اور پُرسکون نیند میں ہے۔ اس کا اہتمام کیجیے۔ اپنا بستر، کمرا اور خصوصی طور پر تکیہ صاف ستھرا اور آرام دہ بنائیں۔

2 ۔ اپنی زندگی میں پانی کا استعمال زیادہ کیجیے......فریج کے ٹھنڈے یخ پانی سے بہتر ہے سادہ پانی استعمال کریں اگر مٹکے یا صراحی کا پانی استعمال کریں تو بہتر ہے۔ ایک گلاس سادہ پانی نہار منہ پینے سے آپ کئی جسمانی تکالیف سے آزاد ہو جاتے ہیں۔

3 ۔ متوازن غذا آپ کی شادابی کی ضامن ہے۔ جب جسم چاق و چوبند ہوگا تو چہرہ بھی شاداب لگے گا۔ کسی بھی کام کو کرنے سے پہلے اس کا دورانیہ مدِ نظر رکھیے۔ اسی حساب سے ترتیب کار کا خیال رکھیے۔ اس طرح آپ اضافی تھکن سے بچ جائیں گی۔

4 ۔ سورج کی براہِ راست شعاعیں جلد کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ ضرورت کے تحت باہر جانے کی صورت میں معیاری سن اسکرین پروف کریمیں استعمال کریں جو سورج کی UVA اور UVB شعاعوں سے محفوظ رکھیں۔

5 ۔ کلینزنگ یا صفائی آنکھوں اور چہرے کے لیے سب سے ضروری ہے۔ روئی کی مدد سے ہلکے ہاتھ سے کریم لگا کر چہرے کی صفائی کریں۔

6 ۔ ٹوننگ اس کے بعد کا عمل ہے۔ ٹونرز... بہ آسانی بازار میں دستیاب ہوتے ہیں۔ اس کا استعمال کلینزنگ کے بعد کریں۔ نرم روئی کے گولے کی مدد سے ٹونر لگا کر اوپر کی جانب جلد پر مساج کریں۔ پیشانی، گال اور ناک کے کونوں پر اس کا استعمال ضرور کریں اور ساتھ ساتھ اپنی تھوڑی کو نہ بھولیں۔

7 ۔ موئسچرائزنگ ایسا عمل ہے جس کے انجام دینے سے ہماری جلد نرم اور ملائم ہو جاتی ہے اور خراب موسم کی وجہ سے ڈل یا خشک ہونے سے بھی محفوظ رہتی ہے۔ اس کے لیے کریم کو چہرے پر نہایت آرام سے لگائیں۔ پیشانی اور آنکھوں پر موئسچرائزنگ کرتے وقت دائروں کی شکل میں یہ عمل دُہرائیں۔ گردن اور تھوڑی کے نچلے حصے کو ہرگز نظر انداز نہ کریں۔

اس کے ساتھ چکنی، چٹپٹی اور بیکری کی مصنوعات کا کم سے کم استعمال کریں۔

8 ۔ گلاب کی پتیوں کو باریک پیس کر چہرے پر اس کا مساج کریں۔ یہ بہترین موئسچرائزر ہے۔ ابٹن میں عرقِ گلاب ملانے سے چہرہ نکھر جاتا ہے۔

چند روزمرہ کی چیزیں جو آپ کے حسن کی حفاظت بھی کریں گی اور اس کے نکھار کا باعث بھی ہیں۔

بیسن

بیسن جتنا کھانے میں مزے دار ہے اتنا ہی حسن بخش بھی ہے۔ اس کو صرف عرقِ گلاب کے ساتھ ملا کر روزانہ دس منٹ لگائیں، چہرے پر چمک اور نکھار پیدا ہوگا۔ دودھ میں بیسن شامل کر کے چہرے پر لگانے سے جلد نرم و ملائم ہو جائے گی۔ دن میں ایک بار بیسن سے منہ دھونے سے کیل مہاسے ختم ہو جاتے ہیں۔

دودھ

چہرے کی جلد کو نرم بنانے اور رنگت نکھارنے کے لیے کچے دودھ کو چہرے پر لگانا سب سے بہترین ٹانک ہے۔ اس کو چند منٹ چہرے پر لگائیں اور اس کے بعد منہ دھولیں۔ اس سے جلد صاف ستھری اور دلکش نظر آتی ہے۔ اکثر خواتین دودھ پینے سے چڑتی ہیں، حالانکہ ایک گلاس روزانہ دودھ پینے سے رنگت شاداب ہوتی ہے۔



بزم پاکیزہ
پاکیزہ بہنیں

پہلا انعام یافتہ سوال

☆ ارم کمال......فیصل آباد

سوال: جھوٹ بولے تو کوا کاٹے اور سچ بولیں تو......؟

جواب: لوگ کاٹیں گے بھی، نوچیں گے بھی اور کھسوٹیں گے بھی۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ نسرین......حیدر آباد

میں اپنے بال کی کھال کس سے نکلواؤں؟

جواب: اس کے لیے تو آپ کو قسائی کو بلوانا پڑے گا۔

☆ ساجدہ ظفر......کمالیہ

سوال: اصلی کا جوڑ یا سیلفی کا جوڑ......ان میں سے کون سا جوڑ زیادہ پکا ہوتا ہے؟

جواب: دونوں ہی کچے ہوتے ہیں اور سیلفی کا تو زیادہ کچا ہوتا ہے۔

☆ نازیہ نزی......نوشہرہ کینٹ

سوال: صاحب کمال کس کو کہتے ہیں؟

جواب: کمال صاحب کو۔

☆ نرگس نسیم......صابہ موہڑہ

سوال: بتائیں انہوں نے میرا کیا نک نیم رکھا ہے؟

جواب: نرگسی کوفتے۔

☆ خدیجہ جمیل......لاہور

سوال: پہلی بارش اور پہلی محبت میں کیا مماثلت ہے؟

جواب: دونوں میں اندازے کا پیریڈ غیر یقینی ہو جاتا ہے۔

☆ ماہ رخ......حیدر آباد

سوال: کیا دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں؟

جواب: میں نے تو آج تک نہیں دیکھے، ہمارے گھر میں تو بچے دیوار میں سوراخ کر دیتے ہیں۔

☆ عائشہ اعوان......رحیم یار خان

سوال: عورت کی سب سے بڑی خواہش؟

جواب: ہر خواہش پر دم نکلنے والی ہوتی ہے اور بس......

☆ حمنیٰ قندیل......کمالیہ

سوال: زندگی کو جاویداں بنانے کا راز؟

جواب: محنت، محنت اور ایمانداری

☆ ماہ نور......کراچی

سوال: کس موسم کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے؟

جواب: یہ تو آپ کی خوشی پر مبنی ہے کہ سردیاں پسند ہیں یا گرمیاں۔

☆ ساجدہ ظفر......کمالیہ

سوال: اگر ریشمی سا خواب پلکوں پر رقص کرنے لگے؟

جواب: تو آنکھیں بند کیے پورا رقص دیکھ لیجیے گا......کیونکہ اس کی تعبیر تو کھدر جیسی ہوگی۔

☆ یاسمین اسرار......ٹوبہ ٹیک سنگھ

سوال: اینٹ سے اینٹ ملے تو مکان بنتا ہے اور دل سے دل ملے تو......؟

جواب: دیوانگی۔

☆فلک بنت ندیم......حیدرآباد

سوال: سرپرائز سے کیا مراد ہے؟

جواب: آپ نے اکثر سنا ہوگا......فلاں شخص کے سر کی قیمت لگادی گئی ہے تو یہ سر کی قیمت کی طرف ہی اشارہ ہے۔

☆رنی......لطیف آباد

سوال: چور چوری سے جاتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں جاتا، کیوں؟

جواب: لوگوں کی عادتوں میں تبدیلیاں آتی ہیں‘ فطرت میں نہیں۔

☆ادیبہ صدف......لطیف آباد

سوال: عید قرباں پر دعوتیں کیوں کی جاتی ہیں؟

جواب: فریج اور ڈیپ فریزر میں رکھے ہوئے گوشت کو قدرے کم کرنے کے لیے تاکہ دیگر چیزوں کو رکھنے کی جگہ بنائی جائے۔

☆نازیہ......نوشہرہ

سوال: بے وقوفی کی آخری حد کیا ہے؟

جواب: وہی جو پاگل پنے کی شروع کی ہوتی ہے۔

☆یاسمین......کمالیہ

سوال: کمر کو کمرا بننے میں کتنی دیر لگتی ہے؟

جواب: شادی کے بعد دو تین بچوں کے بعد کمر......کمرا تو کیا اچھا خاصا لاؤنج بھی بن جاتی ہے۔

☆سیدہ غزالہ عالم......لانڈھی

سوال: سال 2016ء کس کا قرار پایا ہے؟

جواب: ہمیشہ کی طرح خواتین کا، محبت کا، فیشن کا، حرص کا۔

☆مسز روزینہ عابد......کراچی

سوال: اگر سیدھی آنکھ پھڑکے تو غم اور الٹی آنکھ پھڑکے تو خوشی ملتی ہے۔ اور اگر دونوں آنکھیں ایک ساتھ پھڑکیں تو کیا سمجھنا چاہیے؟

جواب: یہی کہ آپ کو آشوب چشم کا مرض لاحق ہوگیا ہے۔

☆انیسہ حامد......کراچی

سوال: مینڈک کی کوز کام کب ہوتا ہے؟

جواب: جب وہ تواتر سے آئس کریم کھاتی رہے اور گھر والوں سے چھپ کر باہر آنگن میں شام سات سے صبح سات تک اپنے مینڈک کو سب کہہ دو پروگرام کے تحت موبائل پر بھی لگی رہتی ہے۔

☆پروین......کراچی

سوال: سیاست سے کوئی دلچسپی؟

جواب: بالکل بھی نہیں۔

☆مس رداحامد......کراچی

سوال: دل دیتا ہے رو، رو دہائی......آخر کیا؟

جواب: کسی پر اعتبار نہ کرو۔

☆ثریاناز......پنجاب

سوال: وہ جب بھی مجھے دیکھتے ہیں، میری شہزادی کہتے ہیں۔ وہ بھی چپکے سے کیوں؟

جواب: دراصل انہیں یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ وہ شہزادے ہیں۔

☆انیسہ زینب......شیخوپورہ

سوال: ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے تو پھر ایک ناکام مرد کے پیچھے کس کا ہاتھ ہوتا ہے؟

جواب: جب بہت سی عورتیں ایک مرد کو بے وقوف بنانے کی کوششیں کریں گی تو اسے ناکامی ہی ملے گی ناں......

☆ایس رانی......سندھ

سوال: باجی اگر میں آپ سے کہوں......کہ آپ اپنی تعریف خود کریں اور شعر میں کریں......تو کیا کہیں گی؟

جواب:

میرے اندر بہت اجالے ہیں
نام انجم جو ماں نے رکھا تھا

☆☆☆



روحانی مشورے

ادارہ

اُمّت مسلمہ کے زوال کا اصل سبب

آج نہ صرف پاکستان بلکہ تمام اُمّتِ مسلمہ پر زوال آرہا ہے اور اس کی اصل وجہ اللہ تعالیٰ کی کتابِ یعنی قرآن حکیم سے دوری ہے۔ ارشادِ نبوی ہے۔ ”بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس کتاب (یعنی قرآن حکیم) کے ذریعے قوموں کو عروج عطا کرے گا اور اس کتاب ہدایت کی تعلیمات پر عمل نہ کرنے کے نتیجے میں کچھ لوگوں کو پست کردے گا۔“ اب آپ خود ہی غور کریں کہ ہم میں سے کتنے لوگ قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں اور اسے سمجھتے ہیں۔ اور اس کی تعلیمات پر عمل کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے اولاد مانگنے کی تین دعائیں

جس شخص کی اولاد نہ ہو یا نرینہ اولاد نہ ہو، وہ ذیل کی دعا کثرت سے مانگا کرے۔

ربِّ لا تذرنی فرداً وأنت خیر الوارثین O

ترجمہ: ”اے میرے پروردگار! مجھے تنہا نہ چھوڑ اور آپ بہترین وارث ہیں۔“

اگر ہوسکے تو دو رکعت ”صلوۃ الحاجتہ“ کی نیت سے پڑھے اور پھر دعا مانگے، اس لیے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص تنہائی میں دو رکعت نماز پڑھے، جس کو اللہ اور اس کے فرشتوں کے سوا کوئی نہ دیکھے تو اس کو جہنم کی آگ سے بری ہونے کا پروانہ مل جاتا ہے۔

اور جو شخص دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ پاک سے کوئی دعا مانگتا ہے تو حق تعالیٰ شانہ وہ دُعا قبول فرمالیتا ہے خواہ فوراً یا کسی مصلحت سے کچھ دیر کے بعد مگر قبول ضرور فرمالیتا ہے۔

حضرت زکریاؑ کی دعا

☆ حضرت زکریا علیہ السلام نے اولادِ نرینہ کے لیے یوں دعا کی۔

رب ھب لی من لدنک ذریۃ طیبۃ ج انک سمیع الدعاء O

ترجمہ: اے میرے پروردگار! اپنی جناب سے مجھ کو (بھی) نیک اولاد عنایت فرما کہ تو (سب کی) دعائیں سنتا ہے (پ ۳۔ آل عمران، آیت ۳۷)

اپنے بچوں کو بد دعا نہ دیں

یہ حقیقت ہے کہ آج کل بہت سے گھرانوں میں والدین اپنی اولاد کی نافرمانی کے ہاتھوں تنگ ہیں اور اگر وہ مالی طور پر بھی ان کی ذمے داری بن گئے ہیں تو ان کے ساتھ ان کی اولاد (جس میں بیٹے، بیٹی دونوں شامل ہیں) کا رویہ بے حد خراب ہے، وہ اپنے والدین سے بدتمیزی سے بات کرتے ہیں اور ذرا، ذرا سی بات پر چڑھ کر آتے ہیں...... جس سے والدین غصے میں آکر اپنے بچوں کو بددعائیں دیتے ہیں اور دوسری صورتِ حال ایسی بھی ہے کہ جہاں والدین پیسے کے حساب سے بے فکر ہیں مگر ان کی اولاد ان کا پیسہ پانی کی طرح بہاتے ہوئے ذرا پریشان نہیں ہوتی...... ایسے میں بھی والدین کو... بددعائیں دیتے دیکھا ہے، اس لیے میں تمام والدین سے یہ کہنا چاہوں گی خدارا آپ اپنے بچوں کو ہرگز... بددعائیں نہ دیں ورنہ وہ اللہ کی گرفت میں آجائیں گے۔ ناخلف اولاد کے لیے آپ ضرور دعا کریں، میں نے ایک جاہل ماں کے منہ سے ایک بہت خوب صورت بات سنی تھی جب وہ اپنے بیٹے سے بہت

ناراض تھی اور وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''اللہ بخشاں والے نوں نیک توفیق دے دے۔''

نافرمان اولاد کے سرہانے بعد نماز فجر ''یا شہید'' اکیس مرتبہ ہلکی آواز میں پڑھ کر پھونکیں۔

اپنے بچوں کے دوست بنیے

کتنی عجیب بات ہے کہ آج کی مائیں نہ اپنی بیٹیوں کی دوست ہیں اور نہ ہی اپنے بیٹوں کی...... ان کے بچوں کے کون دوست ہیں اور کن گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں وغیرہ، نہ ہی والدین اپنے بچے کے دوستوں کے والدین سے باخبر رہتے ہیں۔ بحیثیت ماں آپ کا یہ فرض ہے کہ اپنے بچوں کی دوست بنیں جب آپ کے بچے گھر سے باہر جائیں ان پر چاروں قل اور آیت الکرسی پڑھ کر دم کر کے بھیجیں اور ان سے اس حد تک دوستانہ رویہ رکھیں کہ اگر آپ کی لڑکی یا لڑکے کو کوئی پسند آ جائے تو وہ اس کے بارے میں سب سے پہلے آپ کو بتائے اور آپ بھی بجائے ان کو ڈانٹنے اور پھٹکارنے کے ان کی بات خوب توجہ سے سنیں کم عمر لڑکے لڑکیاں اپنی پسند کی چیزوں کو اپنی محبت کا نام دے دیا کرتے ہیں اور کم عقل مائیں اپنے بچوں پر چیخنا چلانا شروع کر دیتی ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنی ماں کے ساتھ دوستی کا رشتہ ختم کر دیتے ہیں اور یوں...... صورت حال قابو سے باہر ہوتی جاتی ہے۔ اپنے بچوں پر ہر دم سورۂ اخلاص اور اسم الٰہی یا ودود کا ورد کریں۔ انہیں باتوں باتوں میں رسولِ پاکؐ، ازواجِ رسول اور صحابہ کرام کی زندگیوں کے واقعات سناتی رہیں اور گھر میں دینی کتب کا اہتمام کریں۔

گھٹنوں کا درد اور جسم کی سوجن کے لیے

دو ٹیبل اسپون سفید تل لے کر 1/2 کپ پانی میں رات کو بھگو دیں۔ رات کو اگر آٹھ بجے انہیں بھگویا ہے تو صبح آٹھ بجے ہی اسے استعمال کرنا ہے۔ صبح اٹھ کر یہ تل پانی سمیت اچھی طرح پیس لیں یہ پیسٹ سا بن جائے گا اب اس میں ایک گلاس پانی ڈال کر خوب مکس کر لیں اور پھر اسے چھان لیں پانی علیحدہ رکھ لیں اب اس پھوک میں ایک گلاس پانی اور ڈال کر مکس کریں پھر اسے بھی چھان کر پہلے پانی میں ملا لیں اب پھوک پھینک کر اس میں سے ایک گلاس صبح پی لیں اور ایک گلاس شام میں پی لیں لگاتار دو تین مہینے کے استعمال کے بعد دیکھیں کہ بہت فائدہ ہوگا انشاء اللہ اس سے گھٹنوں کا درد، جسم کی سوجن کسی حد تک موٹاپا اور جسم کا درد بھی دور ہوگا۔

یہ بے حد آزمودہ نسخہ ہے...... لازمی بات جو آپ کو یاد رکھنی ہے وہ بھی ہے کہ پینے سے قبل بے شک تین بار ہی سورۂ فاتحہ اول و آخر درود شریف کے ساتھ دم کریں۔ مگر کرنا ضرور ہے۔ سورۂ فاتحہ...... تمام امراض کو جڑ سے ختم کر دیتی ہے۔ اخلاصِ نیت شرط ہے۔ اس کے علاوہ سفید تل کا استعمال کسی بھی طرح خواتین کو ضرور رکھنا چاہیے بعد دو پاک سورۂ فاتحہ۔ یا سورۂ اخلاص لازمی پڑھیں۔

شوہر سے لڑ کر میکے چلے جانا

میاں بیوی کی لڑائیاں بعض گھرانوں میں تو یومیہ ہوا کرتی ہیں اور بعض گھرانوں میں ہفتہ وار تو لازمی ہوتی ہیں اور جہاں ماہانہ بنیادوں پر ہوتی ہیں وہ خاصی زوردار ہوا کرتی ہیں جس میں بیویاں سوٹ کیس اٹھا کر اپنے میکے چلی جاتی ہیں اور شوہر سکون کی سانس لیا کرتے ہیں۔ اس لیے یاد رکھیے کہ کبھی اپنے شوہر سے لڑ کر میکے نہ جائیں بلکہ اگر میاں غصے میں گھر سے نکالیں تب بھی نہ جائیں...... اور جب شوہر کو غصہ آئے اور وہ لڑنا شروع کریں آپ درودِ ابراہیمی پڑھنا شروع کر دیں اور غصے میں کبھی ترکی بہ ترکی جواب نہ دیں۔ آپ کی یہ خاموشی آپ کے شوہر کا غصہ یقیناً کم کرے گی یوں ایک ہاتھ سے کوئی کب تک تالی بجا سکتا ہے۔

☆☆☆

اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

پسینے کی زیادتی

نصیر احمد............آزاد کشمیر

سوال:۔ میری عمر اکیس سال ہے۔ مجھے پسینا بہت آتا ہے۔ گرمی یا سردی میں اگر تھوڑا سا بھی تیز چلتا ہوں تو بھی پسینا آجاتا ہے۔ لوگوں کو بھی پسینا آتا ہے لیکن جو پسینا مجھے آتا ہے وہ کچھ زیادہ ہے۔ مہربانی فرما کر مجھے حل بتائیں۔

جواب:۔ استاد نے شاگرد سے پوچھا تمہیں آتا کیا ہے؟ شاگرد نے جواب دیا سر آپ کو دیکھ کر پسینا۔ نصیر صاحب آپ نے پسینے کی زیادتی کی شکایت تو کر دی لیکن یہ نہیں بتایا کہ (۱) ایسا کب سے ہو رہا ہے (۲) کسی بیماری یا حادثے کی وجہ سے ایسا ہوا (۳) وزن کی زیادتی بھی اس کی وجہ ہو سکتی ہے (۴) پسینہ ٹھنڈا ہوتا ہے یا گرم (۵) پسینے میں کسی قسم کی بو آتی ہے (۶) پسینا زیادہ کہاں آتا ہے، ماتھے پر، بغلوں میں، ہاتھوں پیروں پھر یا جسم پر؟ (۷) کیا سوتے ہوئے بھی پسینہ آتا ہے (۸) شام یا رات کو بھی پسینا آتا ہے؟

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

نومبر 2016ء

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________

پتا: ____________

____

قارئین آپ نے دیکھ لیا کہ بات ایک چھوٹی سی ہے لیکن صحیح تجویزِ دوا کے لیے ہمیں کتنی باریکیوں میں جانا پڑتا ہے۔اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ اپنی کیفیات کو تفصیل سے لکھ کر بھیجیں۔

فی الحال آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Cala Carb 30 کے 5,5 قطرے ایک گھونٹ پانی میں ملا کر دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔

چہرے پر چھائیاں

شبانہ عارف......گاؤں خاوری

سوال: السلام علیکم! میرے ساتھ جو مسئلہ ہے وہ تقریباً سات آٹھ سال پرانا ہے۔میرے چہرے پر چھائیاں ہیں اور منہ کے اردگرد دانوں کے نشان ہیں۔بہت کریمز اور دوائیں استعمال کی ہیں لیکن افاقہ تو کوئی نہیں ہوا اُلٹا آنکھوں کے نیچے .... اور گالوں کے اُوپر.... بادامی داغ نمودار ہو گئے ہیں۔ان داغوں کو ایک سال ہوا ہے اور آنکھوں کے گرد حلقے بھی ہیں۔اسکن بہت خشک ہے۔میں ایک بات بتاتی چلوں میرے مینسز پورے 22 دن کے بعد آتے ہیں لیکن وہ ایسے کہ دو دن لیکوریا میں تھوڑی سی سرخی شامل ہو جاتی ہے اس کے بعد تیسرے دن صحیح طریقے سے مینسز آتے ہیں اور درد بھی بہت ہوتا ہے۔پلیز میرے خط کا جواب ضرور دینا۔شاید میرا خط آپ کو اکتوبر کے شمارے کے بعد ملے کیونکہ یہاں پر ڈاک کا بہت زیادہ مسئلہ ہے۔

جواب: شبانہ صاحبہ، آپ نے اپنی عمر اور ازدواجی حیثیت نہیں لکھی اور وزن بھی نہیں لکھا۔آپ کی کیفیات سے جہاں تک ہم سمجھتے ہیں کہ مسئلہ آپ کے چہرے کا بالواسطہ نہیں بلکہ یہ رحم کی خرابی کی وجہ سے ہے۔لہٰذا ہماری پہلی کوشش یہ ہوگی کہ آپ کو ایسی ادویات تجویز کی جائیں جو آپ کے ایام کو نارمل کریں اور لیکوریا ختم ہو۔متوازن غذا استعمال کریں،خون کی کمی نہ ہونے دیں،ہلکی پھلکی ورزش کیا کریں۔پانی کے کم از کم 8 گلاس روزانہ پیا کریں۔پھل اور سبزیوں کا استعمال بڑھائیں۔ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات کا استعمال کریں۔Pulsatilla 30 کے 5 قطرے چوتھائی گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ اور Ashoka Q کے 10 قطرے آدھا گلاس پانی میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔2 ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

پیٹ کے کیڑے

قاسم دین......کراچی

تھکن ہر وقت رہتی ہے۔آرام کرنے سے تھکن میں زیادتی ہوتی ہے، تھکن دور نہیں ہوتی۔سر میں اکثر درد رہتا ہے اور پیروں کے تلوے جلتے ہیں۔ناک میں یعنی ناک کی نوک پر خارش ہوتی ہے، کسی وقت بھی گلے میں کچھ اٹکنے کا احساس ہوتا ہے۔بھوک مناسب لگتی ہے مگر جب تھوڑا بہت کھا لوں تو متلی ہونے لگتی ہے۔متلی میں اگر اُلٹی کرنے کی کوشش کروں تو تھوک تھوڑا سا آتا ہے۔معدے کے مقام پر اُلٹی کا زور لگانے سے شدید قسم کا درد ہوتا ہے۔درد کے وقت سانس لینا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور کچھ ہی دیر بعد

درد ختم ہو جاتا ہے۔ معدے میں بھی کبھی ہلکا درد رہتا ہے خاص کر جب سو کر اُٹھوں یعنی آنکھ کھل جائے اس وقت تک درد نہیں ہوتا، جسم کے ہلاتے ہی اور اُٹھتے ہی معدے میں درد ہوتا ہے جو پانی پینے اور اس کے بعد ناشتا کرنے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔

حلق میں اور مسوڑھوں میں اکثر دھاگے رکھے ہوئے یا کسی چیز کے چپکے ہونے کا احساس رہتا ہے۔ دانت ہر وقت صاف کرنے کے باوجود گندے رہتے ہیں۔ دانت گندے رہنے سے مراد صاف کرنے سے صاف ہو جاتے ہیں مگر کچھ دیر بعد پھر گندے ہو جاتے ہیں۔ ویسے تو قبض نہیں ہے لیکن اجابت کبھی روزانہ کبھی دو تین دن بعد ہوتی ہے وہ بھی زیادہ نہیں..... میری امی کہتی ہیں کہ میں بچپن میں مٹی کھاتا تھا اور کیڑے تھے۔

جواب:۔ رات کو جلدی سوئیے اور صبح سویرے اُٹھیں۔ فجر کی نماز پڑھ کر ورزش کیا کریں، صاف رہا کریں، روزانہ نہایا کریں۔ ہر چیز میں صفائی کا خاص خیال رکھیں۔ پانی بھی اُبلا ہوا پیا کریں۔ صبح ناشتے میں اور دوپہر کے کھانے میں پھلوں کو بھی شامل کرلیں۔ مثلاً صبح کیلا اور سیب۔ دوپہر کے کھانے میں مٹھا اور انار وغیرہ جو بھی مل جائے۔ سبزیاں بھی استعمال کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات صبح نہار منہ Sulphur 30 کی ایک خوراک۔ روزانہ رات کو سونے سے پہلے Nux Vomica 30 کی ایک خوراک Natrum Phos 30 کی ایک خوراک 11 بجے دن اور Santoninum 30 کی ایک خوراک شام 6 بجے لیا کریں۔ ایک ماہ بعد اپنی کیفیت سے آگاہ کریں...... خوراک سے مراد 5 قطرے چوتھائی گلاس پانی میں ڈال کر استعمال کریں۔

ذہنی کیفیت

جاوید تحسین.........کراچی

سوال:۔ آپ اور آپ کے بورڈ آف ڈاکٹرز نے میرے مسئلے کا حل بہت جلد بھیج کر مجھ پر ایک عنایت کی جس کے لیے میں تہ دل سے شکر گزار اور دُعا گو ہوں۔ تقریباً ایک ماہ ہونے کو ہے جو کیفیت اور فائدہ ظاہر ہوا وہ کچھ اس طرح سے ہے۔

(۱) شروع کے دو تین دن مجھے نیند سکون سے آجاتی تھی اور مجھے کسی قسم کی انگریزی دوائی کا سہارا نہیں لینا پڑا۔

(۲) میں نے انگریزی دوا ایک ماہ ہوا مستقل چھوڑ دی ہے اور خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ اس سے مستقل نجات مل جائے۔

(۳) پچھلے ایک ہفتے سے میں نوٹ کر رہا ہوں کہ نیند مجھے بہت دیر سے آتی ہے یعنی ڈھائی سے تین بجے تک اور چونکہ مجھے صبح سویرے اُٹھنا پڑتا ہے اس وجہ سے میں جلد ہی اُٹھ جاتا ہوں۔ میں یہ بات قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو ان دوائیوں سے فائدہ نہ ہوا ہو۔ خدا کے فضل سے مجھے ان دوائیوں سے بہت فائدہ ہوا۔ پہلے میں اگر کبھی رات بھر جاگ جاتا تھا تو صبح کو کام کرنے کی صلاحیت نہ ہوتی تھی۔ دن بھر خصوصاً ٹانگوں اور کمر میں بہت درد ہو جاتا تھا اور دماغ سائیں سائیں کرتا تھا۔ ان دواؤں کے استعمال

سے کم از کم یہ کیفیت نہیں ہوتی۔ اگرچہ میں آج کل تین سے چار گھنٹے سو رہا ہوں۔ یہ میری کیفیت ہے۔ اب آپ جو مشورہ دیں اس کے مطابق عمل کر کے کلی طور پر شفایاب ہو جاؤں۔

جواب:۔ بہت خوشی ہوئی کہ پہلے سے خود کو بہتر محسوس کر رہے ہیں۔ اللہ آپ کو مکمل شفایاب کرے۔ آپ نے اپنی ذہنی کیفیت کے متعلق نہیں لکھا کہ وہ اب کیسی ہے؟ شک کی عادت کس حد تک ہے؟ دوستوں وغیرہ سے کوئی لڑائی جھگڑا تو نہیں کرتے؟ نیند کی کوئی دوا نہ کھائیں، یہ ذہن پر اچھا اثر نہیں ڈالتی۔ جو ہدایات ہم نے آپ کو پہلے دی تھیں کیا آپ اس پر عمل کر رہے ہیں؟ عمل جاری رکھیں اور پچھلی دواؤں کو روک دیجیے اور ایک ہفتے کے بعد سب سے پہلے ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Thuja 200 کی ایک خوراک صبح اور ایک شام لیجیے پھر تیسرے دن سے دوپہر کے کھانے کے بعد ایک کپ پانی میں مندرجہ ذیل ادویہ کے 5,5 قطرے ڈال کر استعمال کریں۔

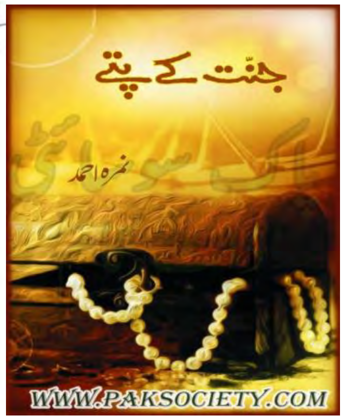
Gelsemium 30 + Passiflora Q + Ignatia 30 + Stramonium 30 ایک ماہ کے استعمال کے بعد پھر کیفیت سے آگاہ کریں۔ یاد رکھیں دوائیں ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی ہی کی استعمال کرنی ہیں۔

صحت مند رہنے کے لیے
متوازن غذا کی ضرورت

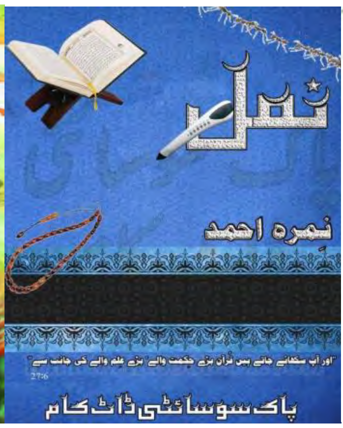
قبل اس کے کہ میں موضوع پر بات کروں پہلے ہم سمجھ لیں کہ ہم کھانا کھاتے کیوں ہیں؟ کوئی کہے گا زندہ رہنے کے لیے۔ کوئی کہے گا مزے کے لیے۔ کوئی کہے گا طاقت کے لیے۔ آپ سب لوگ اپنے طور پر صحیح ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ زندگی کی بقا، جسم کی نشوونما اور ذمے داریوں کی انجام دہی کے لیے ہمیں غذا کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ غذا صاف ستھری، سادہ، تازہ، جراثیموں سے پاک اور متوازن ہوگی تو نہ صرف یہ ہماری زندگی کو قائم رکھے گی بلکہ جسمانی نشوونما میں بھی اپنا بھرپور کردار ادا کرے گی اور ہمیں اس قابل بنائے گی کہ ہم اپنی زندگی کی ذمے داریوں کو احسن طور پر انجام دے سکیں۔ اس کے لیے یہ باتیں ذہن میں رکھیں۔ (۱) غذا صاف ستھری، تازہ اور سادہ ہو۔ (۲) صحیح طور پر پکائی جائے۔ (۳) صحیح طور پر کھائی جائے۔ (۴) متوازن ہو۔ (۵) موسم کے حساب سے غذا کا استعمال کیا جائے۔ مندرجہ بالا باتوں کو سمجھیں تاکہ بہتر طور پر عمل کر سکیں۔

(۱)۔ غذا جتنی صاف ستھری اور تازہ ہوگی وہ بیماریوں سے بچائے گی، اور جتنی سادہ ہوگی اتنی ہی آسانی سے ہضم ہوگی اور جسم کو طاقت پہنچائے گی۔ مرغن غذائیں (قورمہ، بریانی، باربی کیو، برگر، پیزا وغیرہ) مزے میں یقیناً بہت اچھی ہوتی ہیں، بار بار کھانے کو بھی جی چاہتا ہے لیکن یہ غذائیں بیماریاں پیدا کرتی ہیں۔ مثلاً تیزابیت، السر، کینسر، بدہضمی، وزن کا بڑھنا، کولیسٹرول، شوگر، بلڈ پریشر، جگر اور دل

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

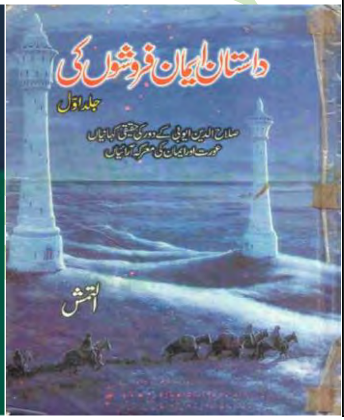




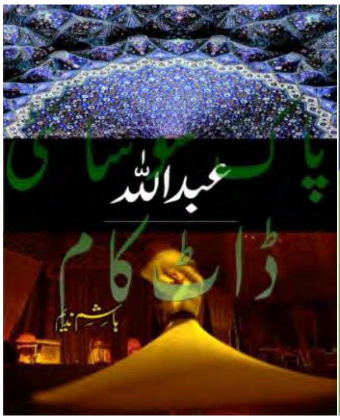


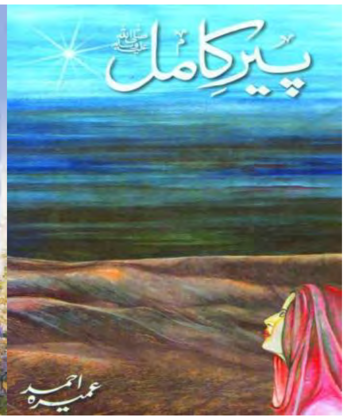


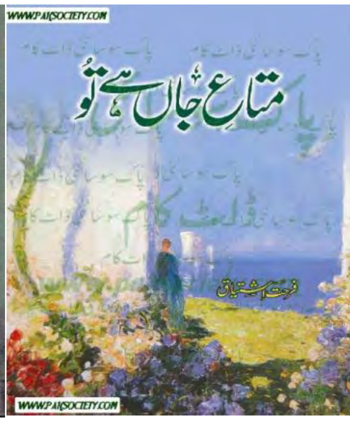


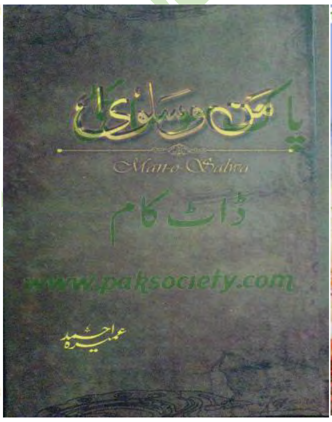




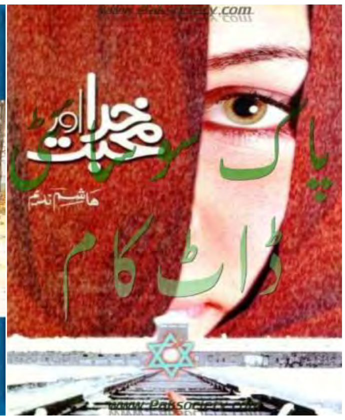


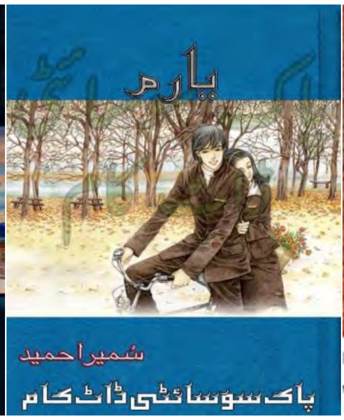




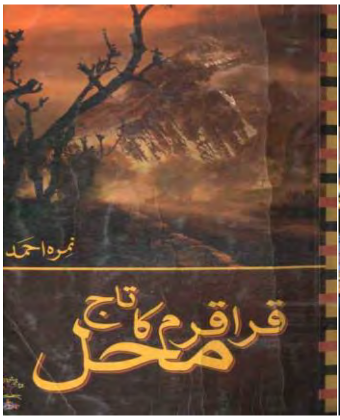












کے مسائل وغیرہ۔

(۲)۔کچھ سبزیاں کچی مفید ہوتی ہیں اور کچھ پکائی ہوئی۔کھانا کھاتے وقت یہ خیال رکھنا چاہیے جو چیز آپ پکا رہے ہیں اس کو کتنے گھی، تیل میں پکانا ہے اور کتنی دیر پکانا ہے۔تلی ہوئی، بھنی ہوئی خصوصاً کوئلے پر بھنی ہوئی چیزیں صحت کے لیے زیادہ مفید نہیں۔

(۳)۔ہمارے کھانے پینے کے طریقے بھی ہماری غذا کی افادیت کو کم یا ختم کر دیتے ہیں۔کھانا کھانے کا طریقہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔

(الف) کھانا کھانے کا ایک وقت مقرر کریں اور اس کی پابندی کریں۔پتے کی پتھری اور تیزابیت کی وجہ یہ بھی ہوتی ہے۔

(ب) کھانے سے پہلے ہاتھ دھوئیں اور ان کو تولیے سے نہ پونچھیں۔

(ج) پانی کھانا شروع کرنے سے پہلے پئیں درمیان میں اور آخر میں ہرگز نہ پئیں۔اس سے کھانا ہضم کرنے میں مشکل ہوگی اسی طرح کھانے کے بعد کولڈ ڈرنک، کافی، چائے وغیرہ کا استعمال بھی نہ کریں۔کم از کم دو گھنٹے بعد پانی یا مشروب کا استعمال کریں۔

(د) کھانے کے بعد فروٹ کا استعمال نہ کریں بلکہ اس کے لیے ایک الگ وقت بنائیں پہلے کھائیں یا کچھ دیر بعد۔

(ح) کھانا بیٹھ کر اور بسم اللہ پڑھ کر شروع کریں۔

(و) کھانا کھاتے وقت ماحول کو پُرسکون رکھیں۔نہ باتیں کریں، نہ ٹی وی دیکھیں، نہ کوئی اخبار یا کتاب پڑھیں۔اچھی طرح چبا کر کھائیں۔نوالہ اتنا بڑا بنائیں جس کو اچھی طرح چبا سکیں (بغیر پانی کے)

(۴)۔متوازن غذا سے مراد ایسی غذا جس میں گوشت (گائے، بکرا، مچھلی، مرغی) انڈا، دودھ، دالیں، سبزیاں، پنیر، مکھن، گھی، تیل، فروٹ اور پانی کی ایک مناسب مقدار کم از کم روزانہ شامل ہو کیونکہ ہمارے جسم کو لحمیات، نشاستہ اور حیاتین کی ضرورت ہوتی ہے۔جسم کی نشوونما کے لیے توانائی اور بیماریوں سے دفاع اور حفاظت کے لیے متوازن غذا کا استعمال ضروری ہے۔

(۵) موسم کے حساب سے غذا کا استعمال کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ موسم کی سبزیوں اور پھلوں کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے۔

کیونکہ اسی طرح ہم اپنے آپ کو بہت ساری بیماریوں سے نہ صرف محفوظ رکھ سکتے ہیں بلکہ جسم کی نشوونما بھی صحیح طور پر کر سکتے ہیں۔

آپ کو صحت کے متعلق کوئی مسئلہ ہو تو اس کے حل کی رہنمائی کے لیے آپ ہم سے... پوچھ سکتے ہیں۔

☆☆☆☆☆